

پچھلے تیس منٹ سے میں مسلسل ایک کام کر رہی تھی اور وہ تھا بالوں کو سلجھانے کا کام مگر بال ابھی تین تین حصے سلجھے تھے ایک حصہ ابھی بھی سلجھانے والا رہتا تھا۔ ہاتھ شل ہو کر میری جھنجھلاہٹ کو بڑھا گئے تو روہانسی ہو کر میں نے پہلے برش پٹا پھر گھٹنوں میں منہ چھپا کر بے بسی سے سسکنے لگی۔ یہ بے حد گھنیرے اور لمبے ریشمی بال میری ماما کو جتنے پسند تھے۔ میرے لیے اسی قدر وبال جان ہو چکے تھے۔ انہیں سنبھالنا اور سنوارنا میرے لیے سب سے دشوار امر ہو چکا تھا۔ ایک حد تک یہ ذمہ داری ماما کی ہی تھی مگر پچھلے کچھ دنوں سے چونکہ ان کی طبیعت کچھ بہتر نہ تھی اور یہ کام تنہا میرے اوپر آ گیا تھا اور میری وہی لا پرواہی ہر روز کالج جاتے وقت تیاری میں بس اوپر اوپر سے سیدھے کیے اور کچر میں جکڑ کر کام چلا لیا یہ یقیناً اسی کوتاہی کا نتیجہ تھا کہ میرے بال اس وقت کسی جھاڑی کا نقشہ پیش کر رہے تھے وہی ریشمی سلکی بال جن پر میری ماما سمیت میری دوستیں دل و جان سے فدا تھیں اور ماما تو اس عاشقی میں اتنا آگے تھیں کہ مجھے کبھی بال کٹوانے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔ حالانکہ میں نے کتنی منتیں کی تھیں ہر طرح سے ضد کر کے دیکھ لی مگر واحد میری یہی ایک خواہش تھی جو بھائیوں سمیت ماما نے بھی بڑی بے نیازی سے رد کر دی تھی جس کے نتیجے میں میں نے روزمرہ کی ذمہ داری بھی ماما پر ڈال دی تھی۔ یہ میرا بڑا معمول سا احتجاج تھا جس میں میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی۔

”کیا ہوا بیٹے؟“

میں یونہی بال بکھرائے سر نیورائے بیٹھی ہوئی تھی جب ماما دودھ کا گلاس لیے اندر آئی تھیں جو ابابا میں نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا اور آنسو بھری آنکھیں جھکا لیں۔

افوہ یہ بھی کوئی رونے والی بات ہے؟ لاؤ میں منٹوں میں سلجھا دیتی ہوں۔ ”انہوں نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور میرا پھینکا ہوا برش اٹھا کر نزدیک آ گئیں۔“

”کب تک کریں گی آخر آپ۔ کیا ہے اگر تھوڑے سے کٹوانے دیں۔“

میری جھنجھلاہٹ بے بسی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”آپ بہت ناشکری کا مظاہرہ کر رہی ہو حجاب بیٹا! آپ کو احساس تک نہیں ہے آپ کفرانِ نعمت کی مرتکب ہو رہی ہو۔ ارے لڑکیاں تو ترستی ہیں ایسے حسین بالوں کے لیے جان ماری کرتی ہیں طرح طرح کے ٹوئکے استعمال کر کے اور تم..... فکر مت کرو آپ کی شادی کروں گی تو ایک نوکرانی دے دوں گی۔ اس کام کو“

وہ جب بھی غصہ ہوتیں مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں ان کا انداز اس غصے میں بھی اتنا دھیمّا اتنا پر جذب ثابت ہوا کرتا تھا کہ میں اپنی جھنجھلاہٹ کو بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہوتا محسوس کرتی۔ مجھے پتا بھی نہ چلتا اور میرے اندر کی تمام تلخی سارا تناؤ ختم ہو جاتا۔ اب پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے گہرا سانس کھینچا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا گویا ہار تسلیم کر لی۔

”آپ نے بس انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے ماما۔ ورنہ اگر بال کٹ جائیں تو آپ کو بھی اس مفت کے بیگار سے نجات حاصل ہو۔“

بال سلجھ گئے تھے ماما چوئی گوندھ رہی تھیں جب میں نے پھر انہیں طیش دلانے والی بات کی۔ یہ انا کا نہیں مذہب کا مسئلہ ہے۔ آپ کو پتا ہے بال کٹوانا سخت گناہ ہے۔

”ایگریکلی ماما یہی تو میں اسے سمجھاتا ہوں کہ یہ بال اسے بہت جگہ کام دے سکتے ہیں۔“ اسی پل موسیٰ بھائی بولتے ہوئے کمرے میں آ گھسے تو میرے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے۔

”اونہہ بال نہ ہو گئے مسئلہ کشمیر ہو گیا۔ جو حل ہونے کا نام نہیں لے رہا۔“

میں حلق تک بے زار ہو چکی تھی اس بحث سے۔

”افوہ پہلا فائدہ تو سنو یہ جو تمہاری اپر سٹوری عقل سے خالی ہے اس ایک بڑی خامی کو تمہارے انہیں بالوں نے بڑی خوبصورتی سے چھپا رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہو سکتا ہے ہمارے دولہا بھائی کو لمبے گھنے بالوں والی دلہن پسند ہو۔ اور تو تم میں کچھ بھی ایسا خاص نہیں کہ اگلے گھر سدھارنے کی وجہ بن سکے۔ اس ایک وجہ کو بھی اگر ہم ہاتھ سے گنوا دیں تو سوچو تمہاری شادی کیسے ہوگی۔“

وہ شروع ہو چکا تھا اور میرا غم و غصے سے برا حال ہونے لگا۔ میں تلملا کر اٹھی تھی اور آؤ تاؤ دیکھے بغیر صوفے سے کشمٹھا کر اسے دے مارا ابھی غصہ ختم نہیں ہوا تھا جیسی مزید کشنز کی طرف جھپٹی مگر ماما بروقت ہمارے درمیان حائل ہو گئیں۔

”حجاب یہ کیا حرکت ہے بیٹا! بھائی بڑا ہے آپ سے۔“

”مگر اسے بھی تو دیکھیں نا کیسی باتیں کر رہا ہے۔“

میری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

”مذاق کر رہا ہے۔ بھائی ہے۔“

ممانے مجھے اپنے ساتھ لگا کر تھپکا۔

”مجھے ایسے مذاق پسند نہیں اگر کرے گا تو پھر مار کھائے گا مجھ سے۔“

میں نے تڑخ کر کہتے پیر پٹنے۔

”میکھ لیں ماما! اور سمجھالیں اسے۔ ورنہ عنقریب آپ کے داماد صاحب کا بھی یہ حشر کر دیں گی۔“

موسیٰ بھائی جو باہر جا چکے تھے۔ پھر سے دروازے میں سر ڈال کر ہانک لگانے والے انداز میں بولے چہرے پر

مسکراہٹ تھی۔

”مما!“ میں پھر احتجاجاً چیخی۔ ممانے اب کی مرتبہ میری بجائے موسیٰ بھائی کو گھورا تھا ان کی صورت پر اترنے والی خفت دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی تھی۔

☆☆

مجھ سے پہلے ماما اور پاپا چار بچوں کے والدین ہونے کا شرف پا چکے تھے۔ یہ چاروں بچے لڑکوں کی صورت میں تھے۔ سب سے بڑے بھائی یعنی عون مرتضیٰ پھر فیضان بھائی تھے ان کے بعد عیسیٰ اور موسیٰ تھے۔ میری پیدائش کے وقت موسیٰ کی عمر چار سال جبکہ عیسیٰ بھائی سات سال کے تھے۔ فیضان بھائی دس جبکہ عون بھیا بارہ سال کے۔ ان چار بھائیوں کو جب میری صورت بہن میسر آئی تو صحیح معنوں میں اتنے لاڈ اٹھائے کہ مجھے سر پر چڑھالیا پاپا سمیت سب نے..... ایک ماما ہی تھیں جنہیں میری تربیت کا خاص خیال تھا۔ ناز و نعم اور محبتوں میں بچپن گزار کر میں اپنی عمر کی اٹھارہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ بڑے بھیا نے ایم بی اے کیا تھا اور پاپا کے ساتھ بزنس میں شریک ہو گئے تھے۔ جبکہ فیضان بھائی نے لندن سے بار ایٹ لا کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور آج کل وہ ملک کے نامور وکلاء میں شمار ہونے والے تھے۔ عیسیٰ نے حال ہی میں ہاؤس جاب مکمل کی تھی۔ پاپا نے ان کی خواہش پر انہیں باہر پڑھنے کے لیے بھیجنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ جبکہ موسیٰ بھائی سب سے شوخ اور کھلنڈرے تھے ہمہ وقت شرارت پر آمادہ رہتے اور ان کی اس شوخی و شرارت کا سب سے زیادہ نشانہ میں ہی بنا کرتی تھی۔ وہ اردو ادب میں ماسٹرز کر رہے تھے اور یہ ان کا پارٹ و دن تھا۔ مجھے چھیڑنا زچ کرنا اور پھر میری ناراضگی پر گھنٹوں منانے پر صرف کرنا اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنا بھی ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ ماما مکمل ہاؤس وائف ہیں سادگی انکساری اور گریہستی میں طاق ہونا ہی ان کا تعارف ہے اضافی خوبی مکمل مذہبی ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی سی عمر میں انہوں نے مجھے نہ صرف گھرداری میں طاق کر چھوڑا (میری ہزار پہلو تہی کے باوجود) بلکہ نماز پنجگانہ کی بھی سختی سے پابندی کرواتی ہیں۔

”حجاب بیٹے یہاں ٹیرس پر کیا کر رہی ہو؟ اندر چلو شام کو ننگے سر باہر نہیں رہتے۔“ عین اسی پل ماما چلی آئی تھیں۔ میں جواب نے خیالوں میں گم بالکونی سے سمندر کا نظارہ کر رہی تھی گہرا سانس بھر کے پلٹی۔

”بس تھوڑی دیر میں آتی ہوں ماما!“

میں نے انہیں تسلی دی تھی اور پھر سے اسی منظر میں گم ہونے لگی۔ ہمارا گھر ساحل سمندر سے اتنا نزدیک نہیں تھا مگر اس لوکیشن سے تھا کہ میرے کمرے کی کھڑکی سے سمندر کا ساحل نظر آتا تھا دور سے جھاگ اڑاتا سمندر اور سمندر کے پانیوں پر ڈوبتے سورج کا عکس مجھے ہمیشہ اپنے طلسمی حصار میں جکڑ لیا کرتا تھا۔

”پگلی ہر روز یہاں کھڑی ہو کر اس منظر کو دیکھتی ہو پھر بھی اشتیاق کا وہی عالم ہے۔“ ماما مسکراتے ہوئے میرے پہلو میں آن کھڑی ہوئیں۔

”یہ شروع سے نیچر کی دیوانی ہے۔ آپ جانتی تو ہیں ماما! بس اب ہمارے بہنوئی صاحب کی تلاش کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیے کہ محترم نہ صرف پیسے والے ہوں بلکہ باذوق بھی انگلینڈ یورپ نہ ہی شمالی

علاقہ جات تو ضرور گھملاائیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی۔ موسیٰ بھائی آن دھمکے تھے اور مجھے تاؤ دلانے کو آج کل ان کے پاس یہی ایک موضوع تھا۔

”موسیٰ بھائی پلیز!“

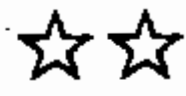
میں کچھ شرم اور کچھ خفت سے سرخ پڑی مگر ان پر خاص اثر نہیں ہوا تھا۔

”سنو ہر روز یہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ایک دن مانعہ کر لیا کرو ضروری نہیں وہ لازمی

بازوق ہوں۔ اور کمپرومائز تو ہر لڑکی کو کرنا آنا چاہیے نا۔“

وہ مدبر بنے کہہ رہے تھے میں ہونٹ بھینچے غصے سے انہیں گھورتی وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئی

وہ بس رہے تھے۔ مقصد جو پورا ہو گیا تھا مجھے وہاں سے ہٹانے کا۔



پچھلے چار گھنٹوں سے میں مسلسل رورہی تھی اور مجھے کسی نے چپ بھی نہیں کروایا تھا۔ وجہ گھر والوں کی بے حسی نہیں بلکہ میرا حد سے تجاوز کرتا ہوا غصہ بدگمانی اور ناراضی تھی۔ پاپا نے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ ممانے جب مجھے بتایا تو پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آسکا تھا۔ مگر جب یقین آیا تو مجھے لگا تھا۔ یکنخت میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی گئی ہے۔ موسیٰ بھائی کی شوخ مسکراہٹیں اور چھیڑ چھاڑ، سب بھائیوں سمیت ممانے کے مطمئن سرشار چہرے جیسے مجھے برزخ میں دھکیل گئے تھے۔ مجھے دکھ کسی ایک بات کا نہیں تھا۔ سب سے بڑا دکھ پاپا کی وعدہ خلافی کا تھا۔ وہ جاننے تھے مجھے ڈاکٹر بننے کا کتنا جنون تھا۔ اور انہوں نے ہمیشہ میری اس معاملے میں فیور کی تھی۔ ممانے چاہتی تھیں جلد میری شادی ہو یہ پاپا ہی تھے جو میری تعلیم وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے حامی تھے۔ اور اس معاملے میں ممانے کے روشن خیالات کے خلاف تھے جو وہ لڑکی کی جلدی شادی کے متعلق رکھتی تھیں۔

”ہماری بیٹی بہت ذہین ہے میں اسے ایک بلند مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بلکہ اگر یہ چاہے تو اپنے

بھائیوں کی طرح پڑھنے باہر بھی جائے گی۔“

یہ بات پاپا ہمیشہ رازداری سے میرے کان میں کہا کرتے پھر اب ایک ایسا کی کیا ہوا تھا کہ وہ خود اپنا عہد فراموش کر گئے تھے۔ میرا ذہن منفی خیالات کی یورش سے بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ میں چاروں بھائیوں سے چھوٹی تھی اور ابھی صرف میڈیکل پارٹ ون میں تھی۔ پھر بھی سب سے پہلے مجھے اس گھر سے دھکا دینے کا منصوبہ بنالیا گیا تھا۔ یقیناً میں اپنے گھر والوں پر کسی ناگوار بوجھ کی طرح تھی۔ جسے وہ موقع ملتے ہی اتار پھینکنا چاہ رہے تھے۔ مجھے کسی کی کوئی وضاحت نہیں چاہیے تھی جیسی میں نے ممانے کی مسلسل پکاروں کو جو وہ بند دروازے کے پار سے دے رہی تھیں نظر انداز کر دیا تھا۔ موسیٰ بھائی کی منت سماجت بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی رنج اور کرب میرے دل کو خون کر چکا تھا۔ بے مائیگی کا احساس اتنا شدید تھا جو کچھ اور سوچنے نہیں دے رہا تھا۔

”حجاب! ہنی بیٹے دروازہ تو کھولو گڑیا!“

مما اور موسیٰ بھائی کے بعد اب جو آواز بند دروازے کے پار سے ابھری وہ عون بھیا کی تھی۔ ان کی مہربان اور گھمبیر آواز نے میرے بچکیوں سے لرزتے وجود کو جیسے زتروں کی زد پہ لاکھڑا کیا۔ ممانے بتایا تھا۔ مسر بڑے بھیا کے پرانے دوست اور یونیورسٹی فیلورہ چکے ہیں۔ گویا یہ سارا کیا دھرا بڑے بھیا کا تھا اور مجھے سب سے زیادہ غصہ بھی انہیں پر تھا۔

”ہنی مائی سویٹ دروازہ کھولو۔“

بڑے بھیا کی آواز میں اب کے ہلکی سی تشویش بھی تھی یقیناً وہ باہر میری وجہ سے بے حد مضطرب تھے میں اب تمام تر خفگی کے باوجود خود کو اٹھ کر دروازہ کھولنے سے باز نہ رکھ سکی۔ بالٹ گرایا مگر پھر خفگی کے اظہار کو رخ پھیر لیا۔

”ہنی! حجاب بیٹاواٹ از دس؟ کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ پاگل ہو با اکل!“

انہوں نے بے تابانہ مجھے تھاما اور اپنی طرف گھماتے ہوئے بولے مگر جیسے ہی نگاہ میرے آنسوؤں سے جل تھل چہرے اور سرخ متورم آنکھوں پر اٹھی وہ ایک بل کو شاکد رہ گئے تھے۔

”حجاب میری جان!“

انہوں نے یکدم سے کھینچ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے ر کے ہوئے آنسو جیسے پھر سے سرعت سے بہنے لگے گھٹی گھٹی سسکیاں بھی فضا میں بکھرنے لگی تھیں۔

”خوشی کے اس موقع پر یوں آنسو بہاتی یہ لڑکی مجھے بہت بے وقوف لگی ہے۔“

آہستگی و نرمی سے میرا سہلاتے ہوئے انہوں نے رسائیت سے کہا تو میں خفگی کے بھرپور احساس سمیت ایک جھٹکے سے ان سے الگ ہوئی۔

”آپ زبردستی مجھے گھر سے نکالنے کے درپے ہیں یہ کیا خوشی کا موقع ہے؟“

بھیگا لہجہ بھرائی ہوئی آواز..... میں کوشش کے باوجود چیخ نہیں سکی۔ بڑے بھیا نے بے ساختہ مسکرا کے پھر مجھے بازو کے حصار میں لے کر بیڈ پر بٹھانا چاہا مگر میں پھری ہوئی موج کی طرح ان کے حصار سے نکل گئی۔

”کس نے کہا کہ تمہیں گھر سے نکال رہے ہیں؟۔ ہے کسی میں اتنی جرأت کہ میری گڑیا کی مرضی کے خلاف کچھ کرے۔“

”اونہہ۔ یہ سب تو جیسے میری مرضی سے طے ہوا ہے نا؟“

میرے زہر خند لہجے میں گہرے طنز کی کاٹ تھی۔ جی جوش لے لے بولتے بڑے بھیا کھسیا ہٹ کا شکار ہو کر سر کجھانے لگے۔

”شادی تو ہر لڑکی کی ہوا ہی کرتی ہے نا۔“

انہوں نے اپنے دفاع میں کمزوری دلیل دی تو میں سر جھٹک کر نخوت سے بولی تھی۔

”شادی لڑکوں کی بھی ہوا کرتی ہے۔“

”ہاں نا جی جی تو ابوداؤد کو بہت جلدی ہے اور شوق جی بہت“

بڑے بھیا مسکرائے تو میرے تیوری پر بل پڑنے لگے۔

”یہ داؤد شاؤد کا یہاں کیا ذکر ہمیں کسی سے کیا لینا دینا۔“

”انہی کا تو ذکر ہے۔ ہمارے برادران لاء ان شاء اللہ!“

ان کے وجہ چہرے پر شوخ سی مسکان بکھری تو میں حق حق سی انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ بڑے بھیا جیسا انسان جسے مسکراتے بھی بہت کم دیکھا گیا تھا کیسی سرشار قسم کی مسکراہٹ تھی ان کے لبوں پر میری عجیب کیفیت ہوئی تھی ہاتھ پیر جیسے ایک دم سن پڑنے لگے اور زبان لڑکھڑا گئی۔

”مم میں آپ کی بات کر رہی تھی۔ آپ سب بھائی بڑے ہیں مجھ سے۔“

میرے شکوے میں بھی احتجاج کا رنگ واضح تھا۔ مجھے نظریں چراتے پا کر بڑے بھیا بڑے خوبصورت انداز میں مسکرائے۔

”حجاب کیا تم اس بات پر خفا ہو کہ تم سے اس معاملے میں رائے کیوں نہیں لی گئی؟ وہ لوگ آتے تھے میں نے ماما سے کہا تھا حجاب کی رائے کو اولیت دی جائے گی۔ ویسے تم نے ابو داؤد کی تصویر تک نہیں دیکھیں ورنہ تم اس وقت مجھ سے اس طرح نہ جھگڑ رہی ہوتیں۔“

”کیا مطلب ایسے کون سے لعل لگے ہوئے ہیں محترم میں؟“

مجھے شدید غصہ آنے لگا۔

”یہ کیا کم بات ہے کہ وہ میرا انتخاب ہے۔“

ان کے لہجے کے تفاخر، مان اور محبت نے جیسے مجھے جکڑ لیا۔

”بھیا مجھے ابھی پڑھنا ہے اینڈ دیٹ از اٹ۔ پھر دوسری شرط آپ لوگوں کی شادیاں ہیں میرا نمبر

آخر میں آتا ہے۔“

میں نے پھر وہی بات دہرائی جو وجہ اختلاف تھی۔

”تم داؤد کی تصویر دیکھ لو۔ پھر مجھ سے بات کرنا۔ اور میری شادی کی بات پھر مت کرنا اوکے“ مجھے

نہیں دیکھنی۔ میں نے غصے میں تڑخ کر کہا مگر انہوں نے جیسے میری سنی ہی نہیں تھی۔ باہر گئے اور اگلے چند لمحوں میں واپس بھی آ گئے ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جس سے انہوں نے کارڈ سائز فوٹو نکال کر زبردستی میری آنکھوں کے سامنے کر دی۔ میں نے فوٹو پر نگاہ ڈالنے کی بجائے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ ان کا دو ٹوک قطعی انداز مجھے بے حد ہرٹ کر چکا تھا۔

”لک لک مائی سویٹ سسٹر۔ ابو داؤد ہرگز ایسی پر سنالٹی نہیں رکھتا کہ اسے رد کیا جائے۔“ اب کے

ان کا لہجہ ایک مرتبہ پھر بے حد سنجیدہ اور بردبار تھا۔

”جب آپ کچھ کرنے کا ٹھان ہی چکے ہیں تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کیسا ہے اور کیا ہے“

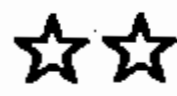
میں نے بے حد نفی سے کہا اور تصویر پر نگاہ ڈالے بغیر ہاتھ سے پرے کر دی۔ بڑے بھیا نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”دیکھو ہنی ابوداؤد بے حد شاندار شخصیت کا مالک ہے۔ یہ پروپوزل اس کی خواہش پر طے ہو رہا ہے۔ میرا دوست ہے میں ایک عرصے سے جانتا ہوں اسے۔ بہت ناس ہے بالکل ویسا جیسا میں تمہارے لیے خواہش کرتا تھا۔ ابھی صرف رشتہ پکا ہوگا۔ شادی تمہاری تعلیم مکمل ہونے پر کریں گے۔ اس بات کو لے کر ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے اس دوران تمہاری بھابھیاں لانے کی خواہش بھی پوری ہو جائے۔ اب بتاؤ اب بھی تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

ان کے لہجے کا رسان اور ٹھہراؤ ہمیشہ کی طرح اثر پذیر ثابت ہوا میں کچھ دیر سا کن کھڑی رہی پھر ان سے پلٹ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی!“

انہوں نے پرسکون ہو کر میرا سر تھپکا اور مسکراتے ہوئے پلٹ کر چلے گئے۔ میں کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر سر جھٹک کر خود کو ہر قسم کے خیالات سے آزاد کرانے لگی تھی۔



رسی کاروائی تو ہو چکی تھی۔ وہ خواتین جو کچھ دن پہلے مجھے دیکھنے آئی تھیں ایک بار پھر آن دھمکیں ان کے تمام تر لاڈ پیار کے باوجود جانے کیوں مجھے یہ سب دکھاوا سا محسوس ہوا اوپر اوپر اس جیسے مارے بندھے یہ سب کر رہی ہوں۔ اب کی مرتبہ یہ لوگ منگنی کی تاریخ لینے آئے تھے۔ عجیب خشک مزاج لوگ تھے۔ روایتی جوش اور شوق کا فقدان تھا انکی گفتگو میں جانے کیوں مجھے یہ لوگ قدردان نہیں لگے میرا جی چاہا تھا ماما سے اس حوالے سے بات کروں مگر مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔ بڑے بھیا پر ماما پاپا کو ہی نہیں مجھے بھی پورا بھروسہ تھا اور یہ انہیں کا فیصلہ تھا۔ شام تک وہ لوگ چلے گئے یہ اس سے چند دن بعد کی بات تھی۔ یہ چھٹی کا دن تھا اور تقریباً سبھی گھر پر تھے۔ موسیٰ اور عیسیٰ کے کمرے سے زور زور سے بولنے اور دھما چوکڑی کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً پھر عیسیٰ بھائی کی کوئی چیز موسیٰ نے ان کی اجازت کے بغیر استعمال کر لی تھی اب ان کا قبر موسیٰ پر ٹوٹ رہا تھا۔

”حجاب چائے مل جائے گی؟“

میں جوٹی وی لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھی اپنے ناخن فائل کر رہی تھی چونک کر متوجہ ہوئی۔ فیضان بھائی اخبار کی سمت ہی متوجہ تھے۔ میں نے گہرا سانس کھینچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ابھی بنا لاتی ہوں بھائی!“

کچن میں آکر میں نے چائے کا پانی رکھا اور خود پلٹ کر فریج سے دودھ کا برتن نکال رہی تھی جب موسیٰ بھائی کی چپکار سنائی دی۔

”اے اداس بلبل! ابھی تک ناراض ہو؟“

اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا تو مجھے جانے کیا ہوا ایک آنکھیں بھر آئیں۔ ہا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا تھا میرے معاملے میں عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ ابوداؤد کی والدہ اور بہنیں مجھے اپنے

روکے پھیرے رویوں کی بدولت بہت بد مزاج لگی تھیں اور ایسے ناقد رے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرنا مجھے ابھی سے حراساں کر رہا تھا۔

”تم نے ابھی تک داؤد بھائی کی تصویر نہیں دیکھی نا؟“

میرے آنسوؤں کے جواب میں موسیٰ بھائی کی بات مجھے بے تکلیفی لگی تھی۔

”ایک بار ان سے مل لو سارے گلے شکوے بھول جاؤ گی۔ ریکی بہت امپریسو پر سنائی ہے ان کی۔“

میں جواب میں کچھ کہے بغیر رخ پھیر کر آنسو پونچھتے ہوئے کھولتے پانی میں پتی ڈالنے لگی۔

”کیا ہوا کیوں رو رہی ہے ہنی؟“

تبھی فیضی بھائی چلے آئے تھے۔ ان کے لہجے میں از حد تشویش تھی۔

”تم نے کچھ کہا؟“

انہوں نے روئے سخن موسیٰ کی جانب مھوڑا تیور بے حد کڑے تھے۔

”کہاں بھائی میں تو چپ کر رہا تھا۔ اسے شکوہ ہے جانے ہم نے کیسے بے ڈھنگے بندے سے انہیں باندھ

دیا ہے۔“ موسیٰ کے جواب نے مجھے اور بوکھلا کے رکھ دیا کہ بھائی کی سوالیہ متحیر نگاہوں کا رخ اب میری جانب تھا۔

”نہیں نہیں بھائی یہ جھوٹ بول رہے ہیں میں تو.....“

میں کچھ اس طور بوکھلائی تھی جبکہ موسیٰ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

امی میں چھوڑ چلی بابل کا دیس

پیا کا گھر پیارا لگے۔

مجھے پھنسا کر وہ گنگنا تا ہوا بھاگ لیا تھا۔ فیضان بھائی بنا کچھ کہے اس کے پیچھے لپکے۔

”موسیٰ کیا واقعی حجاب کو داؤد پسند نہیں آیا؟“

ان کی آواز میں تشویش تھی۔ جانے کیوں میرا دل ڈوب سا گیا۔

”اُف یہ بھائی کیا سمجھ رہے ہیں۔“

موسیٰ نے کیا جواب دیا میں کوشش کے باوجود سن نہیں سکتی تھی کہ وہ دونوں باتیں کرتے دور جا چکے

تھے میں گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

☆☆

”اپنا خیال رکھنا زبیدہ سے میں نے کہہ دیا ہے۔ جب تک ہم واپس نہیں آتے وہ تمہارے پاس

رہے گی۔ گھبرانے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہم لوگ جلدی لوٹ آئیں گے انشاء اللہ! کھانا ضرور کھا لینا

میں نے سب چیزیں تمہاری پسند کی بنائی ہیں۔“

آج میرے گھر والے ابو داؤد کے ہاں جا رہے تھے۔ ماما جانے سے قبل میرے کمرے میں آ کر

خاص ہدایات دے رہی تھیں۔ پیازی کلر کے شیٹون کر نیکل کا بے حد نفیس سوٹ ان کے متناسب سراپے پر

ہے حد بچ رہا تھا۔ ہلکی پھلکی جیولری اور میک اپ کے نام پر نیچرل کلر لپ اسٹک سر پر دوپٹہ اوڑھے میری ماما کا لٹکے بے مثال تھا۔ سفید کرتا شلوار پر بلیک ویسٹ کوٹ پہنے پاپا کے باوقار چہرے پر الوہی چمک اور خوشی تھی۔ ہمارے بھائی پینٹ کوٹ میں ملبوس تھے اور بے حد وجہ لگ رہے تھے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ گاڑی میں بیٹھ کر راحت ہوا تو میں اپنے کمرے میں جاتے جاتے وہیں لاؤنج میں رک گئی۔ گھر کی حالت کچھ بکھری ہوئی تھی۔ بی بی بھائی اور موسیٰ بھائی نے عادت کے مطابق خوب بکھیرا تھا ہر شے کو۔ زبیدہ کھانے کا پوچھنے آئی تو میں نے انا پندیدہ نگاہوں سے لاؤنج میں بکھرے کشنز کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

گھر بہت گندہ ہو رہا ہے۔ ایسا کرو پہلے گھر کی صفائی کرلو۔
”ابھی صبح تو کی تھی اچھا بھلا تو ہے۔“

زبیدہ صدا کی کام چور تھی چہرے پر بارہ بجا کر بولی۔
”صبح کی تھی اور اس کے بعد آندھی آئی تھی کتنی خاک اڑی ہے پتا ہے؟“
”پر جی پہلے روٹی کھالوں پھر کر دوں گی۔“

اس نے عذر تراشا میں جانتی تھی وہ بہانہ گھڑ رہی ہے
”چلو میں ساتھ کراتی ہوں تمہارے۔ پہلے گھر کی صفائی ضروری ہے۔“

میں نے کسی قدر ہٹ دھرمی سے کہا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ پہلے جھاڑ پونجھ ہوئی، دھلائی کا مرحلہ آیا۔ اتنا بڑا گھر تھا مجھے سب سے زیادہ ٹائم موسیٰ کا کمرہ صبح حالت میں لانے کی کوشش میں لگا رہا۔ وارڈ روب کے دونوں پٹ کھلے تھے ہینگر کے سوٹ بھی تہہ کیے کپڑوں کے ساتھ کارپٹ پر ڈھیر تھے۔ لمبیٹ آدمی بستر پر آدمی نیچے جھول رہی تھی ڈرینک ٹیبل کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا اور تو اور موصوف نے شیوہ بھی نہیں بنائی تھی۔ سیفٹی اور پانی کا گج جو چھلک گیا تھا وہیں ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔ آرکیشرا پر ابھی تک کوئی دھن بچ نہیں رہی۔ کارپٹ پر چائے کے دو تین مگ لڑھکے ہوئے تھے۔ واش روم بھی ایسی ہی ابتری کا شکار تھا۔ اس کام کے اہتمام کے بعد میں باہر نکلی تو زبیدہ سارے پنکھے چلائے واپس لگاتے ہوئے اپنے سروں میں گارہی تھی۔
گھر آیا میرا پر دیسی پیاس بھی میری اکھیں کی۔

اس گنگناہٹ کے برعکس چہرے پر بے زاری اور اکتاہٹ کے تمام رنگ سجے ہوئے تھے کہ ابھی
گیراج کے ساتھ ڈرائیو وے کی دھلائی باقی تھی۔

زبیدہ آپا آپ ایسا کرو پاپ لگا دو باقی کام میں بیٹھتی ہوں۔

دوپٹہ اتار کر برآمدے کے پلر سے بل دے کر گرہ لگاتے ہوئے میں نے زبیدہ کے حال پر رحم لیا۔ زبیدہ نے پلک جھپکتے حکم کی تعمیل کی۔ کجا میرا کارادہ بدل جائے۔ پھر جب تک میں دھلائی سے فارغ نہ ہوئی زبیدہ نے کھانا گرم کر لیا تھا۔

”آجائیں حجاب بی بی پہلے کھانا کھالیں۔“

نہیں میں پہلے نہاؤں گی۔

میں نے کچھ اکتاہٹ آمیز انداز میں اپنے گیلے کپڑوں کو دیکھا۔

”ہائے ہائے اتنی دیر میں اور بھوک رہی ہوں۔ نہ بی بی مجھ سے اور بھوک برداشت نہیں ہوگی پہلے کھانا کھالیں۔“ وہ اتنی بے چارگی اتنی بے صبری سے بولی کہ میں گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔ زبیدہ ماما کی سرچہ بھی تھی۔ یہاں ملازمہ والا سلوک تو ہوتا ہی نہیں تھا اس سے ایک طرح سے گھر کے فرد کی حیثیت تھی جس نے زبیدہ کو خاصا میرے خیال میں بدتمیز بنا دیا تھا۔

”ہاں تو تم کھا لو نا۔ میں ایسے مصلیوں والے حلیے میں کچھ نہیں کھا پی سکتی۔“

”مگر میں اکیلی نہیں کھا سکتی آپ کو پتا ہے۔“

زبیدہ کے چونچلے ہی الگ تھے میں جھنجھلا سی گئی۔ کچھ سمجھ نہ آیا کیا کروں۔ پھر گہرا سانس بھر کے کاندھے اچکا دیئے۔

”چلو ٹھیک ہے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔“

میں اس کے ہمراہ کچن میں آ گئی۔ کھانے کے دوران زبیدہ مجھے اسے اپنے پنڈ اور بے بے کی مزے دار باتیں سناتی رہی۔

”آپ تھوڑی دیر بیٹھیں میں چنگی سی چابنا کے لاتی ہوں۔“

زبیدہ میری سنے بغیر برتن اٹھائے کچن میں بھاگ گئی۔ میں نے گہرا سانس کھینچ کر اپنے کپڑوں کو دیکھا شرٹ کا دامن اور شلوار کے پانچے ابھی بھی گیلے تھے۔ دوپٹہ برآمدے کے پلر سے ہی بندھا ہوا چھوڑ آئی تھی۔ خیال آنے پر اٹھ کر باہر آئی۔ ابھی دوپٹے کی گرہ کھول رہی تھی جب گیٹ پر گاڑی کی پہلے ہیڈ لائٹس چمکیں پھر ہارن تسلسل سے بجنے لگا۔ چوکیدار بابا اپنی چادر سنبھالے کسی کونے سے نکلا اور لپک کر گیٹ وا کر دیا۔ میں دوپٹہ کاندھوں پر ڈالتی ہوئی پلٹی تو گاڑی کی تیز روشنیوں میں آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

”حجاب یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کا لباس نہیں تھا؟“

ابھی میں سنبھل کر آنکھوں سے ہاتھ ہٹا بھی نہیں پائی تھی جب بڑے بھیا کی سردی آواز کسی قدر جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں میرے کانوں میں اُتری۔ میں بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹی تو پہلی مرتبہ نگاہ بھیا اور فیضی بھائی کے ساتھ کھڑے اس دراز قد قطعی انجان شخص پر پڑی تھی۔ تب مجھے بھیا کی جھلاہٹ کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔ اجنبی مہمان کے سامنے میں کچھ اور خفیف ہو گئی جیسی کچھ کہے بغیر تیز قدموں سے پلٹ کر اندرونی حصے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ ابھی میں اندر آ کر صوفے سے اپنا سیل فون اور کتابیں اٹھا رہی تھی جب بھیا اجنبی شخص کے ہمراہ وہیں چلے آئے۔ ایک بار پھر اس ہونے والے سامنے نے مجھے شرمندگی کے ساتھ ساتھ بے زاری سے بھی دو چار کر دیا تھا۔

بھیا کو جانے کیا ہو گیا تھا ایک غیر آدمی کو ڈرائیونگ روم تک محدود کرنے کی بجائے گھر کے اندر گھسا

اے تھے۔ میں کچھ تملاکر باہر جانے کو لپکی مگر اس چٹانی وجود کو دروازے میں ایستادہ اور پوری طرح اپنی سمت متوجہ پا کے کچھ گڑبڑ اسی گئی۔

”حجاب زبیدہ کہاں ہے اسے کہو چائے بنائے۔“

فیضی بھیا کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم اور متوازن تھا۔ مجھے کچھ ڈھارس ہوئی میں نے کچھ تشکر سے اہیں دیکھا مگر نگاہ جیسے ان کے مقابل کھڑے دراز قامت مہمان سے جا ملی۔
اُف کیسی نگاہیں تھیں لپکتی ہوئی آ رہی ہوتی ہوئیں۔ مجھے لگا میرے پورے وجود میں کوئی سنسنی کی رو اڑ گئی ہے۔

”آؤ نا داؤد بیٹھو۔“

میں کتر اکر نکل رہی تھی جب بڑے بھیا کی آواز میری سماعت میں اُتری اور مجھے ساکن و سامت کر گئی۔
”داؤد۔ یعنی ابو داؤد! کیا یہ وہی ہیں؟“

میرا دل پوری شدتوں سے دھڑکا اور بے اوسان ہو کر دھڑکتا چلا گیا۔
”مائی گڈ نیس! تو بھیا کی ناراضگی کی یہ وجہ تھی۔ یقیناً مجھے ماسیوں والے اس حلیے میں دیکھ کر انہیں اپنے دوست کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑی ہے۔“
مجھے بے تحاشانہ امت نے آن لیا۔
”کیا سوچ رہے ہوں گے؟“

انہی سوچوں میں گھری میں کچن تک آئی تھی۔ جہاں زبیدہ پہلے سے موجود پوری ترنگ میں اکنکاتے ہوئے چائے بنانے میں مگن تھی۔
”زبیدہ چائے کے ساتھ اہتمام کر لینا۔“

ہاں جی پتا ہے مجھے پروہنے آئے ہیں۔ خاص پروہنے لگتے ہیں۔ اونچے لمبے بے حد سوہنے۔
وہ داؤد کی تعریفوں میں طلب اللسان تھی۔ میں کوئی جواب دیئے بنا ٹرائی میں مختلف چیزیں رکھنے لگی۔ بسکٹس، نمکو، کیک اور دیگر بیکری کی چیزیں پلیٹوں میں نکالنے میں نے زبیدہ کو کباب تلنے کی بھی تاکید کی تھی۔ چائے دم پر تھی میں برتن نکالنے لگی۔ اس کام سے فراغت کے بعد میں نے چائے چھان کر ٹی پارٹ میں اکیلی تھی۔ تب تک زبیدہ نہایت پھرتی سے کباب فرائی کرنا شروع کر چکی تھی۔
”انہیں پلیٹ میں نکال کر ٹرائی ٹی وی لاؤنج میں لے جانا۔“

میں نے رسائیت سے کہا اور خود کچن سے نکل آئی۔ اپنے کمرے کی سمت جا رہی تھی جب اسی سمت آئے موسیٰ بھائی نے آ کر میرا راستہ روک لیا۔ کچھ دیر آنکھیں پھاڑ کر مجھے گھورا پھر ہنسنے لگا۔

”یہ تم ہو، میں سمجھا زبیدہ ہے۔“

”شٹ اپ!“ میں ضبط کھو کر حلق کے بل چیخی۔

سکی، توہین اور غصہ پہلے ہی مجھے بے حال کر رہا تھا یہ مزید توہین میں تو جیسے جھلس کر رہ گئی تھی۔ تمہیں ضرورت کیا تھی گھر کی صفائی کرنے کی؟ نوکرانیوں والا حلیہ بنا کر بیٹھی ہوئی ہو تو دوسروں پر تو مت برسو۔ مجھے تو یہ فکر ستا رہی ہے کہ داؤد بھائی نے بھی تمہیں اسی اسپیشل حلیے میں دیکھا ہے۔ اب بھلے وہ ساری عمر تمہیں بیوی کی بجائے ملازمہ سمجھتے رہیں۔ وہ انگریزی کا ایک مقولہ ہے نافرینٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن۔“ وہ ہنس رہا تھا مگر میری آنسوؤں سے بھری آنکھیں بے ساختہ چھلک گئی تھیں۔

”بڑے بھیا کا موڈ بے حد خراب ہے۔ تم نے جو رونا دھونا مچایا ہوا تھا جیسا بھیا داؤد بھائی کو لائے تھے کہ تم انہیں دیکھ لو ان سے مل لو مگر تم.....“

میری سسکیاں پچکیوں میں ڈھلنے لگیں میں نے رخ پھیر لیا تھا۔
 ”غلطی بھیا کی ہے۔ انہیں کم از کم فون کرنا چاہیے تھا تا کہ تم ذہنی طور پر تیار ہوتیں۔“
 مجھے ہنوز روتے پا کے وہ جیسے ترس کھا کر بولا۔ میں تب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔
 ”اچھا چھوڑو سب کچھ ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن لو۔“
 ”کیوں؟؟؟“

”ہو سکتا ہے بھیا تمہیں بلوالیں۔“

میری دھاڑ نظر انداز کرتے وہ رسائیت سے بولا مگر میں نے مکھی اڑانے والے انداز میں سر جھٹک دیا۔
 ”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے سنگھار کرنے کی۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی نظر آنا چاہتی ہوں۔“ میری جھنجھلاہٹ بتدریج بڑھ رہی تھی۔ بنا غور کیے بولی تو موسیٰ کا چھت پھاڑ قہقہہ مجھے کچھ اور مشتعل کر گیا۔
 ”تو تم حقیقت میں ایسی ہو داؤد بھائی تو کیا مجھے خود آج ہی حقیقت پتا چلی تمہاری“ اس کا دل جلانے والا انداز مجھے دانت کچکچانے پر مجبور کر گیا۔

”بھائی آپ چلے جائیں یہاں سے ورنہ میں آپ کا سر پھاڑ دوں گی قسم سے۔“
 مٹھیاں بھنے میں ہڈیانی انداز میں چلائی تو موسیٰ خائف ہوتا اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”او کے جاتا ہوں۔ مگر میری بات پر غور ضرور کرنا۔“

وہ جاتے جاتے پھر چلایا تھا میں نے تھکے ہوئے انداز میں سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ جو کچھ ہوا وہ واقعی غلط تھا مگر مجھے کچھ خاص فکر نہیں تھی۔ تقریباً آدھ پون گھنٹے بعد میں نے پورج کی طرف سے آتی آوازوں کو سنا تو تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیزی سے اٹھ کر آگے بڑھی براؤن گلاس ونڈو کے پار چاروں بھائیوں کے ہمراہ وائیٹ کلف شدہ دراز شلوار کرتے میں اپنے نمایاں ہوتے قد اور بے حد کروفر اور شان استقامت سمیت کھڑے وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہے تھے۔ مجھے وہ بڑے بھیا اور زبیدہ کی گئی تعریفوں سے کہیں بڑھ کر ڈینگ محسوس ہوئے تھے۔ بڑے بھیا کی کسی بات پر ایک بھر پور قہقہہ لگاتے ہوئے ان کی نگاہ لمحہ بھر کو میرے کمرے کی کھڑکی کی جانب اٹھی تھی۔ مجھے اتنے فاصلے کے باوجود بھی ان کی نگاہ کی وہ لپک اور بے باکی محسوس

اولی تھی جانے کیوں میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں سٹپٹا کر سرعت سے پیچھے ہٹی اور پردہ برابر کر دیا۔ اگر وہ ہاں لیتے کہ میں ہی کھڑکی میں کھڑی ہوں تو یہ بہت فضول بات ہوتی۔ اور یہ مجھے بہر حال گوارا نہیں تھا۔



اگلے کچھ دن میں بڑے بھیا سے کچھ خائف رہی کہ وہ مجھے اس لا پرواہی اور کوتاہی پر ڈانٹیں گے مگر بس ایسا کچھ نہیں ہوا تو میں ریلیکس ہو گئی۔ انہی دنوں گھر میں میری منگنی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں۔ اور میں پڑھائی میں مگن بظاہر ہر شے سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی تھی۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ داؤد کو دیکھنے کے بعد میری ساری یاسیت اور بے دلی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ آج کل ویسے بھی مجھے اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا ہوا سوس ہو رہا تھا۔ ابو داؤد جیسا ویل ایجوکٹیڈ ویل ڈریسڈ بندہ جو اپنی وجاہتوں اور خوبروئی کی بدولت ہر جگہ چھا ہاتا تھا۔ میرا طلبگار تھا ابھی کل ہی تو ممّا عیسیٰ بھائی سے بات کر رہی تھیں۔ عیسیٰ کو ابو داؤد اور میری عمروں کے ارق پر تھوڑا سا اعتراض تھا۔ اسی اعتراض کو وجہ بناتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

”حجاب ابھی بہت چھوٹی ہے ممّا آپ لوگوں نے میرے خیال میں بہت عجلت میں یہ فیصلہ کیا ہے۔“
”مالوگ منگنی کے بعد شادی پر زور ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔“

”بیٹے ہم نے بات کر لی ہے شادی حجاب کی تعلیم مکمل ہونے پر ہی ہوگی۔ عمروں کا اتنا فرق اتنا اہم نہیں ہے لڑکی اگر لڑکے کی ہم عمر ہو تو جلدی بڑی بھی لگنے لگتی ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکی شادی کے بعد بچوں میں پڑے بھی بہت عرصے تک جوان نظر آتی ہے اور جوڑی بھی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔“ ممّا کی اپنی منطق تھی۔

”عمروں کا اتنا فرق عموماً ذہنی تفاوت کا بھی باعث بنتا ہے۔ داؤد بھائی میچور ہیں جبکہ حجاب کی ماری حرکتیں ابھی بچوں والی ہیں۔“

”آپ غلط نہیں کہتے بیٹے مگر پہلی بات تو یہ ابھی شادی میں ٹائم ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ لہاں شادی کے بعد چاہیے کتنی ہی کم عمر میں ہوں بہت جلدی سوجھ بوجھ والی ہو جایا کرتی ہیں۔“ ممّا کے لہجے میں رسان اور دانائی تھی۔ فیضی بھائی پتا نہیں کس حد تک قائل ہوئے البتہ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جبکہ مجھے لگا تھا جیسے میری انکی ہوئی سانسیں بحال ہو گئی ہوں۔ دیکھا جائے تو یہ بات حیرانی کی تھی۔ عجیب معاملہ ہوا کرتا ہے یہ دلوں کا بھی لمحوں میں کایا پلٹ جاتی ہے۔ میں خود بھی حیران تھی کوئی اتنا زور آور بھی ہو سکتا ہے کہ محض ایک بار ماننے آئے اور پورے وجود پر اپنی حکمرانی قائم کر لے۔ ابو داؤد کی شخصیت میں ایسی ہی سحر انگیزی تھی مجھے لگا تھا کہ ابو داؤد کی شخصیت کا جادو چل گیا تھا۔ یہ بہت واضح ہار تھی مگر کسی جیت کے دلنشین احساس کے ہمراہ۔

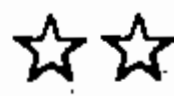
”بیٹے ہر معاملے میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔ زندہ مثال تمہارے سامنے میری اور تمہارے پاپا کی ہے۔ تمہارے پاپا مجھ سے پورے پندرہ سال بڑے ہیں اور ہماری انڈرا سٹینڈنگ کی ہر جگہ مثالیں دی جاتی ہیں۔ پھر یہ تو عموں کی عمر کی بھی نا۔ کیا ہوا۔ علیحدہ ہو گئے دونوں۔“

ممّا شاید ابھی تک بھائی کو قائل کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی دونوں مثالیں ایسی تھیں کہ فیضی

بھائی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔ جانے وہ کیا سوچ کر متفکر تھے کہ ممانے ان کی تسلی کی خاطر وہ انکشاف کیا تھا جسے سن کر میں گنگ ہونے لگی تھی۔

”ابو داؤد حجاب کا پچھلے آٹھ دس مہینوں سے چاہت مند ہے۔ بہت چاہ اور محبت سے اس نے ہمارے سامنے یہ خواہش رکھی ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیے۔؟“

میں اس انکشاف کے بعد وہاں مزید نہیں ٹھہر سکی۔ یہ خیال ہی کتنا تاثر انگیز تھا کہ میں کسی کے لیے صرف خاص نہیں بہت خاص ہوں۔



پھر بیچ کے دن بہت تیزی سے گزر گئے۔ تیاریاں بہت بھرپور تھیں۔ پیپا کے ساتھ بھائی بھی کسی قسم کی کمی نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔ میرے لیے جو تقریب کا جوڑا منتخب ہوا تھا وہ پیازی کلر کا تھا۔ جس کی تراش خراش اور کام نگاہوں کو بے حد بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ منگنی کی تقریب رات کی تھی۔ ساری ایریج منٹ لان میں کی گئی تھی۔ جس وقت موسیٰ بھائی مجھے پارلر سے واپس لے کر آئے تقریب کی رونقیں عروج پر جا پہنچی تھیں۔ برقی ققموں سے سجے لان کے درخت اور ریڈ کارپٹ سے سجائے تک جاتا ہوا راستہ پھولوں سے آراستہ تھا۔ میرے گاڑی سے باہر نکلنے تک موسیٰ میکرا اپنے کمرے سنبھالے لپک کر آئے اور یکا یک میں روشنیوں کی یلغار میں گھر گئی۔ میں جو پہلے ہی نروس تھی حد درجہ کنفیوژڈ ہو کر رہ گئی۔

”بھائی پلیز منع کریں انہیں۔“

میں موسیٰ بھائی کے آگے منمنائی مگر انہوں نے شاید اتنے شور میں میری آواز سنی بھی نہیں تھی۔ ابو داؤد کی بہنوں نے اس موقع پر مجھے اپنے حصار میں لے لیا اور دائیں بائیں سے سہارا دیئے اسٹیج کی جانب لے آئیں۔ ماما کی غیر موجودگی کے باعث ہی مجھے اعتماد بحال کرنے میں خاصی دشواری محسوس ہوئی ابو داؤد کی فیملی ہنوز مجھے گھیرے ہوئے تھی۔

”بہن جی اجازت ہے۔ ابو داؤد کورسم کے لیے اسٹیج پر بلائیں؟“

یہ آواز میرے دائیں پہلو سے اٹھی تھی اور ابو داؤد کی والدہ کی تھی۔ میرا دل ایک دم بے تحاشا ہڑک اٹھا۔ اس کا مطلب تھا ابو داؤد بھی منگنی کی تقریب میں بہ نفس نفیس موجود تھے۔ میں نے کچھ متحیر انداز میں نگاہ اٹھائی تھی۔ بلیک ٹوپس میں ملبوس اسٹیج کے بالکل سامنے کھڑے ابو داؤد سے جا ملی۔ ہونٹوں کے درمیان سگریٹ دبائے گہرا کش لیتے ہوئے وہ پہلے سے میری سمت ہی موجود تھے۔ وہی جاندار بھرپور روح کھینچ لینے والی نظریں جو مجھے جانے کیوں مضطرب کر دیا کرتی تھیں۔ ان کی شخصیت کے بالکل برعکس تھا ان کے دیکھنے کا انداز، میرا دل میری روح اس پل بھی گویا اٹھل پھل ہو کے رہ گئی۔ پورے وجود میں جیسے کوئی سنسنہٹ سی دوڑ گئی۔ پلکیں بے ساختہ لرز کر جھک گئیں۔

میرے ارد گرد ابو داؤد کے ہی رشتہ دار تھے شوخ ہنسی کی جھنکار چلیے فقرے اور معنی خیز سرگوشیاں میرا دل ڈانواں ڈول کر رہی تھیں۔ تبھی ابو داؤد اسٹیج پر چلے آئے اور میرے پہلو میں بیٹھی کسی اپنی کزن کو اٹھا کر نہایت استحقاق بھرے

انداز میں خود براجمان ہو گئے۔ ان کا اس درجہ قرب اور قرب کی آنچ دیتی ہوئی خوشبو میرے حواس معطل کرنے لگی۔
 ”داؤد کم آن رسم شروع کرونا کیوں اتنی نازک سی لڑکی کو پریشان کر رہے ہو؟“

یہ کسی لڑکی کی آواز تھی جس میں شوخی کا رنگ گھلا ہوا تھا۔ میں جو بنا پلکیں اٹھائے بھی داؤد کی پریشانی گہری اور اندر تک سرایت کر جانے والی نظروں سے بے تحاشا پریشان ہو رہی تھی کچھ اور بھی پزل ہو کر رہ گئی۔
 ”اجازت ہے؟“

ان کی بھاری آواز کی گھمبیر تا میرے آس پاس بکھری جانے کے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہند لحوں کے توقف سے انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرا کپکپاتا سرد ہاتھ اپنے پر حدت مضبوط ہاتھ میں لے لیا۔ اس لمس نے جیسے کوئی تیز برقی رو میرے وجود میں بھردی تھی۔ میں ذرا سا کسمائی تھی اور فطری حجاب میں گھرتے اپنا ہاتھ واپس کھینچتا چاہا مگر مقابل کی گرفت از حد مضبوط تھی بھرپور استحقاق سے بھری ہوئی۔ میری دھڑکنیں انتشار کا شکار ہونے لگیں۔ بہت سارے شوخ اور ذومعنی فقروں کی بوچھاڑ میں انہوں نے مجھے رنگ پہنائی تھی۔ مہری رنگت تہمتائی ہوئی تھی اور چہرہ جیسے بھاپ چھوڑ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی غیر مرد کے اس قدر نزدیک تھی۔ وہ بھی ایسے رشتے کے احساس سمیت مجھ سے اپنا آپ سنبھالا ہی نہ جا رہا تھا۔ گھبراہٹ واضطراب ایسا کہ یوں لگنے لگا اگر مزید چند لمحے ایسی ہی صورتحال سے دو چار رہی تو بے ہوش ہو جاؤں گی۔
 ”اماں آپ جاپیے بات کریں عون سے۔“

داؤد نے میرا ہاتھ چھوڑے بنا کہا تھا ان کی مخاطب یقیناً ان کی والدہ تھیں۔

”بیٹے تم خود بات کرتے۔“

آنٹی کی آواز میں کچھ گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ تھی۔

”نہیں آپ کہیں جا کر اس سے۔ ویسے میں نے داؤد سے بھی کہا ہے وہ نیچے ہے وہ بھی بات کرے گا۔“ داؤد کا لہجہ عجیب تھا حاکمانہ دھونس بھرا سا۔ مجھے عجیب سا لگا میں ابھی اسی پوائنٹ پر غور کر رہی تھی۔ جب ایک نسوانی آواز نے مجھے سوچوں کے مہند سے کھینچ لیا تھا۔

”بہت خوبصورت انتخاب ابو داؤد۔ اب سمجھی ہوں تمہارے ہر خوبصورت وجود کو ٹھکرانے اور شادی ایٹ کرنے کی وجہ تم تو اپنی سوہنی کے جوان ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نو خیز کلی کے سامنے ہماری جیسیوں لی دال کیا گلنی تھی۔“

آواز میں تلخی و ناگواری کے ساتھ ساتھ رشک و حسد کی بھی آمیزش تھی میں نہ چاہتے ہوئی بھی صدمہ ہوئی تھی۔

ڈیپ ریڈ بے حد انکمش سیولیس شرٹ اور شلوار میں ملبوس دوپٹے سے بے نیاز وہ کسی حد تک بے باک نظر آتی تھی۔ اس کی جلد کرسٹل کی طرح چمک دار اور بے داغ تھی۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی۔ جواباً
 اہ... نے بھرپور انداز میں ہتھبہ لگایا۔

”سمجھ دار ہو میرے خیال میں وضاحت کی ضرورت نہیں۔“

یو آر ویری لکی سویٹ گرل! یہ شخص کسی کے لیے بہت خاص تھا اور بھرپور دعاؤں کے باوجود نہیں ملا اور تم.....“

”علینہ ضروری نہیں کہ تم اپنی بے مائیگی کا اشتہار ہر جگہ لگاتی پھرو۔ چلو آؤ۔“

یہ ایک دوسری لڑکی تھی جو حلیے میں علینہ جیسی ہی تھی مگر اس کا انداز کچھ تناؤ اور تلخی بھرا تھا وہ ایک لمحے کے اندر علینہ کو ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹی اسٹیج سے اتار لے گئی۔ میں حق دق ششدر سی بیٹھی تھی ابو داؤد کی کھنکھار پر قدرے شیشائی۔

”آپ کے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں حجاب!“

میرا ہاتھ ایک بار پھر ان کی گرفت میں چلا گیا اور میری بدحواسی میں اضافہ ہونے لگا۔

”آپ کو اس روپ میں دیکھ کر دل بے ایمان ہو چلا ہے حجاب! جیہی منگنی کی بجائے نکاح کرنا چاہ رہا ہوں۔“ جی!.....!“ میرے سر پر جیسے آسمان آن گرا۔ سراسمگی کی انتہا کو چھوتے میں نے انہیں دیکھا مگر ان کی شرارت پر مائل شوخ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے مجھے سر جھکانا پڑا تھا۔ مگر جو ہم انہوں نے میرے اعصاب پر پھوڑا تھا وہ اتنی جلدی مجھے سنبھلنے نہیں دے سکتا تھا۔

”حجاب میں نے بہت انتظار کیا ہے تمہارا اب میں تم سے اور دور نہیں رہ سکتا۔ آج ہر صورت تمہیں پانا چاہتا ہوں۔ ورنہ شاید کچھ بھی ٹھیک نہ رہے۔“

وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ جذبوں سے بوجھل گھمبیر آواز میں جو ارادے انہوں نے ظاہر کیے تھے مجھے چکرا کے رکھ گئے۔ میں نے ہوائیاں اڑاتے چہرے کے ساتھ غیر یقین نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پلیز.....!!!“

میں جیسے ایک دم روہانسی ہو گئی۔

”میرا تو کوئی قصور نہیں یہ آپ کے ہوش ربا حسن کی کرشمہ سازی ہے بھگتنا تو پڑے گا۔“

ان پر جیسے مطلق اثر نہیں تھا۔ اسی بے نیازی اور ٹیلے انداز نے میرا دل گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا۔ اس قسم کی سچویشن کے متعلق تو میں نے گمان تک بھی نہیں کیا تھا۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ میں نے اضطراب کے عالم میں پہلو بدلا۔ داؤد کی والدہ اور بھائی مماپا اور بھائیوں کو الگ تھلگ لیے کھڑے تھے۔ پپا کے چہرے پر تردد جبکہ بھائی کچھ تناؤ میں لگ رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا جانے کیا ہونے والا تھا معا ابو داؤد میرے پہلو سے اٹھ کر وہیں چلے گئے۔ کچھ دیر تک مزید بات ہوئی تھی میں متفکر انداز میں بگا ہے اس سمت دیکھتی رہی۔ معا میں نے بڑے بھیا کو اسٹیج کی سمت آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اسپاٹ تھا۔ میں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں اور گود میں رکھے حنائی ہاتھوں کو اضطرابی انداز میں باہم جکڑ لیا۔

”حجاب اٹھو گڑیا اپنے کمرے میں جاؤ۔“

بڑے بھیا کا لہجہ بھی ان کے چہرے کی طرح سرد اور سپاٹ تھا۔ میری دھڑکنیں چٹختے لگیں۔ مہمان المین میں سے بڑے بھیا کے اشارے پر دو لڑکیاں اٹھ کر میری جانب آئیں اور مجھے سہارا دے کر اسٹیج سے اتار آئیں۔ اپنا شرارہ سنبھالتے اچانک میری نظر اٹھی تھی۔ یقیناً یہ ابوداؤد کی مسلسل نظروں کا ارتکاز تھا کہ میں ”واہ ہوئی تھی۔ دلچسپی سمیٹے مسکراتی شوخ نگاہوں کا سامنا میرے لیے خاصا دشوار مرحلہ تھا۔“

”جلدی نہیں سونا میں کال کروں گا تمہیں۔“

پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے سرگوشی کی تھی۔ میرا دل یکبارگی اچھل کر حلق میں آ گیا۔
مہرے یوں خوفزدہ ہو جانے پر دونوں لڑکیاں ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”ویری انو سینٹ سو پرٹی گرل!“

میں خفت سے سرخ چہرے لیے اپنے کمرے میں آئی اور دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ بستر پر ڈھس گئی۔
اُف کیا سوچتی ہوں گی وہ دونوں؟ اور داؤد اُف کس قدر بے باک ہیں ہر معاملے میں۔ میں نے
”طراہٹ دبائی تھی اور کپڑے بدلنے کے خیال سے اٹھ گئی۔“



”حجاب بی بی آپ کا فون ہے جی!“

میں پوری توجہ سے کل ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھی جب زبیدہ نے آ کر بہت
خاص قسم کے انداز میں رازداری سے اطلاع دی تو میرے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ دھیان فوری ابوداؤد
لیست کیا تھا۔ اپنی کئی بات اس رات انہوں نے پوری کی تھی۔ رات ایک بجے کے بعد میرے سیل پر ان کی
کال آتی رہی تھی۔ میں جو شعوری لاشعوری طور پر ان کی کال کی منتظر تھی کچھ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ کبل میں گھس
رہی بن گئی۔ سیل فون کو میں نے سائنلٹ پر کر دیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وقفے وقفے سے فون کی
المرین ہلینک کرتی رہی تھی لیکن میں نے انہیں کیے رکھا۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا فون پر منگیٹروں سے
المیں کرنے والی لڑکیاں آج سے قبل مجھے زہر لگا کرتی تھیں پھر میں خود اس ڈگر پر بھلا کیسے چل پڑتی۔

”کون ہے؟ میرا مطلب کس کا فون ہے؟“

”ہتا نہیں جی آپ کو بلانے کو کہا ہے۔“

میرے سوال کے جواب میں زبیدہ نے ازلی کام چوری سے جواب دیا وہ پھسکڑا مار کر قالین پر بیٹھ
کلی قمی اب اٹھنے میں تاثر سے کام لے رہی تھی۔

”جاؤ پوچھ کے آؤ کون ہے؟“

میں نے غصے میں ڈپٹ کر کہا اور خود پھر سے کتاب کی سمت متوجہ ہوگی؟ زبیدہ کے بُرے بُرے منہ
مالے کا خاص نوٹس نہ لیا یہ اس کی عادت تھی۔ ابھی میں کتاب کی سمت متوجہ ہوئی ہی تھی کہ وہ پھر سے آن دھمکی۔
”وہ جی آپ کی سہیلی کا فون ہے۔“

کون سی سہیلی؟

اس کی بتیسی نکلتے دیکھ کر میں اٹھتے اٹھتے ٹھٹھکی تو زبیدہ نے تیکھے چوتونوں سے جواب دیا تھا۔
”جی اب مجھے یہ تو خیال نہیں رہا کہ نام بھی پوچھ لوں۔ ویسے آپ کی کوئی نہ کوئی سہیلی تو ہوگی نا۔
بات کر کے دیکھ لو پتا چل ہی جائے گا۔“

اس کے لٹھ مار انداز میں ہلکی سی طنز کی بھی آمیزش تھی۔ جیسے میری یہ جانچ پڑتال پسند نہ آئی ہو۔ میں
کچھ سوچتی ہوئی فون اسٹینڈ تک آگئی۔ کل ہی ابھی آسیہ نے مجھ سے نوٹس مانگے تھے۔ شاید انہی کے متعلق کوئی
پوائنٹ سمجھ نہ آرہا ہو۔
”ہیلو!“

ایسی ہی سوچوں میں گھرے میں نے ریسورکان سے لگایا تھا۔
”آپ بتائیے آپ کی صرف آواز سننے کے لیے ہمیں اتنا انتظار کرنا پڑے گا تو آپ تلک پہنچنے کے
لیے تو صدیاں درکار ہیں کچھ تو رحم کریں۔“

میں جہاں کی تھاں رہ گئی۔ اتنا دھیمّا گھمبیر لہجہ میرا دل پوری قوت سے پھیل کر سکڑا
”آ آپ؟؟“ میں ہکلا کر یہی کہہ سکی۔

”جناب!!“ وہ ہنسنے لگی۔ میں فق چہرہ لیے کھڑی تھی۔

”مم مگر وہ زبیدہ کہہ رہی تھی میری دوست.....“

مجھ سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔

”کاش ہمیں بھی آپ کے دوست ہونے کا شرف حاصل ہوا ہوتا۔“

بڑی حسرت سے فرمایا گیا تو میں کھسیا کر رہ گئی۔ گھبراہٹ بتدریج کم ہو رہی تھی۔

”آپ نے یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے؟“

میرا فطری اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

”یہ تو مت پوچھیں اگر فون پر ہی بتا دیا تو آپ سے خدشہ ہے آئیندہ فون سننے سے پرہیز کریں

گی۔“ معنی خیز شوخ لہجہ ذومعنی الفاظ، میرا دل اپنی رفتار سے بڑھ کے دھڑکنے لگا۔ اگلے کئی ثانیوں تک کچھ
بولنے کے قابل نہیں ہو سکی۔

”حجاب میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

یہ غیر متوقع مطالبہ سن کر میں دھک سے رہ گئی۔

”ک کیوں؟“

بس جی چاہ رہا ہے۔ شاہانہ انداز میں بے نیازی تھی۔

”حجاب کیا واقعی آپ کو میری پرواہ نہیں؟ میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے بے تاب ہوں۔“

وقت کا ثنا بھاری ہو گیا ہے۔ ایک ایک لمحہ گویا صدی بن کر گزرتا ہے۔ رات تو خاص طور پر ایک عذاب ہے۔“
 ان کے لہجے میں چھپا اضطراب لہجے کے زیر و بم کے ساتھ جیسے میری سماعتوں میں اتر آیا۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک
 میرے اندر پھیل گئی۔ اتنی چاہ، اتنی محبت، پانا کس کو بُرا لگتا ہے۔ میں جیسے خواب کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔
 ”حجاب میں تم سے ایک بار تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ اپنی بے پناہ چاہتوں کی شدتیں ظاہر کرنا
 چاہتا ہوں تم پر، ایک بار ملو گی نا مجھ سے۔“

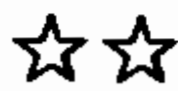
ان کے لہجے میں ایک وحشت سی در آئی میرا دل ٹپٹانے لگا۔ تکلف کی دیوار انہوں نے کیسے ایک
 دم گرا دی تھی۔

”پلیز آپ فون بند کر دیں اب مجھے پڑھنا ہے۔“
 مجھے لگا ان کی جنوں خیزی کی تندہریں مجھے بھی بہا کر لے جائیں گی یہ گھبراہٹ بے حد فطری تھی۔
 بھلا آج تلک میں نے کبھی کسی سے ایسی باتیں سنی تھیں۔ میرے تو اوسان خطا ہونے لگے تھے۔
 بہت کھٹور ہو تم حجاب بہت بے حس! ایک بار میرے پاس آؤ میں تمہیں اپنے جیسا بے قرار کردوں
 گا۔ تمہیں محبت کرنا سکھاؤں گا۔

وہ سرگوشی جیسی آواز میں کہہ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پیر سنسنانے لگے۔ دل کی دھڑکن مجھے اپنے کانوں
 میں دھڑ دھڑاتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے چہرے نے جیسے بھاپ چھوڑنا شروع کر دی۔ مزید کچھ سننے کی تاب نہ
 پا کر میں نے بوکھلاہٹ میں ریسور کریڈل پر پھینک دیا۔ پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہوتے دل پر ہاتھ
 رکھے میں پلٹی تو زبیدہ کو اپنے مقابل کھڑے پایا۔ اس کی معنی خیز نظروں نے جیسے مجھے سراپا آتش فشاں بنا دیا۔
 ”تم تم اب یہاں کیا گھاس چر رہی ہو؟ جب تمہیں پتا تھا کس کا فون ہے تو مجھے بتایا کیوں نہیں۔“
 میں اس پر برس پڑی تھی مگر سامنے زبیدہ تھی جو ماما کی شہہ پا کر اب کسی کے رعب میں نہیں آتی تھی۔

”تو جی جب آپ کو پتا چل گیا تھا تو فون بند کر دینا تھا ہم تو حکم کے غلام ہیں۔“

وہ تن فن کرتی چلی گئی۔ میں ہونٹ بھینچے اپنا غصہ ضبط کر رہی تھی۔



رات کو میں سونے کی غرض سے کمرے میں آئی۔ تو دو پہر کا یہ واقعہ کسی حد تک پڑھائی میں کھو کر گم ہو
 چکا تھا۔ لائٹ آف کرنے سے پہلے میں نے عادتاً یونہی سیل فون چیک کیا تھا۔ قریباً بیس کے نزدیک مسڈ کالز تھیں
 سبھی کی سبھی ابوداؤد کی اس کے علاوہ کچھ میسجز تھے میں نے عجیب سے احساسات سے دو چار ہوتے پہلا میسج کھولا۔

یہ تھوڑا سا جیون

ادھورا سا موسم

یہ رنگوں کی چاہت

گلابوں کی حسرت

یہ روشن سویرے
یہ مدھم اندھیرے
کسی روز تنہا ملو تو بتائیں
خیالوں کی راہیں
چمکتی نکاہیں
ادائیں دکھانا
یہ اک سلسلہ ہے
مگر فیصلہ ہے
اگر جان جاؤ
تو احساس رکھنا
اسے راز رکھنا
کر دایک وعدہ
بنالو گے اپنا
ملاقات کو تم
نیا نام دو گے
کسی روز تنہا ملو تو بتائیں

ہماری محبت ہماری ادائیں

میں نے بے ساختہ ہونٹ کا زریں کنارہ دانتوں سے بھینچ لیا۔ ابو داؤد کیا تھے۔ مجھے قطعی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ منگنی کے روز انہوں نے نکاح پر دباؤ ڈالا تھا بالکل غیر متوقع طور پر اور ماحول خراب ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بڑے بھیا کا موڈ اگلے کئی دن تک بہت گھمبیر رہا تھا۔ ادھر ابو داؤد تھے کہ اس حد تک دیوانے ہو رہے تھے۔ میں نے یونہی پریشانی کے عالم میں اس مسیح کو ڈیلیٹ کیا تھا اور اگلا سچ دیکھنے لگی۔

”حجاب اگر تم ایک رات کو ہی مجھے مستعار مل جاؤ تا تو اگلی صبح تمہارے قریب کہیں جلے ہوئے پروں

کے ساتھ پایا جاؤں۔“

کیسی عجیب حسرت تھی۔ میں ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ باقی کے تمام سچ میں نے پڑھے بغیر ڈیلیٹ کر ڈالے اس رات میں ہمیشہ کی طرح بھرپور اور مکمل نیند نہیں لے سکی۔ بار بار آنکھ کھلتی رہی ایک دو بار تو مجھے داؤد پر غصہ بھی آیا کس مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا مجھے۔ صبح میرا چہرہ کچھ ستا ہوا تھا اور میں مضمحل سی نظر آتی تھی۔

”ہنی کیا بات ہے بیٹے آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

سب سے پہلے یہ سوال پپا نے مجھ سے کیا تھا۔ میں کچھ چونک سی گئی۔

”جی پارات دیر تک پڑھتی رہی نیند پوری نہیں ہوئی۔“

پاپا کو جواب دیتے میں نے بڑے بھیا کی نگاہوں کو خود پر اٹھتے اور ٹھہرتے محسوس کیا تھا تو ایک سرد سی لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ میں نے دانستہ سر اٹھانے سے گریز کیا۔ مہاروٹین کے مطابق دو پہر اور رات کے کھانے کا میڈیوسٹ کر رہی تھیں اس دوران انہوں نے بیٹوں اور شوہر کے مشورے بھی لیے۔ تینوں بھائیوں نے الگ الگ فرمائش کی تھی۔ ہمارے ہاں رات کا کھانا خاص طور پر بہت اہتمام سے تیار ہوا کرتا تھا۔

”عون بیٹے آج آپ نے کچھ نہیں بتایا۔ کچھ خاص کھانے کو جی نہیں چاہ رہا؟“

ممانے پیار بھرے انداز میں بڑے بھیا کو مخاطب کیا تھا وہ کچھ چونک کر متوجہ ہوئے۔ ”نہیں۔ مہاروٹین کی ضرورت نہیں۔ ہنی بھی آج کل اسٹڈی میں بڑی ہے سارا بوجھ آپ پر آ گیا ہے۔“

”ارے“ ممانے نہیں تھیں۔

”بیٹا میں تمہارے کام کرتے کبھی نہیں تھکی۔ پھر بھی اگر میرا اتنا خیال ہے تو دلہن لے آؤ اپنی ہاتھ بٹا دیا کرے گی میرا اور گھر میں بھی رونق ہو جائے گی حجاب تو پر یاد دہن ہے اب جانے کب وہ لوگ شادی پر زور ڈال دیں۔“

بھیا کے فراخ ماتھے پر ایک شکن نمودار ہوئی۔

فیض کی شادی کر دیں ممانے! مجھے یہ بات مت کہا کریں پلیز! لایا تو تھا دلہن مگر کیا ہوا تھا؟ ناس نے اس گھر کو اپنا گھر سمجھا تھا نہ رونق آنے دی تھی بلکہ اپنی جہالت سے رہا سہا سکون بھی برباد کر دیا تھا۔ ”انہوں نے سرد لہجے میں کہا اور یکا یک کرسی دھکیل کر اٹھے اور باہر نکلتے چلے گئے۔ ماما کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ میں لپک کر ان کے قریب گئی تھی۔“

”ریلیکس ممانے!“

ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ باقی سب بھی ماحول کے تناؤ کے زیر اثر تھے۔

”یہ اپنی زندگی برباد کرے گا۔ ساری لڑکیاں ایک جیسی تو نہیں ہوتیں۔“ وہ سسک کر بولی تھیں۔

”خود کو سنبھالو حاجرہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

پپا نے نرمی سے حوصلہ بندھایا مگر ماما کے آنسو گالوں پر چھلک آئے تھے۔

”نہیں یہ کبھی اس دکھ کے حصار سے نہیں نکلے گا محبت کی تھی اس جنم جلی ہے میرے بیٹے نے مگر وہ

بہت منحوس نکلی برباد کر گئی میرے بچے کو۔“

ماما ایک دم ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر ہلک اٹھی تھیں۔ ماحول کی کشیدگی اور تناؤ کچھ اور بڑھ گیا۔

”حاجرا کیا ہو گیا ہے بھئی۔ ریلیکس آپ بچوں کو بھی ڈسٹرب کر رہی ہیں۔“

”میرا عون ڈسٹرب ہے کئی سالوں سے خوشی حرام کر لی اس نے خود پر میں کیسے ریلیکس ہو سکتی

ہوں؟“ ان کے آنسوؤں میں شدت آتی جا رہی تھی۔

”میں سمجھاؤں گا اس کو کیوں نہیں کرے گا وہ شادی! آپ پلیز خود کو سنبھالیں۔“

پپا اٹھ کر ان کے نزدیک آ گئے تھے اور اب کاندھے کو تھپک کر رسانیات سے کہہ رہے تھے۔ ممانے

بہت جبر کیا تھا خو پر اور آنسو پونجھ لیے مگر ان کے انداز میں بہت بے دلی اور دل گرفتگی تھی۔ میرا کالج جانے کا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر ٹیسٹ کی وجہ سے چھٹی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس روز میں دل پر بوجھ لیے کالج گئی تھی۔

☆☆

میری منگنی کی خبر میری فرینڈز تک بھی پہنچ چکی تھی۔ میں جیسے ہی کالج پہنچی وہ سب مجھے خونخوار نظروں سے گھورتیں میرے گرد جمع ہو گئیں۔

”اتنی بڑی اور اہم خبر چھپا گئیں ہم سے کیا سزا ہونی چاہیے تمہاری خود ہی بتاؤ؟“

طیبہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا تو میں بے دلی سے مسکرا دی۔

”ہم تم سے تمہارا فیانی تو نہ چھین لیتے بے ڈھنگی لڑکی اگر منگنی میں بلا لیتیں۔“

ضویا کا غصہ سے شدید تھا۔

”اس کا منگیتر چھیننا آسان نہیں۔ محترمہ کا حسن اور دلکشی ہی وہ ہتھیار ہے جس سے مردوں کو متوجہ کیا

جاسکتا ہے اور یہ ہمارے پاس نہیں ہے۔“

سونیا نے آنکھیں گھما کر کہا تو سب کھی کھی کرنے لگیں۔

”کیسے ہیں محترم ابو داؤد صاحب!“

طیبہ کے لہجے میں بے پناہ اشتیاق تھا۔

”میں کل تصویریں لے آؤں گی دیکھ لینا۔“ میں ہنوز ماما اور عون بھیا کی وجہ سے ڈسٹرب تھی۔

”وہ تو بعد کی بات ہے ابھی تم تو ہٹاؤ نا۔ تم نے تو دیکھا ہے اے۔“

سونیا نے میری آنکھوں میں جھانک کر شوخی سے کہا تو میں بے ساختہ نظریں چرا گئی۔

”بولو نا بتاؤ یا را“ وہ سب میرے پیچھے پڑ گئیں۔

”کہانا کل تصویریں لاؤں گی خود دیکھ لینا۔“ میں نے ایک بار پھر جان چھڑائی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ ابھی تم ہمیں ساری تفصیل بتاؤ اور اس کے بعد ایک زبردست قسم کی ٹریٹ دینا۔“

طیبہ کے کہنے پر سب نے تائید کی میں جو ٹیسٹ کی وجہ سے کالج آئی تھی ان ضدی اور بدتمیز لڑکیوں نے مجھے کلاس

روم تک بھی جانے کی اجازت نہیں دی۔ آخری دو پیریڈ بنک کر کے جب وہ مجھے کھینچ کھانچ کر قریبی ریسٹورنٹ

تک لے آئیں تو میرا احتجاج قابل دید تھا۔

”اتنی ندیدی مت بنو آج میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تم لوگوں کو اتنا مہنگا من پسند ٹھنسا

سکوں“ میں جھنجھلا کر بولی تھی۔ مگر ان پر جو ذرا برابر اثر ہوا ہو۔

”اٹس اوکے نو سینشن جناب ہم سب چھو کر کے مل دے دیں گے مگر کل تمہیں ہمارا یہ قرض چکانا ہوگا۔“

اور میں کوئی راہ فرار نہ پا کر گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

”دیکھو ہم یونیفارم میں ہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ لوگ کیا سوچیں گے ہمارے متعلق۔؟“

مجھے واقعی آکروڑ لگ رہا تھا۔ طیبہ پیری بات سن کر زور سے ہنسنے لگی۔

”محترمہ آپ اپنے فیانسی کے ساتھ نہیں ہیں کہ جو لوگ آپ کو ڈیٹ پر سمجھیں ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ کی نمائی سی سہیلیاں جو خود بھی تمہاری طرح کڑیاں ہی ہیں۔“
میں کچھ کھیسائی گئی۔

کالج کے کینٹین میں میں نے انہیں آفردی تھی جو مرضی کھالیں مگر وہ ماننے والی کہاں تھیں۔ ان کے خیال میں جتنا بڑا کارنامہ میں نے انجام دیا تھا اسی لحاظ سے اب خرچہ بھی کرنا چاہیے تھا۔ وہ سب فراخ دلی سے اپنی اپنی پسند کے مطابق آرڈر کر رہی تھیں میں کچھ گھبرائی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ مجھے واقعی کسی کے دیکھ لیے جانے کا خوف کھائے جا رہا تھا۔

”رنگ کیوں فق ہو رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چند ہزار لگیں گے تمہارے۔ جنابہ اطلاقاً عرض ہے۔ آپ چار کماؤ بھائیوں اور امیر کبیر والد محترم کی اولاد ہیں اب تو خیر سے بزنس ٹانگیوں کی شریک حیات بننے والی ہیں۔“
ضویا کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ میں ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔ آرڈر سرو ہو چکا تو وہ سب بھوکے ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

”کھاؤ نایا اس طرح منہ لٹکائے کیوں بیٹھی ہو؟ مجھے اتنا مالدار منگیترا ملا ہوتا تو میں پورا ہوٹل خرید کر اپنی دوستوں کے نام کر دیتی۔“

طیبہ نے ہنس کر کہا تو میں پھکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے آگے پڑی خالی پلیٹ میں پیزا کا ایک پیس کاٹ کر رکھنے لگی۔
”ایکسکیوز می!“

یہ بھاری مگر بوجھل مردانہ آواز سن کر میں نے چونک کے سر اٹھایا۔ ایش گرے ٹوپیس سوٹ میں ملبوس ابوداؤد کی شاندار قامت بے حد نمایاں ہو رہی تھی۔ مگر ان کی اپنے پاس موجودگی نے مجھے حق دق کر ڈالا۔
”یا وحشت! یہ کیا ہو گیا؟“

میں سن ہوتے اعصاب کے ساتھ بس یہی سوچ کر رہ گئی۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

متبسم لہجہ، شوخ بے حد گہری نگاہیں، میری رہی سہی صلاحیتیں بھی بے کار کر گئیں۔

”شیوروائے ناٹ سر!“

میری بجائے یہ جواب ضویا نے دیا تھا۔ وہ سب کی سب ابوداؤد کی سمت متوجہ تھیں اور ان کی نظروں میں ابوداؤد کے لیے بے حد ستائش چھلک رہی تھی۔

”تھینکس میم!“ وہ مسکرائے اور میرے مقابل نشست سنبھال لی۔ میں ہنوز گم صدم تھی۔

”اب بتائیے کون ہیں آپ؟“

ایک بار پھر ضویا نے انہیں مخاطب کیا باقی سب ہاتھ روکے ہنوز ستائی نگاہوں سے ان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا ان کے انداز سے کہ داؤد کی گروڈ شائنگ پر سٹائی سے مرعوب ہو چکی ہیں۔

اس سوال پر وہ مہم سا مسکرائے پھر بھنوو کو خفیف میں جنبش دی تھی۔

”مگر یہ سوال تو آپ کو پہلے کرنا چاہیے تھا۔“

”اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میں اتنا تو جان گئی ہوں آپ حجاب کے جاننے والے ہیں۔“

ضویا کا اعتماد اب کچھ اور بحال ہو گیا تھا۔ اس جواب پر ابو داؤد بے ساختہ مسکرائے پھر براہ راست مجھے دیکھا اور مسحور کن انداز میں بولے تھے۔

”بجائے فرمایا میں صرف انہی کا تو جاننے بلکہ ماننے والا ہوں۔“ انداز ہڈیاں نہ تھا میں کچھ جھپ سی گئی۔

”آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔“

ضویا کو جیسے بے چینی ہونے لگی تھی مگر وہ اس کی جانب یکسر متوجہ نہیں تھے۔

”آئی تھینک آپ کو میرا یوں آپ کی محفل میں شریک ہونا پسند نہیں آیا۔“

وہ میری جانب نسبتاً جھک کر بولے تھے۔ سگریٹ کے ساتھ پر فیوم اور آفٹر شیو لوشن کی مہک براہ راست میرے اعصاب پر چھا گئی میں گھبرا کر ذرا پیچھے کو سرکی۔

ناں..... نہیں۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔ میری گھبراہٹ سے شاید حظ لے کر وہ ہلکا سا مسکرائے۔

”چلیں مان لیا۔ اب انہیں بتائیں میں کون ہوں آپ کا۔“

ان کی دل آویز مسکان کچھ اور گہری ہو گئی جبکہ میرا چہرہ شرم کی حدت سے دہک کر رہ گیا۔

میں نے بے ساختہ گھبرا کر سر کونفی میں جنبش دی تو انہوں نے جیسے ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

”چلیں میں بتا دیتا ہوں۔“

نہیں پلیز آپ جائیں یہاں سے۔ میں گھبرا کر سٹپا کر ملتجی ہو گئی۔

”میں یہ کہنا نہیں چاہتی تھی مگر جانے کیسے گھبراہٹ میں میرے منہ سے پھسل گیا انہوں نے بے ساختہ

مجھے دیکھا ان نگاہوں میں کیا تھا میری روح کانپ سی گئی۔

”بھئی یہ راز و نیاز ختم کریں آپ لوگ! کیوں ہمارے ضبط کا پیمانہ چھلکاتے ہیں؟“

ضویا کا انداز دہائی دینے والا تھا۔ ابو داؤد چونک اٹھے۔

”اوہ سوری مس! چلیں میں بتاتا ہوں میں ابو داؤد ہوں اور.....“

”اور یہ کہ حجاب کے ہونے والے سب کچھ ہے نا؟“ ضویا نے چہک کر ان کی بات کاٹ دی تو داؤد

حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرے معصومیت سے بولے تھے۔

”اوہ آپ تو مجھ سے غائبانہ متعارف ہیں مگر کیسے؟“

داہنے ہاتھ کی بند مٹھی تھوڑی کے نیچے نکاتے ہوئے ان کی پریش نگاہوں کا فسوں پھر سے میرے

گرد حصار باندھنے لگا۔

”آف کورس حجاب نے۔ یہ ٹریٹ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔“

مجھے ضویا پر جی بھر کے ناؤ آیا۔ اس نے میری پوزیشن کا خیال کیے بغیر داؤد کو یہ سب بتا دیا تھا۔ کیا سوچیں گے وہ۔ میں اتنی سطحی سوچ رکھنے والی لڑکی ہوں جو منگنی کے شوق میں بے حال ہوٹلوں میں سہیلیوں کو دعوتیں کھلاتی پھر رہی ہوں۔ خفت اور سکی کے احساس نے مجھے گویا زمین میں دھنسا دیا میں سرخ چہرے سمیت ساکن بیٹھی رہ گئی تھی۔ بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتے میں نے اپنی آنکھوں میں نمی کو پھیلتا محسوس کیا۔ وہ بے حد شوخ ہو رہے تھے بار بار اشعار پڑھ رہے تھے۔ مجھے آکورد لگا۔

”حجاب تم بھی تو کچھ لو مناسب کچھ ہم ہی ہڑپ کر رہے ہیں۔“

سمعیہ کو میرا خیال بھلے دیر سے آیا تھا مگر آگیا تھا۔ سونیا ابوداؤد پر خاص توجہ دے رہی تھی۔ ان کی پلیٹ مختلف لوازمات سے بھرنے کے بعد مسلسل کھانے پر اصرار جاری تھا۔

”حجاب واٹ ازاٹ؟ آپ رو رہی ہیں؟“

سونیا کے التفات کو انگور کیے ابوداؤد میری جانب ہی متوجہ تھے۔ میری آنکھوں کی نمی ان سے مخفی نہیں رہی تھی۔ مگر یہ سوال مجھے انگارے کی طرح سلگا کے رکھ گیا۔

میں نے ہونٹ بھیجنے اور سر کونٹی میں جنبش دی۔ ابوداؤد کچھ دیر کو بالکل چپ سے ہو گئے۔ پھر جتنی دیر ہم وہاں موجود رہے ہیں دل ہی دل میں ابوداؤد کے وہاں سے اٹھ جانے کی دعا مانگتی رہی۔ مگر ہر دعا قبول نہیں ہوتی مجھے کسی کے دیکھ لینے کا خوف سر دکر رہا تھا۔ سونیا وغیرہ الگ وہاں جم گئی تھیں۔ کھانے کے بعد انہوں نے آسکریم منگوا لی تھی۔ جبکہ میری بے چینی اب اضطراب میں ڈھلنے لگی۔ خدا خدا کر کے جب وہ اٹھی تو میں نے فوراً پرس کھول لیا۔ مگر ابوداؤد نے چند ہرے نوٹ نکال کر مجھ سے پہلے پے منٹ کر دی تھی۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا تو انہوں نے پیسوں سمیت میرا ہاتھ اپنے فولادی ہاتھ میں جکڑ لیا۔ یہ لمس آگ بن کر میرے پورے وجود میں سرسرایا تھا۔ اپنی فرنیڈز کی موجودگی میں ان کی یہ حرکت مجھے سن کر کے رکھ گئی۔

”یہ پارٹی ہماری خوشی کے اعزاز میں تھی نا حجاب! اصولاً پے منٹ مجھے ہی کرنا چاہیے ویسے بھی

میرے پیسے آپ سے الگ تھوڑی ہیں۔“

اپنائیت آمیز گھمبیر لہجہ۔ وارنٹی سے بھرپور شوخ تبسم آمیز نظریں اور لوٹ لینے والا انداز۔ میں گڑبڑا کر رہ گئی۔ میرا چہرہ ابے تھا شا سرخ پڑنے لگا میں مزید ایک پل کو بھی ان کی جانب نہیں دیکھ سکی۔ ہاتھ چھڑانے کو مزاحمت کی تو ابوداؤد نے آہستگی و اپنائیت آمیز انداز میں نرمی سے میرا ہاتھ دبایا جیسے اس لمس کو پوری طرح محسوس کرنا چاہتے ہوں پھر آہستگی سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اس پر ان کی پریش بہت کچھ کہتی ہوئی نظریں۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ سونیا وغیرہ سے الگ ٹوٹ کر حیا آرہی تھی۔

”آپ لوگ واپس کیسے جائیں گی؟“

گاس ڈور دھکیل کر ریسٹورنٹ سے باہر آتے ہوئے ابوداؤد نے اپنے مقابل چلتی سونیا کو مخاطب کیا تھا۔ سونیا کا ندھے اچکا کر لاپرواہی سے بولی۔

”اب تو کالج آف ہو گیا ہے۔ ہم لوگ پوائنٹ سے جائیں گے۔“

”یہ مناسب نہیں ہے۔ اکیچو کی مجھے کسی کام سے جانا ہے ورنہ میں خود آپ کو ڈراپ کر دیتا۔ اپنی دے میں کیب کروادیتا ہوں۔“

رست واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے انہوں نے روڈ پر پہنچ کر ایک ٹیکسی کو روکا۔
”آئیے پلیز!“

ڈرائیور سے کچھ دیر بات کر کے اور ایڈوانس میں کرایہ دے کر وہ پلٹ کر سونیا وغیرہ سے مخاطب ہوئے، ان کا انداز بے حد شائستگی لیے ہوئے تھا۔ میں نے بے اختیار سکھ کا سانس بھرا اور سب نے پہلے کھلے دروازے سے اندر بیٹھنے لگی میرے انداز میں عجلت تھی مگر اس کا وقت مجھے شدید دھچکا لگا جب مجھ سے بھی زیادہ تیزی اور سرعت سے ابوداؤد نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ یہ میری توقع اور سوچ کے برخلاف تھا جہی میں لڑکھڑا کر سنبھلے بنا کٹی ہوئی شاخ کی طرح ان سے جا کر ٹکرائی تھی۔ میں حواس باختہ سی ہو کر سرعت سے انہیں پیچھے ہٹانا چاہتی تھی مگر ابوداؤد نے خود مجھے نرمی سے سنبھال کر فاصلے پر کھڑا کر دیا۔
”ریلیکس ٹیک اٹ ایزی!“

میری خوف سے پھیلی پھیلی آنکھوں میں جھانک کر وہ کسی قدر رسائیت سے بولے تو مجھے ان کا لہجہ کسی قدر سرد لگا۔

”حجاب ہمارے ساتھ نہیں جائے گی کیا؟“

وہ سب اندر بیٹھ چکی تھیں تب سونیا نے کچھ اچھپے سے استفسار کیا تھا۔ میں ماہی بے آب کی مانند چلی گئی مگر میرا ہاتھ ایک بار پھر ابوداؤد کے آہنی ہاتھ کی گرفت میں تھا۔
”نہیں انہیں میں خود ان کے گھر ڈراپ کر دوں گا۔“

ابوداؤد کے جواب نے مجھے بھک سے اڑا دیا۔ میں نے بے ساختہ دہل کر انہیں دیکھا جبکہ وہ میری بجائے دور ہوتی ٹیکسی کی جانب متوجہ تھے پھر اس کے بعد کوٹ کی جیب ٹٹولتے پارکنگ میں موجود اپنی گاڑی کی جانب بڑھے تب بھی ان کا ہاتھ میری کلائی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ میں جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ گھسیٹتی ہوئی آئی تھی۔

”آپ کو میرا یہ اقدام پسند نہیں آیا تو اس کی وجہ یقیناً یہی ہے آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔“

وہ گاڑی کا دروازہ ان لاکڈ کر رہے تھے۔ مجھے ان کا انداز اور لہجہ ایک بار پھر بے حد سرد محسوس ہوا۔
میں بے ساختہ گھبرا کر رہ گئی۔

”ناں نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

انہوں نے فرنٹ ڈور اوپن کر کے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اس دوران انہوں نے میری بات کے جواب پر پرکھتی نظروں سے اچھی طرح میرا جائزہ لیا تھا مجھے ان کا رویہ الجھار ہا تھا میں لرزتے دل کے ساتھ سکڑ کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور اس وقت کو کو نے لگی جب ان بدتمیز لڑکیوں کی وجہ سے میں اس مصیبت میں پڑ گئی تھی۔ ان کی قربت مجھے خائف کر رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن خلاف معمول بہت بڑھی ہوئی تھی۔

”حجاب آپ بہت خوبصورت ہیں۔ اتنی خوبصورت کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہاں سے سراہنا شروع کروں؟“
 بتان کی جانب دیکھے بھی میں ان کی لپکتی بے تاب نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے اندر ہی اندر ہول رہی تھی۔ اس بے باکانہ انداز پر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مجھے لگا میرے گال سلگ اٹھے ہیں۔ معان کا ہاتھ میری جانب بڑھا اور بہت ملائمت سے میرے رخسار کو چھو گیا۔ مجھے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ میں بدک کر ذرا دور ہوئی اور سرا سمگی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

ان کا ہاتھ اپنے کاندھے پر ٹھہرتا پا کر میں جیسے بھری اٹھی۔ مگر ان کی نگاہیں۔ اُف مجھے لگا میرا پورا وجود بخ بستہ ہواؤں کی زد پر آ گیا ہو۔ ان نگاہوں کی جنوں خیزی شدت اور بے لگام جذبوں کی لپک مجھے خوف کی اتھاہ میں گرا گئی۔ وہ عون بھیا کا انتخاب تھے اور عون بھیا کی فہم و فہراست پر مہمیا کو بھی ڈاؤٹ نہیں تھا مگر مجھے لگا تھا کچھ غلط تھا۔ ابوداؤد کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جس نے مجھے گنگ کر چھوڑا۔ جسے میں الفاظ میں بیان کرنے سے شاید ہمیشہ قاصر رہتی۔ ان کا ہاتھ بہت گستاخانہ انداز میں میرے کاندھے پر تھا اور آنکھیں میری آنکھوں میں گڑھی ہوئیں بے بسی کا احساس مجھے بے ساختہ رلا کے رکھ گیا۔

”ابوداؤد پلیز!“

میں بولی تو میرے لہجے میں میری ہار آنسوؤں کی نمی کی صورت در آئی تھی۔ میں نے اتنی گھبراہٹ اور سرا سمگی کے باوجود محسوس کیا ابوداؤد جیسے سنبھل سے گئے ہوں۔

”ڈرگٹیں نا؟“ وہ ذرا سا ہنسے پھر ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

”بس یہی تھی آپ کی بہادری؟“

”جی.....!!!“

میں گنگ ہونے لگی تھی۔

”رومینس کے موڈ میں تھا یا ر! بھول گیا تھا ابھی آپ کو چھونے، آپ کو ہاتھ لگانے کا پرمٹ حاصل نہیں کیا۔“ وہ ایک بار پھر نارمل تھے۔ ڈیش بورڈ سے سگریٹ کیس اور لائٹس اٹھا کر انہوں نے ایک سگریٹ ہونٹوں کے درمیان رکھا اور شعلہ دکھایا پھر گہرا کش لے کر دھواں میرے اور اپنے درمیان حائل کر دیا۔ میں ساکن بیٹھی تھی۔

”کم آن حجاب! تم میری ہونے والی بیوی ہو عزت ہو میری، پھر بھلا میں تمہارے ساتھ..... اوہ نو.....“

وہ سر جھٹک رہے تھے۔ مجھے جانے کیا ہوا۔ میں ایک دم ہاتھوں میں چہرا ڈھانپ کر رو دی۔

”مما کہتی ہیں۔ کسی غیر محرم کو کبھی اتنا حوصلہ نہ بخشو کہ وہ تمہاری شہ پا کر تمہارے نزدیک آجائے اور اس حصار کو توڑ دے جو مذہب اور خدا نے مقرر کیا ہوا ہے۔“

میں نے آنسوؤں کے بیچ سسک کر کہا تھا۔ درحقیقت ابو داؤد کے اس رویے نے مجھے ہرٹ کیا تھا۔
”اچھا اور کیا کہتی ہیں تمہاری ممما!“

انہوں نے ڈھیروں ڈھیروں اپنے آگے پھیلاتے ہوئے عجیب سرد سے انداز میں پوچھا۔ میں کچھ کہے بغیر ہچکیاں لیتی آنسو پونجھتی رہی۔

”دیکھو حجاب یوں بچ کرنے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ میں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔“
انہوں نے جیسے نرمی سے جھنجھلا کر کہا تھا۔

”ہونے والے ہیں نا۔ ہوئے تو نہیں؟“

میں نے شدید ناراضی سے جتایا تو داؤد نے ٹھٹھک کر مجھے دیکھا تھا اور اتنی دیر تک دیکھا تھا کہ مجھے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں ضرورت سے زیادہ بول چکی تھی میرا چہرہ سخت سے سرخ پڑنے لگا۔
”اب چلیں نا پلیز!“

ان کی نگاہوں سے جزبہ ہو کر میں گھبرا کر بولی تھی۔

”یہی تو چاہا تھا میں نے مگر عون نہیں مانا۔ وہ بہت ضدی انسان ہے۔“

وہ کسی قدر درشتی سے بولے۔ ایک بار پھر مجھے ان کا لہجہ بے حد سرد محسوس ہوا۔ وہ کچھ دیر ہونٹ بھیجنے کچھ خاموش بیٹھے رہے پھر ایک دم سے میرے دونوں ہاتھ جکڑ لیے۔

”حجاب تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ تمہارا حصول میری زندگی کا مقصد ہے۔ تمہاری محبت مجھے دیوانہ کر رہی ہے میں تب تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تمہیں اپنی طرح اپنے لیے بے قرار نہ کر لوں۔ تب تک مجھے سکون نہیں مل سکتا جب تک تمہارے لیے میری دوری روح فرسا خیال نہ بن جائے۔“

ان کے سرخ و سفید چہرے پر ایک جارحیت اور لہجے میں بلا کی خوفناکی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتیں رہ گئی۔

”کیا یہ محبت تھی؟ ہرگز نہیں یہ حکمرانی تھی۔ مطلق العنانی تھی یا پھر جارحیت کا کوئی انداز۔“

گاڑی جھٹکے سے رکی تب میں نے چونک کر دیکھا۔ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”سوری حجاب میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ خود گھر چلی جائیے۔“

ان کے چہرے کی طرح سے ان کا لہجہ بھی سپاٹ تھا۔ میں کچھ کہے بنا اپنا بیگ اور چادر سنبھالے گاڑی سے اتر گئی۔ البتہ میں نے باہر آنے سے قبل اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ آس پاس کسی کی موجودگی کا خدشہ نہیں تھا مجھے اطمینان ہوا تھا۔

اس کے بعد بہت سارے دن چپکے سے بیتے چلے گئے۔ کالج میں وہ خبر بہت شدت سے گردش کر رہی تھی۔ ان کی وجاہت اور ٹھاٹ باٹ بہت دن موضوعِ گفتگو رہا۔ لڑکیاں باقاعدہ مجھ پر رشک کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے نزدیک میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی۔ جسے بیک وقت اتنا شاندار، خوب رو، دولت مند اور ٹوٹ کر چاہنے والی خویوں سے مالا مال منگیتر ملا تھا مگر میں گم صمم تھی۔ ان بیٹے ہوئے دنوں میں ابوداؤد نے متعدد بار فون پر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ان کے لاتعداد میسجز میں نے ایک نگاہ ڈالے بغیر ضائع کیے تھے۔ جانے کیوں اس ملاقات نے مجھے ابوداؤد کی جانب سے کھٹکا دیا تھا۔ میں سینے میں چبھتی پھانس کو محسوس کرتی بے حد محتاط ہو گئی تھی۔ ابوداؤد بے تحاشہ دولت مند تھے۔ اور دولت مند لوگ اکثر بھٹکے ہوئے اور گمراہی کے راستوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔ کیونکہ دولت قارون کا ورثہ ہے اور قارون بھٹکا ہوا گمراہ انسان تھا۔ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا ابوداؤد کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ انہی دنوں گھر میں فیضان بھائی کے رشتے کی بات چلنے لگی۔ عون بھیا کی طرف سے مایوس ہو کر ممانے پپا کے سمجھانے پر فیضی بھیا کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دی تھیں۔ اور ایک لڑکی کو پسند بھی کر لیا گیا تھا۔ اس اہم موقع پر ماما ہر جگہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہی تھیں۔ ثانیہ واقعی بہت چارمنگ تھی۔ فیضان بھائی جیسے ڈسینٹ اور شاندار شخص کے ساتھ خوب چچتیں۔ دونوں اطراف سے بات تقریباً طے ہو گئی۔ اس روز منگنی کی فائنل ڈیٹ لینے ہم لوگ جارہے تھے۔ میں تیار ہونے اپنے کمرے میں آئی تو اسی پل میسج ٹون بجی تھی۔

جانے کس رو میں میں نے سیل فون اٹھا لیا۔ ابوداؤد کے نمبر سے ایک غزل تھی۔ میں یونہی بے خیالی میں نظریں دوڑانے لگی۔

چہرے پر میرے زلف بکھراؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو برس جاؤ کسی دن
رازوں کی طرح اتر و میرے دل میں کسی شب
دستک پر میرے ہاتھ کی کھل جاؤ کسی دن
پھولوں کی طرح حسن کی بارش میں نہالوں
بادل کی طرح جھوم کے گھراؤ کسی دن
خوشبو کی طرح گزر و میرے دل کی گلی سے
پھولوں کی طرح مجھ پر بکھر جاؤ کسی دن
پھر ہاتھ کو خیرات ملے بند قبا کی
لطف شب و صبح کو دہراؤ کسی دن
گزریں جو میرے گھر سے تو رک جائیں ستارے۔



دوسرا حصہ

اس طرح میری رات کو چمکاؤ کسی دن
میں اپنی ہر اک سانس اسی رات کو دے دوں
سر رکھ کر میرے سینے پر سو جاؤ کسی دن



میں کچھ خائف کچھ شیشائی ہوئی سی کھڑی تھی۔ ابو داؤد کا انتخاب تھا۔ بے باکی کا رنگ کیسے نہ چھلکتا۔ مجھے خود پر غصہ آیا۔ آخر کیا ضرورت تھی یہ میسج پڑھنے کی۔ انگلی اور انگلیوں کی جنبش سے میں نے دوسرے لمحے اس سمیت دوسرے تمام میسجز بھی ضائع کیے تھے اور سیل فون کو لا پرواہی سے بیڈ کی سائیڈ دراز میں پھینک کر خود تیار ہونے لگی۔ میں لائٹ پر پل سوٹ کے ہمرنگ دوپٹہ سنبھالتی باہر آئی تو ماما میری ہی منتظر تھیں۔ عون بھیا ان کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر تلخی اور بے زاری کا واضح رنگ تھا۔ نزدیک آنے پر مجھے پتا چلا ماما ان کو ایک بار پھر شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ برینہ بھیا بھی والا قصہ ختم ہوئے بھی تین چار سال ہو چکے تھے مگر عون بھیا کے زندگی میں ابھی تک اس واقعہ کی تلخی قائم تھی۔ ماما ان کو پھر سے خوش اور مگن دیکھنے کی متمنی تھیں جبھی ہر صورت ان کی شادی کی خواہاں تھیں مگر عون بھیا کسی طرح بھی پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہے تھے۔ ماما فیضی بھیا کے سسرال پہنچیں تب بھی دل برداشتہ ہی تھیں۔ ثانیہ بھیا بھی سے ایک بار پھر سے ملنا مجھے بے حد اچھا لگا۔ منگنی کی ڈیٹ بھی طے پا گئی۔ ہم واپس گھر پہنچے تو چاروں بھائی موجود تھے۔ دروازہ فیضان بھائی نے ہی کھولا تھا۔

میں نے محسوس کیا جیسے وہ وہاں کی تفصیل جاننے کے خواہش مند ہوں۔ مجھے ہنسی آگئی تھی۔ اس رات ہم بہت رات گئے تک جاگے تھے۔ میں ثانیہ بھیا کی ایک ایک بات دہراتی رہی۔ مقصد فیضان بھائی کو چھیڑنا تھا۔ عون بھیا نے اس رتجگے میں ہمارا ساتھ نہیں دیا تھا۔ وہ جلدی سونے کو اٹھ گئے تھے۔

”کیا عون بھیا آج بھی برینہ بھیا سے محبت کرتے ہوں گے؟“

یہ سوال میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ وہ عورت اس قابل نہیں تھی کہ اس کی خاطر زندگی برباد کی جائے۔“

عیسیٰ بھائی کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔ میں نے ٹھنڈا سانس کھینچا!

”یہ آپ کا خیال ہو سکتا ہے بھائی۔ ہو سکتا ہے عون بھیا بھائی کو بھلانے میں واقعی ناکام ہوں۔“ میرے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔ ایک جان لیوا خاموشی ہمارے بیچ حائل ہو گئی۔

”پچھلے تین سالوں سے میں نے کبھی عون کو کھل کر مسکراتے نہیں دیکھا۔ مگر جب ابو داؤد سے ملا تو اس میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ ابو داؤد کی آمد اس کی زندگی کے لیے بہار کے جھونکے کی مانند تھی۔ مگر اب وہ ایک بار پھر جیسے اسی خول میں سمٹ گیا ہے۔“

فیضان بھائی کے لہجے میں دکھ کا رنگ گہرا تھا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا مگر کچھ کہنے سے گریز کیا۔ ”بھائی بہت تنہائی پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ تنہائی زہر قاتل ثابت ہوا کرتی ہے زندہ انسانوں کے لیے میرا خیال ہے ماما اور پاپا اپنے طور پر یہ کوئی پیاری سی لڑکی دیکھیں اور بھائی کی شادی کر دیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے ذرا جوش کا مظاہرہ کیا تو موسیٰ نے گھور کر مجھے دیکھا۔

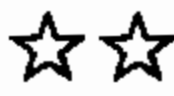
”تم سے ایسی ہی بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔ جتنی عقل ہے اسی حساب سے استعمال کرو گی نا۔ احمق لڑکی عون بھیا کسی فلم ڈرامے یا پھر کہانی کے ہیرو نہیں ہیں جو اس قسم کی پروجیکشن میں تھوڑی سی اکڑ دکھا کر پھر نارمل ہو جائیں گے۔ اس قسم کا اقدام فریق ثانی کی زندگی پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔“

میں کچھ کھسیا کر رہ گئی۔ پھر اسی خجالت کو مٹانے کو ذرا جھنجھلا کر بولی تھی۔

”پھر اس مسئلے کا کوئی حل بھی تو ہونا۔ کیا عون بھیا ساری زندگی خود بھی پریشان رہیں گے اور اپنے ساتھ ہمیں اور می پاپا کو بھی پریشان رکھیں گے؟“

”خدا کرے۔ خدا بہتر حل نکالے گا اس مسئلے کا۔“

فیضان بھائی نے بے حد پر امید لہجے میں کہا تو میں نے دل کی گہرائیوں سے آمین کہا تھا۔



اگلے دن میں کالج آئی تو کچھ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھی۔ عون بھیا کی بے رنگ زندگی دھیرے دھیرے ہم سب گھر والوں کی گہری پشیمانی کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ سونیا وغیرہ کا ارادہ آج پھر میرے ساتھ فضول کی باتیں ہانکنے کا تھا مگر میں نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا اور ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھی۔ اس کے بعد میں لائبریری میں جا کر نوٹس بنانے لگی تھی۔ چھٹی ہوئی تو میں سونیا وغیرہ کا انتظار کیے بنا اپنا بیگ اور جرنل سنبھالے گیٹ کی جانب آ گئی۔ مگر بلیک مرسیڈز کے کھلے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑے سیل فون پر محو گفتگو ابو داؤد کو وہاں موجود پایا کہ مجھے دھچکا لگا تھا۔ چند ثانیوں کو میں متحیر سی وہیں کھڑی ان کی وہاں موجودگی کی وجہ سوچتی رہی۔ وہ میری سمت متوجہ نہیں تھے۔ آف وائٹ پیٹ کوٹ میں ملبوس آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھائے وہ اپنے ڈیل ڈول اور وجاہت کی وجہ سے سینکڑوں نگاہوں کا مرکز بن چکے تھے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سر جھٹک کر اپنی راہ لی۔ پہلے سے دوسرے قدم کے بعد میں تیسرا قدم نہیں اٹھا سکی تھی۔ ابو داؤد اپنی ہر مصروفیت

ترک کیے میزِ اراستہ روک کر کھڑے تھے۔

”دس ازناٹ فیئر حجاب! پچھلے ایک گھنٹے سے میں یہاں آپ کا منتظر ہوں مگر آپ نے جتنی خوبی سے مجھے دیکھ کر بھی انکور کیا اس سے میں کیا سمجھوں؟“

وہ میرے بالکل قریب آ کر بے حد شاکی پن سے بولے تھے۔ میں نے جزبز ہو کر پہلے انہیں پھر اطراف میں اپنی جانب متوجہ لڑکیوں کو دیکھا اور سخت بے چینی کی کیفیت میں ہونٹ کچلے۔ اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتی انہوں نے ہاتھ سے گاڑی کی سمت اشارہ کیا۔

”آئیے پلیز!“

وہ یوں بولے تھے جیسے یہ روٹین کی بات ہو۔ میں کچھ چڑسی گئی۔

”پلیز آپ جائیے یہاں سے۔ یہ سب کچھ کسی طرح بھی مناسب نہیں۔“

مجھے بے حد آکورد فیل ہوا تھا۔ جواباً انہوں نے مجھے کچھ دیر عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”مناسب تو وہ بھی کسی طرح نہیں کہا جاسکتا جو آپ میرے ساتھ کر رہی ہیں حجاب!“

ان کا دھیمالہجہ بھی سلگتا ہوا تھا۔ میں نے کچھ عاجز ہو کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک آگ سی دہک رہی تھی۔ یوں جیسے وہ کسی گہرے ضبط سے دوچار ہوں۔ مجھے پھر کچھ محسوس ہوا مگر کیا یہ میں سمجھنے سے قاصر رہی۔

”آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے نا حجاب!“

ان کا لہجہ کیسا تھا۔ ٹوٹ کر بکھر جانے والے کانچ کی طرح چٹخا ہوا، میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا، میں نے اس پل جاننا یہ شخص یوں بکھر کر بات کرتا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ پہلا آدمی تھا جو میرے زندگی میں اتنے بھرپور انداز میں داخل ہوا تھا۔ جس نے مجھے تمام استحقاق سے چھوڑا تھا مجھے اپنی محبت کی دیوانگی کا احساس دلا کر میری اہمیت مجھ پر واضح کی تھی۔ اس شخص کی حیثیت میری زندگی میں عام نہیں تھی۔ پھر وہ فیصلہ اسی کیفیت میں ہوا تھا میں کچھ کہے بغیر ان کے ساتھ ان کی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

”تھینکس فار دس آنرا!“

ان کی آنکھوں کی چمک اس پل کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے سگریٹ سلگا کر ہونٹوں کے بیچ رکھا پھر آہستگی و نرمی سے بولے تھے۔

”مجھے کچھ بہت اہم باتیں آپ سے کرنا تھیں۔“

میں نے جواباً کچھ نہیں کہا بس گردن موڑے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

”مجھ سے خفا ہیں؟“

سوال بے حد غیر متوقع تھا میں نے ٹھٹھک کر انہیں دیکھا۔

”آپ فون پر میری آواز سننا پسند نہیں کرتیں بتائیں ساری زندگی ساتھ کیسے بسر کریں گی۔؟“

ان کی آواز میں جیسے کوئی شکوہ سا لپک رہا تھا میں گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

”حجاب کیا میری بات اتنی غیر اہم ہے کہ تم اس کا جواب دینا نہیں چاہتیں؟“

گاڑی سگنل پر رکی ہوئی تھی جب انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے اسکارف سے پھسل کر چہرے کے اطراف جھولتی بالوں کی لٹوں کو نرمی سے چھو کر پھر شکوہ کیا۔ میں ان کے لمس کو پا کر خائف سی پیچھے سرکی۔

”اوہ سوزی میں پھر بھول گیا کہ ابھی میں سارے حقوق حاصل نہیں کر پایا۔“

میرے چہرے پر پھیلتی سرد مہری محسوس کر کے وہ پھیلے سے انداز میں ہنسے مگر میں کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی تھی۔

”صاحب پھول لے لیں بیگم صاحبہ کے لیے۔“

اس صدا پر مجھ پر نگاہ جمائے بیٹھے ابوداؤد چونکے تھے۔ میں کچھ اور خفت اور خجالت سے سرخ ہونے لگی۔ ابوداؤد نے ادائیگی کرنے کے بعد گجرے میری سمت بڑھا دیئے۔

”آئی نو مجھے آپ اس جسارت کی اجازت نہیں دے سکتیں مگر انہیں قبول کر لیں پلیز!“

میری نگاہ اٹھی تھی اور ان کی دلچسپی سے معمور پر شوق نگاہ سے الجھ کر اسی بل جھک گئی۔ پھولوں کی بھینی بھینی دلفریب مہک نے گاڑی کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کو بھی اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر گجرے لے لیے تھے۔

”تھینکس اگین حجاب!“

وہ ایک دم سے کھل اٹھے تھے۔ سگنل گرین ہوا تو گاڑی آہستگی سے ریگننے لگی۔

”پلیز حجاب انہیں پہن لیں مجھے بہت اچھا لگے گا۔“

میں گود میں ہاتھ رکھے کچھ پریشان کچھ نرمی میں بیٹھی تھی ان کی اگلی فرمائش پر کچھ اور کنفیوژ ہو کر رہ گئی۔ کہاں پھنس گئی تھی میں۔ میرا دل گھبرانے لگا۔

”اگر آپ کو پر اہم ہے تو میں ہیلپ کر دیتا ہوں۔“

وہ مکمل طور پر ڈرائیو کی سمت متوجہ تھے مگر اس کے باوجود جیسے توجہ کامرکز میں ہی تھی میرا دل زور سے بے ترتیب ہو کر دھڑک اٹھا۔

”نہیں میں گھر جا کے پہن لوں گی۔“

میں بے ربطی ہو کر جلدی سے بولی۔ انہوں نے جواب میں پہلے مجھے دھیان سے دیکھا پھر خفیف سا ہنکارا بھرا تھا اس کے بعد بے حد گھمبیر لہجے میں بولے تھے۔

”لیکن وہ ستائشی نگاہیں کہاں سے لائیں گی جو اس وقت میں.....“

”پپ پلیز!!“

میں بے ساختہ انہیں ٹوک گئی۔ مجھے ایک بل کو لگا میرا دل تھم جائے گا۔ کہاں دیکھے تھے میں نے یہ

نہ یا نہ اندھ ان کا رومینٹک موڈ میرے حواس چھین رہا تھا۔

”او کے او کے فائن! آپ پلیز رومٹ پڑنا۔“

انہوں نے جیسے میری حالت سے حظ لیتے ہوئے شرارت سے مسکرا کر کہا تھا۔ میں پہلو بدل کر رہ گئی۔ میری نگاہ کھڑکی کے باہر پیچھے کی جانب دوڑتے انجان راستوں پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے میرا ہورگوں میں سنسنا کر رہ گیا۔ میں نے گردن موڑ کر متوحش نظروں سے ابوداؤد کو دیکھا تھا۔

”یہ یہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟“

”آپ کے گھر!“ ان کا جواب مختصر تھا مگر معنی خیزی سے بھرپور جو میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔
”لیکن یہ رستہ میرے گھر کا نہیں ہے۔“ میرے چہرے پر تغیر تھا۔ ابوداؤد کی ونڈ اسکرین پر جی سنجیدہ نظریں میری جانب اٹھیں۔

”میرا گھر بھی تو آپ کا گھر ہے حجاب! ہم وہیں چل رہے ہیں۔“

خود پر سکون رہ کر بھی انہوں نے مجھے پوری ہستی سمیت ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں فق چہرے کے ساتھ بیٹھی رہ گئی۔

”اچھا نہیں لگا آپ کو یہاں آنا؟“

دفعتاً گاڑی رُک گئی تھی۔ اب وہ دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر جمائے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں ان نگاہوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی پلکیں لرزیں اور جھک گئیں۔ دل جانے کیوں بھرانے سا لگا۔ ہارن کے جواب میں آہنی گیٹ وا ہوا تھا۔ بے حد خوبصورت وسیع و عریض بنگلہ تھا۔ گاڑی ڈرائیور وے پر پھسلتی گول ستونوں والے پورٹیکو میں جار کی جس کے گرد خوبصورت بیلین لیٹی ہوئی تھیں۔ یہ بہار کا موسم نہیں تھا مگر لان ملکی وغیرہ ملکی پھولوں سے بھرا ہوا انوکھی چھب دکھلا رہا تھا۔ گہرا سبزہ اور بے تحاشا خوبصورتی مگر اس وقت مجھے کچھ بھی اٹریکٹ نہیں کر رہا تھا۔ گاڑی کا دروازہ اوپن ہونے پر میں چونکی وہ میرے باہر آنے کے منتظر تھے۔ اب ان کی مرضی پر چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہر سوا ایک جامد سناٹا اور ویرانی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس بڑے سے گھر میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور مکین نہیں ہے۔ ابوداؤد کی معنی خیز خاموشی مجھے اندر ہی اندر سہا رہی تھی۔

”آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟“

ان کے ہمراہ اندرونی حصے کی جانب بڑھتے ہوئے میں مرے مرے انداز میں بولی تھی۔ میری بات کا جواب نثار دیا تھا۔

”راہی آپا اماں وغیرہ بھی نظر نہیں آرہیں۔ سب لوگ کہاں ہیں؟“

وہ مجھے جس کمرے میں لائے وہ ایک پراسٹش بیڈ روم تھا۔ خواب ناک ماحول دبیز پردے مخملیں صوفے۔ اور بہترین فرنیچر۔ ابوداؤد نے اندر آنے کے بعد لائینٹس آن کر دی تھیں۔ کمرے کی فضا میں کسی غیر ملکی ایئر فریجنر کی مہک رچی بسی تھی۔

”میں یہاں اکیلے رہتا ہوں۔ اماں اور رابعہ آپا وغیرہ سب گاؤں میں ہوتے ہیں۔“

اس جواب نے میرے رہے رہے اوسان بھی خطا کر ڈالے۔ میں نے ٹھٹھک کر انہیں دیکھا میرا رنگ یقیناً فق ہو گیا تھا۔

”تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔“

کوٹ اتارنے کے بعد رستہ داچ پر سرسری نگاہ ڈال کر انہوں نے مجھے ہنوز کھڑے دیکھتے ہوئے میرے ہوائیاں اڑاتے چہرے کی جانب ایک مسکراہٹ اچھالی اور خود پلٹ کر باہر چلے گئے۔ میں مضطرب تھی لرزتے ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم جکڑے خود کو کمپوز کرنے کی سعی کرتی رہی مگر خوف اور واہے تھے کہ مجھے بے حال کیے جا رہے تھے۔ ابوداؤد کا مجھے اس طرح لانے کا مقصد مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی ساکن بیٹھی رہی تھی پھر دبیز پردوں کو پرزور انداز میں ہلتے دیکھ کر چونک اٹھی۔ درپے کھلے تھے اور باہر سے طوفانی ہواؤں کے جھکڑ اندر چلے آ رہے تھے۔ میں سرعت سے اٹھی پردے کو ہٹا کر دیکھا اور موسم کے تیور دیکھ کر کچھ گھبرا گئی۔ مغرب کی جانب سے گرد آلود بگولے بہت سرعت سے پوری فضا کو ڈھانپتے جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھے پورے ماحول پر یہی غبار چھا گیا۔ تند جھونکے بھی بڑھنے لگے۔ میں نے اپنے چہرے پر گرد محسوس کی تو پیچھے ہٹ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ ہلکی سی گڑ گڑاہٹ کی آواز بھی ابھری تھی اگلے لمحے ننھی بوندیں بھی گلاس وال پر گریں اور پھسل کر نیچے جانے لگیں۔ بارش کے باعث فضا میں موجود گرد کا طوفان تھم گیا۔ میں نے ایک بار پھر درپے کے پٹ کھول دیئے اور گن سے انداز میں سرسبز گھاس پر کرٹل کے موتیوں کی طرح بکھرتی بارش کی بوندوں کو تکتے لگی۔ یہ موسم ہمیشہ سے میری کمزوری رہا تھا۔ اس وقت بھی میں یکسر بھول گئی میں کچھ دیر قبل کیسی پریشانی اور تفکر میں مبتلا تھی۔

حجاب آپ کے بال اتنے حسین اور لمبے ہوں گے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔

مجھ پر چھا جانے والی سرمستی کی یہ کیفیت لمحاتی ثابت ہوئی۔ ابوداؤد کی آواز پر میں ساکن رہ گئی تھی۔ اور سرعت سے پھیل جانے والے دوپٹے کو سر پر رکھنا چاہا مگر گردن پر ان کے گرم سانسوں کی حدت محسوس کر کے میں سرا سمگی سے پلٹی تھی۔ ابوداؤد میرے اتنے نزدیک تھے کہ یہ فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ جانے کب اسکارف میرے سر سے سرک گیا تھا۔ اب میں ننگے سران کے سامنے حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ان کے لہجے میں جو خمار آلود بھاری پن تھا وہ مجھے پھر سے سرا سمگی کے حصار میں جکڑ کے رکھ گیا۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

بامشکل گھبراہٹ پر قابو پا کر خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔ اور جھک کر اپنا پیروں میں گرا ہوا اسکارف اٹھانے لگی۔

”جہاں بھی گیا تھا۔ اب تو تمہارے پاس ہوں۔“

انہوں نے ایک بار پھر میرا بڑھایا ہوا فاصلہ گھٹا دیا تھا۔

”جج جی!!!“ میں بکا اسی گئی۔ ان کی بے تحاشا چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے یکدم خوف محسوس ہوا۔

”موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے نا؟“

ایک نگاہ کھڑکی کے باہر طوفانی بارش اور گرجتے ہوئے بادلوں پر ڈال کر وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔ ایک لمحے کو مجھے محسوس ہوا ان کی آواز لڑکھڑاہی ہے۔ شاید وہ ڈرنک کر چکے تھے۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرداب اترتی محسوس ہوئی۔ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹتی میں دیوار کے ساتھ جا لگی۔ وہ وہیں ٹھہر گئے تھے۔ البتہ ان کی نگاہیں مجھ پر ہی فوکس تھیں اور جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا اس بل ان کی نظروں کی لپک شدت اور جنون خیزی کچھ اور بھی بڑھ گئی ہے۔

”موسم بہت خوفناک ہو رہا ہے۔ مم میرا خیال ہے مجھے گھر جانا چاہیے۔“

میں اپنے اندر کے خوف سے انہیں آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی جیسی کسی قدر خود کو سنبھال کر بولی مگر مجھے صاف محسوس ہوا میری آواز بھیگ چلی ہے۔

”ٹریکوں کے دل چڑیا کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ایسے موسم میں وہ خوفزدہ ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ میرے پاس آؤ تمہیں ڈرنہیں لگے گا۔“

ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ کیسی؟ یہ میں شاید کبھی وضاحت نہ کر پاؤں ہاں یہ ضرور تھا کہ اس مسکراہٹ نے میرے خوف کو دوچند کر دیا تھا۔

”نہیں مجھے ڈرنہیں لگتا ایسے موسم سے بھی نہیں۔“

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر اپنی ہی بات کی شدومد سے تردید کی۔

”ریلی؟“ ان کے لبوں کی مسکان مجھے اپنا مضحکہ اڑاتی ہوئی محسوس ہوئی تو بے بسی کے احساس نے میری آنکھیں چھلکا دیں۔

”مجھے گھر چلنا چاہیے داؤد ماما پریشان ہو رہی ہوں گی۔ کالج کب کا آف ہو چکا ہے۔ مجھے ایک بار پھر اپنے سے وابستہ رشتوں کی فکر ستانے لگی۔“

”اتنی بارش میں کیسے جاؤ گی؟ ایسا کرو فون پر ماما کو بتا دو تم میرے ساتھ ہو۔“

ان کی تجویز پر میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں داؤد؟“ میں روہانسی ہو گئی۔

کیا یہ مناسب نہیں ہے؟ وہ از حد معصومیت سے پوچھنے لگے۔ اپنی بے چارگی کے احساس نے میرا گلا آنسوؤں کی تلخی سے بھر دیا۔

”آپ مجھے واپس چھوڑ آئیں پلیز!“ میں نے رقت آمیز آواز میں با مشکل کہا تھا۔ ابو داؤد کچھ دیر

مجھے دیکھتے رہے۔ پھر گہرا سانس کھینچا تھا۔

”حجاب میں تمہیں تمہارا یہ گھر دکھانے لایا تھا جہاں شادی کے بعد ہمیں اکٹھے رہنا ہے۔ تمہیں شاید

اچھا نہیں لگا حالانکہ اس میں آکر دو تو کچھ بھی نہیں اپنی دے چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

ان آخری الفاظ نے جیسے میرے تن مردہ میں جان ڈال دی۔

”چلیں پلیز!“ میں بھاگنے کے انداز میں کمرے سے نکلی۔ رابداری عبور کر کے ہم لوگ جیسے ہی لان اور پورج سے ملحق سڑھیوں پر آئے بارش کی شدید اور طوفانی بو چھاڑنے لمحہ بھر میں ہمیں بھگو کے رکھ دیا۔ ماربل کے چکنے فرش پر میرا پیر پھسلا تھا مگر میں سنبھل گئی اس دوران ابوداؤد مجھے سہارا دے چکے تھے۔ اس سے قبل کہ میں یہ فاصلہ بڑھاتی۔ بادل اچانک بہت زور سے گرجے یہ کڑک اتنی زوردار اور خوفناک تھی کہ میں دہل کر اپنے بے حد نزدیک کھڑے ابوداؤد کے ہنسی وجود میں پناہ لے بیٹھی۔ میرے حلق سے نکلنے والی چیخ اور کپکپاتا ہوا لرزاں وجود میرے بے تحاشا خوف کا غماز تھا مگر یہ میری فاش غلطی تھی جس کا احساس مجھے اگلے ہی لمحے بہت شدت سے ہو گیا تھا۔ ابوداؤد تو شاید پہلے سے ہی کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ ان کے فولادی بازوؤں کا ہر لمحہ ٹنگ ہوتا دھماکہ محسوس کر کے میرے خوف کا رنگ بدل گیا۔ میں مزاحمت کی کوشش میں ناکام ہوئی تھی اور ان کی اس مجنونا نہ گرفت میں میری ہڈیاں چٹختی اور سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ لمس کسی برزخ کی طرح سے ہی میرے روم روم کو خاکستر کرتا جا رہا تھا۔ ناگواری کے ساتھ بے بسی کا شدید احساس ان کی جبری جساتوں کے ادراک نے میرے اندر جگایا تھا۔ ایسا احساس کہ جس کے آگے بے بسی کی انتہا پہ جا کے میں بے ساختہ رو پڑی۔

”چھوڑ دیں مجھے! فارگاڈ سیک مجھے چھوڑ دیں۔“

”تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں تمہیں ڈر نہیں لگتا۔“

میری گزارش میں جانے کیسا کرب اور بے بسی تھی کہ اگلے لمحے جیسے وہ ہوش میں آ گئے مجھے چھوڑا اور فاصلہ بڑھا کر کسی قدر خجالت سے بولے۔ میں کچھ نہیں بولی۔ میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ میرا پورا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں سر تاپا بھیگی ہوئی تھی وہ بھی بھیک گئے تھے ہم ابھی تک وہیں ان اور پورج کے درمیانی سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ میرے چہرے پر بارش کے ساتھ ساتھ میرے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

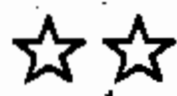
”حجاب آج ہر پابندی توڑ دینے، ہر حد سے گزر جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ مگر میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میں خود پر جبر کر رہا ہوں۔ میں تمہیں واپس چھوڑ آتا ہوں۔ بس تم یہ آنسو نہ بہاؤ۔“ ان کی ملتی انگلیاں میرے گالوں کو خشک کرنے کی سعی کرنے لگیں۔ میں نے بجلی سی بھری اور ان کا ہاتھ بٹا دیا۔ تقریباً دوڑتے ہوئے میں وہاں سے ہٹ کر گاڑی تک آئی تھی اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ انہوں نے خاموشی سے میری تقلید کی تھی۔ گاڑی گیٹ سے نکل کر مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ ہمارے بیچ تکلیف دہ خاموشی چھائی رہی۔ بارش کے باعث سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی اس کے باوجود ابوداؤد نے کسی قسم کی عجالت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میرے کپڑوں سے پانی قطرہ قطرہ نچ رہا تھا اور گاڑی کی سیٹ گیلی ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میں بے حس سی بیٹھی تھی آنکھیں ابھی بھی نم تھیں۔ میرا جسم بھی شاید بھینکنے کی وجہ سے کانپنا شروع کر چکا تھا یا پھر جو مجھ پر قیامت پڑی تھی یہ اس کے اثرات تھے۔

”ابھی شام کے تین بجے ہیں۔ عون تو گھر نہیں آیا ہوگا۔ آپ کہیں تو میں آپ کے ساتھ اندر چلوں؟“
مجھے ابوداؤد کی آواز نے چونکایا تھا۔ میں نے بے ساختہ گھبرا کر انہیں دیکھا۔ گاڑی رکی ہوئی تھی وہ ہاتھ سے اپنے بالوں سے پانی کے قطرے جھٹک رہے تھے۔
”نہیں پلیز! میں چلی جاؤں گی۔“ ابوداؤد نے جواب میں کچھ کہے بغیر محض مجھے دیکھا۔ پھر خاصی تاخیر سے بولے تھے۔

”گھر میں کیا جواز پیش کرو گی اس دیر کا؟“
”میں کہہ دوں گی اپنی فرینڈ کی جانب چلی گئی تھی۔“
مجھے لگا ایک بار پھر میرا گلا آنسوؤں سے بھر گیا۔ میں نے ہونٹ شدت سے کچلے تھے۔
”او کے فائن! ایز یوش!“

انہوں نے کاندھے جھٹک دیئے تھے پھر آگے کی سمت جھک کر دروازہ کھلا تو ایک بار پھر وہ میرے بے حد نزدیک آ گئے۔ میں سہم کر گھبرا کر سرعت سے سمٹ کر دروازے سے جا لگی۔ دروازہ اوپن ہوتے ہی میں سنبھل کر سرعت سے اتر گئی۔
گڈ بائے۔

ان کے ہونٹ ہلے تھے مگر میں پیچھے مڑ کر دیکھے بنا طوفانی بارش کی پرواہ کیے بغیر سرعت سے اپنے گھر کی جانب بھاگ گئی۔ میرا گھر جہاں تحفظ تھا اور کوئی خوف نہیں تھا۔



میں لان میں کین کی چیر پر بیٹھی پکوڑوں کے ساتھ چلی ساس سے لطف لے رہی تھی جب عون بھیا اپنے کمرے سے نکل کر میرے پاس چلے آئے۔

”بھیا پکوڑے لیس نا!“
میں نے انہیں خاموش اور گرم صم یا کے مخاطب کیا تھا۔ وہ چونکے پھر گھبرا سانس بھر کر سر کوٹھی میں جنبش دیتے کچھ دھیان سے مجھے تکتے لگے۔

”ہنی تم کل کہیں گئی تھیں؟“

”جی!!“ میں ہونق ہو گئی۔ وہ مجھے جیسے کسی الجھن میں لگے۔

”آئی میں کل تم داؤد کے ساتھ تھیں؟“

میرا رنگ ایک دم سے اڑ گیا۔ میرے ہاتھ سے پکوڑا اچھوٹ کر میرے پیروں کے پاس ہری گھاس پر جا گرا تھا میں سن بیٹھی تھی۔ بالکل پتھرائی ہوئی۔

”حجاب کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟“ عون بھیا کچھ جھنجھلائے تھے۔ ان کا لہجہ بے حد خشک اور سرد محسوس ہوا تھا۔ حالانکہ بھائیوں میں انہی کا رویہ ہمیشہ میرے ساتھ سب سے زیادہ مشفقانہ اور محبت بھرا تھا۔ وہ

شاید پیاسے بھی زیادہ میرے لاڈ اٹھاتے رہے تھے۔ اب ان کا غصہ اور سختی میرے حواس مختل کر کے رکھ گئی تھی۔
”میں ان کے ساتھ کیوں جاؤں گی بھیا وہ بھی اکیلی۔“

میرے اندر جانے کہاں سے اتنا حوصلہ آ گیا تھا۔ میں نے بڑی ہمت سے جھوٹ بولا تھا اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر تردید کر دی۔ بس ایک ہی احساس اس پل دامن گیر تھا میں ان کی نگاہ میں گرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں ان کا مان توڑنا نہیں چاہ رہی تھی، وہ مان جو انہیں مجھ پر اپنی اکلوتی بہن پر تھا۔ میرے جھوٹ کے پیچھے اگر کوئی وجہ تھی تو بس یہی تھی اور مجھے اس جھوٹ پر ہرگز ندامت نہیں تھی۔

”عون بیٹے آپ کا فون ہے۔“

عون بھیا جو مجھے بغور دیکھ رہے تھے ماما کی پکار پر کچھ کہے بغیر پلٹے اور لمبے ڈگ بھرتے وہاں سے چلے گئے۔ میرا جانے کب سے سینے میں انکا سانس بحال ہوا تھا۔ پھر بہت سارے دن خیریت سے گزرے اسی دوران فیضان بھائی کی منگنی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ گھر میں ایک بار پھر خوشیاں اتر آئی تھیں۔ وہ منگنی سے ایک دن پہلے کی رات تھی۔ میں اپنی دیگر کزنز کے ساتھ ڈھولک سنبھالے بیٹھی تھی اور ہم بہت سارے گانوں کی ٹانگیں توڑ رہے تھے۔ تب ہی مجھے ایک پرانا مگر بہت پیارا گانا سوجھ گیا تو اسی کی تان اڑانا شروع کر دی۔

یہ محفل جو آج بھی ہے اس محفل میں ہے کوئی ہم سا

ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ ہم سا ہو تو سامنے آئے۔

گانا گاتے ہوئے ہمارے دانت مسلسل نکل رہے تھے اور چونکہ یہ گانا بھی پورا نہیں آتا تھا جی بھی ایک ہی بول کی تکرار کرتے رہے۔

ہم سا ہو تو سامنے آئے۔

”لو آگئے ہیں سامنے۔ اب دیکھ بھی لو۔ ماشاء اللہ! چشم بدور“

ثنا کا نہو کا بہت زور والا تھا۔ میں جو مگن سے انداز میں گارہی تھی۔ بدمزگی سے اسے گھورنے لگی تب اندازہ ہوا میرے علاوہ سب خاموش ہو چکی ہیں اور کچھ غیر معمولی کانشش بھی۔ الجھے ہوئے انداز میں میری نگاہ ان کی نظروں کے تعاقب میں اٹھی تو ایک دم میرے سارے جسم کا خون جیسے سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا۔ ابو داؤد دروازے میں کھڑے تھے اور دبی دبی مسکراہٹ سمیت میری جانب ہی دیکھ رہے تھے۔

”سوری میں نخل ہوا۔ اکیچو کلی میں عون کی تلاش میں ادھر آ نکلا تھا۔ آپ نے ماسنڈ تو نہیں کیا؟“ ان کا بھاری لہجہ بہت مدہم تھا۔ مسکراہٹ روکنے کے غرض سے انہوں نے زیریں ہونٹ کا کونہ دانتوں تلے داب رہا تھا مگر یہ چھلکتی ہوئی مسکان گویا ان کے چہرے کے ساتھ آنکھوں کو بھی روشن کر رہی تھی۔ آج ان کا دیکھنے کا انداز ہرگز ہولانے والا نہیں تھا۔ میں اتنا شرمائی ہوئی تھی کہ خفت سے سرخ چہرے لیے بیٹھی رہی۔

”ارے کیسی باتیں کر رہے ہیں ابو داؤد صاحب! آپ کی آمد تو باعثِ صدِ افتخار ہے۔ تشریف رکھیے نا۔“

ثنا نے کسی قدر شرارتی انداز میں کہا۔ ان سب کی سرابتی ہوئی رشک آمیز نگاہیں ابو داؤد کے سراپے

پر جمی ہوئی تمہیں۔ بلیک کرتا شلواری میں پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ نگاہ کوٹھمکائے دے رہے تھے۔
 ”تھینکس میں چلتا ہوں۔ آپ اپنا شغل جاری رکھیں۔“

وہ دھیمسا مسکرائے اور واپسی کو پلٹے تھے جب ثنا کی زبان ایک بار پھر پھسل گئی تھی۔
 جی اب تو جائیں گے ہی۔ مقصد جو پورا ہو گیا آپ کا۔

اس کا شوخ لہجہ معنی خیز ہونے لگا۔ واپسی کو پلٹے ابو داؤد ہٹم سے گئے۔
 ”کون سا مقصد؟“

ان کی کشادہ آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ ثابہ ساختہ ہنسی۔

”آپ تو جیسے جانتے نہیں۔ ہماری کڑی کو چپکے سے جی بھر کے دیکھنے کی خواہش اور کیا؟“
 ثنا کی یہ بات مجھے ناگواری کے ساتھ بے تحاشا خفت میں بھی مبتلا کر گئی۔ میں نے ثنا کو گھورنا چاہا مگر وہ میری جانب متوجہ نہیں تھی۔

”خواہش صرف اتنی ہی تو نہیں تھی۔ میں ان سے بات کرنے کا بھی طلب گار تھا مگر.....!“

ان کی پوری بات سننے بغیر لڑکیوں نے یا ہو کار مچا کر ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ میں نے سٹپٹا کر ابو داؤد کو دیکھا۔ وہ جیسے اسی لمحے کے منتظر تھے۔ مجھ سے نگاہ چار ہوتے ہی نہایت دل آویزی سے مسکرائے۔ میرا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکا اور جسم و جاں میں ایک لطیف سی حدت آمیز سنسنی جاگی۔ چند ایک مزید شوخ جملوں کے تبادلے کے بعد ابو داؤد وہاں سے چلے گئے مگر میں اپنے دل کو بہت دیر بعد تک بھی مدھر سروں میں دھڑکتا محسوس کرتی رہی تھی۔ ثنا وغیرہ نے بعد میں اس حوالے سے جو مجھے زچ کیا وہ الگ۔ رات تقریباً ایک بجے ہم سونے کو لیٹے تھے میں اپنے کمرے میں آئی تو جانے کس جذبے کے تحت تکیے کے نیچے پڑا سیل فون نکال لیا تھا۔ ابو داؤد کا مسیج موجود تھا۔ میں نے کھول لیا۔

میں نے کب داد کے لمحوں سے شکایت کی ہے

ہاں میرا جرم ہے کہ میں نے محبت کی ہے

آج پھر دیکھا ہے اسے محفل میں پتھر بن کر

میں نے آنکھوں سے نہیں دل سے بغاوت کی ہے

اسے بھول جانے کی غلطی بھی نہیں کر سکتا

ٹوٹ کر کی ہے تو صرف اس سے محبت کی ہے

میں نے سیل فون واپس رکھ دیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ جانے کیوں نیند آنکھوں سے دور تھی کروٹیں بدلتے تھک رہی تھی تب آنکھ لگ گئی۔ ابھی غنودگی میں تھی کہ کسی احساس نے پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ سیل فون کی مسلسل ہوتی سیپ تھی۔ میں نے نمبر پر غور کیے بنا کال ریس کی تھی۔

”ہیلو“

”اتنی آسانی سے کیسے سو جاتی ہیں؟“

”کون؟؟“ میں چونک سی گئی۔

”ابوداؤد بات کر رہا ہوں۔ میرے سوا کسی کی اتنی جرأت ہے کہ آپ کو سونے سے جگا سکے۔“
ایک عجیب سی دھونس اور خفگی نمایاں تھی ان کی بوجھل آواز میں۔ میرے ہونٹوں پر بے ساختہ
مسکراہٹ بکھر گئی۔

”آپ ابھی تک کیوں جاگ رہے ہیں؟“

”نیند نہیں آرہی۔“

”کیوں؟“ میں نے منہ پر ہاتھ رکھ کے جمائی روکی۔

”تم پاس نہیں ہوتا۔“ وہ ایک دم پڑی چھوڑ کر پھر بہک گئے۔ میں خاموش رہی تھی۔

”حجاب! عون سے کہو یہ پابندی ہٹا دے میں مزید انتظار نہیں کر سکتا پلیز!“

”کون سی پابندی؟“ میں کچھ اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”میں فوری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے کر لیں مگر کسی اور لڑکی سے۔ میں خود ابھی ایسا نہیں چاہتی۔“

وہ پکارتے رہ گئے مگر میں نے فون آف کر دیا تھا۔ اس کے بعد گوکہ میں سو نہیں سکی مگر میرا دماغ اس
سوچ کے ساتھ ابلتا رہا تھا کہ داؤد مجھے آخر کس راستے پر چلانا چاہ رہے ہیں۔ اگلا دن ہنگامہ خیز تھا۔ منگنی کی یہ
تقریب بہت اعلیٰ پیمانے پر منعقد کی گئی تھی۔ جو مہمان کل رہ گئے تھے انہیں بھی آج ہی آنا تھا۔ میرے لیے ماما
نے خصوصی تیاری کی تھی۔ بے بی پنک کا مدار شرارہ تھا جس کے ساتھ کندنی جیولری میچ کر رہی تھی۔ جب میں
تیار ہو کر آئی تو میری فرینڈز کے ساتھ ابوداؤد کی فیملی بھی پہنچ چکی تھی۔ سونیا وغیرہ نے تو جو میری تعریفیں کی
سو کیں مگر ابوداؤد کی بہنوں نے تو باقاعدہ میری شان میں قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ میں کچھ شرمندہ
اور شرماتی جا رہی تھی۔

”آپ تو بنا سنگھار کے ہی غضب ڈھاتی ہیں بھابھی! ایویں تو بھائی دیوانے نہیں ہو رہے تھے آپ

کے حصول کو۔ آج تو آپ کے چہرے سے نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں۔“

داؤد کی سب سے چھوٹی بہن کا انداز سب سے والہانہ تھا۔

میں بلش ہونے لگی۔ ایک جھینپتی ہوئی مسکراہٹ مستقل میرے ہونٹوں پر تھی۔ ابوداؤد کی رات فون

پر وارنٹی الگ یاد آ کر میرے چھلکے چھڑا رہی تھی۔

”بھائی تو پہلے ہی پاگل ہو رہے ہیں آج آپ کو دیکھ کر سدھ بدھ کھونہ بیٹھیں۔“

وہ پھر شرارتی انداز میں بولی تھی۔ میں کچھ اور سرخ پڑ گئی۔ ماما کچھ فاصلے پر کھڑی تھیں۔ اور مجھے بلا

رہی تھیں۔ مجھے خود بہانہ چاہیے تھا جان چھڑانے کا۔ جی جلدی سے داؤد کی بہن سے ایکسکیوز کرتی ماما کی

جانب آگئی۔

”بیٹے میں نے جو جیولری بانس تمہیں دیا تھا۔ ثانیہ کے لیے وہ لے آؤ۔ گاڑیاں تیار ہیں بس ہم اب نکل رہے ہیں۔ ایسا نہ ہوا فرا تفری میں اہم چیز بھول جائیں۔“

”جی ماما میں نے فیضی بھائی کے کمرے میں ان کی وارڈروب میں رکھ دیا تھا لے آتی ہوں۔“

”ہاں جاؤ۔“ ماما مطمئن ہو کر کسی اور سمت چلی گئیں۔ میں اپنا لباس سنبھالے بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر فیضان بھائی کے کمرے میں آگئی۔ فیضی بھائی پارلر گئے ہوئے تھے میں جانتی تھی جی تاک کیے بنا ان کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ اوپر کی منزل پر مہمان نہ ہونے کے برابر تھے جی یہاں قسبتا تاریکی اور سنائے کا راج تھا۔ میں نے اندر قدم رکھنے کے بعد لائٹس آن کی تھیں پھر آگے بڑھ کر وارڈروب کھول لی۔ لا کر کی چابی مجھے دراز سے مل گئی تھی۔ لا کر سے جیولری باکس نکالتے ہوئے میں نے دروازے پر آہٹ محسوس کی مگر دھیان نہیں دیا تھا۔ باکس نکال کر میں نے لا کر کو پھر سے لاک لگایا اور چابی دوبارہ دراز میں ڈال دی۔ جیولری باکس سنبھالے میں اپنے دھیان میں پلٹی تھی اور کسی فولادی وجود سے ٹکرا گئی۔ میں نے گھبرا کر سر اونچا کیا۔ ابو داؤد میرے بے حد نزدیک تھے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ کہاں سے آگئے تھے۔ میں نے گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر وارڈروب میری پشت پر تھی میری یہ کوشش ناکام تھی۔ میری بدحواسی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا کچھ کہے بنا میں نے دونوں ہاتھوں کے دباؤ سے انہیں پیچھے دھکیلنا چاہا تو انہوں نے خطرناک تیوروں کے ساتھ مجھے وحشت بھرے انداز میں اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

”کیا کہہ رہی تھیں رات تم کہ میں تمہیں چھوڑ دوں؟ بولو یہی کہا تھا نا تم نے؟ ہاؤڈیر یو؟“

ان پر جیسے کوئی جنون سوار تھا۔ وہ شاید حواسوں میں نہیں تھے۔ میری وہ کلائی جوان کے ہاتھ میں تھی ان کی جنونی کیفیت اور دباؤ کے باعث ٹوٹی چوڑیوں سے لہو لہان ہو گئی تھی مگر انہیں شاید احساس تک نہیں تھا۔ وہ اسی طیش اور غیض میں پھرے مجھ سے بار بار باز پرس کر رہے تھے۔

”نہیں۔ میں نے چھوڑنے کو نہیں کہا تھا۔ کسی اور سے شادی کا کہا تھا۔“

میں بے ساختہ سسک اٹھی آنسو پلکوں سے پھسل کر میرے چہرے پر بے بسی کے مظہر بن کر بکھرنے لگے۔ مگر انہیں رحم نہیں آیا تھا۔ مجھے نہایت بے دردی سے جھنجھوڑا اور اسی مجنونانہ انداز میں پھنکارے۔ ایک ہی بات ہے۔

”ایک ہی بات ہے۔ معافی مانگو۔ کہو گی آئندہ ایسی بات؟“

انہوں نے آنکھیں نکال کر سرخ چہرے کے ساتھ تلخی سے کہا میں کچھ اور شدت سے رودی۔

”نہیں کہوں گی۔ کبھی نہیں کہوں گی۔ لیکن مجھے چھوڑ دیں۔ یہاں سے چلے جائیں پلیز! عون بھیا

اپنے کمرے میں ہیں ابھی اگر وہ ادھر آگئے تو.....؟

”تو کیا؟ تم کیا سمجھتی ہو ڈرتا ہوں اس سے میں؟“

وہ سانپ کی طرح پھنکارے میں خائف سی ہو کر ٹکڑا نہیں تکتے لگی۔

”اچھا ہے وہ دیکھ لے پھر اپنی فضول ضد سے باز آجائے گا۔ جلدی شادی ہو جائے گی ہماری۔ بلکہ آؤ میں تمہیں اس کے سامنے لے کر جاتا ہوں۔ تم کہو گی نا اس سے تم خود بھی یہی چاہتی ہو۔“

وہ یقیناً حواسوں میں نہیں تھے۔ انہوں نے نہایت جارحانہ انداز میں مجھے اپنی جانب کھینچا تھا اور باہر لپکے۔ میں دہل کر رہ گئی۔ خوف میرے حواس سلب کرنے لگا۔

”پاگل ہو گئے ہیں ابو داؤد! چھوڑیں مجھے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے یہ فضول بات کرنے کی۔“

میرا ضبط چھلک گیا تھا میں دبے ہوئے انداز میں چیخ پڑی اور پوری طاقت صرف کر کے اپنا ہاتھ ان سے چھڑا لیا۔ انہوں نے ٹھٹھک کر مجھے دیکھا تھا کچھ دیر یونہی تکتے رہے تھے پھر بوجھل آواز میں بولے تھے۔

”یہ تم اس لیے کہہ رہی ہونا حجاب کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

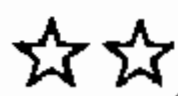
میں جواب میں کیا کہتی گہرا سانس بھر کے نظریں بدل لیں۔ وہ جیسے ڈھسے گئے۔

”شاید تم مجھ سے کبھی محبت نہ کرو شاید تم مجھے کبھی نہ ملو۔“

ان کی آواز کچھ اور بوجھل ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے جیسے لہو چھلکنے لگا۔ مگر مجھے ان پر رحم آنے کی بجائے طیش آ رہا تھا۔ عجیب انسان تھا یہ آدمی۔ دیوانہ سکی۔ میرا دماغ چنچنے لگا۔

”آپ نے اپنی حرکتیں دیکھی ہیں۔ ایسے انسان کو واقعی کچھ نہیں ملنا چاہیے۔“

میں نے کسی قدر غضبناک انداز میں کہا اور جیولری باکس جو نیچے کارپٹ پر گر گیا تھا جھپٹ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ ابھی مجھے کسی کی نظروں میں آنے سے پہلے اپنا حلیہ بھی سنوارنا تھا جو اس پاگل شخص کی وجہ سے کسی حد تک مشکوک ہو چکا تھا۔



اس کے بعد میں بہت الجھ گئی تھی۔ ابو داؤد مجھے ہرگز نارمل نہیں لگے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی ایسی صورتحال میں کیا حکمت عملی اپناؤں۔ خاموشی سے آنے والے وقت کے تیور دیکھوں یا پھر ماما کو سب کچھ بتا کر اس سلسلے کو ختم کر ڈالوں۔ ابو داؤد کے لیے میرا دل ہمیشہ خاموش رہا تھا۔ میں نے جب بھی اس سے پوچھا اس نے چپ سادھے رکھی۔ میں ان کے لیے نارمل فیلنگز رکھتی تھی۔ مجھے ان سے ہرگز جنونی محبت نہیں تھی۔ جس تعلق کے ساتھ وہ میری زندگی میں شامل ہوئے تھے وہ اہم تھا مگر ان کی حرکتیں ہرگز بھی برداشت کرنے والی نہیں تھیں۔ یہ ساری زندگی کا معاملہ تھا اور میں ساری عمر برباد کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ یہ فیض بھائی کی منگنی سے دو دن بعد کی بات تھی جب ان کے حوالے سے ایک اور خبر نے مجھے ٹھٹھکا کے رکھ دیا۔ ابو داؤد کا ایکسڈنٹ ہوا تھا اور وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے۔ میں ان سے جتنا بھی خفا سہی مگر اس خبر نے مجھے شدید ذہنی دھچکا پہنچایا تھا۔ ماما اور پاپا تو اطلاع ملتے ہی حواس باختہ سے ہاسپٹل کی جانب بھاگے تھے۔ چاروں بھائی بھی گھر پر نہیں تھے۔ پیچھے میں رہ گئی تھی۔ خدشات اور واہموں کے درمیان پریشان۔

منگنی کی اور اس سے اگلی رات بھی ابو داؤد مسلسل مجھ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ سوری کے کئی مسیج بھی تھے۔ مگر میں نے پٹ کر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہتی تھی مگر اب یہ سنجیدگی پریشانی اور تفکر میں ڈھل رہی تھی۔ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا ابو داؤد کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا گہرا تعلق اس تنازعہ سے ضرور بندھا ہوا ہے۔ آج صبح انہوں نے لاسٹ مسیج کیا تھا۔ جسے میں نے لا پرواہی سے دیکھا تھا۔

”حجاب اگر تم نہ مانیں تو میں زندگی سے روٹھ جاؤں گا۔ تمہارے بغیر میرے نزدیک زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مان جاؤ حجاب ورنہ پچھتاؤ گی۔“

اور تب میں نے سر جھٹک دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے انتظار سے تھک کر اس جنونی انسان نے ہمت ہار دی ہو۔ میرا دل ایک دم سے گھبرانے لگا۔ کچھ اور نہ سوچتا تو میں نے سیل فون پر ماما سے کانٹیکٹ کر لیا تھا۔

”آپ ہاسپٹل پہنچ گئیں ماما!“

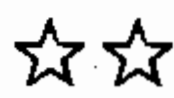
ہاں بیٹے! ان کا لہجہ سنا ہوا اور متورم تھا جو صورتحال کی گھمبیرتا کا گواہ تھا۔ میرا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔

”ابو داؤد کیسے ہیں؟“

مجھے بہت اچھی طرح اندازہ تھا میری آواز خدشات کی یلغار سے لرز رہی تھی۔

”بس دعا کرو بیٹے۔ آئی سی یو میں ہے ابھی تو۔“

ماما کی آواز مجھے بھگی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ جانے کیوں میری آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ زندگی کے احساس جوش اور امنگوں سے بھرپور وہ انسان جو میری نگاہوں کے سامنے رہا تھا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ پتا نہیں زندگی یہ بازی جیتی بھی ہے یا نہیں۔ میں بے دم سی ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ مجھ میں اتنی سکت باقی بچی ہی نہ تھی کہ ماما سے کچھ اور سوال کرتی۔ سیل فون میرے ہاتھ میں تھا اور آنسو قطرہ قطرہ میری آنکھوں سے گرتے جا رہے تھے۔ کیا میں ایک ایسے انسان کے لیے رو رہی تھی جو مجھے عزیز نہیں تھا۔ میں ایسے شخص کے لیے رو رہی تھی جو اپنی دیوانگی اور پاگل پن سمیت مجھے بے حد اپنا محسوس ہو رہا تھا۔



وہ ساری رات میں نے جاگ کر اور شدید اضطراب میں گزاری تھی۔ لمحہ لمحہ دعائیں میرے لبوں پر مچلتی رہی تھیں۔ میں اُس مالک دو جہاں کے حضور گڑ گڑاتی رہی تھی۔ ایک موقع کی خواہش مند ہوتی رہی تھی۔ بس ایک موقع پھر اس کے بعد میں ابو داؤد کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ جو اپنی محبت میں اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے کھونے کے تصور سے زندگی سے منہ موڑ رہا تھا۔ اگلی صبح بہت بوجھل تھی۔ فضا میں پرندوں کے نغمے بھی جیسے سہمے ہوئے تھے۔ میرا کالج جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ ساری رات جاگنے کی وجہ سے طبیعت مضطرب تھی۔ میں کمرے سے باہر آئی تو ماما کچن میں ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔ مگر ان کے انداز میں ہمیشہ والی

طمانیت مقصود تھی۔

”حجاب بیٹے ابوداؤد کو دیکھنے ہاسپٹل جاؤ گی؟“

ممانے مجھے دیکھ لیا تھا۔ آہستگی سے استفسار کیا۔ میں کچھ کہے بغیر سر جھکائے کھڑی رہی۔

”تم تیار ہو جانا عون کہہ رہا تھا تمہیں جانا چاہیے۔“

”کب جانا ہے؟“

میں بولی تو میرے حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکلی تھی۔ ممانے ہاتھ روک کر مجھے پٹ کر دیکھا۔ پھر

کچھ کہے بنا مجھے ساتھ لگا تھپکا تھا۔

”ریلیکس بیٹے! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میرا دل بہت گھبرا رہا ہے ماما! اگر کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔“

میں ان کے کاندھے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے پھپھک کر رو پڑی۔

خدا بہتر کرے گا میری جان! میں نے بہت دعائیں مانگی ہیں۔

وہ مجھے کتنی ہی دیر تھپک کر تسلی دیتی رہیں۔

یہ ٹرے لے جاؤ۔ اپنے بھائیوں کو ناشتے پہ بلاؤ خود بھی کچھ کھا لینا۔ اس کے بعد ہاسپٹل چلتے ہیں۔“

”مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا ماما پلیز!“

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے دل گیری سے جواب دیا تھا اسی پل عون بھائی کھنکھارتے ہوئے

اندر آ گئے۔

”اتنا پریشان نہیں ہوتے ہیں ہنی بیٹا! یونہی خدا اپنے بندوں کو ان کی برداشت سے بڑھ کر نہیں آزماتا!“

میں جواب میں کچھ کہے بنا پلکیں جھپک کر آنسو روکتی رہی۔

”چلو آؤ میں خود اپنے ہاتھ سے کھلاؤں پھر ہاسپٹل چلیں گے۔“

عون بھیا نے مجھے اپنی مہربانی آغوش میں سمیٹ لیا پھر وہ واقعی مجھے نوالے بنا کر کھلاتے رہے تھے۔

”بی بیو مائی لٹل ڈول!“

انہوں نے میرا سر تھپکا تھا مگر میرا ضبط ایک بار پھر چھلک گیا تھا۔

”وہ ٹھیک تو ہو جائیں گے نا بھائی!“

انشاء اللہ! انہوں نے یقین سے کہا تھا اور میرا گال سہلاتے اٹھ کر تیار ہونے چلے گئے تھے۔ ہم

ہاسپٹل پہنچے تو ہمارے لیے اچھی خبر تھی۔ ابوداؤد کو کچھ دیر پہلے ہی ہوش آئی تھی۔ میرا چہرہ ایک کھل اٹھا۔

”ہم مل سکتے ہیں؟“

عون بھیا کے استفسار پر ڈاکٹر نے کچھ دیویٹ کو کہا تھا۔ ماما مجھے ساتھ لیے کارڈور کے صوفے پر جا

بیٹھیں تقریباً پون گھنٹے کے بعد ہمیں ابوداؤد سے ملنے کی اجازت ملی تھی سب سے پہلے ماما پاپا اور عون بھیا اندر

گئے تھے۔ اس کے بعد میری باری آئی تھی۔

”آپ میرے ساتھ چلیے نا ماما!“

مجھے اکیلے اندر جاتے وہ بھی عون بھیا اور پپا کی موجودگی میں عجیب سی جھجک محسوس ہوئی تھی۔

”نہیں بیٹے آپ جاؤ اینڈ ریلیکس!“

انہوں نے نرمی سے میرا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا میں نے کترائے ہوئے انداز میں نگاہ اٹھائی۔ عون بھیا

لمبے ڈگ بھرتے راہداری کے موڑ پر غائب ہو گئے تھے۔ میں نے گہرا سانس کھینچا اور بو جھل قدموں سے ادھ کھلے

دروازے سے اندر چلی آئی۔ سامنے بیڈ پر ابوداؤد دراز تھے۔ سینے تک سفید چادر تانے۔ ان کی گردن اور کانڈھوں

کا جو حصہ چادر سے باہر تھا وہ سفید پیٹوں میں جکڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت ایک دم زرد ہو رہی تھی۔ یوں

جیسے جسم کا سارا لہو کھینچ کر نکال لیا گیا ہو۔ آنکھیں بند تھیں۔ ان کی حالت میرے ضبط کا کڑا امتحان ثابت ہوئی۔ منہ

پر ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی میں آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں سے وہیں کھڑی انہیں تکتی رہی۔ مجھ میں ہمت ہی نہیں

تھی کہ آگے بڑھتی اور انہیں مخاطب کر لیتی۔ جانے کتنی دیر یونہی جیتی تھی معاً ان کی کراہوں کی آواز پر میں چونکی۔ وہ

بے چینی کی کیفیت میں سر کو تکیے پر دائیں بائیں مار رہے تھے۔ میں تڑپ کر تیزی سے ان کی جانب لپکی۔

”ابوداؤد، داؤد آنکھیں کھولیں۔ میری طرف دیکھیں۔ یہ کیا حالت بنالی آپ نے۔؟“

ان کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر میں ان کے اوپر جھکی تھی۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور کچھ

دیر یونہی مجھے تکتے گئے۔ ان کی زندگی کے احساس سے دور آنکھوں میں شناسائی کا کوئی رنگ نہ پا کر میرے

آنسوؤں میں شدت آ گئی۔

”میں حجاب ہوں داؤد آپ کی حجاب! مجھے معاف کر دیں یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے نا؟“

گہرے کرب سے دو چار ہوتے میں زور زور سے رونے لگی۔

”حجاب!“ وہ کراہے اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

”تم مجھ سے خفا ہونا؟“

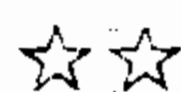
”نہیں بالکل بھی نہیں۔ آپ بس ٹھیک ہو جائیں۔“

میں نے سسکتے ہوئے انہیں یقین دلایا وہ کچھ دیر غیر یقینی سے مجھے تکتے رہے پھر شاید ممنوعیت کے

احساس سمیت میرے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔

”تھینکس اینڈ آئی لو یو فار ایور۔“

انہوں نے سرگوشی کی تھی۔ میں نے خفیف سی ہو کر آہستگی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔



پھر اس کے بعد جب تک ابوداؤد ہاسپٹل سے ڈسچارج نہیں ہو گئے۔ ماما مجھے باقاعدگی سے اپنے

ساتھ ان کی عیادت کے لیے لے جاتی رہی تھیں۔ ابوداؤد بہت تیزی سے امپروو کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ

خوشی مجھے ہی تھی۔ ان گزرے ہوئے چند دنوں میں میں ابوداؤد کے بہت تیزی سے نزدیک آئی تھی۔ ابوداؤد کا رویہ بھی بہت تسلی بخش تھا۔

”اس روز کیا ہوا تھا؟“

میں ابوداؤد کو سوپ پلا رہی تھی جب میں نے اچانک ان سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ مجھے ہر وقت پریشان رکھتی تھی۔ ذرا سی مزاج کے خلاف بات ہوئی اور اپنی جان کے درپے ہو گئے یہ تو کوئی بہادری یا انسانیت نہیں تھی۔

”کس روز؟“

وہ اچھے خاصے گم صم تھے۔ میری بات پر چونکے۔

”جس روز ایکسڈنٹ ہوا بلکہ آپ نے خود کیا۔ ابوداؤد آپ مجھے صرف یہ بتائیں آپ نے اتنا

خطرناک کام کیوں کیا؟“

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائے تھے پھر اپنی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر نکا دیں۔

”میں تمہیں کھو کر زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔“

ان کے لہجے میں وہی جنونی کیفیت تھی۔ میں جھنجھلا سی گئی۔

”میں کہیں نہیں کھوئی تھی۔ یہ دیکھیں یہ رنگ اسی بات کی علامت ہے کہ میں آپ کو سوپ دی گئی

ہوں۔“ میں نے اپنے انگلی سے سج ہاتھ کو ان کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔

تم کیا سمجھتی ہو حجاب میں صرف جسمانی طور تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں؟ ایسا نہیں ہے۔ میں

تمہاری محبت تمہارا اعتماد بھی چاہتا ہوں۔ جو تمہیں مجھ پر نہیں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

وہ ضبط کھو کر جیسے پھٹ پڑے تھے۔ میں نے جواباً سکون سے انہیں دیکھا اور سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”ہاں غلط کہہ رہے ہیں آپ۔“

انہیں شاید مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ ٹھٹھک کر ساکن نظروں سے مجھے تنکے لگے۔

ابوداؤد آپ غلط سمجھ رہے ہیں غلط کہہ رہے ہیں۔ اب مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں ہے کہ

میں بھی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ آپ کا یہ منہ زور جذبہ جو بے حد سرکشی لیے ہوئے آیا تھا۔ پھرے ہوئے

بے کراں سمندر کی طرح مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا ہے۔ میں نے اپنی بے نیازی، لائقیت، نسوانیت کے

وقار کے جو چھوٹے بڑے پتھر اس کا بہاؤ روکنے کو پھینکے تھے وہ حقیر کنکروں کی طرح اس کی شدت کے آگے دم

توڑ گئے۔ میں کسی طرح بھی خود کو آپ کی محبت سے محفوظ نہیں رکھ سکی۔“ میں اس اعتراف کے ساتھ بے تحاشا

آنسو بہاتی جا رہی تھی۔ ابوداؤد نے مجھے کتنی دیر خاموش نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر انگشت شہادت سے میرے غم

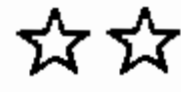
گال کو چھوا اور کسی قدر خفگی سے بولے تھے۔

”میں کیسے یقین کر لوں تمہارے یہ آنسو تمہاری بات کے منافی ہیں۔“

میں آہستگی سے مسکرا دی۔

”آنسو صرف دکھ کی علامت تو نہیں ہوتے ابوداؤد یہ خوشی کے موقع پر بھی بہتے ہیں۔ میں مشکور ہوں رب نے مجھے آپ کا ساتھ لوٹا دیا۔“

ابوداؤد مجھے کچھ دیر مشکوک نظروں سے تکتے رہے تھے پھر آہستگی سے مسکرا دیے۔ اس مسکراہٹ میں بھرپور آسودگی تھی۔



میں نے ابوداؤد کی بیماری کے دوران جو بات شدت سے نوٹ کی وہ عون بھیا کا اضطراب تھا۔ ان کا رویہ کبھی کبھار تو مجھے بہت الجھا دیا کرتا تھا۔ میں نے اکثر یہ بات محسوس کی تھی بھیا کو میرا ابوداؤد سے ملنا پسند نہیں ہے۔ وہ بہت روشن خیال تھے اور کبھی انہوں نے بے جا پابندیاں بھی عائد نہیں کی تھیں۔ پھر ابوداؤد والا پروپوزل بھی انہی کی سو فیصد مرضی اور ایما پر قبول کیا گیا تھا۔ ابوداؤد عون بھیا کے ہی کلوز فرینڈ تھے۔ اس کے باوجود بھیا کا رویہ الجھا رہا تھا۔ جس روز ابوداؤد سچا رچ ہوئے بھیا نے مما سے صاف لفظوں میں کہا تھا۔

”آپ اگر داؤد کے ہاں اس کی عیادت کو جائیں تو حجاب کو لے جانے کی ضرورت نہیں۔ مناسب نہیں لگتا۔“ اور ممانے پتا نہیں کس حد تک دھیان دیا تھا مگر میں کچھ خائف ہو گئی تھی۔ یہ بھیا کا ہی آرڈر تھا کہ اس کے بعد ممانے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا نہیں کہا تھا۔ میری بس فون پر ہی داؤد سے بات ہو رہی تھی۔ ابوداؤد مجھ سے ملنے کو بے چین تھے۔ رات پھر فون پر انہوں نے اصرار کیا تھا۔

”تم آتی کیوں نہیں ہو حجاب!“

”آؤں گی نا۔ کچھ پڑھائی میں بڑی ہوں۔“

میں نے بہانہ تراشا تھا۔ مگر انہیں بہانا آسان نہیں تھا۔

”پڑھائی مجھ سے اہم ہے کیا؟“

”ایسی بات نہیں ہے ابوداؤد میں آؤں گی ریلیکس!“

”کسی نے منع تو نہیں کیا؟“ وہ جیسے چونکے تھے اور میں بے حد محتاط ہو گئی۔

”ایسا کون کرے گا بھلا؟ عون بھیا اور ممانے مجھے خود آپ کے پاس لاتے رہے ہیں۔“

”ہاں ہے تو۔“ ان کی آواز میں الجھن نمایاں تھی۔ پھر یہ ان کا اصرار ہی تھا کہ میں اگلے روز کالج

سے کلاس چھوڑ کر ان سے ملنے چلی آئی تھی۔ پہلے تو مجھے اپنے روبرو پا کے انہیں جیسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا

تھا۔ پھر وہ خوشی اور مسرت سے بے قابو ہو کر ایک دم اٹھ بیٹھے تھے۔ مگر ایسا کرنے پر ان کے چہرے پر تکلیف

کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے تیزی سے بڑھ کر انہیں شانوں سے تھام لیا تھا۔

”کیا کرتے ہیں ابوداؤد! آپ کے زخم ابھی کچے ہیں۔“

”مجھے یقین تو کرنے دو حجاب کہ تم از خود چل کر میرے پاس آئی ہو۔“

وہ کراہ کر بولے میں نے نم ناک آنکھوں سے انہیں دیکھا اور ان کے کاندھوں پر دباؤ ڈالا اور انہیں پھر سے تکیوں کے سہارے واپس لٹا دیا۔ وہ مسلسل مجھ پر نگاہیں نوکس کیے ہوئے تھے۔ ان نگاہوں میں ایک ناقابل فہم کیفیت تھی۔

”تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی نا؟“

میں آہستگی اور نرمی سے مسکرا دی۔

”میں آپ کے پاس ہوں۔“

”یہاں میرے قریب آؤ حجاب!“

انہوں نے اپنے پہلو میں اشارہ کیا میں جھجک سی گئی۔

”ابوداؤد میں یہاں ٹھیک ہوں۔ آپ کے سامنے ہوں نا۔“

”تمہیں اب بھی مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔“ وہ پھر سے کچھ وحشت زدہ سے چیخے میں بوکھلا اٹھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے ابوداؤد لیکن مذہب نے کچھ حد بندیاں بھی مقرر کی ہیں نا۔“

”تو پھر ہم شادی کر لیتے ہیں ابھی اسی وقت۔“

وہ ابھی بھی اس کیفیت کے حصار میں تھے جو مجھے خوفزدہ کر دیا کرتی تھی۔

”ابوداؤد شادی تو ہماری ہونی ہی ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔“

”کب.....؟ شاید عون ایسا کبھی نہ چاہے۔“ ان کی وحشت بڑھنے لگی۔

”آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں ابوداؤد۔“ میں زچ ہوئی تھی۔ پھر نرمی سے ان کا ہاتھ دبایا۔

”بھائی کے نزدیک میری خوشی اہم ہے۔“

”کیا میں تمہاری خوشی ہوں؟“ وہ کسی ننھے بچے کی طرح خوفزدہ تھے۔ میں بے ساختہ مسکرا دی۔

”آپ کو ابھی بھی شک ہے؟“

انہوں نے کچھ دیر جھانچتی پرکھتی نظروں سے مجھے دیکھا پھر جانے کیا ہوا اپنے ہاتھ میں پکڑے

میرے ہاتھ کو انہوں نے اچانک جھٹکا دیا تھا اور مجھے اپنے پہلو میں کھینچ لیا۔ میرے لیے یہ حملہ غیر متوقع اور شدید

تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں مقید کر لیا تھا۔ یہ حلقہ مجھ کو نہ گرفت

نہیں کھلا سکتا تھا۔ وہ مجھے بہت نرمی سے خوشی اور والہانہ جوش سے چھو رہے تھے۔

”مجھے لگ رہا ہے حجاب آج میں سرخرو ہو گیا ہوں۔ آج میں نے تمہارے دل کو فتح کر لیا ہے یہ کوئی

”ممولی کامیابی تو نہیں ہے نا۔“

میں نے گہرا سانس کھینچا اور ان کے حصار سے نکلنا چاہا مگر وہ حصار تو ریشمی الجھاؤ تھا جو سلجھانے کی

لوشش میں مزید گہرا مزید گھمبیر ہو رہا تھا میں شپٹانے لگی۔

”تمہیں پتا ہے حجاب میں کبھی دوست نہیں بنا پایا۔ مجھے ایسے دوست کی ضرورت تھی جو مجھے سمجھ سکے

اتنا قریب ہو کہ میں بارش میں چل رہا ہوں۔ میرا چہرہ پانی سے تر ہو مگر وہ میرے آنسوؤں کو پہچان لے۔ میرے مسکراتے چہرے کی آڑ میں چھپے غم کو پہچان لے۔ میری خاموشی کے پیچھے بولتے لفظوں کو سن سکے۔ میرے غصے میں چھپی میری محبت کو دریافت کر سکے۔ میں خوش ہوں حجاب مجھے ایسا دوست مل گیا مجھے تم مل گئیں۔“

وہ ایک بار پھر حواسوں میں نہیں تھے۔ ایک بار پھر وہ مجھے بے بس کر چکے تھے۔ میں اتنا گھبرا گئی تھی کہ مجھے قطعی سمجھ نہیں آ سکی میں اس موقع پر کیا کروں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بہتر کر پاتی وہ ہوا تھا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔ مگر جب یکے بعد دیگرے فلش لائٹ چمکی اور کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تب میں تڑپ کر ابوداؤد سے الگ ہوئی تھی۔ ابوداؤد خود چونک اٹھے تھے۔ مگر مجھے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ولید بھائی ہاتھ میں کیمرے کی بڑی مکاری سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

”ویری نائس! امیزنگ! مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ میں یہاں عیادت کو آؤں گا تو ایسی انٹرٹینمنٹ سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملے گا۔ ویل ڈن!“

وہ طنزیہ کاٹ دار لہجے میں ایک ایک لفظ چبا کر بول رہے تھے۔ آنکھوں سے جیسے شعلے لپک رہے تھے۔

”سٹ آپ! یہاں کیسے آئے ہو؟“

ابوداؤد سنبھل کر پوری قوت سے دھاڑے مگر ولید بھائی خائف نہیں ہوئے تھے۔

”ہمارا تعارف تو یہ حجاب بی بی کروائیں گی۔ اگر یہ اب مجھے پہچاننے سے انکاری نہ ہو جائیں۔

ویسے کیسے کیسے معصوم چہروں سے نقاب اتر رہے ہیں خدا معاف کرے۔“

ولید بھائی کے لہجے میں حقارت تھی۔ میں ہنوز سکتے کی کیفیت میں تھی۔ ولید بھائی میرے سیکنڈ

کزن تھے۔ ابوداؤد سے پہلے ان کے ہاں سے میرا پروپوزل آچکا تھا مگر پاپا نے انکار کر دیا تھا۔ مگر اس وقت

جس قسم کی آکورد سچو پیشن تھی وہ مجھے زمین میں گڑھتے پر اکسار ہی تھی۔

”معاف کیجیے گا۔ آپ کی اجازت کے بغیر یہ پکچر لے لیں۔ میں تو اپنے بھتیجے کی برتھ ڈے

سلیبریٹ کرنے کے لیے کیمرے میں ریل ڈلوا کر لے جا رہا تھا مگر اندازہ نہیں تھا اتنے حسین اور یادگار لمحے بھی محفوظ کرنے کا موقع میسر آ جائے گا۔“

وہ خباثت سے بولے تھے اور پلٹ کر جانے لگے مگر ابوداؤد نے بہ مشکل اٹھتے ہوئے ان کی شرٹ

کا کالر پیچھے سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا تھا۔

”کیمرہ یہاں رکھ دو۔ ان کا انداز خطرناک تھا۔“ میں پھٹی پھٹی آنکھیں لیے ساکت بیٹھی تھی۔

”یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ بات بھول جاؤ ہیرو کہ تم یہ معرکہ بھی جیت لو گے۔ میرے اٹھے

ہوئے چند ہاتھ تمہیں لہو لہان کر دیں گے۔ اپنی پھٹے ہوئے حالت کو مت بھولو۔“

وہ پھنکار کر بولے تھے۔ ابوداؤد کا ہاتھ گھوما اور ولید کے چہرے پر جا پڑا اس کے اگلے چند لمحے بے

حد سنسنی خیز تھے۔ ابوداؤد اور ولید بھائی کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا تھا پلڑا ولید بھائی کا بھاری رہا ابوداؤد

مخروج سی حالت میں چند لمحوں میں بانپ رہے تھے۔ جبکہ ولید بھائی فاتحانہ اور جتاتی نظروں سے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دیتے کیمرے سمیت جا چکے تھے۔ میرا رنگ فق تھا اور حالت ایسی تھی کہ کسی بھی پل غش کھا کر گر جاتی۔ ابو داؤد نے متا۔ غانہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں بے ساختہ سسک اُٹھی۔

”یہ اچھا نہیں ہوا ہے ابو داؤد! بالکل بھی اچھا نہیں ہوا۔“

”آئی ایم سوری! میں کچھ نہیں کر سکا میں زخمی تھا حجاب!“

وہ بے حد خفت زدہ نظر آنے لگے مگر اس پل وہ اپنی تکلیف کو بھی جیسے فراموش کر چکے تھے۔

”آپ نے کسی ملازم کو بھی نہیں پکارا۔ کم از کم وہ فضول تصویریں تصویریں تو ساتھ نہ لے جاتے۔“

مجھے اس پل جیسے کوئی کند چھری سے ذبح کرتا تو اتنی تکلیف نہ ہوتی جو اس احساس سے مل رہی تھی۔

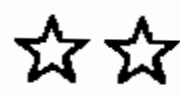
”سہارے ملازموں کو احتیاطاً تمہاری وجہ سے میں نے سرونٹ کو ارٹرز میں بھیج دیا تھا۔“

ان کی وضاحت کو میں دھیان سے نہیں سن سکی۔ خوف نے میرے اندر پنچے گاڑھنے شروع کر دیے۔

جو کچھ ہوا تھا وہ بے حد غلط تھا مگر جو اس کا نتیجہ برآمد ہونا تھا وہ اس سے کہیں بڑھ کر شدید ہوتا اس کے بعد

میں وہاں ٹھہر نہیں سکی تھی۔ ابو داؤد نے مجھے تسلیاں دلا سے دیے تھے مگر یہ تسلیاں میرے اندر در آنے والے

خوف کو ختم نہیں کر سکی تھیں۔



اگلے تین چار دن خیریت سے گزرے تھے مگر حقیقتاً خوفزدہ کرنے والے۔ ولی بھائی کی فطرت سے

میں خوب آگاہ تھی وہ کبھی کمینگی دکھانے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ رشتہ نہ ملنے پر پہلے ہی جلے بیٹھے تھے اب تو

انہیں بہت اچھا موقع ملا تھا مجھ سے بدلا لینے کا۔ ہر پل میرا جیسے کانٹوں پر بسر ہو رہا تھا۔ ابو داؤد کی جذباتیت اور

جلد بازی نے ہمیشہ مجھے ڈسٹرب ہی کیا تھا۔ اور غلط کام کے ہمیشہ غلط نالٹ ہی نکلا کرتے ہیں۔ میری غلطی تھی

کہ میں ان سے ملنے چلی گئی تھی۔ ابو داؤد نے بھی پچھلے کئی دنوں سے مجھ سے۔ انہیں کیا تھا میں خود بھی ایسا نہیں

ہا رہی تھی۔ مگر ان سے معلوم بھی کرنا تھا کہ اس مسئلے کا حل کیا نکالا ہے۔ میں نے سوپ فون پر بات کر لوں۔ مگر

پھر پیٹ میں ہونے والی شدید ایتھنٹھیں نے مجھے بتایا میں پچھلے کئی دنوں سے کھانے پینے سے غفلت برت رہی

ہوں۔ اس مسئلے میں الجھ کر میں بہت اہم کام بھول چکی تھی۔ فون کا کام بعد پرٹا لیتے ہوئے میں کچن میں آ گئی۔

اس پل رات نصف کے قریب تھی۔ کھانا ہم نوبے کھایا کرتے تھے مگر آج بھی میں نے کھانے کو صرف سونگھا اور

لموٹا تھا۔ بھائیوں سمیت مہما پیا بھی اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ زبیدہ اپنے کوارٹر جا چکی تھی۔ میں بنا آہٹ

کے کچن میں آ گئی۔ میں نے چائے کا پانی رکھ کر فریج کھولی۔ شامی کباب اور بریانی نکال کر اوون میں گرم

ہونے کو رکھنے کے بعد میں نے فریج سے پیسی کاٹن پیک اور سلاد کے ساتھ راستہ بھی نکال لیا تھا۔ جب تک میں

نے کھانا کھایا چائے تیار ہو چکی تھی۔ چائے چھان کر مگ میں نکالنے کے بعد میں نے برتن سمیٹ کے یونہی رکھ

دیے۔ کمرے میں آ کر پہلے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا پھر سیل فون اٹھا کر ابو داؤد کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ نمبر آف تھا۔

میں پریشان ہو گئی۔ متعدد بار بار رڑائی کے باوجود ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو میں ایک دم روہانسی ہو گئی۔ اس رات میں ایک بار پھر نہیں سو سکی تھی۔ اگلے دن بھی گاہے بگاہے ابوداؤد سے رابطہ کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ اب مجھے وہ ہری فکر لاحق ہو گئی تھی۔ وہ خیریت سے ہوں۔ ماما سے پوچھنے میں حجاب مانع تھا۔ میں نے اگلے دن ان کے ہاں جانے کا ایک بار پھر قصد کر لیا تھا۔ یہ جانے بنا یہ سوچے بنا کہ میں ایک بار پھر ایک غلط حرکت کرنے والی ہوں۔

☆☆

اگلے روز میں پھر نہیں جا سکی تھی۔ میرا ارادہ کالج سے واپسی پر جانے کا تھا مگر بالکل غیر متوقع طور پر غون بھیا نے کالج سے واپسی پر مجھے پک کر لیا۔

”کیا بات ہے حجاب! تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“

”میں واقعی پریشان ہو گئی تھی پروگرام چوٹ ہو جانے پر مگر اس بل غون بھیا کے استفسار نے مجھے گڑبڑا کے رکھ دیا۔“

”نہیں بھائی ایسا تو کچھ نہیں۔“

میں نے گہرا سانس بھر کے ان کی تسلی کرانا چاہی مگر شاید کر نہیں پائی تھی۔ انہوں نے مجھے کچھ دیر بغور دیکھا تھا پھر نا صحانہ انداز میں گویا ہوئے تھے۔

”ہنی بیٹا میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ لڑکیوں کی عزت آنگینوں کی طرح سے نازک ہوتی ہے۔ ذرا سی احتیاطی سے اگر تھیں پہنچ جائے تو پھر کوشش کے باوجود دارڑیں بھرا نہیں کرتیں۔“

میں ایک دم ساکن رہ گئی۔ میں نے محتاط مگر ڈرتی ہوئی نظروں کو اٹھایا تھا۔

”واٹ ہپنڈ بھائی! مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔“

ان کی بے حد اور گہری سنجیدگی مجھے ہولانے کے لیے کافی تھی۔ مجھے لگا میرا خون خشک ہو گیا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ ڈونٹ وری میں بس تمہیں ایک بات سمجھا رہا تھا۔ اس کے باوجود کہ میں جانتا ہوں میری گڑیا بہت سمجھ دار ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ ہنی مجھے یہ بھی پتا ہے آپ جانتی ہیں کہ آپ ہمارا یہ فخر ہمیشہ قائم رکھیں گی۔“

میرا دل جیسے حلق میں آکر دھڑکنے لگا۔ مجھے لگا جیسے کچھ نہ کچھ لازماً بھٹک بھیا کو پڑ گئی ہے۔ میری رنگت لمحہ بہ لمحہ پھسکی پڑتی جا رہی تھی۔ مجھ سے جواب میں ایک لفظ نہیں بولا گیا۔ بس بہت سارا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ یہ کیفیت مجھ پر اگلے کئی گھنٹوں تک اپنا تسلط جمائے رہی تھی۔ یہ چوتھی رات تھی جب میں بستر کی بجائے ایک بار پھر کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ میری آنکھیں میرا پورا وجود جل رہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے سیل فون اٹھایا تھا اور ایک بار پھر ابوداؤد کا نمبر رڑائی کیا۔

ہیلو!

دوسری سے تیسری کوشش کے بعد رابطہ بحال ہو گیا تھا۔ ابوداؤد کی بے زار اور بے انتہا بوجھل آواز

میری سماعتوں میں اتری تو میں کچھ اور بھی بے کل ہوا اُٹھی۔

”ابوداؤد کہاں تھے آپ؟ کل سارا دن میں آپ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔“

”یہ زحمت کیوں کر رہی تھیں آپ؟“

جواباً ان کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔ میں جیسے چکرا کر رہ گئی۔

”ابوداؤد کیا کہہ رہے ہیں؟“ مجھے بے ساختہ رونا آنے لگا۔

چار دنوں سے بستر پر سڑ رہا ہوں۔ بھوکا پیاسا۔ مجھے تو سینس نہیں اس حالت میں کسی سے کیسے بات کرتے ہیں؟ تم کیسے چھوڑ کر گئیں تھیں مجھے۔ کہ کڑ کے تو نہیں لگا رہا تھا میں۔

وہ جیسے پھٹ پڑے تھے۔ مجھے کچھ اور شدت سے رونا آنے لگا۔

”آئی ایم ساری! آپ مجھے بتا دیتے۔“ میں منمنائی۔

”مانگ کر حاصل کی جانے والی ہر شے سے نفرت ہے مجھے۔“

ان کا لہجہ ہنوز شدید تھا۔ میں منہ پر ہاتھ رکھ کے سسکیاں دبانے لگی۔ ہم دونوں کے بیچ تکلیف دہ خاموشی سانس لیتی رہی۔ پھر شاید انہیں اپنی بدسلوکی کا احساس ہوا تھا۔

”آئی ایم ساری حجاب ریٹلی ویری سوری! اکیچوئلی میں ڈسٹرب تھا۔“

”اٹس اوکے۔“ میں نے اپنے آنسو پونچھے۔

”میں بہت تنہا ہوں حجاب“ بہت اکیلا ”مجھے تمہاری ضرورت ہے پلیز آ جاؤ۔“

ان کے بکھرے ہوئے لہجے میں التجا دم توڑ رہی تھی۔ میں بے طرح تڑپ اُٹھی۔

”اس وقت میں کیسے آسکتی ہوں داؤد! آپ پلیز کسی ملازم کو بلائیں اپنے پاس! کچھ کھایا آپ نے؟“

”مجھے کسی اور کی نہیں تمہاری ضرورت ہے حجاب اگر تم سمجھو تو۔“

وہ کسی قدر لجاجت سے بولے تھے۔

”میں کل آنے کی کوشش کروں گی ابوداؤد پلیز ابھی کسی ملازم کو اپنے پاس بلائیں۔“ بلکہ بہتر ہوگا

اپ کاؤں سے آپایا پھر اماں کو یہاں آنے کا کہیں۔“

چند مزید ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے فون رکھا تو ابوداؤد کا بجھا ہوا انداز میری خلش اور

پہاؤ کو بڑھاوا دے چکا تھا۔ اگلے روز میں تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر آئی تو میں نہ صرف مضطرب تھی بلکہ سست

امی اور ہی تھی۔ شاید جی بھی فیض بھیا کے علاوہ عیسیٰ بھائی اور ممانے بھی میری طبیعت کا پوچھا تھا۔ میں نیند نہ آنے

کا بہانہ کر کے ٹال گئی تھی۔ مگر عون بھیا کی خاموش جائزہ لیتی نظریں میرے لیے بہت تکلیف دہ تھیں۔ میرے

پہ ان کے سامنے بیٹھنا اور خود کو کمپوز ڈرکھنا از حد دشوار تھا۔ عیسیٰ بھائی اپنے کلینک جاتے ہوئے مجھے کالج

پر لے کر گئے تھے۔ آج میرا ارادہ کالج جانے کا نہیں تھا۔ میں نے اچھی طرح سے چہرہ ڈھانپا اور تیز قدموں

پر ہلتی روڈ پر آگے نکل گئی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا انسان جب پہلی مرتبہ گناہ کرتا ہے تو خوف اور شرمندگی ایک

ساتھ دامن گیر ہوتی ہے۔ مگر جب دوسری بار اسی گناہ کا ارتکاب ہو تو پھر وہ احساس کمزور ہو جاتا ہے تیسری اور چوتھی مرتبہ کے بعد یہ خلش بھی برقرار نہیں رہتی۔ شیطان کا وعدہ ہے کہ وہ غلط راستوں کو اتنا آراستہ پیراستہ کر کے دکھاتا ہے کہ صرف یہی دلکشی قائم رہ جاتی ہے۔ باقی ہر احساس اپنا ہاتھ چھڑالے جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ گھر والوں کی عزت، بھائیوں کا ملن۔ خدا کے قوانین، مذہب کی حدود میں سب کچھ پھلانگتی جا رہی تھی۔ ایک ذرا سی دنیاوی لذت کی غرض سے، اس کے بعد میرے ساتھ جو بھی غلط ہوتا وہ میرا اپنا بھگتان ہوتا تھا۔

میں ابو داؤد کی رہائش گاہ پر پہنچی تو موسم ایک بار پھر پلٹا کھا چکا تھا۔ سرد ہوا میں اور آسمان پر جھومتی کالی گھٹائیں مجھے ایک بیتی ہوئی تلخ یاد کا فسانہ سنار ہی تھیں مگر میرے قدم نہیں رکے تھے۔ رکشہ ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنے کے بعد میں چادر اور بیگ سنبھالے نیچے اتر گئی۔ گیٹ پر الرٹ باوردی ملازم موجود تھا۔ میرے تعارف کروانے پر باچھیں چیر کر بولا۔

”بی بی صاحبہ ام آپ کو جانتی۔ صاحب اپنے روم میں آپ کی ہی منتظر“

میں نے سرکوا ثبات میں ہلایا اور مضبوط قدموں سے چلتی ابو داؤد کے بیڈ روم کی جانب آگئی۔ اندر داخل ہونے سے قبل میں نے خود کو کمپوز کیا تھا۔ پھر پہلے ہلکے سے دروازے کو ناک کیا پھر ناب گھما کر دروازہ اوپن کرتی اندر داخل ہو گئی۔ بیڈ روم ہلکی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہازی سائز بیڈ پر ابو داؤد کا تنومند سراپا ٹیبل لیپ کی روشنی میں دراز دکھائی دے رہا تھا۔ اس غضب کی سردی میں بھی وہ بنا شرٹ کے صرف جینز میں ملبوس تھے۔ میں جھجک کر وہیں تھم گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس درجہ بے تکلفانہ انداز میں میرے روبرو تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ آہستگی سے اٹھ بیٹھے۔

”آؤ حجاب رک کیوں گئیں؟“

میں ایک قدم ہی بڑھا سکی۔ میں گریزاں تھی چاہتی تھی وہ شرٹ پہن لیں۔ مگر ابو داؤد کو شاید اس بات کا خیال نہیں آیا تھا۔

”تم واقعی آگئی ہونا۔ آئی کانت بلیواٹ۔ میں تمہیں چھو کر خود کو یقین دلا سکتا ہوں؟“

انتہائی شوخ لہجہ بشارت سے بھرپور تھا۔ میں جوان کی بیماری کا سن کر کچے دھاگوں سے بندھی کھینچی آئی تھی چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ ان کی نیم خوابناک آنکھیں تمام تر گہرائی لیے مجھ پر ہی مرکوز تھیں۔ میری پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔

”آپ تو کہہ رہے تھے آپ بیمار ہیں؟“

میں اب کچھ کھسیاہٹ کا شکار ہو چکی تھی۔

”آئی تھینک اگر میں یہ نہ کہتا تو آپ کبھی تشریف نہ لاتیں۔ اور پھر وہ کیا خوب کہا گیا ہے کہ:-

ان کے آجانے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کچھ ایسی ہی بات ہے محترمہ! ویسے مجھے چھو کر دیکھیں بیمار تو ابھی تک ہوں۔
انہوں نے کسی قدر شوخی سے کہتے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ مجھے ان کی قربت سے بے
تھاشا حیا آنے لگی۔ میں سخت جزبز ہو گئی تھی۔

”آپ شرٹ تو پہنیں نا داؤد۔“

میں واقعی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ وہ پہلے چوٹے پھر بے ساختہ ہنستے چلے گئے۔
”عجیب لڑکی ہو یا لڑکیاں میری اس باڈی پر مرتی ہیں۔ بہانے بہانے مجھے چھوتی ہیں اور تم.....؟“
وہ جیسے متاسفانہ انداز میں سر جھٹک رہے تھے۔ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔
مجھے ایسی لڑکیوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا تھا۔
”لیکن یا رتم میری ہونے والی بیوی بھی تو ہو۔“

”ہونے والی ہوں نا۔ ہوں تو نہیں۔ آپ اس بات کو تو سمجھیں۔“ مجھے جھنجھلاہٹ نے آن لیا۔
”میں سمجھ سکتا ہوں مگر جو میڈیسن میں نے لی ہیں وہ بہت ہائی پوٹنسی کی تھیں میرا دل گھبرا رہا تھا جی
شرٹ اتاری تھی۔ ابھی بھی دیکھو میرا دل اپنی رفتار سے کہیں بڑھ کر تیزی سے دھڑک رہا ہے۔“
انہوں نے اپنی بات کے اختتام پر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ مجھے جیسے ہزار و لیج کا کرنٹ
اکٹھا۔ یہ حرکت مجھے طیش سے پاگل کر گئی تھی۔ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر میں سرعت سے اٹھی تھی۔ مگر میری
پاش کا میا بی سے ہمکنار نہیں ہو سکی۔ ابو داؤد نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
”کیا ہوا.....؟“

”کیا ہوا؟ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ آپ کو خود کچھ بھی پتا نہیں ہے داؤد۔ مجھے یہ بے تکلفی یہ
ٹیلری ہرگز ہرگز پسند نہیں ہے سمجھے آپ۔“

میرا پارہ چڑھ گیا تھا اور میں پھٹ پڑی تھی۔ ابو داؤد نے مجھے جواباً سرد نظروں سے دیکھا تھا پھر
اُٹ کر بولے تھے۔

”کونسی بدتمیزی کی میں نے۔ تم بدتمیزی کا مطلب جانتی ہو؟“

ان کا لہجہ بے حد گستاخ تھا ان کی نظریں اتنی قہر بھری اور غلیظ تھیں کہ میں یلکھت حیرت اور صدمے
مگن ہونے لگی۔

”بدتمیزی دست درازی کو کہتے ہیں۔ جو میں نے ابھی تک تم سے نہیں کی۔ بدتمیزی کے اور بھی کئی
طالع ہیں جو میں ابھی تم پر ظاہر کر سکتا ہوں۔ تم جیسی لڑکی پر جو اپنے گھر والوں کو دھوکہ دے کر اپنے نفس کی
لحظ کی خاطر یہاں آتی ہے۔“

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میری چادر کھینچی تھی اور گول مول کر کے دور کونے میں پھینک دی۔ مجھ پر
ال ہواب پھینک دیتا تو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ مجھے کوئی بھڑکتے الاؤ میں پھینک دیتا تو شاید میں احتجاج نہ

کرتی مگر یہ داؤد کے الفاظ تھے۔ اتنی توہین، اتنی سبکی، ایسی بے مائیگی۔ شاید میرے غلط راہ پر پڑے ہوئے قدموں کی سزا یہی ہونی چاہیے تھی۔ میں بڑی طرح کانپ رہی تھی۔ میری چھلکتی آنکھوں میں ان کا سراپا دھندلا گیا تھا۔ مجھے لگا تھا میری ٹانگیں میرے وجود کا پورا بوجھ نہیں سہا سکیں گی۔ میں لڑکھڑائی تھی اس سے پہلے کہ گر جاتی ابو داؤد نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ میرے اندر غضب کی مزاحمت ابھری مگر میری ساری صلاحیتیں بے کار ہو چکی تھیں۔ میں نے غم سے ڈوبتی نگاہوں کے ساتھ انہیں دیکھا تھا اور کرب سے آنکھیں موند لیں تھیں۔ انہوں نے شاید کچھ کہا تھا۔ مگر میری ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں سمجھ پاتی۔ میں نیم وا آنکھوں بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ بے بسی کی شدت سمیت یلکھت میں ان کے بازوؤں میں سمٹی کھڑی تھی۔ معاً کچھ ناگوار شور اُبھرا۔ میں نے ابو داؤد کو چوکلتے دیکھا پھر وہ ٹھٹھک گئے تھے۔

”اسے چھوڑ دو ابو داؤد اور خود پیچھے ہٹ جاؤ۔“

مجھے ذہن پر زور ڈالنا پڑا یاد کرنے کو کہ یہ آواز کس کی تھی۔

”اوہ تم! اچھا ہوا آگئے۔ دیکھو تمہاری سسٹر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ حالانکہ یہ میری عیادت کو آئی تھی۔ ابو داؤد کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ میرے حواس سلب ہونے لگے۔ میں نے ان کی بانہوں سے نکلنے کی موہوم سی مزاحمت کی تھی۔“

”مجھے شک تھا تم پر۔ تم اتنے گھٹیا ہو گے مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔“

اگلے لمحے وہ ابو داؤد پر جھپٹے تھے اور مجھے جارحانہ انداز میں اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ میری پہلے تو جو حالت تھی سو تھی۔ اب مرے ہوئے پردوروں والی بات ہو گئی تھی۔ جس آکورد پوزیشن میں دیکھا تھا بھائی نے مجھے اس کے بعد میں شاید مر کے بھی ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ ابو داؤد اور بھیا اب ایک دوسرے کے مقابل تھے اور پھرے ہوئے سائندوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کو تیار میں سہمی ہوئی چڑیا کی طرح ایک کونے میں دبک گئی تھی۔

”میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ حرام زادے! تمہاری دشمنی مجھ سے تھی۔ میرے گھر کی عزت کی طرف نظر اٹھانے کی جرأت کیسے کی تم نے؟“

بھیا نے کف اڑاتے ہوئے للکارا تھا ان کا چہرہ شدت غضب سے سیاہ پڑ رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ میرے جیسے گم شدہ حواس بحال ہو اٹھے مجھے لگا تھا اگر ان دونوں کو روکا نہ گیا تو شاید وہ ایک دوسرے کو مار مار کر ختم کر دیں گے۔

”بٹ جائیں بھیا! چھوڑ دیں پلیز چھوڑ دیں۔“

میں اُٹھ کر لڑکھڑاتی ہوئی بھیا کی جانب گئی تھی اور انہیں پکڑ کر الگ کرنے کی ایک بے ضرری کوشش کی۔ انہیں تو باز نہیں رکھ سکی البتہ بھیا کے طیش کو مزید ہوا ضرور دے دی۔ ایک ہاتھ سے داؤد کو پیچھے پٹخنے کے بعد انہوں نے دوسرے ہاتھ سے گھما کر مجھے طمانچہ رسید کیا تھا۔

”دفع ہو جاؤ تم اپنی شکل لے کر۔ تمہاری وجہ سے محض تمہاری وجہ سے آج یہ دو نکلے کا انسان ہمیں ذلیل کر رہا ہے۔“

عون بھی یقیناً اپنے آپے میں نہیں تھے۔ ان کا یہ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ میں کسی بے جان چیز کی طرح دیوار سے جا ٹکرائی۔ میرے سر کے پچھلے حصے اور ناک کے ساتھ ہونٹوں سے ایک ساتھ خون بہہ نکلا تھا۔ ابو داؤد جو خود بھی بھیا کے طیش اور مارشل آرٹ کے فن کا نشانہ بن رہے تھے مگر مجھے اس طرح گرتے دیکھ کر ایک کر میری جانب آئے تھے۔

”حجاب! آریو او کے؟“

انہوں نے جھک کر مجھے سنبھالنا چاہا مگر اس سے پہلے عون بھیا نے کسی غفرت کی طرح انہیں بالوں سے دبوج کر مجھ سے دور کھینچ لیا تھا۔

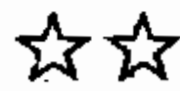
”خبردار اپنے ناپاک ہاتھ میری بہن سے دور رکھنا سمجھے؟“

وہ زور سے چلائے تھے اور ایک زوردار گھونسا داؤد کو ایک بار پھر اپنے چہرے پر کھانا پڑا۔ ایک لمحے کے اندر داؤد کا چہرہ البولہان ہو گیا تھا۔ یہ شور اور چیخ و پکار سن کر ملازم اور واچ مین وہاں آ گئے تھے۔ اور بدو اس اپنے مالک کو پٹا دیکھ رہے تھے۔ معاواچ مین کے حواس بحال ہوئے اور اس نے عون بھیا پر گن تان لی۔

خو ظالم کی بچی! چھوڑ دو امارے صیب کو ورنہ ام گولی چلا کر یہیں ڈھیر کر دے گی تم کو۔ پٹھان واچ مین کے ارادے خطرناک تھے مگر بھیا کو جیسے پرواہ ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ایک زوردار ٹھوکر ابو داؤد کو رسید کی اور نفرت سے ہونٹ سکڑ کر بولے تھے۔

”میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر ہمیشہ کے لیے۔ میرا وہ اعتماد جو میں نے تم پر کیا وہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ آج کے بعد میں تمہاری شکل نہ دیکھوں۔“

انہوں نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ کی انگلی سے انگلی جمنٹ رنگ کھینچی اور ابو داؤد کے منہ پر مارتے مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے باہر نکلتے چلے گئے تھے۔ شاید یہ قصہ آج یہیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔



خواب مرتے نہیں

خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو

ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے

جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے

خواب مرتے نہیں

خواب تو خواب ہیں روشنی نوا ہیں ہوا ہیں

جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں

ظلم کے دوزخوں سے بھی بچ سکتے ہیں
روشنی اور نور اور ہوا کے ظلم
مستقلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے ہیں

خواب تو نور ہیں

خواب سقراط ہیں

خواب منصور ہیں

اس کے بعد زندگی میرے لیے بہت مختلف اور تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ بھیا نے میرے خلاف جو ایکشن لیا تھا۔ وہ شدید تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے مجھے کالج سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد میرے گھر سے نکلنے اور ریل فون کے ساتھ لینڈ لائن استعمال کرنے پر بھی سخت پابندی عائد کر دی تھی۔ وہ ٹرکیاں جو گھر والوں کی عزت سے کھیلتی ہیں ان کے ساتھ شاید یہی ہونا چاہیے۔ جو والدین اور بھائیوں کی محبتوں کا ناجائز استعمال کرتی ہیں ان کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔ میرے اندر بھی اس سلوک نے بغاوت بھر دی تھی۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو ابو داؤد نے بھی میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے بھی میری عزت دو کوڑی کی تھی۔ مگر شاید مجھے ان سے محبت تھی، جی میں ان کے لیے نرمی کا پہلو نکال رہی تھی۔ عون بھیا مجھے وہاں سے لاتے ہوئے ابو داؤد کے ساتھ میرا ہر تعلق توڑ آئے تھے۔ مگر یہ ان کی سوچ تھی۔ ہاتھوں میں سے انگوٹھی اتار دینے سے دلوں کے تعلق ناپائیدار نہیں ہو جایا کرتے۔ اس روز عون بھیا مجھے اپنے ہمراہ لے کر گھر پہنچے تو ان کے فولادی چہرے پر اتنی برودت ایسی درشتی تھی جو خوف سے روح سلب کر دے۔ مگر جانے کیوں مجھے پھر بھی ان سے خوف نہیں آیا تھا۔ پورٹیکو میں گاڑی روک کر انہوں نے بند دروازے کو کھولا تھا اور آندھی طوفان کی طرح باہر نکلے تھے۔ پھر مجھے بازو سے پکڑ کر بے جان شے کی مانند کھینچتے ماما کے پاس لائے اور مجھے ان کی طرف دھکیل دیا تھا۔ دوپٹے کے بغیر ناک اور ہونٹ سے بہتے خون کے ساتھ میری حالت قابل رحم تھی مگر ماما کو تو دھچکا لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتیں عون بھیا غرا کر بولے تھے۔

”سنجھالیں اسے، ایسا نہ ہو میں اسے جان سے مار ڈالوں“

قہر سے بھرا سر دلچہ ماما کو سرا سمیہ کر گیا۔

”عون کیا ہوا؟“ انہوں نے گھٹتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

”بہتر ہوگا آپ اسی سے پوچھ لیں۔ میری زبان بھی زیب نہیں دیتی۔“

انہوں نے قہر برساتی، لہو رنگ نظریں لمحہ بھر کو مجھ پر نکالیں۔ ان آنکھوں کی تلخی اور ان سے اٹھتی چنگاریاں مجھے بھسم کرنے کو کافی تھیں۔ میں آنسو بہانا بھی بھول چکی تھی۔ بس سبکی کا شدید احساس تھا جس نے مجھے جیسے جامد کر دیا تھا۔ عون بھیا جیسے دندناتے ہوئے آئے تھے۔ ویسے ہی چلے بھی گئے۔ اب میں عدالت میں پیش مجرم کی طرح ماما کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی اور وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی کرب آلود نظریں میرے سراپے پر جمی تھیں پھر وہ آگے بڑھیں اور الماری کھول کر جو دوپٹہ ہاتھ لگا کھینچ کر

میرے کاندھوں پر ڈال دیا۔

”عون کیا کہہ گیا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔؟“

میں کیا کہتی میرے پاس کہنے کو الفاظ ہی نہیں رہے تھے۔

”بولو حجاب! اور نہ میرا دل پھٹ جائے گا۔“

ان کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑتی جا رہی تھی۔ ان کی سوالیہ نظروں میں جو ملامت اور شک تھا وہ

مجھے نظریں چرانے پر مجبور کر گیا۔

”بولو حجاب! کیا کیا ہے تم نے؟“

ان کا ضبط چھلک گیا تھا۔ انہوں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ پھر میں نے اپنی زندگی کا سب سے کڑا

وقت سہا میں نے خود اپنے منہ سے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور لمحہ بہ لمحہ ماما کا سفید پڑتا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ کھڑے سے بیٹھ گئیں تھیں۔ پھر میں نے ان کی سرسراتی ملاستی آواز سنی تھی۔

”تمہیں پتا ہے حجاب تم اپنے نام کی لانج نہیں رکھ پائیں۔ تم نے آج ہمیں ہماری نظروں سے گرا دیا۔“

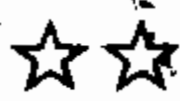
”مجھے معاف کر دیں ماما! مجھے معاف کر دیں۔“

میں ان کی حالت دیکھ کر زور زور سے رونے لگی مگر انہوں نے میرے ہاتھ جھٹک دیئے تھے۔

”یہاں سے چلی جاؤ حجاب میں ابھی تمہاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوں۔“

کتنی بے حسی، بے رغبتی اور نفرت تھی ان کے لہجے میں ان کی آنکھوں میں، مجھے لگا تھا میں نے اس

روز ابوداؤد کو ہی نہیں اپنے تمام رشتوں کو کھو دیا تھا۔



زندگی مجھے عجیب دورا ہے پر لے آئی تھی۔ جب ابوداؤد سے یہ رشتہ استوار ہوا تھا میں نے تب بھی

احتجاجاً خود کو کمرے میں مقید کر لیا تھا۔ اب جب یہ رشتہ توڑا گیا تھا تو میں ایک بار پھر یہاں مقید تھی۔ غم وغصے رنج

اور بے بسی کے احساسات سے مغلوب تھی۔ اس معاملے کو پیانے اپنی فہم و فراست سے سلجھا لیا تھا۔ انہوں نے

ساری بات سنی تھی۔ مجھ سے بھی اور عون بھیا سے بھی پھر انہوں نے رشتے کی تجدید تو نہیں کی مگر ہمارے درمیان

جور بخش درا آئی تھی اسے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

”یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں ہم صرف حجاب کو قصور نہیں ٹھہرا سکتے۔ سب سے اہم عمل دخل ابوداؤد کا

تھا۔ ہم پر واضح ہو ہی چکا تھا کہ اس کے مقاصد کیا تھے اس نے انہی مقاصد کے لیے ہماری بیٹی کو استعمال کیا۔

حجاب ابھی نادان ہے اپنا اچھا برا نہیں سمجھ سکتی۔ ویسے بھی بچوں سے غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ عون بیٹے آپ

بڑے ہو بہن کی غلطی معاف کر دو۔“

میں خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی اور بس آنسو بہا رہی تھی۔

”اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ دوبارہ اس غلطی کو نہیں دہرائے گی؟“

عون بھیا کی آواز خشک تھی۔

”عون چیڑاپ بیٹے! میں نے کہا نا بچوں سے غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ پھر ہماری بیٹی کو ٹریپ کیا گیا تھا۔ خدا نخواستہ اس کے کردار میں کسی قسم کی کوئی جھول نہیں۔“

پیا کا لہجہ وانداز مدلل اور بھرپور تھا۔ عون بھیا نے گہرا سانس بھرا۔

”ٹھیک ہے پیا مگر میں اب محتاط رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس گھٹیا انسان پر بھروسہ نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں میں دوسری مرتبہ اس سے دھوکہ کھانا نہیں چاہتا۔“

”کیا کرنا چاہتے ہو تم؟“

پیا نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

”حجاب کالج نہیں جائے گی۔ اور سیل فون بھی یوز نہیں کرے گی۔“

انہوں نے جس قطعیت سے کہا وہ انداز پیا کے پیشانی پر شکن سمیٹ لایا۔

”دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں حجاب پر اعتماد نہیں؟“

پیا نے ناگواری سے پوچھا تھا۔ عون بھیا نے کاندھے اچکا دیئے۔

”میں نے کہا میں اتنا اسٹیمنا نہیں رکھتا کہ پھر سے دھوکہ کھالوں۔ اس آدمی سے کچھ بعید نہیں ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو عون؟“

پیا نے کسی قدر سنجیدگی سے انہیں دیکھا تھا وہ ہونٹ بھیجنے کچھ لمحے خاموش بیٹھے رہے۔

”میں جتنا اسے جانتا ہوں آپ سب لوگ نہیں جانتے پیا! پلیز میری بات کو سمجھیں۔ اگر آپ کسی

بڑے نقصان سے بچنا چاہتے ہیں تو یہ احتیاط ضروری ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے کی محتاط پلاننگ کرنی ہوگی۔“

عون بھیا کا لہجہ وانداز گھمبیر بنا لیے ہوئے تھا۔ پیا نے بغور انہیں دیکھا تھا۔

”کھل کر بات کرو عون مرتضیٰ!“

”میں حجاب کی شادی کرنا چاہتا ہوں فوری۔ یہ بے حد ضروری ہے پیا!“

عون بھیا کے منہ نکلنے والے الفاظ میرے اعصاب پر بم بن کر گرے تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے

سراونچا کر کے انہیں دیکھا مگر وہ میری سمت متوجہ نہ نہیں تھے۔

”میرا ایک دوست ہے۔ حیثیت تو اتنی زیادہ نہیں ہے مگر خاندانی اور پڑھا لکھا قابل لڑکا ہے میں

چاہتا ہوں ایک ہفتے کے اندر اندر نہایت رازداری سے فراز کے ساتھ حجاب کا نکاح ہو جائے آپ یقین کریں

اس کام کے بعد سو میں سے نوے فیصد خطرہ ٹل جائے گا۔“

عون بھیا کا انداز قائل کرنے والا تھا۔ اور شاید مہم پیا قائل ہو بھی جاتے۔ مگر میرے اندر غضب کی

مزاحمت پیدا ہوتی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔



تیسرا حصہ

بارشوں کے موسم میں
 دل کی سرزمینوں پر
 گرد کیوں بکھرتی ہے
 اس طرح کے موسم میں
 پھول کیوں نہیں کھلتے
 کیوں فقط یہ تنہائی
 ساتھ ساتھ رہتی ہے
 کیوں مجھرنے والوں کی
 یاد ساتھ رہتی ہے
 اتنی تیز بارش سے
 دل کے آئینے پر سے
 عکس کیوں نہیں ڈھلتے
 نیند کیوں نہیں آتی
 بارشوں کے موسم میں
 آنکھ کیوں برتی ہے
 اشک کیوں نہیں ٹھمتے
 بارشوں کے موسم میں
 لوگ کیوں نہیں ملتے

سرما کی ایک طویل و سخت رات دھیرے دھیرے قرب و جوار کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ ایک ہلکا سا گہر بند کمروں سے باہر نشیب و فراز کو ڈھانپ رہا تھا۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ مگر میں کمرے کی کھڑکی کھولے موسم کی شدتوں کو سہہ رہی تھی۔ آنسو بہا بہا کر بھی تھک گئی تھی۔ آنسو کبھی مسئلے حل نہیں کرتے۔ صورتحال کی گھمبیرنا اپنی جگہ تھی۔ بھیا نے وہ بات صرف کہی نہیں تھی اس پر عمل کر کے دکھا

دیا تھا۔ فراز کے گھر والے کل شام آئے تھے۔ بوڑھی ماں، جواں سال بہن اور ایک بھائی، بات تو پہلے ہی طے ہو گئی تھی۔ انہوں نے رسماً میرے ہاتھ پر کچھ روپے رکھ دیئے تھے۔ میرے اندر آنسوؤں اور آہوں کی طغیانی تھی مگر چہرہ بالکل سپاٹ رہا تھا۔ کل شب میں نے خود سے اور حالات سے ہار تسلیم کر لی تھی۔ مجھے عزت کھو کر صرف محبت کا انتخاب بے حد دشوار محسوس رہا تھا۔ پھر ابو داؤد کے پاس میرے لیے کہاں عزت تھی۔ آخری ملاقات میں لمحوں میں مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی تو جانتے تھے میں ان کے فورس کرنے کی اور دھمکیوں کے بعد ان سے ملنے گئی تھی۔ مگر اذلی اصول اس مرتبہ بھی قائم دائم رہا تھا۔ عورت بے قصور ہو چاہے معمولی قصور وار سزا اور الزام اسی کے سر آتے ہوتے ہیں۔ میری تمام مزاحمتیں تمام شکوے اور گلے اسی رنج کی رو میں بہہ گئے تھے۔ اب ایک جامد سناٹا تھا جو دل و روح کے ایوانوں میں سرسرا رہا تھا۔

مجھے دکھ اس بات کا تھا۔ مجھے میرے اپنوں نے غلطی کے بعد معافی کی گنجائش نہیں دی تھی۔ آٹا فانا رشتہ طے کرنا اور پھر شادی کی تاریخ مقرر کر دینا میرے کردار کو ان لوگوں کی نظروں میں مشکوک کر چکا ہوگا۔ ساری زندگی ایک نادیدہ بوجھ کے ساتھ گزرنے والی تھی۔ میں عمر بھر اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال نہیں کر سکتی تھی۔ یہ سوچوں کی تلخی ہی تھی کہ میری آنکھیں پھر سے بہہ گئی تھیں۔ رات بھر میں خود سے لڑتی اور آنسو بہاتی رہی تھی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو ماما میرے اوپر جھکیں کھل کر اڑھا رہی تھیں۔ میں نے دکھتی آنکھوں سمیت انہیں دیکھا تھا اور اذیت میں مبتلا ہوتے کروٹ بدل لی۔ میرے لیے محبتوں اور رشتوں کے مفہوم بدل کر رہ گئے تھے۔ ہر جذبے سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ مجھے کب اعتراف نہیں تھا کہ میری غلطی نہیں تھی۔ مگر مجھے سزا میری خطا سے کہیں بڑھ کر دی گئی تھی۔ رنج اور اذیت مجھے بے حال کرنے لگی۔ مجھے پتا بھی نہ چلا اور بچکیوں سے میرا وجود لرزتا چلا گیا۔ ماما کا ہاتھ میرے شانے پر آ کر ٹھہر گیا۔ اگر میں اپنی اذیتوں کے سمندر میں اتنی گہرائی سے ڈوبی نہ ہوتی تو مجھے اسی ساعت ان کے ہاتھ کی لرزش کا اندازہ ہو جاتا۔

”اتنی خفا ہو مجھ سے؟“

ماما کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ جواب میں میں نے کچھ نہیں کہا تھا میرے دل میں میری روح میں اتنا غم بھرا ہوا تھا کہ میں کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔

مجھے پتا ہے تم خوش نہیں ہو۔ مگر جو کچھ تم نے کیا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔

انہوں نے پھر کہا اور میرے سر ہانے بیٹھ گئیں۔ میری آنکھیں شدتوں سے بہتی رہیں۔

”اتنی محبت کرتی ہو ابو داؤد سے کہ اس کی وجہ سے ہم سب سے منہ پھیر لیا ہے؟“

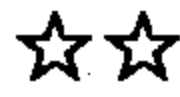
ماما کی بات ایسی تھی جس نے میرا دل پاش پاش کر دیا تھا۔

”مجھ سے یہ سوال کرنے کی بجائے آپ لوگ یہ سوچیے۔ آپ کو اپنی بیٹی پر اتنا ہی اعتبار تھا جو ابو

داؤد کی کی ہوئی صرف ایک حرکت سے اس طرح ٹوٹ کر بکھرا کہ اس کے بعد کچھ باقی نہیں بچا۔ ماما میں آپ سے شکوہ نہیں کر رہی کہ میں نہیں سمجھتی مجھے اس کا حق بچا ہے۔ مگر مجھے جواب دینا ابو داؤد کے ساتھ اس تعلق کو استوار کرنے والا کون تھا۔ اس تعلق کو توڑنے والا اور پھر سے نیا رشتہ بنانے والا کون ہے۔ میں خاموش ہی ہوں

نامری تو نہیں۔ اس گھر سے بھاگی تو نہیں؟ آپ کی دی ہوئی سزا کو میں نے قبول کر لیا ہے۔ اس لیے کہ میں آپ کے مخالف راستوں پر چلنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا اس کے بعد میری زندگی کتنی کنھن ہو جائے گی۔ میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی میری صرف ایک خواہش ہے مجھے آپ لوگ معاف کر دیں۔“

اپنی بات پوری کرنے سے قبل ہی میں زار و قطار رو پڑی تھی۔ ماما آنسو بھری آنکھوں سے کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی تھیں پھر مجھے گلے لگا کر وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں نہ جانے کیوں؟



شہر دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی
بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی
جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے
روح و جان میں بہتی ہے

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ ابو داؤد کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کبھی کبھار میں حیران ہو جاتی۔ وہ میری زندگی میں کیوں آئے تھے۔ محض عون بھیا سے کوئی پرانا بدلہ چکانے۔ اگر ایسا تھا تو مجھے اپنے نزدیک لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کی کیا ضرورت تھی۔ یا شاید ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ ابھی وہ کچھ اور چاہتے تھے مگر عون بھیا اپنی فہم و فراست کی بدولت بڑے نقصان سے محفوظ رہے۔ کچھ بھی تھا اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ نقصان میرے حصے میں آیا تھا۔ میں نے ایک گہرا طویل سانس کھینچا اور کمرے سے لکل کر ٹیرس پر آگئی۔ سردرات کے اس پہر چاندنی میں دور تک پھیلا سمندر کا ساحل ویران نظر آتا تھا۔ تیز ہوا سے ان میں لگے سفیدے اور جامن کے پیڑ جھوم رہے تھے۔ ہر شے ساکن اور پرسکون تھی سوائے میرے۔ دو دن بعد لراز کے ساتھ میرا نکاح تھا ساتھ ہی رخصتی تھی۔ میں جب بھی سوچتی میرا دل خون ہونے لگتا۔ شادی دلوں کے ملنے ایک دوسرے کو قلبی طور پر قبول کرنے کا نام ہے۔ میرے دل میں فی الحال ایسے کسی خجوج کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک ایسا انجانا شخص جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں تھا جانتی نہیں تھی پتا نہیں اس کے ساتھ ساری عمر کیسے گزرتی جبکہ ابو داؤد کا لگایا داغ بھی میرا دامن آلودہ کر گیا تھا۔ میں جتنا سوچتی تھی میرا ذہن اسی قدر اذیت کا شکار ہونے لگتا تھا۔ اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے میں ذرا سا چونکی تھی البتہ پلٹ کر نہیں دیکھا جانتی تھی ماما کے سوا کون ہوگا۔

”حجاب کھانا کیوں نہیں کھایا تم نے؟“

ماما کے سوال پر میں نے بھیچے ہوئے ہونٹوں کو گہرا سانس بھر کے کھولا تھا۔

”بھوک نہیں تھی۔“

مما کچھ دیر مجھے افسردگی کی کیفیت میں دیکھتیں رہیں۔ پھر یوں چہرے کا رخ پھیر لیا جیسے مجھ سے کچھ چھپانا مقصود ہو۔

”دس ازناٹ فیئر ہنی!“ کچھ دیر بعد وہ بولیں تو ان کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ میں پتھر کی مورت کی مانند ساکن رہی میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد کسی بے حسی کا مجھ پر طاری ہو جانا کچھ ایسا عجیب بھی نہیں تھا۔

”ہمیں معاف کر دینا بیٹا ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں۔ بسا اوقات بہت بڑے نقصان سے بچنے کے لیے نسبتاً معمولی نقصان کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے ممما! مجھے آپ کا ہر فیصلہ چاہیے وہ کیسا ہی ہو قبول ہے ڈونٹ وری!“ میں نے ٹھہری ہوئی مگر سرد آواز میں بالآخر ان کی تشفی کرنی چاہی تھی۔

”ابھی تمہیں شاید لگے کہ یہ فیصلہ ہم نے جذباتیت میں کیا مگر ابوداؤد.....“

”فارگیٹ اٹ ممما! پلیز تمام چیپٹر کلوز کر دیں۔“

میں نے کرب آمیز لہجے میں کہا اور پلٹ کر کمرے میں آگئی۔ ممما میرے پیچھے تھیں۔

”تمہارے پپا اور عون چاہتے ہیں تم سب کے ساتھ ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا کرو۔“ پلیز بیٹا

انکار نہیں کرنا۔“

وہ تلخی سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”میں خود کو اس قابل نہیں پاتی کہ اب کسی کا سامنا کر سکوں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

میرا لہجہ بنا چاہتے ہوئے بھی ترش ہو گیا۔

”ایسا کب تک چلے گا؟“

”محض دو دن۔ آپ لوگوں نے انتظام کر تو لیا ہے۔“

میرے ساندرو کی ساری تلخی میرے الفاظ سے ظاہر ہو گئی۔ ممما بے بس سی نظروں سے کچھ دیر مجھے دیکھتی رہیں تھیں پھر گہرا سانس بھر کے آہستگی سے پلٹ کر چلی گئیں۔ جبکہ میری آنکھیں ایک بار پھر گیلی ہوتی چلی گئیں تھیں۔

☆☆

وہ ایک شخص کہ جس سے محبتیں تھیں بہت

خفا ہوئے تو اسی سے شکایتیں تھیں بہت

بہت عزیز تھے اپنے اصول اس کو بھی

ہمیں بھی اپنی انا کی ضرورتیں تھیں بہت

عجیب شب و روز تھے۔ راتوں کو جاگتی تو دن جڑھے تک پڑی سویا کرتی۔ دن کا ایک حسہ گزر گیا تھا۔ جب دروازہ زور سے دھڑ دھڑائے جانے پر میری آنکھ کھلی۔ رات بھر کھلی کھڑکی سے سرد ہوا کے جھونکے

کمرے کو بخ بستہ کرتے رہے تھے اب اسی کھلے ہوئے درتچے سے سورج کی کرنیں بڑی بے تکلفی سے اندر آگھسی تھیں میں نے اٹھ کر بال سیٹے ہوئے پیروں میں سیلپرائٹ کائے۔ اس دوران دستک مزید دو مرتبہ ہو چکی تھی۔

”چھوٹی بی بی بیگم صاحبہ کہتی ہیں ناشتہ کر کے فائٹ تیار ہو جائیں۔“

دروازے پر زبیدہ تھی۔ جب سے یہ سازی صورتحال ہوئی تھی زبیدہ سے شاید میرا پہلا سامنا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے تاسف اور ہمدردی دیکھنا بھی ایک آزمائش تھی۔ میں کچھ کہہ بغیر پلٹ کر واش روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر تو لیے سے خشک کرتی باہر آئی تو ماما خود ناشتے کی ٹرے کے ساتھ میری منتظر تھیں۔

”مما پلیز! میری خاطر یہ زحمت مت کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

تو یہ صوفے پر پھینکتے ہوئے میں جھنجھلا کر بولی تھی۔ وہ جواباً کچھ کہنے کی بجائے مجھے دیکھتی رہیں۔

”ناشتہ کر لو۔“

مجھے بھوک نہیں تھی مگر محض ان کی تسلی کی خاطر میں نے ایک سلاٹس چائے کے ساتھ لے لیا۔

”جوس تو لو بیٹا!“

جی نہیں چاہ رہا۔ میں نے چائے کا خالی گد واپس رکھتے ہوئے کہا تو ماما جیسے تمہید باندھتے

ہوئے بولیں۔

”اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ نہا کر ذرا اچھے کپڑے پہن لو، فراز کی بھانج اور بہن آرہی ہیں۔“

میرے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ ہونٹ بھیچے میں اٹھی تھی اور وارڈ روب کھول کر کپڑے دیکھنے لگی یہ نہیں

”یہ ریڈ والا پہن لو۔“

میرے ہاتھ سے لائٹ گرین سادہ سوٹ لے کر واپس رکھتے انہوں نے بروشے کا بہت اٹاکش

سوٹ میرے آگے کیا جو عون بھیا ملتان سے میرے لیے چند ماہ قبل لائے تھے۔ اس سوٹ کے ساتھ عون بھیا کی

محبت کا بہت خوبصورت احساس تھا جو اب میرے لیے تکلیف دہ ہو چکا تھا۔ مگر میں نے ماما کو انکار نہیں کیا تھا۔

”ان لوگوں کا ارادہ تمہیں شاپنگ کے لیے ساتھ لے جانے کا ہے۔“

ممانے کچھ خائف سے انداز میں مجھے بتایا تھا۔ میں تب بھی خاموش رہی۔

نہالو طبیعت فریش ہو جائے گی اور وہاں ان بھلی مانس عورتوں سے ذرا ہنس کر بات کر لیا کرو۔ بہت

اہم رشتہ بننے والا ہے تمہارا ان سے۔ اتنی چاہت کا اظہار کرتی ہیں مگر تم آگے سے اتنی ہی سرد مزاجی کا مظاہرہ.....

بیٹا مناسب نہیں لگتا یہ سب۔“

”میں آئندہ خیال رکھوں گی۔“

میں نے یونہی جھکے سر کے ساتھ کہا تھا۔ پھر ماما کے جانے کے بعد میں کپڑے اٹھائے واش روم میں

چلی گئی۔ اس معاملے میں میں نے خود پر ایک بے حسی طاری کر لی تھی۔ میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ عون بھیا

نے میرے ساتھ جو بھی کیا تھا مگر میں ان کے اعتماد کو مزید ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی چاہے اسی کوشش میں ضبط ہار کر میرا

دل پھٹ کیوں نہ جاتا مگر مجھے حرف شکایت زبان پر نہیں لانا تھا۔ میں باتھ لے کر باہر نکلی تو زبیدہ میری منتظر تھی۔
 ”وہ لوگ آگئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کہتی ہیں میں بال سلجھانے میں آپ کی مدد کروں۔“
 ”نہیں زبیدہ میں خود سلجھا لوں گی۔ تم جاؤ نیچے ماما کو ضرورت پڑ سکتی ہے تمہاری۔“

زبیدہ کے تذبذب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں نے اسے نیچے بھیج دیا پھر میں نے برش اٹھا کر بال سلجھانے شروع کیے تھے۔ میری زندگی کا معاملہ الجھا تھا تو بالوں کی الجھنیں تو اب کسی کھاتے میں ہی نہ رہی تھیں۔ پھر دو دن بعد میرے یہ جو نچلے کس نے اٹھانے تھے۔ میری آنکھیں پھر سے گیلی ہونے لگیں مگر میں نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ بال سنوار کر سیٹے اور کچر میں جکڑ لیے۔ ٹوریک سے میچنگ کے سینڈل پہن کر دوپٹہ اوڑھتی میں نیچے چلی آئی۔ مہمان خواتین ماما کے ساتھ ہال کمرے میں ہی براجمان تھیں۔ تینوں باری باری اٹھ کر میرے گلے سے لگیں اور بہت خوشدلی سے اور تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔

”ماشاء اللہ بھابھی گلاب کی طرح مہکی مہکی نوخیز اور شاداب ہیں انہیں تو کسی سنگھار کی بھی ضرورت نہیں۔ اللہ نے فراز کے بھاگ جگا دیئے ہیں جی!“
 فراز کی بہن فرط مسرت سے لرزتی آواز میں بولیں۔

”دو دن ہیں بیچ میں پھر تو اس چاند چہرے کو ہمیشہ ہمارے گھر میں ہی روشنی پھیلائی ہے“ ان سادہ دل خواتین کی گفتگو بھی ویسی ہی تھی۔ سادہ اور بناوٹ سے عاری! میں خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی۔
 ”فراز کہہ رہا تھا وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ مگر میں نے منع کر دیا۔ ساری زندگی اس کو ہی بیوی کے ساتھ گھومنا پھرنا ہے ابھی ہمارا موقع ہے۔“

فراز کی والدہ ہنس رہی تھیں جبکہ یہ گفتگو میرے دل کے درد کو بڑھاؤ دے رہی تھی۔
 ماما پتا نہیں کہاں چلی گئیں تھیں۔
 ”بیٹا آپ بھی کچھ لوٹا۔“

آئی خود کیک سے لطف اندوز ہو رہی تھیں مجھے بھی دعوت دی میں گھبرا گئی۔
 نن نہیں مجھے خواہش نہیں۔ اچھو کلی میں نے ابھی ناشتہ کیا ہے۔
 ”اچھا۔ اچھا“ وہ مطمئن ہو گئیں۔

ماما کے آنے پر ان لوگوں نے اجازت چاہی تھی۔ ماما کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔
 ”ہم تو چاہتے تھے آپ بھی چلتیں ساتھ۔ بچی ذرا ریلیکس رہتی۔“
 فراز کی بھانجی نے ماما سے کہا تھا۔ ماما مسکرا دیں۔

”بچی ریلیکس ہی ہے۔ اسے ساری عمر اب آپ کے ساتھ ہی بسر کرنی ہے۔“

مجھے لگا تھا ماما نے در پردہ مجھے کچھ بتلایا تھا۔ میرے دل میں کوئی نا دیدہ سا تیر پیوست ہو گیا۔ ان لوگوں کے ہمراہ میں گاڑی میں بیٹھ کر مارکیٹ پہنچی تھی پھر ان تینوں خواتین کے ساتھ مختلف دوکانوں پر خوار ہوتی

پہری تھی۔ چتا نہیں یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ کیوں لے کر آئی تھیں۔ جبکہ شاپنگ وہ خالصتاً اپنی پسند سے کر رہی تھیں۔ مجھ سے تو بس رائے لی جا رہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کو ہنسی بھی آئی تھی۔ یہ بھلا کیسی فارملیٹی تھی جسے یہ لوگ نبھا رہی تھیں۔ خیر میرا یہ کوئی جذباتی اور قلبی لگاؤ تو تھا نہیں کہ کڑھتی پھرتی۔ بازار میں دکانیں گھومتے ہمیں دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ اب صحیح معنوں میں میں بے زار ہونے کے ساتھ بھوک بھی محسوس کرنے لگی تھی مگر وہ لوگ تن من دھن سے شاپنگ میں مصروف تھیں۔ نسبتاً مہنگے بوتیک سے وہ برائیدل ڈالیں چوز کرنے کو آئیں تو کچھ زورس تھیں۔

”بھابھی سچی بات ہے ہم کبھی ایسی دکانوں پر نہیں گئے مگر یہ فراز کا حکم تھا کہ ویسے کا جوڑا بہت شاندار ہونا چاہیے۔ یہاں جو بھی ڈیل کرنی ہے آپ نے ہی کرنی ہے۔“

فراز کی بہن نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی اور میں پریشان سی ہو کر رہ گئی۔ جس طرح ان لوگوں نے بھاؤ تاؤ کیا تھا پیسے کم کرانے کو دو دکانداروں سے جھگڑے کیے تھے اگر یہ مجھ سے ایسی توقع یہاں لگا رہی تھیں تو میں اس توقع پر ہرگز پوری نہیں اتر سکتی تھی۔ میں انہیں بتانا چاہتی تھی کہ مجھے یہ کام کرنا نہیں آتا نہ میں نے کبھی کیا ہے مگر وہ مجھ سے جواب لیے بنا جیسے فرض ادا کر کے آگے بڑھ گئیں۔ ظاہری بات تھی میں کنفیوژ ہوئی تھی۔ مجھے قطعی سمجھ نہیں آئی تھی اس الجھن سے کیسے نکلوں کہ اس سے بڑی اور اچانک آپڑنے والی افتاد نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ جس جگہ پر میں کھڑی تھی وہاں شیشے کے بڑے بڑے کیسوں میں اسٹائلش ملبوسات کو پوری طرح نمایاں کر کے لگایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ کبنٹ تھے جن میں ہینگر کیے ملبوسات لٹک رہے تھے اسی کبنٹ کے پیچھے سے کسی نے ہاتھ بڑھا کر میری کلائی جھپٹی تھی اور مجھے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ یقیناً دہشت اور خوف کے باعث میں لازماً چیخ اٹھتی مگر مجھے قابو کرنے والا اس خطرے سے آگاہ تھا جیسا کہ میرے ہونٹوں کو کھلنے سے پہلے فولادی ہتھیلی جما کر بند رہنے دیا۔ میں محصور پرندے کی مانند محض پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اس گرفت میں وحشت تھی وہ طوفان کی طرح مجھے گھسیٹتا ہوا کچھ اور پیچھے ہوا ہمارے چاروں اطراف لٹکتے ہوئے ریشمی کپڑے تھے۔ تاریکی تھی اور جس تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں ایک بار پھر پھڑ پھڑانے لگی۔ خوف اور دہشت سے کسی پل بھی میرا دل بند ہو سکتا تھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو۔ میں بھول گیا تمہیں؟“

میرے بکھرے ہوئے حواس ابوداؤد کی سرد پھنکار پر بالکل ساتھ چھوڑتے محسوس ہوئے۔

تو یہ ابوداؤد تھے۔ انتقام اور نفرت کی آگ میں بھڑ بھڑ جلتے ہوئے۔

”سالاد صاحب سے کہہ دینا اس نئے تماشے کو یہیں ختم کر دیں۔ یہ بات طے ہے۔ اگر تمہارے

ماتھ کسی کی شادی ہوگی تو وہ ابوداؤد ہی ہوگا۔ وہ مجھے ذلیل کر کے عزت قائم رکھے گا ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ ہازی میں اسے ہرگز جیتنے نہیں دوں گا۔ اگر قسمت نے پھر سے ہمارے نصیب میں لکھی تو میں جیتنے والے کو ٹوٹ کر دوں گا۔ کہہ دینا اس سے۔“

میری نگاہ پہلی مرتبہ ابوداؤد کے چہرے پر پڑی تھی۔ شاید اب اس تاریکی سے میری آنکھیں کچھ مٹا سا ہوگی تھیں۔ میں خاموش سا کن انہیں تکتی رہی۔

”اگر میں چاہتا تو اب بھی تمہیں اپنے ساتھ لے جاسکتا تھا۔ مگر میں بزدل نہیں ہوں۔ ڈنکے کی چوٹ پر ہر کام کروں گا۔ اور اس وقت جس کی ہزیمت اسے بھلائے نہ بھولے۔“

وہ غیض و غضب سے پھرے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے زور سے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”اب تم جاؤ، مجھے یہی کہنا تھا تم سے۔“

میں لڑکھڑا کر اس ملبوسات کے ڈھیر سے باہر آکھڑی ہوئی میں حواس باختہ نہیں تھی شاید تھی۔ میرے چہرے کی رنگت شاید نارمل نہیں تھی۔ میں اگلے کئی گھنٹے شاید نارمل نہیں ہو سکتی تھی۔

”ارے بھابھی آپ پیچھے ہی رہ گئیں۔ آئیے نا آپ کو بتایا ہے نا ہمیں یہاں کا کچھ پتا نہیں ہے۔“
فراز کی بہن نے آکر میرا سر دہاتھ تھام کر اپنی دھن میں کہا وہ یقیناً میری سمت متوجہ نہیں تھیں ورنہ میری دگرگوں حالت سے ضرور کھٹک جاتیں۔

”آپا پلیز! میری طبیعت بالکل ٹھیک نہیں۔ شاید بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ آپ ماسنڈ نہ کریں تو میں وہاں بیٹھ جاؤں؟“ یہ چند فقرے میں نے جن دقتوں سے بولے تھے یہ میرا دل جانتا تھا۔ سانسیں بہت تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ خدشات مجھے آکٹوپس کی مانند جکڑ چکے تھے۔ ابوداؤد کا طنطنہ ان کی اکڑ اور دھمکیاں میرے حواس چھین لے گئی تھیں۔ آنے والے وقت میں کیا ہونا تھا یہ خیال مجھے پاگل کرنے لگا۔

”کیا ہوا؟ ابھی تو ٹھیک تھیں۔“

میری فق صورت دیکھ کر فراز کی بھابھی اور اماں بھی میری جانب لپک آئیں۔ سیلز گرل بھی صورتحال کی گھمبیر تادیکھ کر قریب آگئی تھی۔ سیون آپ منگوا کر مجھے پینے پر اصرار کیا جانے لگا۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اتنے اصرار کے جواب میں میں نے ایک دو گھونٹ لے کر گلاس ہٹا دیا۔

”انہیں لٹا دیں اور پلیز آپ سائیڈ پر ہوں انہیں ہوا لگنے دیں۔“

سیلز گرل نے مجھے ہمدردانہ انداز میں تھام کر بچ پر لٹا دیا۔ میری آنکھوں سے نمی پھسل کر کنپٹیوں میں جذب ہونے لگی۔ فراز کی بہن ماما کو فون پر اس نئی صورتحال کی خبر دے رہی تھیں پھر فون بند کر کے میرے نزدیک آگئیں۔

”فکر نہ کرو بھابھی ابھی ہم آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں۔“

وہ اپنے دوپٹے سے مجھے ہوا دھیتے ہوئے تسلی دلانے کو بولیں۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے جب میں نے عون بھیا کی پریشان کن آواز سنی تھی۔ وہ میرے متعلق سوال پر سوال کر رہے تھے۔

”کچھ پتا نہیں بھائی صاحب بھابھی کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی ہے۔“

فراز کی بہن نے عجلت بھرے انداز میں کہا تو عون بھیا انہیں ہٹاتے میرے نزدیک جھک آئے۔

”ہنی کیا ہوا گڑیا!“

میں نے نقاہت بھرے انداز میں آنکھیں کھولیں اور سر کونفی میں جنبش دی تھی مگر جانے کیوں عون

بھیا کو دیکھتے ہی میرے آنسو پھر سے بہنا شروع کر چکے تھے۔

”بگلی روتے نہیں ہیں۔ چلو آؤ میں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں۔“

”نہیں بھیا مجھے گھر لے چلیں پلیز!“

میں ان کے بازو سے لپٹ کر بھراہٹ زدہ آواز میں بولی تو انہوں نے نرمی و آہستگی کے ساتھ مجھے

تھام کر اٹھتے میں مدد دی اور سہارا دیئے گاڑی تک لے آئے۔

”آپ لوگ نہیں چلیں گے؟“

عون بھیا نے مجھے فرنٹ ڈوراوپن کر کے بٹھانے کے بعد فراز کی فیملی کی سمت دیکھا۔

”نہیں بیٹا! ہمارا کام ابھی رہتا ہے۔ وہ پنچالیس شام کو فراز کے ساتھ دمی رانی کی خبر گیری کو آئیں

گے۔ رب را کھا!“

”او کے ایز یوش فی امان اللہ!“

عون بھیا نے رسائیت سے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ہمارے گھر پہنچنے

سے پہلے ممائی بھائی کو ان کے کلینک سے بلوا چکی تھیں۔ مجھے لٹا کر انہوں نے میرا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔

”فکر کی کوئی بات نہیں بی بی نارمل نہیں ہے۔ میں انجکشن دے رہا ہوں۔ ماما سے آرام کرنے

دیں۔ سو کر اٹھے گی تو نارمل ہوگی۔“

ممائی بھائی نے کہا تھا پھر ماما کی مدد سے میری کلائی میں انجکشن لگانے کے بعد عون بھیا کے ساتھ باہر

نکل گئے۔ میں اس کے بعد جیسے خود سے بھی غافل ہو گئی تھی۔ شام کو جب انٹھی تو نماز پڑھتی تھی مجھے سوپ پلایا تھا پھر

دوا کھلانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ وہ نماز پڑھنے کو انٹھی تھیں تب میں اپنے وحشت زدہ خیالات کے

ساتھ ایک بار پھر تنہا رہ گئی تھی۔ میری نظریں کمر کی کھشے پر وقفہ وقفے سے گرتی بوندوں پر تھیں اور چہرے پر تنگراہٹ

جال پھیلا رہا تھا۔ حالات جس نہج پر چل نکلے تھے میں نے سمجھوتا کیا تھا۔ صرف اپنے رشتوں کی خاطر حالانکہ میں نہیں

سمجھتی تھی جو عجلت میں میرے لیے فیصلہ ہوا تھا وہ انصاف کے زمرے میں آتا تھا اور زیادتی نہیں تھی مگر میں ہر صورت

اپنے دامن پر لگے داغ کو دھو دینا چاہتی تھی مگر یہ ابوداؤد شاید یہ مجھے ایک بار پھر زندہ درگور کرنا چاہتے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو حجاب؟“

عون بھیا کی آواز پر میں اپنی جگہ زور سے اچھل گئی وہ جانے کب آگئے تھے۔ میں نے سہم کر انہیں

دیکھا اور سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔

”پریشان ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے مختصر جواب دیا اور ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا تھا۔

”شاپنگ آرکیڈ میں کیا ہوا تھا؟“

”جج جی!!!“ میں نے سرا سمیہ ہو کر انہیں دیکھا وہ بغور میری جانب ہی تک رہے تھے جیسے میری

آنکھوں سے ذل کا بھید پالینے کے متمنی ہوں۔ میں خوف سے سلب ہونے لگی۔

”تمہاری طبیعت یونہی تو خراب نہیں ہو سکتی۔ کچھ تو وجہ ہوگی؟“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بھیا۔“ میں روہانسی ہو کر رہ گئی۔ میں جانتی تھی اب انہیں مجھ پر اعتماد نہیں

رہا ہے مگر وہ اس طرح بار بار مجھے شرمندہ کریں گے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

”دیکھو حجاب تم اچھی بھلی یہاں سے گئی تھیں۔ شاپنگ کے دوران بھی نارمل تھیں مگر پھر..... دیکھو جو

بھی بات ہے مجھے بتادو..... ہم سب کے حق میں یہی بہتر ہے۔“

ان کا اٹکنا رکتا لہجہ ان کے اندرونی خلفشار کی چغلی کھا رہا تھا۔ یعنی انہیں کچھ شک تھا مگر یقین نہیں۔

میں انہیں کچھ کیسے بتا سکتی تھی۔ وہ طیش میں آ کر پتا نہیں کیا کرتے۔ ابوداؤد تو ویسے ہی بھرے ہوئے تھے۔ میں

ہرگز مزید بگاڑ نہیں چاہتی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے بھیا پلیز بلیومی!“

میں نے پر زور انداز کو اختیار کیا مقصد انہیں یقین دلانا تھا۔ جو پتا نہیں کس حد تک کامیاب رہا۔ اس

سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے زبیدہ ماما کا پیغام لے کر آگئیں

”نیچے پروہنے آئے ہیں جی! فراز صاحب کے گھر والے، بیگم صاحبہ آپ دونوں کو بلاتی ہیں۔“

اس اطلاع پر میرا چہرہ ابجھ سا گیا۔ اس وقت میں کم از کم کسی سے ملنے کی خواہش مند نہیں تھی فراز کی

فیملی سے تو بالکل نہیں۔

”او کے تم چلو ہم ابھی آتے ہیں۔“

بھیا نے زبیدہ کو چلتا کیا تھا پھر خود اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے دیکھے بنا خشک لہجے میں بولے تھے۔

”نیچے آنے سے پہلے اپنا منہ اچھی طرح دھو لینا تاکہ آنسوؤں کے نشان مٹ جائیں۔“

ایک دم میرا گلا غم کے بوجھ سے بند ہونے لگا۔ یہ میرے سب سے پیارے بھیا تھے۔ مگر حالات

نے انہیں مجھ سے اتنے ہی فاصلے پر ٹنچ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی فراز کی والدہ بھانج اور بہن باتیں

کرتیں وہیں چلی آئیں۔

”ہم نے سوچا بچی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہم خود اس کے پاس آ جاتے ہیں۔“

”آپ نے زحمت کی آنٹی! الحمد للہ حجاب اب بہتر ہے۔ یہ نیچے آ ہی رہی تھیں۔“

عون بھیا نے ٹھہری ہوئی آواز میں سنجیدگی و متانت سے کہا۔

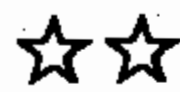
”نیچے فراز بھی آیا ہے ہمارے ساتھ بچی شاید اس کے سامنے آنے سے گھبراتی۔“

فراز کی والدہ نے ہنستے ہوئے وضاحت کی میری اور بڑے بھیا کی نظریں محض لمحہ بھر کو ملی تھیں۔ پھر میں

نے سر جھکا لیا۔ بڑے بھیا خاموشی سے باہر نکل گئے۔ تینوں خواتین مجھ سے طبیعت اور خیریت دریافت کرنے لگیں۔

میں حتی المقدور ان کی تسلی کرانے والے جواب دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ تبھی چائے کی ٹرالی کے ساتھ زبیدہ اور اس

کے پیچھے ماما اور عون بھیا اور شاید فراز تھے۔ میں گم صم سا کن سی بیٹھی رہ گئی۔ سانولی رنگت، لمبا قد اور واجبی سے نقوش والے فراز شاید میری موجودگی یا پھر پہلی بار سامنے کے باعث کچھ پزل سے تھے۔ وہ عون بھیا کے ساتھ میرے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے خیریت بھی دریافت کی تھی مگر میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔ فراز کسی طرح بھی ابوداؤد کے پاسنگ نہیں تھے۔ میری نگاہ لمحہ بھر کو عون بھیا کی سمت اٹھی تھی پھر میں نے آہستگی سے سر جھکا لیا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ میں نے فراز کی بات کا جواب بھی دیا اور خود کو نارمل رکھنے کے سبب جتن بھی کرتی رہی۔ فراز بہت تھوڑی دیر بیٹھے پھر کسی کام کا کہتے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ عون بھیا بھی ان کے ساتھ تھے۔ مجھے لگا تھا جاتے ہوئے وہ میرا ہا سہا سکون بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس رات پھر میں سو نہیں سکی تھی۔



جی تو چاہتا ہے کبھی آگ لگا کر دل کو

پھر کہیں دور کھڑے ہو کے تماشا دیکھیں

اگلادن ناڈل گزرا حالانکہ ہر پل مجھے کچھ ہو جانے کا دھڑکا لگا رہا تھا۔ کل ہی ساری کارروائی ہونا تھی پہلے مہندی کی رسم پھر نکاح اس کے ساتھ ہی رخصتی۔ بھیا نے مہمانوں کو اکٹھا نہیں کیا تھا۔ عین نکاح کے وقت کا بلاوہ دیا تھا وہ بھی بے حد خاص لوگوں کو۔ وہ وقت لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔ جس کا خوف مجھے ادھ موا کر چکا تھا۔ اس روز میں دانستہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ ماما پھر ماں تھیں انہوں نے تینوں وقتوں کا کھانا میرے ساتھ کھایا تھا۔ وہ خاموش تھیں مگر آنکھیں بار بار بھیگتی تھیں جنہیں وہ مجھ سے چھپا کر پونچھ رہی تھیں۔ رات کو جب ممانماز پڑھ رہی تھیں۔ پاپا میرے پاس چلے آئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

بیٹھو بیٹے! انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

ہمارے بچ خاموشی در آئی۔ پاپا خاموش تھے اور ان کا ہاتھ میرے سر پر لرز رہا تھا۔ میں اپنے والدین کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ پاپا سے تو مجھے کوئی شکایت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اس وقت بھی میرا ساتھ نبھایا تھا جب جنم دینے والی ماما بھی بدگمانی کی زد میں آ گئی تھیں۔

”ہمارے معاشرے کا ازل سے دستور رہا ہے بیٹے کہ عزت کی حفاظت کا جب بھی مرحلہ آیا تو قربانی ہمیشہ عورت سے وصولی جاتی ہے۔ جو کچھ ہو چکا میں اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف اتنا کہوں گا۔ میری بیٹی اگر ہم سے کوئی زیادتی ہو گئی ہے جو کہ یقیناً ہوئی ہے ہمیں معاف کر دو۔ فراز شاید تمہیں اپنے قابل نہ لگے مگر بیٹے کچھ فیصلے انسانی بس سے باہر ہوا کرتے ہیں۔ اس بات پر تو آپ کا بھی ایمان ہے نا کہ جوڑے آسمانوں پر بنے ہیں۔ اسے خدا کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینا۔

میں جو بے حس سی بیٹھی ساری بات سن رہی تھی پاپا کی آواز کو بھگتا محسوس کر کے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا پھر ان کے ہاتھوں کو تھام کر بوسہ دیا تھا۔

مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے پاپا! آپ نے ٹھیک کہا جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اور میں

اپنے نصیب پر شاکر ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کبھی مجھے اس حوالے سے شاکی ہوتا نہیں دیکھیں گے۔ انہوں نے نم آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر میری پیشانی چوم کر سرعت سے پلٹ کر چلے گئے۔ میں کتنی دیر یونہی بیٹھی رہی تھی پھر لیٹنے کے بعد کروٹ بدل لی۔ میری یہ ذرا سی اطاعت ہمیشہ کے لیے میرے رشتوں کو ٹوٹنے اور غمزدہ ہونے سے بچا سکتی تھی تو میں یہ منافع بخش سودا کیوں نہ کرتی۔ مجھے ہر صورت اپنے خاندان کی بقا چاہیے تھی۔ اس لیے بھی کہ دوسرے راستے پر بھی مجھے امید کا جگنو نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆

بارشوں کے موسم میں
وقت کے اندھیروں میں
میں نے اس سے پوچھا تھا
چھوڑ تو نہ جاؤ گے
ہاتھ تھام کر اس نے
کان میں یہ بولا تھا
کیسے چھوڑ سکتا ہوں
تم تو جان ہو میری
اور آج ایسے ہی
وقت کی تمازت میں
وحشتوں کے موسم میں
میں نے اس سے پوچھا ہے
چھوڑ کر ہی جانا تھا
آس کیوں دلائی تھی
پیاں کیوں جگائی تھی
میرے ان سوالوں پر
چلتے چلتے وہ بولا
موسموں کی عادت ہے
وقت پر بدل جانا

وہ سارا دن عجیب سی وحشتوں کی نذر ہو گیا۔ مما معمول سے کہیں زیادہ مصروف تھیں اس کے باوجود وہ بار بار میرے پاس چکر لگا رہی تھیں۔ ایک عجیب سی بے بسی اور اداسی ان کا گھیراؤ کیے ہوئے تھی۔ شام کے چار بجے تھے جب زبیدہ مہندی کا پیلا اور اورنج بے حد خوبصورت سا کاندانی جوڑا اور اس کے ساتھ کی میچنگ

چوڑیاں اور سینڈل کے ساتھ پھولوں کے زیورات کا ڈبہ لیے میرے پاس چلی آئی۔
 ”بیگم صاحبہ کہتی ہیں نہا کر کپڑے پہن لیں۔“

زبیدہ بھی چپ چپ تھی میں نے بوجھل پونٹوں کو اٹھا کر زبیدہ کو دیکھا پھر اس کی لائی چیزوں کو، میرے دل سے اس سامان میں مہندی کی کون دیکھ کر ہوک سی اٹھی تھی۔ میں گم صم بیٹھی رہی۔ زبیدہ کے دوبارہ احساس دلانے پر میں اٹھی تھی وہ میرے کپڑے اور تولیہ وغیرہ واش روم میں رکھ چکی تھی۔ میں نے بہت بے دلی اور رنجیدگی کی کیفیت میں غسل کیا تھا اور باہر آگئی۔ زبیدہ ہیئر برش لیے میرے پاس آگئی۔ میں نے اسے آج اس کام سے منع نہیں کیا میری ہمتیں اور حوصلے جیسے لمحہ بہ لمحہ جواب دیتے جا رہے تھے مجھے لگ رہا تھا میری ساری بہادری سارا ضبط بس یہیں تک تھا اب میں ہمت ہار دوں گی۔ زبیدہ نے بالوں کو سلجھالیا تو ڈرائیر کی مدد سے انہیں سکھانے لگی۔ اس کام سے فراغت کے بعد اس نے مہندی کی کون اٹھالی تھی۔ میں جانتی تھی وہ بہت ماہر ہے اس کام میں اس نے پچھلے سال اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر باقاعدہ پارلر سے اس کام کی ٹریننگ لی تھی۔ اس کی مہارت اب میرے ہاتھوں کی کلائیوں ہتھیلیوں کے بعد پیروں پر ظاہر ہو رہی تھی۔ میں ساکن بیٹھی اسے اپنے کام سے انصاف کرتے دیکھتی رہی۔
 ”آپ ذرا لیٹ جاؤ بی بی جی تھک گئی ہوں گی۔“

میری کمر پر گاؤ تکیہ رکھ کر اس نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے نیم دراز کر دیا میرے پیروں کے نیچے کشن رکھ دیئے کہ مہندی کا ڈیزائن خراب نہ ہو۔ خود وہ بکھرا ہوا کمرے سمیٹنے لگی۔
 ”دس پندرہ منٹ بعد جب یہ سوکھ جائے تو ہاتھ دھو لینا۔ میں اب نیچے جاتی ہوں آوازوں سے لگ رہا ہے مہمان آنا شروع ہو چکے ہیں۔“

زبیدہ نے مجھے مخاطب کر کے کہا اور پلٹ کر کمرے سے چلی گئی۔ میں نے بے تحاشا جلتی ہوئی آنکھوں کو بند کر لیا۔ میں سوچوں سے بچنا چاہتی تھی مگر سوچیں اژدھے کی طرح پھن پھیلانے مجھے ڈسنے کو تیار تھیں۔ ابوداؤد کی دھمکی نے میرا خون خشک کیا۔ فراز کے ساتھ شادی کے بعد کے تصور نے میری روح پر بھاری بوجھ دھر دیا۔ مجھے لگا تھا میں ایک بار پھر گھٹ گھٹ کر رو رہی ہوں۔ جانے کتنا وقت اسی طرح بیت گیا۔ دروازے پر پھر آہٹ ہوئی میں نے چوتکتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ زبیدہ کے ساتھ اس مرتبہ ماما بھی تھیں۔ وہ کچھ دیر ساکن سی مجھے دیکھتیں رہیں پھر آگے بڑھ کر بے ساختہ مجھے گلے سے لگا کر بھینچ لیا تھا۔ ”بہت پیاری لگ رہی ہو۔ خدانیک نصیب کرے۔ نظر بد سے بچائے۔“

میرا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرے وہ کتنی ہی دیر مجھے دعاؤں سے نوازتیں رہیں۔
 ”جاؤ بیٹے ہاتھ دھولو۔ پھر نیچے چلنا ہے۔ رسم شروع کرنی ہے۔“

ماما نے نرمی سے کہا تو مجھے لگا تھا جیسے انہوں نے مجھے مقتل گاہ لے جانے کا حکم سنایا ہو۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ واش روم گئی تھی۔ مہندی کی خوشبو زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے حواسوں کو جامد کرتی محسوس ہوئی۔ لٹک ہو کر جم جانے والی مہندی کو ہٹاتے میں نے اپنے دل کے ساتھ ہاتھوں میں بھی لرزش محسوس کی تھی۔ یہ

معمولی سا کام شکستہ اعصاب کی بدولت میں نے بیس سے پچیس منٹ میں انجام دیا۔ مہندی کارنگ بے حد گہرا آیا تھا۔ بے تحاشا سفید ہاتھ اور پیر اس آرائش کے بعد کچھ اور بھی نمایاں اور حسین لگنے لگے تھے۔ مگر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ممانے عجلت بھرے انداز میں میرے بال سیٹے اور انہیں کچر میں جکڑ دیا۔ زبیدہ نے میرے دونوں ہاتھوں میں چوڑیاں پہنائی تھیں۔ اس کے بعد زبیدہ کی مدد سے ممانے پھولوں کے زیورات سے مجھے لاد دیا۔ چھوٹا سا ٹیکہ بڑے بڑے بالے گلے کی مالا اور کلائیوں کے گجرے سب کے سب منہ بند کلیوں اور گلاب کے سرخ پھولوں سے بنائے گئے تھے۔ مہندی کی خوشبو پر گلاب اور موتیے کی خوشبو کا غلبہ چھانے لگا۔ زبیدہ نے بیڈ پر دھرا میرا باریک گولڈن کناری والا دوپٹہ پن کی مدد سے میرے سر پر اٹکایا تھا اور میچنگ کی سینڈل میرے پیروں میں ڈال کر تیاری مکمل کر دی۔ ممانے ایک بار پھر مجھے گلے لگا کر چوما تھا میں جیسے ایک مرتبہ پھر پتھر کی مورتی میں ڈھل گئی تھی۔ ممانے اور زبیدہ کے ہمراہ اپنے کمرے سے سیڑھیاں اتر کر میں ہال کمرے میں آ گئی۔ وہاں مختصر سے مہمانوں کے بیٹھنے کا بہت مناسب انتظام تھا۔ صوفے پر مجھے بٹھایا گیا تو فراز کی فیملی نے لپک کر مجھے گھیر لیا۔ پھر رسم کی ادائیگی ہونے لگی۔ بہت سادگی اور کسی حد تک خاموشی کے ساتھ۔ شاید فراز کی ہی فیملی میں سے کوئی ہنڈی کیم سے ان لمحات کی عکس بندی بھی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد فراز کو بھی بلا کر میرے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ میں تب بھی ساکن اور بے حس سے بیٹھی رہی تھی۔ چند سہاگنیں جو تھیں وہ بہت جلد اس رسم سے فارغ ہو گئیں۔

”میرا خیال ہے پہلے نکاح ہو جائے پھر بچی کو تیار کیا جائے۔“

یہ تجویز فراز کی والدہ کی تھی۔ جس پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی۔

”جیسی آپ کی مرضی، مولانا صاحب ابھی ابھی تشریف لائے ہیں۔“

عون بھیا کی آواز کہیں نزدیک سے ابھری تھی۔

”ٹھیک ہے تو بسم اللہ کریں پھر۔“

فراز کی والدہ کے کہنے پر عون بھیا مولانا صاحب کو پکارنے لگے اور یہی وہ پل تھے جب اچانک ہال کمرے کا پرسکون ماحول درہم برہم ہو گیا تھا۔ فارز کی زبردست آواز گونجی اور گولیوں کا پورا برسٹ گلاس وال کا شیشہ چکنا چور کرتا چلا گیا۔ بدحواس نسوانی چیخیں ابھری تھیں اور ہال میں انتشار پھیل گیا۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے ورنہ گولیوں سے چھلنی ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔“

”اتنی جلدی کیا ہے سالا صاحب! اہم مہمان تو ابھی رہتے تھے۔ یعنی آپ کے برادر ان لاء! کیا

خیال ہے یہیں نکاح پڑھائیں گے یا پھر آپ کی عزت مآب بہن کو اپنے ساتھ لے جائیں۔؟“

بلیک چست جینز پر بلیک ہی سلیو لیس شرٹ میں ابوداؤد کسی پھرے ہوئے شیر کی طرح اندر گھسے تھے اور عون بھیا جو ایک لمبے دھڑنگے رائفل بردار کی رائفل کی زد میں شاکڈ سے کھڑے تھے وہ ان کے سامنے تن کر بولے۔

”شٹ آپ! ویل یوشٹ آپ!“ وہ پوری قوت صرف کر کے دھاڑے اور ہاتھ گھما کر ابوداؤد کو

گھونسا رسید کرنا چاہتے تھے مگر ابوداؤد غافل نہیں تھے ان کا تیزی سے گھوما ہوا ہاتھ اپنے نولادی پنچے میں جکڑ کر

ایک جھٹکے سے نیچے کر دیا۔

”آج میں ہارنے نہیں آیا۔ آج اگر میں ہار تو یہاں لاشوں کے ڈھیر لگا دوں گا عون مرتضیٰ! اپنے آپے میں رہو۔“ وہ غرا کر بولے تھے مگر عون بھیا خائف نہیں ہوئے تھے۔

”میں تیری گیدر بھسکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں کتے دفع ہو جا یہاں سے۔“

”دفع تو ضرور ہوں گا مگر تمہاری بہن کو ساتھ لے کر جاؤں گا سالا جی۔“

وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسے اور میں جو رنج خوف اور دہشت سے تھر تھر کانپ رہی تھی انہوں نے آگے بڑھ کر وحشی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت جارحانہ انداز میں کھسٹ کر مجھے اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ میں کھڑی کیا ہوئی تھی ایک طرح سے لڑکھڑا کر ان کے پہلو سے لگ گئی تھی۔ عون بھیا زور سے چیخے تھے اور ابوداؤد پر جھپٹنا چاہتے تھے کہ اس ہل نہیں رفل کی زد پر رکھنے والا حرکت میں آیا۔ ایک بار پھر آتش اسلحے نے آگ اگلی تھی اور عون بھیا کے وجود نے خون اگل دیا تھا۔ میں جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ایک دم حواس باختہ ہو کر پوری قوت صرف کر کے چلائی اور عون بھیا کی جانب لپکی تھی مگر ابوداؤد نے مجھے مضبوطی سے پکڑا تھا اور اپنی جانب کھینچ لیا میں نے گم ہوتے حواسوں کے ساتھ عون بھیا کو لڑکھڑا کر نیچے گرتے دیکھا تو اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

☆☆

کوئی مجھ کو میرا بھرپور سراپا لادے

میری آنکھیں، میرے بازو، میرا چہرے لادے

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں

مجھ کو میرا وہی خواب پرانا لادے

جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں

کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لادے

کشتی جاں تو بھنور میں ہے کئی برسوں سے

اے خدا اب تو ڈوب دے یا کنارہ لادے

میری آنکھ دوبارہ کھلی تو میں یکسر انجان کمرے میں گداز مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے کی فضا میں سگریٹ اور الکحل کی مہک کا احساس غالب تھا۔ میں کچھ دیر تک ساکن پڑی رہی۔ میری نظروں میں ابھی بھی جیسے اندھیرے پوری طرح نہیں چھٹے تھے۔ معادھیرے دھیرے میرے حواس بحال ہوئے تھے پھر مجھے خود پر ٹوٹ جانے والی قیامت کا احساس ہوا تھا۔

”عون بھیا!“

میں حلق کے بل چیختی ہوئی اٹھی تھی کہ نگاہ اپنے سامنے صوفے پر بیٹھے ابوداؤد سے جا ٹکرائی۔ میرے شکستہ اعصاب کو ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ میرے اندر سرسراتی ہوئی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا انہیں نظر

انداز کیے بغیر میں اٹھ کر دروازے کی جانب بھاگی تھی۔

”دروازہ کھولو۔ پلیز دروازہ کھولو۔ مجھے جانے دو۔ عون بھیا! عون بھیا!“

دروازہ کھولنے کی کوشش میں ناکام ہو کر میں نے پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے دروازہ دھڑ دھڑاڈالا عون بھیا کا خون میں لت پت ہو کر گرتا وجود میری روح کو سراسیمگی کی انتہاؤں پر لے جا رہا تھا۔

”اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاسکتیں۔ بہت شوق تھا تمہیں اس بھوت کی دلہن بننے کا۔“

ابوداؤد نے پیچھے سے آ کر مجھے کاندھوں سے تھاما تھا اور ایک جھٹکے سے رخ اپنی جانب پھیر کر میرے ہاتھوں کی چوڑیوں اور کلائی کے گجروں کو وحشیوں کی طرح سے بھنبھوڑ کر اتارنے کی کوشش کی۔ میں کچھ اور شدت سے رونے لگی۔

”عون بھیا کو مار دینا آپ نے۔ میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

میں حواسوں میں نہیں تھی غم و غصے شدید ذہنی کرب نے مجھے جنونی کر دیا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح سے ان پر جھپٹی تھی۔ انہوں نے مجھے روکنے اور سنبھالنے کی کوشش کی مگر میں جیسے طیش سے بے قابو ہو چکی تھی۔ میرا ہاتھ ان کے چہرے پر گہری خراش ڈال گیا تھا۔ پہلے انہوں نے میرا ہاتھ زور سے جھٹکا پھر اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے پر مارا تھا۔ تراخ کی زوردار آواز ابھری اور میں تیوراً کئی فٹ پیچھے جا کر گری تھی۔ میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا اور ایک بار پھر میں حواس کھو گئی تھی۔ اس کے بعد دوبارہ میں جب ہوش میں آئی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور بال کھل کر بکھر چکے تھے۔ سر کے پیچھے حصے سے اٹھنے والی درد کی ٹیسیں ناقابل برداشت تھیں۔ مگر یہ تکلیف اس تکلیف کے آگے کچھ بھی نہیں تھی جو عون بھیا کے حوالے سے میں دل میں روح میں محسوس کر رہی تھی۔ میرا بھائی مجھے تباہی سے بچاتے بچاتے خود زندگی ہار گیا تھا۔ میرے اندر قیامت کا دکھ اتر ا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ابوداؤد نے اگر یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا تو مجھے چھوڑنے کے لیے انہیں اٹھایا تھا۔ پتا نہیں میرے ساتھ زندگی اور قسمت مل کر کیا سلوک کرنے والی تھی۔ میرا دل غم سے بوجھل تھا جس وقت دروازہ کھول کر ابوداؤد اندر آئے میری آنکھیں تسلسل سے بہہ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ جسے انہوں نے جھک کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ میں سرعت سے اٹھی تھی اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دیں ابوداؤد! مجھے جانے دیں۔“

وہ ساکن مگر سپاٹ چہرے لیے کھڑے رہے۔ میزی التجاؤں، آہوں، سسکیوں کا ان پر جیسے ذرا برابر اثر نہیں ہوا تھا۔ میں تھک کر گھٹنوں میں سر چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی تھی جب انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میری کلائی تھامی اور نرمی سے صوفے پر بٹھا دیا۔ میں خوف اور بے بسی کے عالم میں انہیں تکتے لگی۔

”تمہیں بہت زیادہ چوٹ آئی ہے؟ درد اب بھی ہو رہا ہے؟“

پتا نہیں یہ ہمدردی تھی یا زخموں پر نمک پاشی! مگر میرے ٹھٹھر جانے والے آنسو پھر سے برس پڑے۔

”آپ کو مجھے لانا تھا۔ لے آتے ہر بدلا ہر انتقام مجھ سے پورا کر لیتے ابوداؤد مگر عون بھیا آپ

نے عون بھیا کو کیوں مار دیا۔“

میں ایک بار پھر آہوں اور سسکیوں سے روتی چلی گئی۔ ابوداؤد نے کچھ ٹھٹھک کر مجھے دیکھا تھا۔ پھر کچھ کہے بنا بھیچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ جینز کی جیب سے سیل فون نکالا تھا اور ایک نمبر ڈائل کیا تھا۔

”جانتے ہو سالہ صاحب کون بات کر رہا ہوں یا تعارف کرواؤں“

ان کا کاٹ دار لہجہ گہرا طنز لیے ہوئے تھا۔ میں چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ تمہاری بہن صاحبہ مجھے تمہارا قاتل سمجھے بیٹھی ہیں۔ یقین دلاؤ اسے کہ میں نے تمہاری جان

نہیں لی۔ بھلا سوچنے کی بات ہے اگر تمہیں مارنا ہوتا تو یہ سارا کھڑاک پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں لمحہ لمحہ کی موت پہ زیادہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر ایک جنونی قہقہہ لگایا تھا۔

”ہاں میرے پاس ہے وہ۔ ابھی بھی شک ہے تمہیں؟ تھرو پر اپر چینل ہر کام کیا ہے تم سے رشتہ

داری کرنے کو بڑے پاڑے بیٹے ہیں بھئی!“

میں ساکن آنکھیں پھاڑے غیر یقین بیٹھی تھی۔ ابوداؤد نے ایک نگاہ مجھے دیکھا پھر سیل فون کا لاؤڈ

اسپیکر آن کر دیا تھا۔

”بکواس مت کرو خبیث گھٹیا انسان! میں تمہیں قبر کی تہ سے بھی نکال لاؤں گا۔ ایسے نہیں چھوڑوں

گا تمہیں۔“ وہ عون بھیا کی آواز تھی بلاشبہ، میرا سہا ہوا وحشت زدہ بے قرار دل جیسے لمحوں میں سکون پا گیا۔

نکال لینا نکال لینا مگر تب تک تم ماموں ضرور بن چکے ہو گے۔

”ابوداؤد ہنس رہے تھے۔ میرا چہرہ جیسے جل اٹھا۔“

”حجاب کہاں ہے؟ بات کراؤ میری اس سے“

عون بھیا نے پھنکار زدہ لہجے میں کہا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے بات نہیں کر سکتی۔ اب تم پوچھو گے کیا ہوا تو میں خود بتا دیتا ہوں۔“

نزاکت ختم ہے ان پر ہوا ہے درد سر پیدا

ذرا ماتھے کو چوما تھا پڑے ہیں کل سے سر باندھے

ابوداؤد کا لہجہ بے باک اور بے مہارت تھا۔ اگلے لمحے رابطہ منقطع ہو گیا۔ یقیناً عون بھیا نے خود سلسلہ

کاٹا تھا۔ ابوداؤد نے ایک جنونی قہقہہ لگایا۔

”یہ ہوتی ہے جیسی۔ دیکھو کسی کو خوش دیکھنا برداشت نہیں کرتے لوگ!“

وہ مجھے دیکھ کر کاندھے جھٹک کر کہہ رہے تھے۔ میں نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔ جو بھی تھا

عون بھیا کی آواز سن کر میرا آدھا دکھ اور صدمہ ڈھل گیا تھا۔ میں نے گالوں سے آنسوؤں کی نمی پونجی اور

نڈھال سے انداز میں بیڈ پر جا بیٹھی بیڈ کے سرہانے اپنا دوپٹہ پڑا دیکھ کر مجھے احساس ہوا میں تب سے بنا دوپٹے

کے ابو داؤد کے سامنے رہی ہوں۔ کچھ خفت کچھ گھبراہٹ کی کیفیت میں میں نے دوپٹہ اٹھا کر اپنے گرد لپٹا تھا۔ اور ایسا کرتے میں نے ابو داؤد کی آنچ دیتی نظروں کا حصار اپنے گرد بندھتا محسوس کیا تھا۔

”پہلے کھانا کھا لو۔ اس کے بعد اپنا حلیہ سنوار لینا۔ آج ان فاصلوں اور جدائیوں کو شکست فاش دینا ہے مجھے۔“

میں نے پہلے چونک کر پھر سہم کر انہیں دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ سر کونفی میں جنبش دینے لگی۔

”کیا نہیں؟ ہاں بولو؟ تمہاری پوزیشن ایسی ہے کہ مجھے انکار کر سکو؟“

وہ ایک دم طیش میں آ گئے تھے۔ میری طرف لپک کر بازو پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے اتنی زور سے دھاڑے کہ دیواریں تک لرز اٹھیں۔ میں سہم کر دبک سی گئی۔

”مجھے معاف کر دیں۔ مجھے جانے دیں۔ پلیز!!!“

شٹ آپ! جسٹ شٹ آپ! وہ پھر دھاڑے پھر اسی بے دردی سے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر میرا چہرہ اپنے غضب ناک چہرے کے مقابل کرتے ہوئے سرد آواز میں پھنکارے تھے۔

”آئندہ واپس جانے کی بات نہیں کرنا۔ ورنہ میں تمہارا حشر بگاڑ دوں گا۔ تمہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یہ محبت کا معاملہ نہیں ہے۔“

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے جھٹکا تو میں بے جان گڑیا کی طرح بستر پر دھے گئی تھی۔

”کھانا کھاؤ۔ اٹھو۔“ وہ پھر گرجے میں منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی رہی۔

”تمہیں سنتا نہیں ہے؟“ وہ خطرناک ارادوں سے میری جانب بڑھے تو میں بے ساختہ چیخ پڑی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے مجھے تو ہے۔ ہر قسم کی۔ تم اٹھو ان منحوس کپڑوں سے نجات حاصل کر لو۔ تمہارے کپڑے اور ضرورت کی ہر چیز اس الماری میں پڑی ہے۔ ہری آپ“

انہوں نے کھانے کی ٹرے اپنی جانب کھینچتے ہوئے نخوت بھرے انداز میں مجھے حکم دیا تھا۔ میں کچھ دیر ساکن بیٹھی رہی تھی پھر بستر سے اتر کر لڑکھڑاتے قدموں سے ان کے نزدیک آ گئی۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا پھر ان کے ابرو ناگواری کے احساس سمیت تن سے گئے تھے۔

”اب کیا ہے؟ انداز پھٹکار ڈالنے والا تھا۔“

”ابو داؤد مجھ سے نکاح کر لیں۔ مجھے خود میری نظروں میں گرنے سے بچالیں۔“

میں نے ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھ کر جیسے التجا کی تھی۔ وہ پہلے ہونق ہوئے تھے۔ پھر جانے کیا ہوا زور سے ہنستے چلے گئے۔ میں بے بسی کی تصویر بنی چھلکتی آنکھیں پونجی رہی۔

”تمہیں پتا ہے اگر تمہارا اکڑو بھائی تمہاری یہ بات سن لے تو تمہاری گردن اپنے ہاتھ سے اڑا سکتا

ہے۔ یونو اس نے تو تمہارے لیے بڑا ریڈی میڈ دولہا دوسرے لفظوں میں کاٹھ کا الو تلاش کر لیا تھا۔“
 میں نے کسی کرب سے گزرتے ہوئے دانتوں سے ہونٹوں کو کچل ڈالا تھا۔
 ”چلو تم اتنی منت کرتی ہو تو میں نکاح کا انتظام کراتا ہوں۔ شاباش تم ذرا خوب اچھی طرح دلہن بننا
 اوکے“ ان کے لہجے میں نخوت اور بے نیازی تھی۔ میں نے بے اختیار گردن کو اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆☆

ہوا تو کچھ بھی نہیں بس تھوڑے سے مان ٹوٹے ہیں

تھوڑے سے خواب بکھرے ہیں

تھوڑے سے لوگ بچھڑے ہیں

ہوا تو کچھ بھی نہیں

بس تھوڑی سی نیندیں اڑ گئی ہیں

تھوڑی سی خوشیاں چھن گئی ہیں

تھوڑا سا چین لٹ گیا ہے

ہوا تو کچھ بھی نہیں

بس اپنا آپ گنویا ہے

آنکھوں کو برسنا سکھایا ہے

کسی اپنے نے رلایا ہے

ہوا تو کچھ بھی نہیں

بس محبتوں کا صلہ پایا ہے

ابوداؤد کے سونے کے بعد میں یونہی سا کن لیٹی کتنی دیر بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ آنسو جو غم کی شدت
 پر ہمارے درد کا اظہار بنا کرتے ہیں۔ یہ آنسو تو میں پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل بہا رہی تھی۔ مگر ابوداؤد کو مجھ پر رحم
 نہیں آسکا تھا۔ انہیں مجھ پر رحم آتا بھی کیونکر۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا تھا۔ میں صرف انتقام کا ذریعہ تھی۔
 یہ کیا کم تھا کہ انہوں نے مجھ سے نکاح کر لیا تھا۔ ہاں یہ بہت بڑا احسان تھا جو مجھے بھولنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ کونسا
 انتقام تھا کیسا انتقام تھا۔ ماضی میں عون بھیا نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ ابوداؤد نے مجھے
 بتانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ہاں اس جرم کی سزا ضرور میں نے پائی تھی جو مجھ سے سرزد بھی نہیں ہوا تھا۔ میرا پورا وجود
 درد کا پھوڑا بنا ہوا تھا۔ جس پر ہر انداز میں ابوداؤد نے اپنی وحشتیں رقم کی تھیں۔ شراب کے نشے میں خود سے غافل
 ہونے کے بعد انہوں نے مجھ سے اگر کوئی تعلق استوار کیا تھا تو اس تعلق میں سوائے ذلت، شرمندگی اور اذیت کے
 اور کیا ہو سکتا تھا۔ وہ میری تڑپ اور سسکیوں سے حظ اٹھاتے رہے تھے۔ میرے لیے سب سے پریشان کن اور
 مضطرب کرنے والا جو خیال تھا وہ ابوداؤد کے ان مظالم کو سہنے کا تھا۔ اگر میں محض کسی اندھے انتقام کا ذریعہ تھی تو پھر

مجھے ہمدردی کی توقع عبث تھی۔ جانے کتنی دیر مزید یونہی اشک بہاتے رہنے کے بعد میری آنکھ لگ گئی تھی۔
 ”سمجھا کرو یا ردیر تک سونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ تم بھی تو ایسی گولڈن نائٹ گزار چکے ہونا کتنے
 بچے جاگے تھے میں نے تو نہیں پوچھا۔“

میری آنکھ دوبارہ کھلی ہی ابوداؤد کی آواز پر تھی۔ وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھے۔ دوسری جانب کیا کہا
 گیا وہ بہت زور سے ہنستے تھے۔

اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کی نشانی چھوڑ آیا ہوں
 اس نے مانگی تھی محبت کی نشانی مجھ سے
 ”اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ سمجھ سکتے ہونا۔ پھر بھی اگر تمہیں اسے تلاش کرنے اور اس تک پہنچنے کا
 جنون ہے تو اس شوق کو پورا کرتے رہو۔ جب تک وہ میرے پاس ہے تب تک میں اسے برتوں گا۔ پھر تم لے
 جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔“

ابوداؤد کی گفتگو ان کی فطرت اور مزاج کی طرح بے حد کھلی ڈلی اور قابل اعتراض تھی۔ میں نہیں
 جانتی تھی وہ کس سے محو گفتگو ہیں البتہ یہ جاننے میں مجھے ایک لمحہ نہیں لگا تھا کہ گفتگو میرے متعلق ہو رہی ہے رات
 بھر میں جس اذیت سے دوچار رہی تھی یہ اذیت اس سے ہزار ہا گناہ بڑھ کے ناقابل برداشت تھی۔ میں بے جان
 مٹی کی ڈھیری کی طرح ان کے پہلو میں پڑی ہوئی تھی۔ اپنے چکراتے سر کو سنبھالے ایک جھٹکے سے اٹھی مگر ایک
 کراہ کے ساتھ مجھے پھر اسی پوزیشن میں واپس آنا پڑا میرے لمبے بال دو تہائی تک ابوداؤد کے گرائنڈیل وجود
 کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ میں نے سسکیاں دباتے ہوئے آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں سے انہیں دیکھا وہ سیل
 فون ٹھوڑی کے نیچے نکائے اطمینان بھری کیفیت میں مجھے دیکھ رہے تھے۔
 ”میرے بال چھوڑ دیں پلیز!“

میں بولی تو میری آواز میں سوائے آنسوؤں کی نمی اور بے بسی کے اور کچھ نہیں تھا۔
 ”کہاں جا رہی ہو؟ ویسے اب تو دنیا سے اٹھنے کو جی چاہ رہا ہوگا۔ ہے نا تم بھی سوچتیں ہوگی میں کتنا
 ظالم ہوں۔ مگر جو تمہارے بھائی نے کیا میرے ساتھ اگر وہ جان لو تو.....“
 سیل فون پر ہونے والی بیپ نے ان کی بات کا تسلسل ختم کر دیا۔ ابوداؤد نے نگاہ کا زاویہ بدل کر
 بلنک کرتی اسکرین پر نگاہ کی دیکھتے ہی دیکھتے ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔
 ”دیکھو وہی ہے۔ بار بار مروڑا اٹھ رہے ہیں سالہ صاحب کو۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ میں نے
 تمہارے کہنے پر نکاح کیا ہے مگر مانتا نہیں۔ تم بات کرو اس سے۔“

”میں بات نہیں کروں گی۔“ میں نے دکھتے سر کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے بے ساختہ انکار کیا۔ ابوداؤد
 نے مجھے لہو رنگ آنکھوں سے گھورا پھر ایک دم سے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر زوردار جھٹکے دیتے ہوئے بولے تھے۔
 ”ابھی بھی انکار کرو گی؟ جانتی نہیں ہو میں کیا سلوک کر سکتا ہوں تمہارے ساتھ۔“

میرے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلتی چلی گئیں آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹ سی گئیں تھیں۔
 ”بتاؤ اسے کہ تم نے منت کی تھی میری تب میں نے تم سے نکاح کیا ہے۔ اور یہ کہ تم میرے ساتھ رہنا
 پسند کرتی ہو وہ تمہاری تلاش ترک کر دے۔“ ایک ہاتھ سے میرے بالوں کو دبوچے دوسرے سے انہوں نے چٹاخ
 ہٹاخ کئی تھپڑ میرے منہ پر برسائے تھے۔ میں بے دم سی ہو کر دوبارہ بیڈ پر گر گئی۔ میرے پاس میری ہار کے سوا کوئی
 ہمارہ نہیں تھا۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ میں نے عون بھی اسے وہ سب کہہ دیا جو کہنے کو نہ میرا دل آمادہ تھا نہ
 زبان مگر مجھے یہ سب کہنا پڑا تھا تو اس کی وجہ ابوداؤد کی بربریت تھی۔ مجھے نہیں پتا عون بھیانک نے میری بات کا کس حد تک
 یقین کیا یا مجھ سے یہ سب کچھ سن کر ان کی کیسی حالت ہوئی۔ البتہ ابوداؤد کی آنکھوں میں میں نے واضح فتح کا خمار اترتا
 دیکھا تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لیتے مسکراتے رہے تھے اور میں ایک بار پھر گہری تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔



یہ جو ضبط داد ہے عشق کا مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں
 یہ تو زندگی کا اصول ہے کبھی اپنا کوئی ہوا نہیں
 یہ جو سلسلہ ہے اک درد کا یہ تحفہ یونہی ملا نہیں
 تو جان کر بھی جس سے انجان ہے وہ راز میں نے کہا نہیں
 مجھے اپنی خبر تو ہے مگر تیری سوچ کا کچھ پتا نہیں
 یہ جو آنسو ہے میری آنکھ میں بے سبب تو یہ بہا نہیں
 یہ صدا سی جو ہے گونجتی وہ لفظ تو نے کہا نہیں
 میرا جرم ہے میری سادگی میری اور کوئی خطا نہیں
 مجھے نہیں پتا تھا میں کتنی دیر غافل رہی تھی۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو داؤد کے ساتھ ایک اجنبی
 چہرہ بھی دکھائی دیا تھا۔ وہ شاید ڈاکٹر تھا۔ مجھے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اور ڈاکٹر ابوداؤد کو میری طبیعت کے حوالے
 سے ہی کچھ بتا رہا تھا۔ میرا ذہن سویا سویا سا تھا۔ کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔ میں نیم جان سی پڑی رہی تھی۔ کچھ
 دیر بعد میں نے ابوداؤد کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا تھا۔

”حجاب آریو آل رامیٹ؟“

میں نے جلتی اور دکھتی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل ذرا سا کھولا۔ وہ میرے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ میں
 بے اختیار ہو کے سسک پڑی۔

”مجھے چھوڑ دیں ابوداؤد مجھے جانے دیں۔ میرے ساتھ ایسا مت کریں پلیز!“

الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر میرے ہونٹوں سے بکھرے تھے۔ میں شدید کرب میں مبتلا تھی۔ ابوداؤد کے
 پہرے پر عجیب سا تاثر پھیل گیا۔ وہ کچھ دیر مجھے یونہی دیکھتے رہے تھے۔ ہونٹ بھیچے بالکل خاموش۔
 ”کچھ کھالو۔ پھر دوالینی ہے تمہیں۔“

وہ خاصی تاخیر سے بولے تھے مگر وہ کچھ بولے تھے جس میں میری قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے اندر جو موہوم سی امید تھی وہ بہت بُری طرح سے ٹوٹی تو آنکھوں سے سیل رواں بہتا کنپٹیوں میں جذب ہونے لگا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے پہلے مجھے بوائے انڈیا ایک سلاٹس کھلایا اور چائے پلائی تھی پھر اس کے بعد دوا دی۔

”تمہیں ٹھیک ہونا ہے۔ اس لیے کہ مجھے ابھی تمہاری ضرورت ہے۔“

”انتقام پورا کرنے کی خاطر.....؟“

میں خود اذیتی کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ زہر خند سے ہنسے۔

”اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

ان کی آنکھوں میں کس درجہ سفاکیت تھی۔ میری روح لرز اُٹھی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ میرے دل میں ان کے حوالے سے گھن کے احساس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھ گئے۔ ہاتھ لے کر انہوں نے لباس چینج کیا تھا۔ پھر خود کو اچھی طرح پرفیوم میں بسایا۔ بال سنوار کر وہ الماری کی جانب بڑھے تھے پٹ وا کر کے انہوں نے لمبی گردن والی شیمین کی بوتل نکالی تھی۔ کچھ دیر جیسے تذبذب کی کیفیت میں کھڑے رہے۔ پھر سر جھٹک کر بوتل واپس رکھ دی۔ میں نیم والی آنکھوں سے ان کی نقل و حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ اس پل ان کا سیل فون مدھر سروں میں گنگنانے لگا تھا۔ وہ خفیف سا چونکے اور گردن موڑ کر ٹیبل پر پڑے سیل فون کو گھورا پھر ہاتھ بڑھا کر کال ریسو کر لی تھی۔

”ہاں سمیع بولو!“

”گڈ! اس کی تمام کاروائیوں کو نگاہ میں رکھو۔ دیکھو اگر وہ اس سمت آنے کی کوشش کرے تو مجھے وقت پر آگاہ کرنا۔ کوتاہی نہیں ہونا چاہیے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“

آخری فقرہ انہوں نے پھنکارنے کے انداز میں ادا کیا تھا۔ سیل فون کو چار چنگ پر لگا کر وہ ایک بار پھر میری جانب متوجہ ہوئے میں نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔ وہ بچے تلے قدموں کے ساتھ میری جانب آئے تھے پھر میرے بازو میں لگی ڈرپ کو ہٹا دیا تھا۔ متاثرہ جگہ پر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انہوں نے کاٹن رکھ کر بند تاج چپکادی۔

”کیسا محسوس کر رہی ہو اب؟“

ان کی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر آکر ٹھہر گئیں۔ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا میں ہونٹ بھیچے پڑی رہی۔ انہوں نے بچھ دیے مجھے دیکھا پھر پلٹ کر تمام لائٹس بجھا کر نائٹ بلب روشن کر دیا۔ شرٹ اتار کر سائیڈ پر پھینکی اور آہستگی و نرمی کے ساتھ میرے بستر میں گھس گئے۔ مجھے لگا تھا میرا دل خوف سے بند ہو جائے گا۔

”اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے؟ اچھا خاصا ہنڈ سم ہوں یار۔“

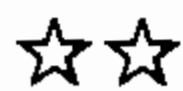
مجھے دہشت زدہ محسوس کر کے وہ میرا گال تھپک کر مگر ذرا کھسیا کر ہنسے تھے۔ میری آنکھیں بے بسی کے واضح اظہار کے طور پر آنسو بہانے لگیں۔

”آج کی رات مجھے معاف کر دیں ابو داؤد! میری طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے پلیز پلیز!“
میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر باقاعدہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ ابو داؤد کا چہرہ جانے کس
احساس کے تحت بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔ آنکھیں لہو چھلکانے لگیں۔

”بکو اس بند کرو۔ اس بدتمیزی کے جواب میں شوٹ کر ڈالوں گا تمہیں۔“
شدت غیض سے ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ میں سہم کر چپ ہو گئی۔ وہ کتنی دیر تک گہرے گہرے
سانس بھر کے جیسے اپنے طیش پر قابو پاتے رہے تھے۔ اور میں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ خود کو ان کی
وحشت کا نشانہ بنانے کے لیے ہمتیں مجتمع کرتی رہی۔

”سو جاؤ۔ مجھے لگ رہا ہے اگر میں نے تمہیں چھو لیا تو تم صدے سے فوت ہو جاؤ گی۔ اور میں اتنی
آسان موت تو نہیں چاہتا تمہارے لیے۔“

معا ان کی آواز سے مجھے جیسے زندگی کا مژدہ ملا تھا۔ میں نے غیر یقینی سے آنکھیں پھیلا کر انہیں
دیکھا۔ ان کے چہرے کے وجہ خدو خال میں دبا دبا غصہ تھا۔ پھر انہوں نے میری طرف سے کروٹ بدل لی۔
میرے اندر جو غضب کا خوف و ہراس تھا جیسے ایک دم سے جاتا رہا۔ میں کچھ دیر ششدر سی پڑی رہی پھر میرے
ہونٹوں پر ایک شکستہ مسکان بکھر گئی تھی۔ میں ذرا پرسکون ہوئی تھی اور اپنے اوپر کھینچ کر سونے کی کوشش کرنے
لگی۔ نیند کو مجھ پر مہربان ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہ رات کا نہ جانے کونسا حصہ تھا جب کسی احساس سے
ایک بار پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں میں نے ابو داؤد کو اپنے بے حد نزدیک دیکھا
تھا۔ مجھے اپنا آپ ہواؤں میں معلق محسوس ہوا تھا۔ میری حیات ساکت رہ گئی تھیں۔ وہ ناقابل یقین متحیر کرنے
والا منظر تھا۔ ابو داؤد شاید حواسوں میں نہیں تھے۔ وہ جو زخم لگانے کے ہنر سے ہی آشنا تھے بھلا مسیحائی کیسے کر سکتے
تھے۔ مگر ایسا ہو رہا تھا۔ ابو داؤد کے لمس میں نرمی تھی لگاؤٹ اور خوشبو تھی۔ عجیب عقیدت بھرا سا انداز تھا ان کی
محبت میں، وہ میرے زخموں کو پہنچ رہے تھے۔ وہ میرے درد کو چن رہے تھے۔ یہ جتنی بھی ناقابل یقین بات ہوتی
مگر اس سے کئی گنا بڑھ کر طمانیت آمیز تھی۔ یہ صرف انتقام کے جذبے کی کہانی تو نہیں تھی۔ اس میں کوئی اور
احساس بھی پوشیدہ تھا۔ اللہ جانے یہ میری خوش فہمی تھی یا اس کا حقیقت سے بھی کوئی تعلق تھا۔ بہر حال جو بھی تھا ابو
داؤد کے اندر سے اچھائی کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی سی مگر نیکی موجود تھی۔ جسے ابھارا جاسکتا تھا۔



ہم نازک نازک دل والے، بس ایسے ہی تو ہوتے ہیں
کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں، کبھی دل میں خواب پروتے ہیں
کبھی محفل محفل پھرتے ہیں، کبھی ذات میں تنہا ہوتے ہیں
کبھی چپ کی مہر سجاتے ہیں، کبھی گیت لبوں پر لاتے ہیں
کبھی سب کا دل بہلاتے ہیں، کبھی خود میں تنہا ہوتے ہیں

کبھی شب بھر جاگتے رہتے ہیں، کبھی لمبی تان کے سوتے ہیں
ہم نازک نازک دل والے بس، کچھ ایسے ہی تو ہوتے ہیں

اس سے اگلی صبح میں بہت دیر سے بیدار ہوئی تھی۔ میرے پہلو میں جہاں رات ابوداؤد موجود تھے اب خالی تھا۔ میں نے یونہی لیٹے لیٹے گردن موڑ کر دیکھا۔ واش روم کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر تاریکی تھی۔ اس کا مطلب وہ وہاں بھی نہیں تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر بالوں کو سمیٹتے میری نظر اپنے داہنے جانب قد آدم آئینے کی جانب اٹھ گئی تھی۔ میرا چہرہ استا ہوا اور زرد روٹھا آنکھیں شدت گریہ سے سوجھ کر سیاہی مائل ہو رہی تھیں۔ گردن کے نیچے اور اطراف میں کئی چھوٹے بڑے داغ بے حد نمایاں تھے۔ کچھ سگریٹ کے تھے اور کچھ دانتوں کے۔ میں نے ہاتھ کی پوروں سے انہیں چھوا اور گہرا سانس کھینچ کر پھر سے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپٹنے لگی۔ میرے وجود پر ابھی تک وہ عروسی لباس تھا جو ابوداؤد نے مجھے نکاح کی رات پہننے کو دیا تھا۔ میں خود کو سمیٹ کر اٹھی اور آہستگی سے چلتی وارڈ روب کی جانب آ گئی۔ وہاں ابوداؤد کے ہی کپڑے تھے۔ میں کچھ پریشانی کے عالم میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یہ بھاری لبادہ میرے وجود کو جیسے کاٹ رہا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک پر میں نے چونک کر گردن موڑی۔ چوکھٹ میں ایک ملازمہ ٹائپ لڑکی موجود تھی۔

”بیگم صاحبہ ناشتہ یہیں لا دوں؟؟“

میں اسے بغور دیکھ رہی تھی ہاتھ کے اشارے سے اندر بلا لیا۔ وہ کم عمر تھی اور کچھ کم گو بھی جھجکتی ہوئی میرے پاس آئی تھی۔

”ابوداؤد کو بلاؤ۔ کہاں ہے وہ؟“

”آپ صاحب کی بات کر رہی ہیں؟“ وہ تو گاڑی لے کر صبح سے کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ کہہ گئے تھے آپ کا دھیان رکھوں۔ جب جاگ جائیں تو ناشتے کا پوچھ لوں۔

”کب تک آئیں گے بتایا نہیں؟“

میں نے اٹھ کر دوپٹہ اوڑھتے ہوئے پوچھا یہ وہ دوپٹہ تھا جو میں اوڑھ کر یہاں آئی تھی۔

”نہیں جی وہ نوکروں کو کیوں بتائیں گے بھلا؟“

میں نے گہرا سانس کھینچا پھر اسے دیکھ کر نرمی سے بولی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟ یہ دیکھو یہ جو دوپٹہ ہے نا اس کے ساتھ کا میرا سوٹ بھی تھا۔ مگر اب نہیں مل رہا۔“

”میرا نام زریںہ ہے جی! اور یہ سوٹ آپ کا میں نے کل دھویا تھا۔ استری کرنے کو رکھا ہوا

ہے۔ لا دوں؟“

”ہاں زریںہ! بہت شکریہ پلیز جلدی لا دو۔“

”میں ابھی استری کر کے لاتی ہوں جی!“

وہ سرعت سے پلٹ گئی۔ اگلے دس منٹ بعد وہ پھر آئی تو اس کے بازو پر میرا استری شدہ لباس تھا۔

”ناشتہ کس چیز کا لیس گی جی؟“

وہ دیہاتی تھی اور پنجابی لہجے میں اردو بولتی تھی۔ مجھے وہ بہت معصوم اور پیاری لگی۔

”ایسا کرو زرینہ اپنی پسند کا ناشتہ تیار کر لو۔ پھر ہم اکٹھے ناشتہ کریں گے۔“

میرے دوستانہ فقرے پر وہ آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگی پھر بے ساختہ کانوں کو ہاتھ لگاتی پلٹ کر چلی گئی۔ میں آہستگی اور بے دلی سے مسکرا دی۔ ہاتھ لے کر میں نے کپڑے بدلے تھے۔ اور بالوں کو سمیٹ کر دروازہ کھولتی باہر آ گئی۔ موسم سرما کا یہ ایک روشن دن تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ میں برآمدوں کے پر حرارت ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں آئی تو یہ احساس اور بڑھ گیا تھا۔ کوٹھی کا بیرونی حصہ بھی اندرونی حصے کی طرح شاندار تھا۔ محرابی دروازے دبیز کارپٹ کمروں اور برآمدوں میں کود کچھ چکی تھی۔ ایسے ہی کارپٹ بیڑھیوں پر بھی نظر آئے تھے۔ بھاری پردے اور فانوس ویسی ہی جدید آرائش جو پر شکوہ عمارتوں کا خاصا ہوا کرتی ہے۔ ابو داؤد کے رات کے موصلا افزا رویے نے میرے اندر زندگی کی دم توڑتی خواہش کو جیسے پھر بیدار کر دیا تھا۔ گھوم پھر کر گھر دیکھنا اس خواہش کی وجہ سے تھا۔ سرد ہوا میرا باریک آنچل اڑانے لگی ساتھ میرے بال بھی۔ میں یونہی چہل قدمی کے انداز میں وسیع و عریض کوٹھی کو گھوم پھر کے دیکھتی رہی پھر چھت پر آ گئی۔ بڑی اچھی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ دور تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر مکشائل مل کی وسیع عمارت نظر آتی تھی۔ رہائشی حصے اور مل کو ایک پرائیویٹ کشادہ سڑک ملائی تھی۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر جی ٹی روڈ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کیکر کے گھنے درختوں کے اندر گا ہے ہکا ہے کسی تیز رفتار گاڑی کا شیشہ چمک دکھا کر اوجھل ہو جاتا تھا۔ دور افتادہ ہارن بھی سنائی دیتے تھے۔ میں کچھ وہیں مہلتی رہی۔ حدت آمیز دھوپ نڈھال تھکے ماندے وجود کو بھلی لگ رہی تھی۔ معاً ہوا کے جھونکوں میں تیزی آنے لگی۔ بالوں کی لٹیں بل کھا کھا کر میرے رخساروں سے لپٹ رہی تھیں۔ میں نے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور دوپٹہ سنبھالتی نیچے آ گئی۔ زرینہ کچھ پریشان سی مجھے پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے لپکتی آئی۔

”آپ کہاں چلی گئی تھیں بیگم صاحبہ!“

”چھت پر تھی۔ ناشتہ تیار ہو گیا؟“

”ہاں جی آجائیں۔“ معاً وہ ٹھٹھکی۔

”کہاں کھائیں گی۔ کمرے میں یا؟؟“

”نہیں کچن میں تمہارے ساتھ“

”مم میں.....!“ وہ گھبرائی مگر میں نے نرمی سے اس کا گال تھپکا تھا۔

”دیکھو میں اکیلی کچھ نہیں کھا سکتی۔ تمہیں میرا ساتھ اس لیے بھی دینا چاہیے کہ میں بھوکی نہیں رہنا چاہتی۔“

”مم مگر بیگم صاحبہ!“

وہ کچھ اور ہچکچائی مگر میں نے اسے باتوں میں لگا لیا تھا۔ وہ چھوٹی سی تھی مگر بہت مہارت سے ہر کام

کرتی تھی۔ آملیٹ، پرائٹھے، چائے کا ناشتہ اس نے اتنے مزے کا بنایا تھا کہ میں دوپرائٹھے کھا گئی۔

”صاحب کہہ رہے تھے آپ کو دو اضرو رکھلاؤں۔“

”میں لے لوں گی۔ تم پریشان مت ہو۔“

چائے کا بھاپ اڑاتا مگ اٹھائے میں اس کا گال تھکتی کچن سے نکل آئی۔ مگر اندرونی حصے کی جانب بڑھتے میرے قدم ٹھٹھک کر رک گئے تھے۔ چار چاک و چوبند مسلح پولیس اہلکاروں کے ساتھ اسٹک کے سہارے چل کر تیزی سے اندرونی حصے کی جانب بڑھتے ہوئے وہ عون بھیا ہی تھے۔ چائے کا مگ میرے بے جان ہو جانے والے ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر جا گرا۔ مگ کرنے کی آواز پر ہی وہ لوگ متوجہ ہوئے تھے اور اگلے لمحے میں نے عون بھیا کو ٹھٹھک کر رکے دیکھا۔

”وہ دیکھیں آفیسر! میں نے کہا تھا نامیری بہن اس خبیث کی تحویل میں ہے۔“

عون بھیا نے چلا کر کہا تھا اور پھر اسٹک کے سہارے کسی قدر لڑکھڑا کر آگے بڑھتے میرے نزدیک آگئے۔

”میں پتھر کے بت کی طرح سے ساکن تھی۔“

”حجاب! گڑیا تم ٹھیک ہونا؟“

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنے بازو کے نرم حصار میں مقید کر لیا۔

”مسٹر عون! ہم آپ کی سسٹر سے کچھ سوالات کرنا چاہیں گے۔“

وردی میں ملبوس اسماٹ سے پولیس آفیسر نے کسی قدر کھر در ری آواز میں بھیا کو مخاطب کیا۔

”آفیسر حجاب آپ سے ضرور تعاون کرے گی لیکن پلیز آپ یہاں سے تو نکلیں۔ وہ بہت خطرناک

ہے۔ اگر وہ پہنچ گیا تو حجاب کو اپنی تحویل سے نکلتے دیکھ کر وہ اسے شوٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا آپ اسے نہیں جانتے۔“

بھیا زور سے چیخے تھے۔ آفیسر کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت ابھری پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو

واپس مڑنے کا اشارہ کیا تھا۔ اور وہ بھیا کی جانب پلٹا۔

”مسٹر عون آپ خاتون کے ساتھ چل کر گاڑی میں بیٹھیں۔ میں اس لڑکی سے چند سوالات کر کے

آتا ہوں۔“

عون بھیا نے سرکواشات میں جنبش دی تھی پھر مجھے یونہی بازو کے حلقے میں لیے گیٹ سے باہر آئے

اور وہاں باہر کھڑی پولیس جیپ میں بیٹھ گئے تھے۔

”گڑیا تم ٹھیک ہونا؟“

بھیا کے چہرے پر کتنی وحشت تھی یہ سوال پوچھتے وہ مجھ سے نظریں چرا رہے تھے۔ نظریں ملانے کی

ہمت تو مجھ میں بھی نہیں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آئی ان کی اس بات کا کیا جواب دوں۔ کیا میں واقعی ٹھیک تھی؟ پولیس

آفیسر تقریباً دس منٹ کی تاخیر کے بعد گاڑی میں آکر بیٹھا تھا اس کے بیٹھتے ہی گاڑی کا بھاری انجن غرایا اور

گاڑی بہت سرعت سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

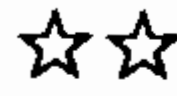
”مسز عون آپ کا کیس خاصا کمزور ہو رہا ہے۔ لڑکی کے بیان کے مطابق ابوداؤد آپ کی سسٹر کے ماتھ نکاح کر چکا ہے۔ آپ انہیں لے جاتو رہے ہیں مگر مجھے نہیں لگتا زیادہ دیر اپنے پاس رکھ سکیں۔“

”سب جھوٹ ہے فراڈ ہے۔ میں بتا چکا ہوں نا آپ کو۔ بہت کرپٹ ہے وہ انسان۔ اس نے خود اپنے گندے کارنامے فون پر بتائے ہیں مجھے۔“

عون بھیا جیسے پھسک کر بولے تھے۔ شدت غیض سے ان کا چہرہ سرخ ہو کر دکھنے لگا تھا۔

”کنٹرول پور سلیف مسز عون!“

آفیسر نے کسی قدر نرمی سے ان کا کندھا تھپکا۔ بھیا ہوٹ بھینچے سر جھٹک کر جیسے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ہنوز گم صم بیٹھی تھی۔ مجھے قطعی سمجھ نہیں آرہی تھی اپنی اس کیفیت کی۔ آیا میں ابوداؤد سے بات مل جانے پر خوشی محسوس کروں۔ یا اپنا سب کچھ گنوا دینے پر ماتم؟



جو ذرا کسی نے چھیڑا تو چھٹک پڑیں گے آنسو

کوئی مجھ سے یوں نہ پوچھے تیرا دل ادا اس کیوں ہے

مجھے لگتا تھا کسی نے میری زندگی سے سکون کو چھین لیا ہے۔ میں گھر واپس لوٹ آئی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جہاں میں نے اپنی عمر کی انیس بہاریں دیکھی تھیں۔ یہاں سب میرے اپنے تھے۔ میرا خیال رکھنے والے مگر ان دوراتوں میں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ ماما پاپاسیت سب مجھ سے نظریں چرائے پھرتے۔ ماما دل جوئی بھی کرتیں تو اس میں ایسی کیا کمی تھی کہ میرے زخموں پر کھرٹڈ نہیں بن رہے تھے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ ماما ابوداؤد سے بے حد خائف ہیں۔ جس شب ابوداؤد بد معاشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے یہاں سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ جس طرح انہوں نے عون بھیا کو بے دریغ زخمی کیا تھا۔ اس سے ماما کا خائف ہونا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

”میں نے منع کیا تھا عون کو صبر کرے اس سب پر مگر وہ انا کا ناک کا مسئلہ بنا کر بیٹھ گیا ہے۔ شادی تو تمہاری ہونا تھی۔ فراز سے نہ سہی اسی سے سہی۔ مگر عون سمجھتا نہیں ہے۔

ماما ہاتھ مسئلے ہوئے ایک اضطراری کیفیت میں مبتلا لگ رہی تھیں۔

”وہ تم سے تصدیق چاہے گا بیٹے تم مان جانا۔“

انہوں نے کسی قدر جھجک کر کہا۔ میں ٹھٹھکتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔ دراصل مجھے ان کی بات سمجھنے میں اشواری ہوئی تھی۔

”وہ کہتا ہے اس نے تم سے نکاح کیا ہے کیا یہ سچ ہے؟“

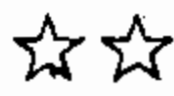
”جی ماما! میں سسکی۔“

”عون تم سے بات کرے تو تم کہہ دینا تم ابوداؤد کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔“

ماما کی بات پہ میں نے غیر یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔ وہ بے ساختہ نظریں چراگئیں۔

”دیکھو بیٹے شروع میں اکثر شادی شدہ زندگی میں عورت کو مشکلات سے گزرنا اور قربانیاں دینا ہی پڑتی ہیں۔ محبت، خلوص اور اطاعت سے سخت سے سخت گیر انسان بھی موم ہو جاتے ہیں۔ تم اسے محبت سے رام کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر تم بھی عون کی ہمنوا ہو گئیں تو یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تم نے اس دن دیکھا نا۔ دیکھا نا وہ کیسے مرنے مارنے پر اتر آیا تھا۔ وہ میری گودا جاڑ دے گا۔ وہ میرے عون کو نہیں چھوڑے گا۔“

مما پہلے سسکیوں سے روتی تھیں پھر گھٹ گھٹ کر رونے لگیں میں ساکت و جامد بیٹھی انہیں دیکھتی رہی تھی پھر میں نے نم آنکھوں سے ان کے ہاتھ کو چوما تھا اور کچھ کہے بغیر ان کے گلے لگ کر خاموش آنسو بہائے گی۔ میں نے خود کو ایک بار پھر قربانی کے لئے پیش کر دیا تھا۔



آج پھر درد و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر تیرے خیال کے پھول
ترک الفت کے دشت سے جن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھول
تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تیری یاد پر چڑھا آئے
باندھ کر آرزو کے پلے میں
ہجر کی راہ اور وصال کے پھول

عیسیٰ بھائی نے عون بھیا کی ٹانگ کی پٹیاں چنچ کی تھیں پھر کچھ دیر فریو تھراپی کی مشقیں کراتے رہے۔ میں کھڑکی میں کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ عیسیٰ بھائی یقیناً کلینک جا رہے تھے۔ انہوں نے بھائی کو کچھ ہدایات دیں۔ پھر رسٹ واپس پر نگاہ کی اور اپنا بیگ اٹھائے پورج کی جانب چلے گئے۔ عون بھیا جو انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے گہرا سانس بھر کے اچانک سر اٹھا کر کھڑکی کی جانب مجھے دیکھا۔ میرے چہرے پر جانے کیا تھا کہ وہ کچھ دیر یونہی مجھے دیکھتے رہنے کے بعد اٹھ کر لان سے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ میرا ذہن بالکل خالی تھا۔ میں پھر بھی وہیں کھڑی رہی تھی۔ جب دروازہ ناک کرتے عون بھیا اندر آ گئے۔

”بیٹھ جاؤ ہنی! مجھے تم سے کچھ بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔“

”اسٹک سائیڈ پر رکھ کر انہوں نے رسائیت سے مجھے مخاطب کیا۔“

”جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ ہرگز بھی بھلانے والا نہیں ہے۔ حجاب میں نے پوری کوشش کی تھی تمہیں

اس بھڑکتی آگ سے بچالوں مگر میری توقع سے کہیں بڑھ کر وہ خبیث ثابت ہوا۔ یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ وہ اپنے مذموم ارادوں میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔ مجھے اب تم سے صرف یہ کہنا ہے جو کچھ ہوا اسے کسی بھیا نک خواب

کی طرح بھول جاؤ۔ تم میرے لیے بہت اہم ہوئی! اس حادثے کے بعد میں ٹیکل مردوں کی طرح نہیں سوچ رہا ہوں۔ مجھے ہر صورت تمہیں اس خبیث کے شر سے بچانا ہے۔ یہ میرا احسان نہیں تم پر تمہارا بھائی ہونے کے ناطے میرا فرض ہے۔ اور اس گناہ کا ذرا سا ازالہ بھی جو میری کم فہمی کی بنا پر وہ تمہاری زندگی میں اس حد تک انوالو ہو گیا۔

انہوں نے کچھ دیر تک توقف کیا تھا پھر اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں دوبارہ گویا ہوئے تھے۔
 ”تمہیں خود کو مضبوط بنانا ہے حجاب! اب حالات رخ بدلنے والے ہیں۔ عین ممکن ہے۔ وہ ہمیں کوٹ تک گھسیٹ لے۔ مگر تمہیں کہیں بھی ہمت نہیں ہارنی!“

میں نے جھک کر سر اٹھا کر نمناک نظروں سے انہیں کچھ دیر دیکھا تھا پھر آہستگی سے بولی تھی۔
 ”میں نہیں چاہتی ہوں بھیا کہ یہ سب ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں میں اپنا گھرا جاڑنا نہیں چاہتی۔ ابو داؤد بڑے سہی مگر میں انہیں بطور شوہر تسلیم کر چکی ہوں۔“

”کونسا شوہر اور کیسا گھر؟ تم پاگل ہوئی! تمہیں صرف ٹریپ کیا گیا ہے۔ وہ نکاح جعلی تھا۔ محض دکھاوا۔ وہ سراسر فراڈ انسان ہے۔ اس نے خود اپنی زبان سے مجھے اس فراڈ کی کہانی سنائی ہے۔ وہ کیسا آلودہ تعلق ہوگا جو تمہارا اس سے قائم ہوگا اندازہ ہے تمہیں؟“

عون بھیا جیسے شدید اشتعال کے عالم میں پھٹ پڑے تھے۔ ان کی آواز میں اتنا طیش اتنی تلخی اور اتنی کاٹ تھی کہ میں خود کو پارہ پارہ ہوتا محسوس کرتی جیسے ہواؤں میں بکھر گئی۔ شدید حیرت غیر یقینی اور دکھ کی کیفیت نے مجھے اپنے حصار میں اس طرح سے جکڑا تھا کہ میری قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی مجھے یاد آیا عون بھیا نے اس قسم کی بات ابو داؤد کے گھر سے مجھے اپنے ساتھ لاتے ہوئے پولیس آفیسر سے بھی کہی تھی۔ یہ بات جس حد تک بھی درست تھی یہ الگ بات تھی میں صرف خود کو گزر جانے والی اس تباہ کن رات کے تصور سے خس و خاشاک ہوتا پارہی تھی۔ ابو داؤد نے مجھے ایک اور سنگین دھوکہ دیا تھا۔ ایسا دھوکہ جس کے بعد شاید احساس گناہ مجھے کبھی سکھ کا سانس نہ لینے دیتا۔ میری آنکھیں جل اٹھیں تھیں میرا سینہ غم سے بھر گیا۔ یہ کیسا انکشاف ہوا تھا جو جیتے جی مجھے برزخ میں اتار گیا تھا۔ میں اس دھچکے سے سنبھل نہیں پائی تھی کہ ایک اور افتاد ٹوٹ پڑی۔ اس سے پہلے کہ میں یا بھیا کچھ سنبھلتے۔ چند پولیس آفیسر ایک لیڈی پولیس ورکر کے ساتھ دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔
 ”آپ مسز ابو داؤد ہیں؟“

لیڈی پولیس ورکر نے کرخت آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ میں جواب میں کچھ کہنے کی بجائے حواس ہانتہ سی اسے تکتے لگی۔

”ایکسکیوز می میم! واٹس یور پرابلم!“

عون بھیا خود کو سنبھال کر اٹھے اور لیڈی پولیس کو مخاطب کیا اس نے جواباً کاٹ دار نظروں سے عون بھیا کو دیکھا تھا۔

”مسٹر پرابلم ہمیں نہیں آپ کو ہے۔ کسی کی بیوی کو دن دھاڑے اغوا کر کے آپ جس بے جا میں

رکھنے کے جرم میں اندر بھی ہو سکتے ہیں۔“

دیکھیے آپ کو سراسر غلط انفارمیشن دی گئی ہیں۔ یہ میری سسٹر ہیں اور وہ آدمی ہرگز بھی اس کا شوہر نہیں ہے۔ جس بے جا میں اس آدمی نے رکھا ہوا تھا میری بہن کو۔“

”بہت ضبط کے باوجود عون بھیا کا لہجہ آخر میں ترش ہو گیا تھا۔ لیڈی پولیس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔“

آپ کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کا پروف ہے؟

وہ اسی مخصوص کرخت انداز میں بولی تھی جس میں اب طنز کی بھی آمیزش تھی۔

”پروف تو اس آدمی کے پاس بھی نہیں ہے جو یہ بکواس کر رہا ہے۔“

عون بھیا پھٹ پڑے۔ وہ بہت سلیف کنٹرول رہتے تھے مگر اب ان کی ذہنی حالت بے حد مخدوش تھی۔ مماقت چہرے لیے دروازے کے پاس کھڑی ٹکر ٹکر ہم سب کی صورتیں دیکھ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر یونہی لگتا تھا وہ کسی بھی پل بے ہوش ہو کر گر پڑیں گی۔

”دیکھو مسٹر آپ ہمارا خواہناؤ نام ویسٹ کر رہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ہم جھک مار رہے ہیں۔ یہ نکاح نامہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے بڑھ کر آپ کو کیا پروف چاہیے کہ آپ کی سسٹر کے مسٹر داؤد شرعی و قانونی شوہر ہیں۔“

اسمارٹ پولیس آفیسر نے ایک کاغذ عون بھیا کے سامنے لہرایا۔ عون بھیا نے ٹھٹھک کر اس کاغذ کو دیکھا تھا اسے پکڑا اچھی طرح جانچ پرکھ کی۔ اس دوران ان کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ وہ جیسے ڈھے سے گئے۔

”ہو گئی آپ کی تسلی؟ اب ہم لے جاسکتے ہیں نامسز ابو داؤد کو؟“

لیڈی پولیس ورکر کا لہجہ گہرے طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ عون بھیا کا چہرہ متغیر تھا وہ زمین پر نظریں گاڑھے کھڑے تھے۔ مجھے لگا وہ جیسے ابھی تیورالے کر گر جائیں گے۔ میں لپک کر ان کی جانب بڑھنا چاہتی تھی مگر لیڈی پولیس ورکر نے میرا ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لیا۔

”چلیں خاتون! باہر تمہارا شوہر تمہارا بہت بے چینی سے منتظر ہے۔ تمہارا!“

وہ شاید ایک ہی لمحے میں بات کرنے کی عادی تھی۔ اور وہ کاٹ دار طنزیہ انداز تھا۔ میں بے بس سی کیفیت میں چھلکتی آنکھیں لیے ایک طرح سے گھسیٹی ہوئی اس کی معیت میں باہر آئی۔ دائیں بائیں الرٹ پولیس اہلکار تھے۔ یہ رخصتی بھی انوکھی تھی۔ ایسی ذلت پتا نہیں کیوں بار بار میرا نصیب بن رہی تھی۔ گھر کے ملازموں نے ہی نہیں آس پاس کے گھروں اور کئی راہگیروں نے بھی یہ انوکھا تماشا بڑی جزیات سے دیکھا تھا۔ کاش میرے بس میں ہوتا میں زمین میں گڑ جاتی۔ میرا دل اتنی سبکی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

”یہ لیں جی اپنی امانت اور آئندہ سنبھال کر رکھیے۔“

لیڈی پولیس ورکر نے مجھے ابو داؤد کی جانب دھکیل دیا جو بہت مگن اور مطمئن انداز میں اپنی گاڑی کے کھلے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ شرمندگی اور توہین کے احساس نے میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کئی آنسو گرائے تھے۔ ابو داؤد نے نہایت بے تابانہ انداز میں مجھے تھام کر خود سے

لہا لیا اور ایک جذب اور ایک وارنگی کے عالم میں میرے چہرے کے نقوش کو بار بار ہونٹوں سے چھوا میرے آنسو پونجھے اور ایک بار پھر گلے لگا لیا۔ میں جانتی تھی یہ سب دکھاوا تھا اس کے باوجود ان کی یہ بے باکی مجھے لفت سے سرخ کر گئی۔

”تھینک یو سو مچ سر! میں بتا نہیں سکتا آپ نے مجھے کتنی لازوال خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔ اگین ٹھینکس!“ مجھے ساتھ لگائے لگائے وہ بے ساختہ چہک کر کہتے پولیس آفیسر سے مصافحہ کرنے لگے۔ آفیسر کی اہن آنکھوں میں خفیف سی مسکراہٹ جاگی!

یوہ یلکم! اٹس مائی ڈیوٹی! وہ جواباً خوشدلی کا مظاہرہ کرتا اپنے ماتحتوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ ابوداؤد نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے سہارا دے کر اندر بٹھایا۔ میں سرتاپا جیسے کسی طوفان کی زد میں تھی۔ میں نے آنسو بھری نظروں سے اپنے گھر کی جانب دیکھا۔ وہاں ویرانی تھی۔ ایک جان لیوا سناٹا اس کے در و دیوار سے لپٹ کر دہائی دیتا ہوا محسوس ہوا مجھے۔ پھر میری آنسو بھری آنکھوں میں یہ منظر دھندلا گیا تھا۔ میں خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ یہ احساس یہ خیال میرے لیے بے حد جان لیوا تھا کہ اس گھر اور اس گھر کے کیمینوں کو جو میری رگ جاں سے بھی قریب تر تھے شاید میں آخری بار دیکھ رہی تھی۔ اور یہ خیال مجھے پاگل کر رہا تھا۔ میری سسکیاں آہوں میں بدلی تھیں اور آہیں گھٹی گھٹی چیخوں میں۔ شاید میں یونہی آنسوؤں میں خود کو بہا دینے کی خواہش مند تھی۔

”بس کرو اب ختم کرو یہ ماتم! نہ تو میں ابھی مرا ہوں اور نہ تمہارا وہ بھیا! یہ آنسو بچا کر رکھ لو کسی ایسے موقع کے لیے۔“

ابوداؤد نے زور سے گیسر بدلتے ہوئے مجھے بے تحاشا جھاڑ پلائی مگر مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں اسی بے قراری اور وحشت سے روئے گئی تھی۔

”حجاب! چپ کر جاؤ میری اتنی بڑی کامیابی پر رو کر نحوست ڈالو گی تو میں تمہیں اٹھا کر چلتی ہوئی گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔“

وہ دھاڑے تھے میں جیسے ایک دم بھراٹھی۔

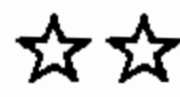
”ہاں پھینک دیں۔ مجھے مار ڈالیں ایک ہی بار۔ لمحہ لمحہ کی اس موت سے تو بچ جاؤں گی نا۔“ میں نے اسٹیرنگ سنبھال لے ان کے ہاتھوں کو ایک طیش کے عالم میں جھنجھوڑا تھا۔ گاڑی بے توازن ہو کر ڈول سی گئی۔ ابوداؤد کے چہرے پر بے تحاشا نفرا بھرا انہوں نے ہونٹ بھینچ کر شدید غیض کی کیفیت میں مجھے اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا تھا۔ میں اس طوفانی تھپڑ سے جیسے اڑ کر گاڑی کے دروازے سے ٹکرائی تھی۔

چوتھا حصہ

میرے احساساتِ حس طرح مفلوج تھے۔ میں اندازہ نہیں کر پائی مجھے کہاں چوٹ آئی تھی۔ ہاں یہ تھا کہ کچھ دیر تک میں اسی پوزیشن میں ساکن پڑی رہی تھی۔ یہاں تک کہ ابو داؤد نے ہی مجھے سیدھا کیا تھا۔ میرا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور ایک قسم کی بے ہوشی مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔

”حجاب! حجاب!“

انہوں نے میرے گال کو تھپتھا کر مجھے آوازیں دی تھیں مگر مجھے ان کی آواز کہیں بہت دور سے بہت مدھم سی سنائی دی تھی۔ پھر انہوں نے شاید مجھے پانی پلانا چاہا تھا میں نے اپنی گردن اور ہونٹوں پر نمی محسوس کی تھی اس کے بعد میری یہ سوجھ بوجھ کی صلاحیت بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ میں بالکل غافل ہو گئی تھی۔



میرے اعصاب اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ میں یوں بار بار حواس کھونے لگی تھی۔ جب دوبارہ میں ہوش کی دنیا میں لوٹی ابو داؤد میری جانب سے اچھے خاصے متفکر نظر آرہے تھے۔ میں اسی بیڈروم میں تھی جہاں ابو داؤد مجھے پہلے بھی لے کر آچکے تھے۔ ڈاکٹر میرے معائنے میں مصروف تھا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے ابو داؤد سے بہت دھیمے لہجے میں کچھ ڈسکیشن کی تھی۔ میں نیم جان سی آنکھیں موندے پڑی رہی۔ مجھے جیسے کسی چیز میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر کو رخصت کر کے ابو داؤد میرے نزدیک آ بیٹھے۔ پھر انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔ میں نے کوئی جنبش نہیں کی۔

”حجاب!“ ان کا لہجہ سرگوشی سے بلند ہر گز نہیں تھا۔

”آئی ایم ساری!“ وہ پھر میری طرف جھک کر بولے۔ میں خاموش بے حس پڑی رہی۔ البتہ میری بند آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے۔

”تم خود کو سنبھالو حجاب! پلیز ٹھیک ہو جاؤ“ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔

میرے اندر جیسے لمحہ لمحہ زندگی دم توڑ رہی تھی۔ مجھے ان کی کسی بات کا یقین نہیں تھا۔ انہوں نے جس انداز میں مجھے لوٹا تھا اس کے بعد میرے پاس کوئی امید باقی بچی ہی نہیں تھی۔

”آنکھیں کھولو مجھے دیکھو حجاب!“

اس فرمائش نے میرے اندر سرسراتی نفرت کو دو چند کر دیا۔ میں نے لاشعوری طور پر آنکھیں سخت

سے بچ لی۔

”حجاب!“ وہ جھک کر میرے بے حد نزدیک آ گئے۔ مجھے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ میں تڑپ کر فاصلے پر ہوئی تھی۔ ابو داؤد نے حیرت زدہ ہو کر میری اس حرکت کو دیکھا۔

”اتنی نفرت کرنے لگی ہو مجھ سے؟“

ان کے لہجے میں تلخی نہیں تھی تا سب تھا میں منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں روکنے لگی۔
 ”آپ نے مجھے مار ڈالا۔ ابو داؤد آپ نے مجھے پیٹ کیا۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا تھا سوائے اس کہ مجھے گنکار ہونے سے بچالیں۔“

میں زار و قطار روتے ہوئے کہہ گئی تھی۔ وہ ششدر ہونے لگے۔

”میں سمجھا نہیں حجاب!“

”آپ نے مجھ سے نکاح نہیں کیا نا؟ مجھے دھوکہ دیا ہے نا؟“

”تم سے کس نے کی یہ بکواس؟“

وہ بڑی طرح سے جھنجھلائے۔

”یہ سچ ہے نا؟“ میں نے ایک دم ان کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ میرے اندر غضب کی ٹوٹ پھوٹ

بج مکنی تھی۔

”یہ محض بکواس ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج تم میرے پاس نہ ہوتیں۔ وہ نکاح نامہ ہی تھا جس کی

بدولت تم میرے پاس ہو۔“

”وہ نکاح اصلی تو نہیں ہے نا؟“

میں نے پھر ان کا گریبان جھنجھوڑا۔ انہوں نے جواباً سر داہ بھری۔

کبھی پیغام دوستی کبھی مجھ سے بد گمانی!

تیری یہ بھی مہربانی تیری وہ بھی مہربانی!

میں نے ان کی بات پر جیسے کان ہی نہیں دھرے تھے۔ اور زور سے چیختی تھی۔

”مجھے بتائیں ابو داؤد آپ نے اتنا قبیح فعل کیوں کیا؟ مجھے بتائیں ورنہ میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔“

”تم خود کو شوٹ کرنا چاہتی ہو تو شوق سے کر لو۔ میں چاہتا تو یہی تھا مگر صورتحال کے اس رخ کو نظر

انداز نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال تو تم میری بیوی ہو اگر تمہیں یہ تعلق پسند نہیں تو ابھی طلاق دے دیتا ہوں یہ زبانی

کلامی ہوگی۔ کاغذی ثبوت نہ ہونے کی بنا پر تم اس بات کو ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہو گی اور یوں میری

کیپ کی حیثیت سے میرے ساتھ رہو گی۔ بولو منظور ہے؟“

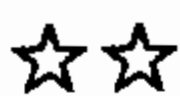
وہ کس درجہ نخوت اور بے نیازی سے کہہ کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔ مجھے لگا تھا اتنے گندے الفاظ سن

کر مجھے مر جانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں میں اتنی سخت جان اتنی ڈھیٹ کیوں ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا مجھے کسی

نے اُبلتے ہوئے آتش فشاں میں دھکیل دیا ہو۔ اتنی سبکی، اتنی تذلیل، میری رگیں جیسے کلتی چلی گئیں۔ اور وجود جیسے شدید تشنج کی حالت میں چلا گیا۔ ابو داؤد جیسے غیر مہذب انسان سے کسی شائستگی اور تہذیب کی امید عبث تھی غلطی میری ہی تھی کہ میں ان سے اُلجھ گئی تھی۔ مجھے یہ بات خود سمجھ جانی چاہیے تھی کہ اگر عون بھیا نے مجھے یہاں آنے دیا تھا تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ تو تھی۔

”آئندہ مجھ سے کوئی بھی فضول بات کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا۔“

وہ میری صدے سے ساکن پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر طنز سے کہتے پلٹ کر چلے گئے۔ پیچھے میں اکیلی رہ گئی تھی اپنے آپ سے لڑنے اور آنسو بہانے کو۔



کس قدر تکلیف دہ تھا آرزوؤں کا سفر

سلسلہ در سلسلہ سانحہ در سانحہ

اگلے دن میں نے بستر سے پیر نیچے نہیں اُتارا۔ عجیب سی شکستگی میرے اعصاب کو جکڑ کر بے کار کر چکی تھی۔ اور شبنم میرے لیے کھانا لے کر آئی میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ دل ہی نہیں مان رہا تھا کچھ کھانے کو ابو داؤد شاید کہیں گئے ہوئے تھے۔ سارا دن نظر نہیں آئے۔ رات کو جب وہ آئے میں اسی وقت واش روم سے نکلی تھی۔ نقاہت اور اعصابی شکستگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ میں واش روم تک آنے جانے میں ہی ہانپ کر رہ گئی تھی۔ ایک بار پھر سر بُری طرح سے چکرایا میں نے بے اختیار سنبھلنے کی غرض سے سہارے کو ہاتھ پھیلایا تھا۔ ابو داؤد نے لپک کر میرا ہاتھ ہی نہیں مجھے پورے کا پورا سنبھال لیا۔ میں اگلے لمحے ان سے دور ہٹ جانا چاہتی تھی مگر نقاہت اور آنکھوں میں اترتے اندھیروں نے مجھے بے بس کر ڈالا۔ ابو داؤد نے میری کمر کے گرد بازو حائل کیا تھا پھر مجھے نرمی سے سنبھال کر بیڈ تک لے آئے۔ بیڈ پر بیٹھنے کے بعد بھی انہوں نے میرا سر اپنے زانو سے نہیں ہٹایا تھا۔ پھر انہوں نے بہت توجہ اور نرمی سے میرے بال سمیٹ کر پیچھے کیے تھے۔ میں نے کسمسا کر پیچھے ہٹنا چاہا تو انہوں نے میرے بازو پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تھا۔

”ہر وقت کی ضد اچھی نہیں ہوتی حجاب! تمہارے سر کا زخم گہرا ہے یہ جو چکر شکر ہیں نا اسی چوٹ کا شاخسانہ ہیں۔ اب ہلنا نہیں میں تمہاری بینڈج چسبج کر رہا ہوں۔“

انہوں نے میرے بالوں کو جکڑے ہوئے کچر کو نکالا پھر زخم کو چیک کیا تھا۔ مرہم لگا کر پھر سے بینڈج ٹیپ چپکادی۔ پتا نہیں کیوں میری آنکھیں خاموشی سے بہتی رہی تھیں۔

”کیوں روتی ہو؟“

اس کام سے فراغت کے بعد ان کی نگاہ میں میرے آنسو آئے تو انہوں نے میری بھیگی آنکھوں پر ہونٹ رکھ کے سرگوشی کی۔ میں ان کی اس حرکت پر سن سی رہ گئی تھی۔

”حجاب تم بہت معصوم ہو بہت خاص پیاری اور محبت کے لائق! اگر تم سمجھو اگر تم یقین کرو تو جان من بات صرف انتقام کی نہیں ہے۔ تم مجھے اچھی بھی لگتی ہو۔“

وہ میرے بالوں میں بہت ملائمت سے انگلیاں چلا رہے تھے۔ میں ساکن پڑی تھی پڑی رہی
 انہوں نے غور سے مجھے دیکھا پھر نرمی سے باقاعدہ جھنجھوڑ دیا۔ انداز توجہ حاصل کرنے والا تھا۔
 ”کس سوچ میں گم ہو؟“

”مجھے اب آپ کی کسی بات کا یقین نہیں۔“ میں نے پھپھک کر کہا اور ایک جھٹکے سے ان سے الگ
 ہو گئی۔ ایک لمحے کو محض ایک لمحے کو مجھے لگا تھا ابوداؤد کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہو۔ مگر اگلے لمحے وہ نارمل تھے۔
 ”گڈ سمجھ دار ہو تم تو۔ میں بھی پاگل نہیں ہوں۔ بس ڈائلاگ جھاڑ رہا تھا۔ میں سچ تمہیں بتلا چکا
 ہوں اور سچ وہ تھا جو تم پر واضح ہو چکا ہے۔ تمہاری حیثیت میری داشتہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ وہ حلق کے بل چینے
 قے میں نے شدت کرب میں مبتلا ہوتے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ وہ سلگتے ہوئے دروازے کو ایک زور
 وار ٹھوکر رسید کرتے کمرے سے چلے گئے تھے۔“



آباد گھروں سے دور کہیں
 جب بنجر بن میں آگ جلے
 دل دکھتا ہے
 جب رات کا قاتل سناٹا
 پر ہول ہوا کے وہم لیے
 قدموں کی چاپ کے ساتھ چلے
 دل دکھتا ہے
 جب وقت کا نابینا جوگی
 کچھ ہنستے بستے چہروں پر
 بے درد رتوں کی راکھ ملے
 دل دکھتا ہے
 جب شہرگ میں محرومی کا نشتر ٹوٹے
 دل دکھتا ہے

کچھ دن مزید وہاں گزارنے کے بعد ابوداؤد مجھے اپنے ساتھ لاہور لیے چلے آئے تھے۔ البتہ اس
 سے پہلے انہوں نے مجھے شاپنگ کرا دی تھی۔ کپڑے جیولری کا سمسٹیکس۔ میں نے ہر طرح سے بے نیازی اور
 اتقلقی کا رویہ اپنائے رکھا۔ انہوں نے بھی اس دوران مجھ سے مشورے یا رائے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
 اور ان سفر بھی ہمارے بیچ زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ یہ سفر انہوں نے بائی روڈ کیا تھا۔ راستے میں دو تین جگہ پر
 قیام بھی کیا گیا۔ میں سمجھتی ہوں اگر ہمارے تعلق میں اتنی سرد مہری نہ ہوتی تو یہ یادگار سفر بن سکتا تھا۔ ابوداؤد کی

اماں اور بہنیں مجھے ابوداؤد کے ساتھ دیکھ کر انگشت بندھاں رہ گئیں
”یہ یہ تمہارے ساتھ کیسے؟“

بجائے میرا استقبال کرنے یا میری خیریت دریافت کرنے کے وہ اسی بھونچکے انداز میں آنکھیں
پھاڑے ابوداؤد سے مخاطب ہو گئی تھیں۔ میں جو پہلے ہی شرمندگی اور خجالت سے دو چار تھی کچھ اور بھی سبکی محسوس
کر کے رہ گئی۔

”میں نے کہا تو تھا اماں تجھ سے۔ یہ لڑکی اگر کسی کی بیوی بن سکتی ہے تو وہ ابوداؤد ہی ہو سکتا ہے۔“
ابوداؤد کے لہجے میں اپنی ذات کا گھمنڈ اور زعم تھا۔ میری آنکھیں جانے کس احساس کے تحت جل اٹھیں۔
”تو کیا بھگالایا ہے؟“ انہوں نے تیز ہو کر کہا تھا جواباً ابوداؤد زور سے ہنس پڑے۔

”مجبوری تھی نا سالا صاحب باعزت طریقے سے محترمہ کو ہمیں سوچنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ایسے کیا
کھڑی ہو سلام کرو نا اماں کو۔ تمہاری ساس ہیں۔“

نخوت بھرے انداز میں بات کرتے ہوئے انہوں نے مجھے کسی قدر غصے سے مخاطب کیا تھا۔ میں
نے آنسوؤں کی نمی اپنے چہرے پر محسوس کی تھی۔ مگر حکم تو ماننا تھا۔ جیھی گھٹی گھٹی آواز میں سلام کیا تھا۔ انہوں نے
جواب دیتے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر گردن موڑ کر بیٹی سے بولی تھیں۔

”جاؤ سارہ خانساں سے کہو چائے بنا لائے۔ شامی کباب ضرور لکوانا پاس کھڑے ہو کر۔“
سارہ آپا کے جانے کے بعد وہ مجھے کاندھے پر دباؤ ڈال کر اپنے پہلو میں بٹھاتے ہوئے خود بھی
بیٹھ گئیں۔

”داؤد تم کہاں جا رہے ہو؟ چائے تو پی لو۔“

”میں باتھ لے لوں چائے آپ میرے کمرے میں بھیج دینا۔“

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے انہوں نے اماں کی بجائے مجھے دیکھا تھا اور آنکھ کے اشارے سے
مجھے اپنے ساتھ کمرے میں چلنے کا کہا۔ میں نے فی الفور گڑ بڑا کر نگاہ گھاڑا وہ بدلاتھا اور کن اکھیوں سے اماں کو
دیکھا وہ بظاہر بے نیاز نظر آرہی تھیں۔ مجھے ابوداؤد کی یہ بے حجابی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی جیھی کان دھرے بنا
بیٹھی رہی۔ اماں نے ایک بار پھر ریموٹ کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر میک اپ زدہ بھاری جیولری
سے سجے چہرے تھے۔ میوزک کا بے ہنگم شور اور لمحہ بہ لمحہ کیمرے کے کلوز اپ میں آتے اداکار اور ان کے
تاثرات۔ یہ کوئی انڈین ڈرامہ تھا جس میں اماں پوری طرح غرق ہو گئی تھیں۔ فضا میں عصر کی اذان کی پکار اٹھی
مگر اماں نے ٹی وی کا دایوم کم نہیں کیا تھا۔ میں سخت جزبز ہوئی تھی۔

”اماں اذان ہو رہی ہے۔“ میں نے جیسے انہیں اطلاع دی۔

”ہاں مجھے پتا ہے۔“ جواباً انہوں نے بے نیازی سے کہا تھا اور آواز کا دایوم کچھ اور بڑھا دیا۔ میں
ششدر رہ گئی تھی۔ اسی دوران سارہ آپا چائے کے لوازمات سے بھری ٹرالی لیے چلی آئی تھیں۔

”بھابھی چائے لے لو۔“

سائرہ آپا نے ایک بڑی پلیٹ میں اماں کے لیے مختلف چیزوں کا انبار جمع کر کے انہیں چائے کے گم کے ساتھ دینے کے بعد مجھے مگ تھمایا اور پلیٹ اٹھا کر ایک بار پھر بھرائی شروع کی تو میں بوکھلا گئی۔

”نہیں آپا میں بس چائے لوں گی۔“

آپا نے پہلے چونک کر پھر گھور کے مجھے دیکھا تھا۔

”میں اپنے لیے ڈال رہی ہوں۔ یہ تمہارے سامنے پڑے ہیں ناجو جی چاہے لے لو۔“

ان کی آنکھوں کی طرح ان کی آواز بھی کچھ خفا خفا تھی۔ میری کھسیاہٹ کا عالم پوچھنے والا نہیں تھا۔

”بھائی کدھر چلے گئے اماں؟“

آپا اماں کے مقابل نشست سنبھالتے ہوئے جیسے چونک کر بولی تھیں۔

”اپنے کمرے میں چلا گیا ہے۔ اسے چائے وہیں دے آؤ۔“

سائرہ آپا کے چہرے پر کوفت سی چھا گئی۔ پھر ہونٹ سکڑ کر بولی تھیں۔

”بھابھی تم ہی چائے لے جاؤ۔ مجھے تو بھائی کے عجیب و غریب موڈ سے سچی بات ہے ڈر لگا رہتا ہے۔“

اپنی ذمہ داری میرے کاندھوں پر ڈال کر وہ چائے کے ساتھ اسٹیکس کا لطف لیتے ٹی وی میں مگن

ہو گئیں۔ میں کچھ جزبزی ہو کر رہ گئی تھی۔

”بھابھی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ بھائی کا مزاج ایسی باتوں سے بہت بُری طرح بگڑتا ہے۔“

سائرہ آپا نے مجھے ہنوز بیٹھے دیکھ کر جیسے بتلایا تھا۔ میں یکنخت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”مم مگر مجھے روم کا پتا نہیں ہے نا۔“

”افوہ یہ بھی ایک مصیبت ہے۔ ساجدہ ساجدہ!“

وہ کچھ جھنجھلائیں تھیں پھر زور سے کسی کو آواز دی۔ شاید ملازمہ کو۔ اگلے چند لمحوں میں ایک ہٹی کٹی

اور تاندر آگئی تھی۔ گیلے ہاتھوں کو اپنی اوڑھنی سے خشک کرتی ہوئی۔

”ہاں جی بی بی صاحبہ!“

”یہ بھابھی کو بھائی کے کمرے تک لے جاؤ۔ یہ ٹرائی بھی۔“

ساجدہ نے سر ہلایا اور ٹرائی کا ہنڈل پکڑ لیا۔

”چلیے چھوٹی بیگم صاحبہ!“ وہ میرے آگے چل پڑی۔ راہداری عبور کر کے جیسے ہی برآمدے میں

نہیں ابوداؤد بناشرٹ کے گیلے بدن پر جینز اور میناں چڑھائے کچھ جھلائے ہوئے سے اسی سمت آتے دکھائی

پے۔ گیلے بال کشادہ پیشانی پر بے ترتیب تھے۔

”مل گئی تمہیں فرصت اس کام کی اور تم.....؟“

وہ پہلے ملازمہ پر بر سے پھر خشبگیں نگاہوں سے مجھے گھورا، ساجدہ کچھ تھرا سی گئی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ

تیزی سے ٹرائی سمیت آگے بڑھ گئی۔ ابوداؤد نے سر نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔
 ”بڑی جلدی خیال نہیں آگیا تمہیں میرا؟“

میرے پاس اس بات کا بہت دل شکن جواب تھا مگر میں ہونٹ بھیجنے اندر کمرے میں آگئی۔ ساجدہ چائے کی ٹرائی ٹیبل کے ساتھ لگا کر پلٹ رہی تھی۔ ہمیں آگے پیچھے کمرے میں آتے دیکھ کر کچھ سہم گئی۔
 ”چائے بنا دوں صاحب؟“

”تم اپنی شکل سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ ابوداؤد زور سے دھاڑے ساجدہ فق چہرے پر سراسیمہ سی ہو کر گرتی پڑتی وہاں سے نکلی تھی۔ مجھے شدید قسم کی ناگواری بنے آن لیا مگر ہونٹ بھیجنے خاموش رہی تھی۔
 ”کس سوچ میں ڈوب گئی ہو چائے بناؤ میرے لیے۔“

ابوداؤد نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا تھا۔ میں آہستگی سے سر جھکائے تعمیل میں لگ گئی۔
 چائے بنا کر میں نے مگ ان کی سمت بڑھایا تھا اور سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
 ”کچھ اور چاہیے؟“

”ہاں چاہیے تو.....؟“ جواباً ان کی نظریں مجھ پر آن جمی تھیں۔ مگر میں بے خیال تھی۔
 ”کیا بتائیں.....؟“

”تم! تمہاری ضرورت ہے۔ کروگی میری دلداری؟“
 مگ وہ سائیڈ پر رکھ چکے تھے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں گھیسٹ لیا۔ میرے لیے یہ غیر متوقع تھا۔ میرے حواس جھنجھنا سے اٹھے۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟ چھوڑیں مجھے!“

میں بے ساختہ پھنکاری تھی اور ان کی گرفت سے نکل جانے کو مچلی۔ انہوں نے ایک دم اس گرفت کو سخت کر دیا ان کی گرفت میں محض پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اپنی بے بسی کا احساس میری آنکھوں میں آنسو بھرنے لگا۔ ان کی وہ ساری گھٹیا گفتگو جو انہوں نے لاسٹ ٹائم لڑائی کے دوران کی تھی۔ میرے سینے کا ناسور بن چکی تھی۔
 میں فیصلہ کر چکی تھی ابوداؤد کی پیش رفت کے جواب میں انہیں مجھ سے منہ کی کھانی پڑے گی۔
 ”بد تمیزی میں نہیں تم کر رہی ہو۔ اپنے انداز ملاحظہ کرو۔“ وہ کسی قدر درشتی سے بولے تھے۔

”ابوداؤد میں کہہ رہی ہوں مجھے چھوڑ دیں۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

میں نے بھیجنے ہوئے سر سراتے لہجے میں کہا تو ابوداؤد نے چیلنج کرتی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔
 ”کیا کروگی تم؟“

”یہ آپ پھر دیکھ لیں گے۔ مجھے میری مرضی کے خلاف آپ استعمال نہیں کر سکتے۔“ میں تیز ہوتے تنفس کے بیچ غرائی تو جواباً وہ زور سے ہنس پڑے۔

”مائی ڈیئر میں تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف بڑے معرکے کے بعد ہی حاصل کر پایا ہوں۔ فتح تو

ہو چکیں تم“ ان کا گھمنڈی لہجہ جتنی بھی معنی خیزی لیے تھا مگر اس میں جوتاؤ دلاتا احساس تھا وہ مجھے پاگل بنانے کو کافی ثابت ہوا۔ میں جوان کی طاقت کے آگے بے بس سی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بھری ہوئی موج کی طرح پل کر ان کے حصار سے نکل گئی۔ ہمتیں ایک دم جیسے بیدار ہوئی تھیں۔ میرا ہاتھ اٹھا تھا اور ابوداؤد کے چہرے پر نشان ثبت کر گیا تھا۔ کمرے کے سناٹے میں جیسے شور سا گونجا اور ابوداؤد ساکن اور ہونق رہ گئے۔ میں انہیں پیچھے دھکیلتی سرعت سے بیڈ سے اٹھی تھی اور انہیں گھورتی ہوئی فاصلے پر جا کھڑی ہوئی۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں؟ آپ یہ گھٹیا سلوک کریں گے میرے ساتھ اور میں برداشت کرتی رہوں گی؟ نو نیور..... میں اس ذلت بھری زندگی پر موت کو ترجیح دے سکتی ہوں۔ میں مر جاؤں گی مگر یہ سلوک برداشت نہیں کروں گی۔“

کتنے آنسو بہت سرعت سے میرے رخساروں کو بھگوتے چلے جا رہے تھے۔ اس پل میں ہر خوف سے آزار تھی۔

”میں ابھی تمہیں بتاؤں گی میں اور کیا کر سکتی ہوں۔ میں ابھی خود کو شوٹ کروں گی۔ پھر لیتے رہنا انتقام“ میں اتنی وحشت سے چلائی تھی کہ اپنے ہی کانوں کے پردے پھٹتے محسوس کیے۔ اس وحشت بھرے انداز میں پلٹ کر دروازے کی جانب بھاگی۔ اس سے پہلے کہ دروازے سے نکل جاتی ابوداؤد یقیناً اس سکتے سے نکل کر میری جانب لپکے تھے۔ پھر نہایت جارحانہ انداز میں میرے بالوں کو ہاتھ کی گرفت میں جکڑ کر سلگتی نظروں سے مجھے دیکھا اور نہایت بے دردی سے مجھے چٹاخ چٹاخ کئی طمانچے رسید کر دیے تھے۔ ان کے چہرے پر اتنا غیض تھا اتنا غصہ کہ ایک پل کو میری روح فنا ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اس کے بعد بھی نہیں چھوڑا میری ٹانگ پر اپنے جوتے سے جو انہوں نے ضرب لگائی تھی وہ اتنی شدید تھی کہ میں تیوراً کر نیچے جا گری۔ اپنے قدموں میں، انہوں نے مجھے ٹھوکروں اور گھونسوں کی زد پر رکھ لیا تھا۔ میری برداشت ختم ہو گئی تھی۔ میں ذبح ہونے والے بکرے کی طرح ہی چینی تھی۔ یقیناً انہیں چیخوں کی آواز پر اماں اور سائرہ آپا حیران پریشان اندر آ کر گھسی تھیں اور مجھے اتنی بُری طرح سے پٹتے دیکھ کر ان کی آنکھیں پٹی رہ گئی تھیں۔

”تم خود کو شوٹ کرو گی تم؟ میں اپنے ہاتھ سے ماردوں کا تمہیں۔ سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو؟“

”داؤد..... داؤد! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ہوش میں آؤ..... جان سے مار ڈالو گے کیا؟“

ماں نے حواس بحال کر کے شاید داؤد سے مجھ کو چھڑانا چاہا تھا مگر وہ اتنا پھرے ہوئے اور بے قابو تھے کہ انہیں بھی دور دھکیل دیا۔

”ہاں جان سے مارنا ہے اور آپ لوگ یہاں کیوں منہ اٹھا کر گھس آئیں۔ تماشا ہو رہا ہے یہاں۔“

ناؤ گیٹ لاسٹ!“

لہورنگ آنکھوں اور چڑھتی سانسوں سمیت وہ چیخے تھے اور ایک ہی جوتک میں اماں کے ساتھ ساتھ سائرہ آپا کو بھی دھکیل کر دروازے سے باہر بیچ دیا اور دروازہ لاک کر کے ایک بار پھر خطرناک تیوروں سے میری

جانب لپکے تھے۔ مجھے بالوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کیا پھر میری خوفزدہ چھلکتی آنکھوں میں اپنی سر د نظریں گاڑھ کر زور سے پھنکارے تھے۔

”دماغ آیا ہے ٹھکانے پر یا ابھی مزید برین واشنگ کی ضرورت ہے۔“
 ”نہیں آیا۔ مارڈالو مجھے۔ مجھے تمہارے منحوس وجود سے نجات مل جائے۔ گھن آتی ہے مجھے تم سے۔“
 میری دماغی حالت صحیح نہیں تھی۔ زخم زخم بدن تھا اور میں طیش میں مبتلا ہو کر جیسے انہیں کچھ اور سلگا گئی۔ انہوں نے کچھ دیر تک ساکن نظروں سے مجھے دیکھا تھا پھر ایک دم سے مجھے جھٹک دیا۔

”اتنی آسان موت نصیب نہیں بنے دوں گا تمہاری! لمحہ لمحہ تڑپاؤں گا۔“
 ان کے لہجے کی تندہی، سفاکی اور حقارت نے مجھے پھوٹ پھوٹ کر رونے پر اکسایا تھا۔ وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گئے میں جانے کب تک یوں ہی سکتی رہی تھی۔

☆☆

زندگی کے رستے میں
 اتنی گرداڑتی ہے
 فاصلے سے دیکھیں تو
 کچھ نظر نہیں آتا
 منزلوں کے چہرے بھی
 راہ کی نشانی بھی
 سب ہی ڈوب جاتے ہیں
 گرد کے سمندر میں
 درد کے سمندر میں
 فاصلہ نہیں مٹتا
 فاصلہ نہیں گھٹتا

اگلے دو تین دن تک مجھے ابوداؤد کی صورت نظر نہیں آ سکی۔ میرا نیلونیل جسم مجھے بستر سے اترنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ انہیں دیکھنے کی خواہش بھی میرے اندر نہیں تھی۔ مگر جب دو دن مزید گزر گئے اور وہ نظر نہیں آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔

”سائرہ آپا داؤد کدھر ہیں؟“

شام کو سائرہ آپا میرے لیے چائے لائیں تو میں نے پوچھا تھا۔ جواباً انہوں نے بے حد عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

”تمہارا شوہر ہے بی بی وہ، ہمیں کیا پتا اس کے پروگراموں کا۔“

ان کا لہجہ طنزیہ تھا میں اپنے چہرے کو تپتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ مگر یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں تھا۔
”کیا وہ واپس کراچی چلے گئے ہیں؟“

”تمہارے پاس فون نہیں ہے؟ پتا کر لو۔ ویسے اتنی چار چوٹ کی مار کھانے کے باوجود بھی تمہیں اس کی یاد ستا رہی ہے۔ عجیب سنگی لڑکی ہو۔“

سارہ آپا کی بات پر میں نے ہونٹ بھیج کر خود کو کچھ سخت کہنے سے باز رکھا۔ پھر جب وہ کمرے سے چلی گئیں۔ تب میں نے سیل فون اٹھا کر ابو داؤد کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ ان کا نمبر آف تھا۔ میں بار بار ٹرائی کرتی رہی تھی۔ ان کا نمبر آن تو ہو گیا مگر وہ میری کال پک نہیں کر رہے تھے۔ میرے اندر سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ یہ شخص اب میرے ساتھ کیا کرنے والا تھا۔

میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ ابو داؤد دانستہ مجھے یہاں جھوڑ گئے تھے۔ چند دن کی مہمان نوازی کے بعد سارہ آپا اور اماں نے بھی نظریں پھیرنا شروع کر دیں۔ اور پھر جیسے وہ کھل کر سامنے آگئی تھیں۔ بات بے بات جھگڑنا اور مجھے گالیاں کو سننے دینے کے ساتھ الزامات لگانا دونوں کی فطرت بنتی چلی گئی۔ ایسے میں بھابھی کا دم غنیمت تھا جو مجھے کسی حد تک اچھا سمجھتی تھیں۔

”کب سے خراب ہے تمہاری طبیعت؟“

اس روز کچن میں کام کرتے ہوئے میں جب یک دم منہ پر ہاتھ رکھے باہر بھاگی تھی اور کتنی دیر الٹیاں کر کے بے حال ہوتی رہی تھی تب بھابھی نے میرے پاس آ کر کاندھے پر ہاتھ دھر کے استفسار کیا تھا۔

”ابو داؤد کو پتا ہے؟ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا تمہیں؟“

”مجھے بخار تھا تب ڈاکٹر کو گھر پر بلوایا تھا۔“

میں نقاہت سے چور ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے بہتے گرم پانی کے سیلاب کو بے حسی سے صاف کر

کے بولی۔

”ارے نہیں بچی اس خرابی طبیعت کا۔“

وہ ہلکا سا مسکراہیں تو میں چونکی۔

”کس خرابی طبیعت کا؟“

”مجھے لگتا ہے تم پیریگنٹ ہو جباب! بہر حال ڈاکٹر سے چیک آپ ضرور کرا لو۔“

انہوں نے نہایت مخلصانہ مشورہ دیا تھا جبکہ میں شکاؤد رہ گئی تھی۔ ساکن پھٹی پھٹی نظروں سے

انہیں دیکھا۔

”تم پریشان کیوں ہو گئی ہو بچی! یہ تو خوشی اور شکر کا مقام ہوتا ہے شادی شدہ عورت کے لیے۔

بہن کے بغیر تو وہ ادھوری تصور کی جاتی ہے۔“

انہوں نے میرے گال کو تھپتھپایا تو میری آنکھوں سے نپ نپ کئی آنسو ٹوٹ کر بکھرتے چلے گئے۔

”ابوداؤد جو ذرا ٹیڑھا ہے نا تمہارے ساتھ دیکھنا اب کیسے سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے تمہیں۔“ وہ ہنس کر کہہ رہی تھیں مگر مجھے لگا تھا جیسے میرے زخموں کو کسی نے بھنبھور ڈالا ہو۔ میں بہت خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ ایسی حالت کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میرا خیال رکھا جاتا الٹا اماں نے جیسے مجھ سے بیرباندھ لیا تھا۔ بھابھی کی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی درخواست بھی انہوں نے بے دردی سے رد کر ڈالی۔ مجھ پر کاموں کا لوڈ بھی بڑھا دیا گیا۔ میری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں رہتی تھی ایسے میں یہ صورتحال میرے لیے اور بھی پریشان کن ثابت ہوئی تھی۔ بھابھی اکیلی میری خاطر کس کس سے لڑتیں۔ چند دنوں کے اندر میں سوکھ کر کاٹنا ہو گئی۔ اس روز کچن کا کام نپٹا کر میں اپنے کمرے میں آئی تو بے حد غمناک حال ہو رہی تھی۔ جی کی متلاہٹ کے باعث میں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ دروازے پر کھٹکا محسوس کر کے میں نے بے دلی سے گردن موڑی اور بھابھی کو اندر آتے دیکھ کر پھر پہلی پوزیشن میں چلی گئی۔

”کھانا کھا لو حجاب!“

انہوں نے آگے بڑھ کر ٹرے میز پر رکھ دی۔

”آپ نے کیوں زحمت کی بھابھی مجھے بھوک نہیں تھی۔“ میری آواز بھگ رہی تھی اور نقاہت سے

بھری ہوئی۔

”زحمت کیسی! اٹھو تم! مجھے تم سے کچھ اور بات بھی کرنی ہے۔“

ان کا مدھم لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ میں نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

”میں نے تمہارے گھر والوں کو سب بتا دیا ہے آج تمہارا بھائی تمہیں لینے آرہا ہے۔ کسی کو نہیں پتا۔

بس تم چپکے سے نکل لینا۔“

میرے نزدیک سرک کر انہوں نے سرگوشی کی اور میں حواس باختہ ہو گئی تھی۔

”یہ آپ نے کیا کیا بھابھی! آپ کو مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔ میں اب واپس نہیں جانا چاہتی۔“

میں نے شدید لہجے میں کہا تھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”پاگل مت بنو حجاب! یہاں رہو گی؟ کس کی خاطر ابوداؤد کی؟ جسے تمہاری رتی برابر پرواہ نہیں۔ خود

کو برباد مت کرو حجاب اب تم اکیلی نہیں ہو۔ تمہاری زندگی کے ساتھ ایک ننھی جان جڑی ہوئی ہے۔“ مجھے ڈانٹے ہوئے وہ تنبیہی لہجے میں بولیں تو میں بے اختیار آنسو بہانے لگی تھی۔

”جو بھی ہو بھابھی میں اپنے سے وابستہ رشتوں کو مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی۔ میری وجہ سے وہ

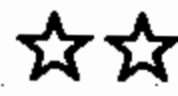
پہلے ہی بہت ذلت اور دکھ اٹھا چکے ہیں۔“

”صرف وہی نہیں تم نے بھی یہ ذلت اور دکھ سہے ہیں حجاب!“ انہوں نے جیسے باور کرایا۔

”پھر بھی بھابھی! میں اب ایسا نہیں چاہوں گی مزید! ابوداؤد کا پتا ہے نا آپ کو۔ وہ کبھی یہ برداشت

میں کریں گے۔“

میں سک اٹھی تھی۔ بے چارگی کا احساس مجھے بار بار رلاتا تھا۔
 ”تم خود لٹھ اپنی لڑائی۔ مگر اس کے لیے تمہاری بیک پر کسی کا ہونا ضروری ہے۔ سنو حجاب میں سمجھتی تھی ابو داؤد کو شاید تم سے محبت ہو۔ مگر یہ صرف انا اور انتقام کا معاملہ ہے۔ وہ تمہاری زندگی برباد کرنا چاہتا ہے تمہارے گھر رابطہ کرنے سے پہلے میں نے اسے بتایا تھا۔ مگر اسے کوئی پرواہ نہیں بلکہ تمہیں یہ جان کر شاک لگے گا کہ تمہارے ساتھ اماں کا یہ سلوک بھی ابو داؤد کی ایما پر ہو رہا ہے۔ ابو داؤد کا گھر ہے، یہ یہاں سب اس کی کمائی سے ہو رہا ہے۔ اماں اس کے آگے نظر نہیں اٹھا سکتیں۔ حجاب میں نے اسے تمہاری پریکٹسی کا بھی بتایا مگر وہ پھر بھی نہیں پگھلا۔ تم خود کو برباد مت کرو اپنے آپ کو بچاؤ۔ ظلم سہنا بھی گویا خود پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ تم یہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دے رہی ہو۔ اب اگر تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی گئیں تو وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تمہارا۔ تم اس کے ساتھ قانونی لڑائی لڑنا۔“
 بھابھی بہت دیر تک چپکے چپکے مجھے سمجھاتی رہیں اور میں ساکن بیٹھی رہی تھی۔



بارشوں کے موسم
 بس انہی سے ہیں وابستہ
 کہ محبتوں میں بارش
 بڑی لازمی سی شے ہے
 چاہے آسماں سے برے
 چاہے چشمانِ نم سے

پھر اسی رات بڑے بھیا مجھے وہاں سے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ جو میری حالت تھی اس نے عون بھیا کے بعد مہاپا کو بھی شاک لگایا تھا۔ موسیٰ بھائی بھرا اٹھے تھے۔ وہ اسی وقت ابو داؤد سے بھڑنے کو تیار تھے۔ پپانے اور فیضی بھیا نے بڑی مشکلوں سے انہیں سمجھایا بھجایا تھا۔ مہا کسی ننھی سی بچی کی طرح دن رات میرا خیال رکھنے لگی تھیں۔ یہ ان کی محبت اور خیال ہی تھا کہ میں جو بہت کمزور اور نحیف ہو گئی تھی پھر سے تندرست اور صحت مند ہونے لگی۔ مگر جو اندر روگ تھا وہ نہیں جان چھوڑتا تھا۔ ان دنوں فیضی بھیا کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں گھر میں جو میرے جانے پر درا تھی تھیں پھر سے اسی جوش و خروش سے ہونے لگیں۔ شادی کی تاریخ طے ہوئی تو دن گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا اور تانیہ بھابھی بیاہ کر ہمارے گھر کی رونق بڑھانے چلی آئیں۔ سبک سے نقوش والی نازک سی بھابھی اپنے نام کی طرح قمیص بے حد کیئرنگ بے حد محبت کرنے والی۔ ہر دم ہر کسی کی خدمت پر مامور۔ مہا کا جیسے آدھا دکھ ختم ہو گیا۔ فیضان بھیا بھی بے حد مطمئن نظر آتے تھے۔ تب ایک بار پھر مہا کو عون بھیا کی ویران اور خالی زندگی کا احساس ستانے لگا۔ انہوں نے انہیں سمجھانے منانے اور گھیرنے کی بہت کوشش کی مجھے اور ثانی بھابھی کو بھی اپنے ساتھ اس کوشش میں شامل کیا مگر عون بھیا یہی ایک ایسی بات تھی جس پر کچھ سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار پھر مہا طویل ہوئیں ایک بار پھر ہمت ہار کر بیٹھ گئیں۔ مزید بہت سے بوجھل دن اسی کیفیت کے ساتھ گزر گئے۔ ابو داؤد کی جانب سے بھی خاموشی

تھی جو کم از کم مجھے تو کسی طوفان کا ہی پیش خیمہ لگتی تھی مگر عون بھیا مطمئن تھے۔ ماما کی یہی اداسی جو دھیرے دھیرے بیماری کا روپ دھار رہی تھی۔ پریشان ہو کر عون بھیا نے عیسیٰ بھائی کی شادی کا موضوع چھیڑ دیا۔ شاید ان کا مقصد ماما کا دھیان بٹانا ٹھہرا ہو۔ عیسیٰ بھائی ان دنوں اسپتالائزیشن کے لیے انگلینڈ جا چکے تھے۔ ان سے اس موضوع پر بات بہت سرسری سے انداز میں ہوئی۔ زور ان کے روانگی کے بعد پکڑا گیا۔ عون بھیا نے بھابھی اور ماما کو اس سرگرمی پر اکسایا تھا۔ وہ چاہتے تھے عیسیٰ بھائی کی واپسی سے قبل نہ صرف منگنی ہو جائے بلکہ شادی وغیرہ کی سب تیاریاں بھی انجام پا جائیں۔ پتا نہیں کیوں انہوں نے اس معاملے میں عجلت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

”آپ نے عیسیٰ بھائی سے بات کی؟“

میں نے ماما کو زور و شور سے لڑکیاں دیکھتے پا کر ایک دن سوال کیا تھا۔ وہ مسکرا دیں۔

”وہ بہت سعادت مند ہے۔ بہت پہلے سے یہ اختیار وہ مجھے سوئپ چکا ہے۔“

ماما کے لہجے میں فخر کے ساتھ درپردہ ایک چھین بھی تھی۔ انہوں نے گویا عون بھیا کو جتلیا تھا وہ کچھ فاصلے پر موجود اخبار دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحے کو ان کی نگاہ مجھ سے ٹکرائی تھی۔ میں نے ان کا چہرہ متغیر ہوتا محسوس کیا۔ اگلے لمحے وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ میرا دل جانے کیوں بے انتہا بوجھل ہو کر رہ گیا۔ پھر بہت تلاش بسیار کے بعد ماما کی نگاہ انتخاب روشانے خان پر جا کے ٹھہری تھی۔ بیلی کی کلیوں سی نازک دربا اور بے تماشا حسین روشانے کی عمر شاید مجھ سے بھی کچھ کم ہی تھی۔ وہ گریجویشن کر رہی تھی۔ ماما کو وہ اتنی پسند آئی تھی کہ اس وقت تک ٹک کر نہیں بیٹھیں جب تک ہاں نہیں کرائی۔ اور جس روز انہوں نے بات پکی کی گویا خوشی سے ان کے قدم زمین پر نہیں ٹھہر رہے تھے۔

”یہ لودیکھو کتنی پیاری بچی ہے۔ نیک بااخلاق!“

انہوں نے ایک تصویر اپنے بیگ سے نکال کر عون بھیا کی جانب بڑھائی تھی۔ وہ چونک پڑے۔

”آپ کا انتخاب ہے ماما چھائیسی نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سسپینس آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں؟“

انہوں نے کسی قدر رسائیت سے کہا تھا۔

”اسی لیے کہ تم بھی دیکھ لو۔ اور جان لو کہ اگر تم مجھے موقع دیتے تو تمہارے لیے بھی ایسی ہی لڑکی

ڈھونڈتی خیر یہ اس لیے دے رہی ہوں کہ عیسیٰ کو نیٹ کے ذریعہ دکھا دینا۔“

عون بھیا نے تصویر لینے کو ہاتھ نہیں بڑھایا اور آنکھوں سے گلاسز اتار کر صاف کرتے ہوئے نرمی

سے بولے تھے۔

”آپ یہ پکچر موسیٰ کو دیں وہ ہر وقت نیٹ پر بڑی رہتا ہے یہ کام بخوبی کر لے گا۔“

ماما کی پہلی بات کو وہ یکسر نظر انداز کر چکے تھے۔ میں ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی بھیا بھی حد کرتے تھے

کبھی کبھار، پھر یہ اس سے دو ماہ بعد کی بات تھی۔ صبح صبح ماما کی طبیعت ایک دم بے تحاشا بگڑ گئی۔ عون بھیا کا طیش

سے سرخ چہرہ مجھے ششدر کر رہا تھا۔

”کیا ہوا ماما کو بھابھی!“

میں سراسیمہ سی ثانی بھا بھی کے پاس بھاگی تھی کہ ماما کو تو بھیا اور پاپا ہاسپٹل لے گئے تھے۔

”بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گی وہ۔ تم خود کو سنبھالو حجاب!“

میری حالت کے پیش نظر انہوں نے مجھے تھام کر سہارا دیا اور قریبی صوفے پر بٹھا دیا۔ مگر میری حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑنے لگی۔ ہاتھ پیر ایک دم سرد ہو گئے تھے۔ رنگت پیلی ہوتی چلی گئی۔

”کیا ہوا ہے بھا بھی مجھے بتادیں۔ ورنہ میرا دل تھم جائے گا۔“

خشک ہوتی زبان اور گلے کے ساتھ میں بہ مشکل بول پائی۔ میری آواز کانپنے لگی تھی۔

”حجاب گڑیا کمپوز یور سیلف ڈیر! کہانا ماما کو بی پی.....“

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ چھپا رہی ہیں مجھ سے کچھ۔ ابو داؤد نے پھر کچھ کر دیا ہے نا.....؟“

کچھ بہت غلط..... فیض بھائی اور موسیٰ کدھر ہیں۔ مجھے بتائیں.....؟“

میں ہاتھوں میں چہرا ڈھانپ کر بے تحاشا رو پڑی۔ میرا سارا جسم جیسے خدشات کی یلغار سے کانپ رہا تھا۔ عون بھیا کے چہرے پر جو طیش تھا اس کی وجہ ابو داؤد ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین سا تھا۔

”بھا بھی نے میرے ہاتھ تھام لیے مجھے گلے سے لگا کو چوما!“

نہیں حجاب ایسا نہیں ہے۔ قسم سے ایسا کچھ نہیں ہے۔ معاملہ اور ہے کچھ

”کیا؟؟ مجھے بتائیں۔“

میں نے ہراساں ہونے کی کیفیت میں آنکھوں میں آنسو لیے انہیں دیکھا۔ مجھے ان کی بات کا یقین

آہی نہیں سکتا تھا۔

”عیسیٰ کو رو شانے پسند نہیں آئی۔ آئی مین وہ رو شانے سے شادی پر آمادہ نہیں ہے۔“

”واٹ!“ بھا بھی کے انکشاف نے مجھے ششدر کر ڈالا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

”مگر ماما..... تو.....“

ہاں یہی تو مس انڈرا سٹینڈنگ ہوئی ہے حجاب! کل رات جب موسیٰ کو ساری بات بتائی وہ بہت خفا

ہوا۔ اور صاف لفظوں میں منع کر دیا۔

”مگر سرسری سہی ان سے تذکرہ تو ہوا تھا۔ اب منع کرنے کا مقصد؟؟“

میں ٹھٹھک کر بولی تھی عیسیٰ بھائی کی اس فضول حرکت پر مجھے بھی غصہ آیا تھا۔

”یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ پہلے اس نے منع نہیں کیا۔ مگر جب سب کچھ طے ہو گیا تو کہہ رہا ہے

میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔ منگنی پر، شادی کی تاریخ طے ہونے پر بھی کچھ نہیں بولا۔“

”یہ بات وہ پہلے بھی بتا سکتے تھے۔“

”اسی بات پر عون بھیا کو غصہ ہے۔ ایک ہفتے بعد کی عیسیٰ کی فلائٹ ہے مگر عون بھیا جتنے غصے میں

ہیں مجھے خدشہ ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل نہ آکھڑے ہوں۔“

بھابھی کے خدشات غلط اور بے جا نہیں تھے۔ میں خود بھی اسی فکر میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اگلا پورا ہفتہ اسی اضطراب اور بے کلی کی نذر ہو گیا۔ ماما کی طبیعت بس ایسی ویسی ہی سنبھلی تھی۔ ہاسپٹل سے تو ڈسچارج ہو گئیں مگر اس صدمے نے انہیں چار پائی سے اٹھنے کی ہمت نہیں دی تھی۔ پھر عیسیٰ بھائی بھی پہنچ گئے۔ مگر ان کا استقبال ہرگز بھی شاندار طریقے سے نہیں ہو سکا تھا۔ وہ بھی جیسے صورتحال کی سنگینی کو سمجھ گئے تھے اور خود بھی بے حد سنجیدہ تھے۔ گھر کا ماحول گھٹا گھٹا سا تھا۔ جس پل وہ ماما سے گلے ملنے لگے ماما نے خفگی کے اظہار کو منہ پھیر لیا تھا۔

”میں مر بھی جاؤں تو میرے جنازے میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری اپنی بیٹی کو جو ذلت ایک غیر مرد کے ذریعے ملی مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کبھی میری کوکھ کا جنا بھی کسی بچی کو ایسی رسوائی اور شرمندگی سے دوچار کر سکتا ہے۔“

وہ ہپھک ہپھک کر روتی تھیں۔ ماحول ایک دم کشیدہ اور سوگوار ہو گیا تھا۔ مگر موسیٰ بھائی بے حس بنے بیٹھے رہے تھے۔ مجھے ان کی سنگدلی پر رونا آئے جا رہا تھا۔

”جس روز یہ بات چلی تھی تم سے کچھ چھپایا نہیں گیا تھا۔ لحوہ کی رپورٹ تمہیں موسیٰ کے ذریعے ملتی رہی تھی پھر بھی تم نے اسی وقت انکار نہیں کیا۔ عین وقت پر آکر منع کرنے کی وجہ؟؟“

عون بھیا کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ پڑ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا ان کا مشکلوں سے خود پر باندھا ضبط کا یہ بند کسی پل بھی ٹوٹ کر بکھر جائے گا اور وہ سب کچھ تمہیں نہیں کر دیں گے۔

”تب تک مجھے لیزا نہیں ملی تھی۔ میں اس کی محبت میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔“

عیسیٰ بھائی کا لہجہ پرسکون تھا وہ بے نیاز بنے ہوئے تھے۔

”تم اس فرنگین کی خاطر اپنی ماں کو ہرٹ کرو گے؟“ عون بھیا نے ملاستی لہجہ میں پھنکار کر کہا تو عیسیٰ بھائی کے چہرے پر زہر خند پھیل گیا تھا۔

”آپ بھی ایک آوارہ لڑکی کی خاطر ہی ابھی تک اپنی ماں کو ہرٹ کرتے آئے ہیں۔ آپ میں اور مجھ میں.....“ ان کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ عون بھیا کا ہاتھ طیش کے عالم میں اٹھا تھا اور عیسیٰ بھائی کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔ پورے کمرے میں یلکھت سناٹا در آیا۔ عیسیٰ بھائی کی آنکھیں اس پل جیسے لہو چھلکانے لگیں ایک لمحے کو تو مجھے لگا تھا وہ جواباً عون بھیا پر ہاتھ اٹھالیں گے مگر خیریت گزری تھی۔ وہ محض انہیں گھورنے پر اکتفا کر چکے تھے۔

”ماما آپ ان لوگوں کو شادی کی تاریخ دیں۔ میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں کرتا یہ شادی!“

عون بھیا نے پھنکار کر کہتے ماما کو مخاطب کیا۔ ماما بھی تنے میں تھیں۔

”آپ اگر ایسا کریں گے تو اس کی تمام تر ذمہ داری بھی آپ پر لاگو ہوگی۔ میں کسی قیمت پر یہ شادی نہیں کروں گا۔ سنا آپ نے؟“

وہ تند خیز لہر کی طرح اٹھے تھے اور کمرے سے نکل جانا چاہتے تھے مگر عون بھیا نے ہاتھ بڑھا کر ان کا بازو اپنے آہنی ہاتھ میں پکڑا تھا اور ایک خفیف سے جھٹکے میں اپنے مقابل کھینچ لیا تھا۔ پھر ان کی آنکھوں میں اپنی

ملتی انگارے برساتی نظریں گاڑھ کر ایک ایک لفظ چبا کر بولے تھے۔
 ”کیا کرو گے تم؟ گھر سے بھاگ جاؤ گے؟ یا خودکشی کر لو گے؟ جو تمہارا جی چاہے کرنا مگر ہم شادی ملے کر رہے ہیں! سنا تم نے۔“

”عون!!!“ ممالرز کر اور خوف زدہ ہو کر چیخی تھیں مگر ان دونوں میں سے کسی نے بھی جیسے ممالر پر توجہ نہیں دی۔ دونوں پھرے ہوئے سائندوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ایک دوسرے کو مار دینے کے خواہش مند نظر آ رہے تھے۔

میں نہ گھر سے بھاگوں گا نہ میں خودکشی کروں گا۔ آپ نے مجھے بزدل کیوں سمجھ لیا؟ میں روشانے کے گھر والوں کو خود انکار کروں گا۔ وہ اتنے بے شرم تو نہیں ہوں گے کہ زبردستی.....“
 ان کی بات ایک بار پھر ادھوزی رہ گئی اس بار جوان کے منہ پر تھپڑ پڑا تھا۔ وہ عون بھیا کا نہیں تھا ماما کا تھا۔ وہ جوش غضب سے کانپ رہی تھیں۔

بے شرم، بے حیا! زبان بند کر لے۔ ورنہ میں جان لے لوں گی اپنی! وہ لڑکی ہے عزت دار لڑکی تم نے اسے کیا سمجھ لیا۔ چلے جاؤ سب یہاں سے مجھے تنہا چھوڑ دو.....“
 وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہی بال اپنے ہاتھوں سے نوچنے اور خود کو گھسوٹنے لگیں۔ عون بھیا تڑپ کر ان کی جانب لپکے تھے مگر وہ کچھ اور بھی پھراٹھی تھیں۔

”ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔ مت چھوؤ، تم کدھر سے ہمدرد ہو۔ ایک جیسے ہو دونوں ایک جیسے۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ بلک رہی تھیں۔ عون بھیا کے چہرے پر خفت اور ملال کی سرخی بکھر گئی۔
 ”خدا یا مجھے موت دے دے میں ان لوگوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے اس سے پہلے اٹھالے۔“

مما کی آہ و بکا میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پپا آگے بڑھ آئے۔ وہ تب سے خاموش تھے مگر اس پل میں نے ان کے چہرے پر گھمبیرتا محسوس کی تھی۔
 ”خود کو سنبھالیں بیگم صاحبہ خدا نے چاہا تو ہم اس شرمندگی سے بچ جائیں گے۔“
 ”کیسے بچیں گے کیسے؟“ ماما ہنوز زار و قطار رو رہی تھیں۔

”ہمارے دو بیٹے اور بھی ہیں۔ موسیٰ اور عون!“ ہم روشانے کو مقررہ تاریخ پر بیاہ کر انشاء اللہ لازمی کھلائیں گے۔

پپا کا فیصلہ ایسا کیسا ہوا تھا۔ اور سب کو سنائے میں مبتلا کر گیا۔ موسیٰ تو وہاں تھا نہیں البتہ عون بھیا ضرور شپٹا گئے تھے۔

”آپ بس موسیٰ کی بات کریں۔ عون کو چھوڑیں۔ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ موسیٰ سے بھی پوچھ لیں۔ ہم زبردستی تو کسی پر نہیں کر سکتے۔“

مما کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہوا تھا۔ عون بھیا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ وہ ہونٹ بھیچے سر جھکائے خاموش کھڑے رہ گئے تھے۔

”بہت ہمدردی ہو رہی تھی نا آپ کو مما سے۔ کر دیں ازالہ اگر آپ اتنے ہی سنسیر ہیں سب گھر والوں کے لیے۔ ویسے بھی موسیٰ تو ابھی پڑھ رہا ہے نا، دو بڑوں کو چھوڑ کر سب سے چھوٹے کی شادی وہ بھی اتنی عجلت میں ہونا کچھ حیران کر دے گا دنیا کو۔ روشانے کی شادی تو ہو جائے شاید مگر لوگوں کو ایک موضوع بھی ضرور مل جائے گا۔“ عیسیٰ بھیا کو جانے کیا سوچتا تھا کہ عون بھیا پر تاک تاک کر نشانے لگاتے چلے گئے تھے۔ میں نے عون بھیا کے چہرے پر زلزلے کے آثار اٹھتے دیکھے۔ انہوں نے یونہی بھیچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ مما کو دیکھا تھا۔ وہ خفا خفا سی چہرہ موڑ گئیں۔ ”مگر نہیں آپ ایسا کیوں کریں گے بھلا؟“

عیسیٰ بھائی نے ایک بار پھر کاٹ دار طنز کے تیر برسائے تھے۔ عون بھیا نے بھیچے ہوئے ہونٹوں کو کھولا تھا پھر مما کی بجائے پپا کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔

”آپ کو موسیٰ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے پپا! روشانے سے میں شادی کروں گا۔ بس آپ ان لوگوں کو اس بات پر طریقے سے قائل کر لیجیے گا۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکتے نہیں تھے۔ تیز قدموں سے باہر نکلتے چلے گئے۔ ہم سب جیسے بھونچکے رہ گئے تھے۔



یہ صورتحال جتنی بھی کشیدگی کا باعث تھی بہر حال بہت خوش اسلوبی سے معاملہ سلجھ گیا۔ مما کے ساتھ پپا اور فیضی بھائی اور بھابھی روشانے کے ہاں گئے تھے اور بات کی تھی۔ ان لوگوں نے تھوڑے سے رد و کد کے بعد عون بھیا کا پروپوزل تسلیم کر لیا تھا۔ کچھ دن ماحول میں تناؤ رہا تھا پھر سب کچھ معمول پر آ گیا۔ مما عیسیٰ بھائی سے البتہ خفا رہی تھیں۔ وہ ہر پل انہیں منانے کے جتن میں کوشاں نظر آتے۔ البتہ یہ بات سب نے واضح طور پر محسوس کی تھی کہ روشانے جو مما کی من پسند بہو تھی جب سب سے پیارے بیٹے کے لیے منتخب ہوئی تو ان کی خوشی کا عالم ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ بیماری شماری سب بھولے وہ دھڑا دھڑ شادی کی تیاریوں میں مصروف نظر آنے لگیں۔ اس روز بھی وہ اپنے ہاتھوں سے روشی کے بری کے کپڑے بھابھی کے ساتھ تیار کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھیں جب عیسیٰ بھائی وہیں چلے آئے تھے۔

مما! انہوں نے آتے ہی پکارا تھا مگر مما ان سنی کیے اپنے کام میں مگن رہیں۔

”مما پلیز! اب اس ناراضگی کو تو ختم کر دیں۔“ وہ عاجز سے ہو گئے تھے۔

”ہاں ختم کر دوں تاکہ تم اپنی اس فرنگن کو لا کر ہمارے سروں پر بٹھا سکو۔“

وہ جانے کس موڈ میں تھیں کہ غصے میں کہہ گئیں حالانکہ اب وہ عیسیٰ بھائی کی بات کا جواب بھی نہیں

دیا کرتی تھیں۔ میری ہنسی نکل گئی تھی۔ مگر عیسیٰ بھائی سنجیدہ رہے تھے۔

”اگر میں ایسا نہ کروں تو آپ مجھے معاف کر سکتی ہیں؟“
 ”نہ میں ایسا کیوں کروں گی؟ جس کی خاطر تم نے اتنا پنگالیا ہمارے لئے اسے کیوں چھوڑنے لگے تم؟“
 ممانے سلگ کر جواب دیا تھا۔ عیسیٰ بھائی نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔
 ”جسے میں نے پکڑا ہی نہیں اسے چھوڑنا کیسا؟“ وہ منہ پھلا کر بولے تو میں زور سے چونکی۔
 ”کیا مطلب ہے بھائی؟“

انہوں نے بھرپور سنجیدگی سے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ پھر اٹھتے ہوئے بولے تھے۔
 ”مطلب لیزا نام کی کوئی لڑکی میری زندگی میں نہیں ہے۔“
 وہ ہم سب کو ہنق چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔ ماما کی حیران نظریں مجھ سے ٹکرائی تھیں۔
 ”یہ عیسیٰ کیا کہہ گیا ہے؟“ وہ اچھی خاصی بے قرار ہو کے بولیں۔
 ”میں پوچھتی ہوں۔“ میں خود پریشان ہو گئی تھی۔ عیسیٰ بھائی کا گھمبیر لہجہ مجھے ٹھٹھکا کے رکھ گیا تھا۔
 میں ان کے کمرے میں چلی آئی وہ وہیں تھے درتے میں کھڑے سگریٹ سلگارہے تھے۔ میں نے لپک کر سب سے پہلے سگریٹ چھینا تھا ان سے۔

”یہ خرافات کب سے پال لیں آپ نے؟“ میں خفا ہوئی تھی۔ وہ محض مسکرا دیے۔
 ”کیا کہہ رہے تھے آپ؟“
 ”کچھ نہیں!“ انہوں نے کاندھے جھٹکے مگر میں بے حد عاجزی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔
 عیسیٰ بھائی پلیز! وہ کچھ دیر سا کن نظروں سے مجھے دیکھتے رہے تھے پھر مسکرا دیے۔
 ”میں نے یہ سب کچھ دانستہ کیا تھا حجاب! جانتی ہو کیوں؟“
 میں نے بے ساختہ سرکونفی میں جنبش دی۔ حیرت سے میں منجمد ہوتی جا رہی تھی۔
 ”ماما کے لیے، عون بھیا کے لیے۔ میں جان گیا تھا۔ عون بھیا کبھی شادی نہیں کریں گے۔ ماما کی خاطر بھی نہیں۔ تب میں نے یہ پلان کیا۔ یہ کسی حد تک رسکی تھا مگر میں نے یہ رسک لیا۔ اور دیکھ لو کامیابی صوب ٹھہری ہے۔“ بات کے آخر میں وہ کھکھلائے تھے۔ مگر میں پریشان ہو گئی تھی۔
 مگر بھائی روشی! وہ بہت نازک، بہت چھوٹی سی ہے۔ اگر وہ ہرٹ ہوئی ہو اگر اس نے شریک

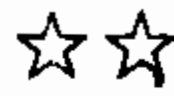
بات کے طور پر آپ کو.....
 ”ڈونٹ یووری حجاب! مجھے ایسے کسی خطرے کا احتمال تھا۔ جیہی میں نے آغاز میں ہی روشی سے لائیکٹ کر لیا تھا۔ وہ تمہاری سوچ اور خیالات سے بڑھ کر صاف گواور کھری ہے۔ پتا ہے کیا ہوا تھا۔“
 میں نے میری آنکھوں میں جھانکنے ڈرامائی وقفہ لیا۔
 ”کیا؟؟؟“ میں بے تاب سے بولی۔

”روشانے نے مجھے کہا تھا وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی اس لیے کہ وہ اس حوالے سے کسی اور کو پسند

کرتی ہے۔ میں نے کہا ڈونٹ وری! مجھے بتاؤ وہ کون ہے میں نہ صرف شادی سے انکار کروں گا بلکہ اس کی ہیلپ کی کوشش بھی کروں گا تب اس نے کچھ جھجک کر مجھے عون بھیا کا نام بتا دیا تھا۔“

”واٹ! ریلی.....؟“ میں حیرت اور غیر یقینی سے چیخ اُٹھی۔

”شیور۔ مگر اس نے یہ وعدہ لیا تھا کہ یہ بات میں عون بھیا کو کبھی نہیں بتاؤں گا۔ جی تو اس دن ان کے تھپڑ کھا کر بھی میں چپ رہا تھا۔ میں نے صورتحال کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ بھیا اپنے منہ سے کہنے پر مجبور ہو گئے۔“ وہ ایک بار پھر ہنسنے لگے۔ میں ہنوز غیر یقین اور شکاک تھی۔ یہ جتنی بھی ڈرامائی پجوشن تھی مگر حقیقت تھی۔ میں عیسیٰ بھائی کے کمرے سے نکلی تو میرا چہرہ تہمتار ہا تھا۔ ماما کے لیے میرے پاس بہت بڑی خوش خبری تھی۔



پھر یہ خبر دھیرے دھیرے سب میں ہی گردش کر گئی۔ سوائے عون بھیا کے۔ عیسیٰ بھائی سے ناراضگی تو دور کی بات ان کی اہمیت کچھ اور بڑھ گئی۔ سب ہی بے تحاشا خوش تھے۔ البتہ عون بھیا تھے۔ جو کچھ اور بھی گھمبیر قسم کی سنجیدگی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میں وقتی طور پر سارے غم بھول گئی تھی۔ میری حالت ایسی نہیں تھی کہ زیادہ چلتی پھرتی جی شادی کی مصروفیات اور ہنگاموں میں بھی میں زیادہ تر ایک سائیڈ پر بیٹھی رہی تھی۔ اگرچہ ماما کے ساتھ بھائیوں کی بھی یہ ہی خواہش تھی کہ ڈلیوری کے بعد یہ شادی ہو مگر میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ زور دیا تھا کہ یہ کام جتنا جلدی ہو سکے کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ماما میری ضد اور خواہش کے آگے مجبور ہو گئی تھیں۔ بھیا رسمومات سے کئی کترا رہے تھے۔ مگر موسیٰ اور دیگر کزنز وغیرہ نے اس معاملے میں ایک نہیں سنی تھی اور تمام رسموں کی ادائیگی کی گئی تھی۔ اس وقت بھی مہندی کی تقریب میں سفید کلف شدہ شلوار کرتے میں عون بھیا کی وجاہت بے حد نمایاں ہو رہی تھی۔ موسیٰ نے ان کے گلے میں پیلا پٹکا بھی زبردستی ڈال دیا تھا۔ ہمیشہ کے بے حد ڈینٹ اور باوقار سے عون بھیا اس روپ میں بھی خوب بچے تھے۔ مگر وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو رہے تھے۔ اور ان کی یہی سنجیدگی میرے دل کو دھڑکا دیتی تھی۔ شاید روشی کو کچھ سخت قسم کے حالات دیکھنے پڑتے۔ یہ سوچ میرا دل ہولا رہی تھی۔ رسم کی ادائیگی میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اسٹیج کو گلاب گیندے اور موگرے سے بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ پورے گھر میں بھی انہی پھولوں کی لڑیوں سے بہت شاندار آرائش کی گئی تھی۔ صحیح معنوں میں سب نے اپنے دل کے ارمان نکالے تھے بھیا کے منع کرنے خفگی ظاہر کرنے کے باوجود ”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔ یہ میری پہلی شادی نہیں ہے۔“

وہ یہ سارے انتظامات دیکھ کر جھلائے تھے۔

”آپ یہی سمجھ لیں۔ نہ بھی سمجھیں روشا نے کی بہر حال پہلی شادی ہے۔“

ثانیہ بھابھی نے بے حد چپک کر کہا تھا۔ اور عون بھیا کسی قدر خفگی سے کچھ کہے بغیر وہاں سے واک آؤٹ کر گئے تھے۔ اور ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔ موسیٰ نے تیز آواز میں ڈیک آن کر دیا۔ وہ سستی میں آکر بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ پھر شاید عیسیٰ نے ان کا بازو پکڑ کر انہیں بھی ساتھ شامل کرنا چاہا تھا۔ میں نے بھیا کے چہرے کے عضلات کھینچتے محسوس کیے۔ انہوں نے موسیٰ بھائی کا ہاتھ زور سے جھٹکا تھا پھر وہ غصے سے غالباً

پلٹے بولے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی بنا پر میں وہ سب سن تو نہیں سکی مگر معاملے کی گھمبیرتا کا احساس مجھے ہونے لگا تھا۔ میں گھبرا کر ایک دم اٹھی تھی۔ مگر پھر مجھے بیٹھنا پڑا پہلو میں درد کی بہت شدید لہر اٹھی تھی۔ جو مجھے گہرے کرب سے دوہرا کر کے رکھ گئی۔ ہونٹوں کو بھیج کر کراہیں دباتی میں پھر بھیا کی جانب تکتے لگی۔ شاید بھیا وہاں سے چلے گئے تھے۔ عیسیٰ بھائی نارمل تھے۔ یعنی بدمزگی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ رسم کے لیے عون بھیا کو شاید زبردستی لایا گیا تھا۔ مگر ان کا موڈ ایسا تھا کہ کسی کو ان سے مذاق کرنے کی ہمت نہیں ہو سکی۔ میرے اندر جو خدشے تھے وہ دو ہند ہونے لگے تھے۔ بھیا کا ناقابل فہم رویہ مجھے مضطرب کر رہا تھا۔ میں انہی خیالات میں گم صم بیٹھی تھی کہ عیسیٰ بھائی میرے پاس چلے آئے۔ سیل فون ان کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ بہت خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔

”نہ بھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اب جو ہوگا آپ خود فیس کرنا۔ محبت کرنا آسان مگر اسے سہنا اور نبھانا اسی قدر کٹھن ہوا کرتا ہے۔ میں تو یہی کیوں گا۔ کی ہے تو بھگتو۔“

اپنی بات کا اختتام پر وہ جیسے خود ہی مزا لے کر ہنسے۔ میں سمجھ گئی۔ وہ روشانی سے بات کر رہے ہیں۔

”ہاں حجاب میرے پاس ہے کر لیں بات!“

انہوں نے رسائیت سے کہا اور سیل فون میری جانب بڑھا دیا۔

”روشانے بھابھی تم سے بات کریں گی۔“

میں نے کچھ کہے بغیر سیل فون لے لیا۔

”عیسیٰ بھائی بتا رہے تھے اُن کا موڈ کچھ آف ہے۔“

سلام دعا کے بعد روشانی نے کسی قدر جھکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے روشنی ڈونٹ وری! میں اسے ہرگز ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔“

”ارے مجھے تو لگ رہا ہے حجاب آپ خود پریشان ہیں۔“

وہ یقیناً بہت بلند حوصلے کی مالک تھی جیسی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں کچھ خفت زدہ سی ہو گئی۔ وہ

کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

”روشنی میں واقعی آپ سیٹ ہوں۔ بھیا شادی پر آمادہ نہیں تھے تم جانتی ہونا؟“

میں نے کسی قدر بے چینی سے کہا جو اب وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

”آپ دیکھتی جائیے۔ آپ کے اکڑو بھائی کے ساتھ میں کرتی کیا ہوں۔ سارے بدلے ایک

ایک کر کے لوں گی۔“

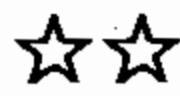
اس کا انداز اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ میں بھی مسکرا دی۔ مگر میری تشویش اپنی جگہ قائم قائم تھی۔

”پھر بھی روشنی آئی تھنک تم نے ایک بہت بڑا رسک لیا ہے۔ شاید تمہیں ایک بڑی سٹرگل کرنا پڑے۔“

”جب اوکھلی میں سردیا ہے تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا۔“

اس کا انداز ہنوز وہی تھا۔ میں اس کی بہادری اور بلند حوصلے کی قائل ہو کر رہ گئی تھی۔ اور دل

سے دعا گو بھی۔



اگلا دن بہت مصروفیات اور خوشگوار ہنگامہ لیے طلاع ہوا تھا۔ دن بھر اسی ہنگامے کی نذر ہوا برات رات کی تھی۔ چونکہ میں بارات کے ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ جیسی بھیا مبری وجہ سے بے حد آپ سیٹ تھے۔ وہ چاہتے تھے موسیٰ یا پھر فیضی بھائی میرے پاس ہر صورت رکیں۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

”پلیز بھائی اتنے اہم موقع پر یہ زیادتی ہے۔ اتنا شوق ہے سب کو جانے کا۔“ میں منمنائی تھی۔

”تم چپ رہو۔“ انہوں نے مجھے نرمی سے جھڑکا۔

”حجاب کچھ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہی ہے بھیا! گیٹ پر سیکورٹی گاڑ ڈھوگا گھر پرزبیدہ بھی ہوگی۔ اس کے علاوہ دیگر ملازم بھی۔“

موسیٰ نے بھی دبا دبا احتجاج کیا تھا۔ انہوں نے کسی قدر سر د نظروں سے موسیٰ کو دیکھا۔

”میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ پپا میں ہرگز کنفرنسیل نہیں ہوں گا۔ آپ سمجھ رہے ہیں؟“

”ڈونٹ وری بھیا میں حجاب کے پاس گھر پر رک جاؤں گا۔“

عیسیٰ بھائی نے رسائیت سے کہا تو بھیا کچھ دیر اسے سر د مگر سوچتی نظروں سے دیکھتے رہے تھے پھر جیسے مطمئن ہو گئے۔ بھیا عام لڑکوں کی طرح پارلر تیار ہونے نہیں گئے۔ ان کی تیاری میں کوئی بھی خاص اہتمام نہیں تھا۔ بلیک ڈنر سوٹ میں سرخ ٹائی کے ساتھ جب گلے میں گلاب اور موتیے کی مالا پہن کر وہ تیار ہوئے تو اتنے وجہ لگ رہے تھے کہ ممانے بے ساختہ ان کی نظر اتاری تھی۔ بارات بہت دھوم دھام سے رخصت ہو گئی تو میں جو ذرا سی مشقت سے ہی آجکل تھکنے لگی تھی۔ بے دم سی ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات گہری ہو گئی تھی اور خنک بھی۔ کچھ دیر قبل یہاں سے بارات روانہ ہوئی تھی اس کے تمام خوشگوار احساس باقی تھے۔ میں نے انٹرکام پرزبیدہ سے کنٹیکٹ کیا تھا اور اسے گھر کی صفائی وغیرہ کرانے کی تاکید کی۔ جواباً زبیدہ نے میری تسلی کرائی تھی کہ وہ اس کام کی جانب ہونے لگی ہے۔ میں انٹرکام کا ریسورس رکھ کے پٹی تو عیسیٰ بھائی کوڑے میں کافی کنگ لیے اندر آتے پا کر مسکرا دی تھی۔

”آپ آرام کر لیتے بھائی! سارا دن کے تھکے ہوئے ہیں۔“

”اونہ یہ آرام کا دن تھوڑی ہے یہ تو خوشی کی گھڑیاں ہے۔ سوئی!“ وہ واقعی بے حد سرشار تھے۔ میں نے محبت سے انہیں دیکھا پھر ان کے ہاتھ سے مگ لینے کے بعد نرمی سے ان کا ہاتھ تھاما اور ایک عقیدت بھرا بوسہ دیا۔ میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

”آپ نے جو کچھ کیا بھائی وہ بے حد قابل تحسین ہے۔“

”نہ بھی تحسین خاصا بیک ورڈ نام ہے۔ مجھے اپنی شریک حیات کا کچھ اور نام چاہیے۔“

انہوں نے بے ساختہ گھبرانے کی ادا کاری کی تھی۔ پہلے تو میں سمجھی نہیں مگر جب سمجھی تو ان کی شرارت اور بر جستگی کے مظاہرے پر بے اختیار ہنستی چلی گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک مجھے ہنستے دیکھتے رہے پھر لب بھینچ کر نگاہ کا

زاویہ بدل لیا۔ مجھے لگا جیسے وہ ایک دم آپ سیٹ ہو گئے ہوں۔

”کیا ہوا بھائی!“ میں کچھ بے چین سی ہو کر بولی تھی۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور سر کونفی میں ہلایا۔

”آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں نا؟“

نہیں۔ انہوں نے پلکیں جھکالیں اور کافی کا گھونٹ بھرا مگر مجھے ان کی آنکھوں میں مچلتی نمی صاف نظر آئی تھی میرا دل بے ساختہ تھم تھم کر دھڑکنے لگا۔

”بھائی!!“ میں بولی تو میری آواز میں سرراہٹ تھی۔ انہوں نے محض خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”بھائی کہیں آپ روشی میں اٹوالو؟؟؟“

میری آواز بھرا گئی تھی۔ اور آنکھیں چھلک گئیں۔ یہ خیال بھی میرے لیے بے حد روح فرسا تھا۔

سچی بھائی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بے ساختہ میرے ہونٹوں پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”بے وقوف! اتنی فضول بات کیوں سوچی تم نے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اتنا بھی خاص نہیں ہوں۔ نہ

مجھے سوشل ورک کا شوق ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو خود شادی کرتا۔ قربانی نہ دیتا۔“

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے سچ کی پرکھ کرنی چاہی تھی ان کی آنکھیں شفاف تھیں وہ

جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ میرے دل کو ذرا سا سکون ملا۔

”لیکن آپ اداس تھے وائے؟“

”چھوڑو گڑیا، پلیز!“

وہ جیسے کترانے لگے مگر میں نے ان کی جان نہیں چھوڑی تھی۔ تب پھر انہوں نے کسی قدر یاسیت

سے جواب دیا تھا

”وجہ کوئی اور نہیں تم ہو حجاب! تمہاری بے رنگ زندگی۔ تم ہنستی ہوئی پیاری لگتی ہو ہمیں۔ مگر تمہاری

مسکراہٹ..... ہنی کاش کاش میں تمہارے لیے بھی کچھ کر سکتا۔“

ان کی آنکھیں پھر بھینگنے لگی تھیں۔ میرے پاس جیسے کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش اپنی

اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے۔ لمحے ہمارے درمیان بے حد بوجھل ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ہی خود کو سنبھالا تھا۔

”آپ کو یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا بھائی! یہی تو موقع تھا خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کا۔ کوئی پسند بھی

آہی جاتی۔“

میں نے دانستہ اپنی آواز میں شوخی کا رنگ بھرا۔ بہر حال میں انہیں اپنی وجہ سے اداس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر ڈیر سسٹر! کل ولیمہ پر بھی یہ موقع مجھے مل سکتا ہے۔“

انہوں نے بھی یقیناً میری خاطر ہی خود کو سنبھالا تھا اور مسکراتے لگے۔ مگر ان کی آنکھوں اور آواز سے

اداسی چھٹی نہیں تھی۔ کچھ دیر اور ہم اس طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے پھر عیسیٰ بھائی کے سیل پر ان کے

سی دوست کی انگلیٹڈ سے کال آنے لگی تھی۔

”افوہ اسے بھی ابھی فون کرنا تھا۔ اندر سگنل کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ میں ابھی بات نہیں کر سکتا۔“
وہ کچھ جھلا کر بولے تھے۔ میں نے بے ساختہ ٹوکا۔

”ایسا مت کریں بھائی! ہو سکتا ہے ضروری بات ہو۔ آپ باہر جا کے بات کر لیں نا۔“
”تم اکیلی ہو جاؤ گی۔ اس کی باتیں ایک بار شروع ہو جائیں تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔“
”اُس اوکے بھائی! میں اکیلی کہاں ہوں۔ زبیدہ فارغ ہو چکی کام سے وہ آتی ہو گی میرے پاس!“
میں نے نرمی سے تسلی دی اور انہیں مطمئن کر کے بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے انٹر کام پر
ایک بار پھر زبیدہ سے رابطہ کیا تھا۔

”کام مکمل ہو گیا زبیدہ!“

”بس بی بی جی میں نہانے جا رہی ہوں۔ کام تو ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا ذرا تیار ہو جاؤں۔“
”وہ خاصی عجلت میں لگ رہی تھی۔ میں مسکرا دی۔“
”اوکے تم ہو جاؤ تیار! سمن سے کہو میرے اور بھائی کے لینے کھانا گرم کر دے۔ اوکے؟“
”جی بہتر!“ وہ سعادت مندی سے بولی تو میں نے ریسور کریڈل پر ڈال دیا۔ اور پھول جانے
والے سانسوں کو بحال کرنے لگی۔ تبھی دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی تھی۔

”اتنی جلدی آگئے آپ! کہہ تو رہے تھے اتنی دیر لگ سکتی ہے۔“
میری پشت دروازے کی طرف تھی میں رخ پھیرے بغیر مسکرا کے گویا ہوئی۔
”اتنی جلدی کہاں؟ مجھے تو ایک ایک لمحہ صدی پر بھاری لگا ہے۔“
جواب میں قدموں کی چاپ ابھری تھی اور کوئی میرے سامنے آ گیا۔ وہ ابوداؤد تھے۔ میں ششدر
رہ گئی تھی۔ حیرت، خوف اور غیر یقینی کے شدید احساس نے مجھے منجمد کر ڈالا تھا۔

جی چاہتا ہے چوم لوں فرط شوق سے
وہ لب جو مجھے دیکھ کے حیرت سے کھل گئے
وہ کسی قدر شریر انداز میں گنگنائے اور پھر آگے بڑھ کر کوئی شوخ جسارت کرنی چاہی تھی مگر میں اس
لمحاتی سکتے سے نکل کر بدک کر پیچھے ہٹی۔

”اونہہ دھیان سے جان من! آپ کی حالت ہرگز ایسی نہیں کہ یہ اچھل کود زیب دے۔“
ان کا مخصوص بے باکانہ انداز تھا۔ اور نظریں اتنی گہری اتنی تفصیلی تھیں کہ میں نہ صرف سمٹ سی گئی
بلکہ اپنے وجود کو شال میں چھپانے کی سعی کرنے لگی۔ میری اس کوشش نے ہی یقیناً انہیں ہنسنے پر مجبور کیا تھا۔
”کم آن ڈیر شوہر ہوں تمہارا! یونو تمہارے اسی روپ کو دیکھنے کو تو جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آیا ہوں۔“
وہ اسی معنی خیزی اور شوخی سے بولے۔ میں اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی تھی۔
”آپ یہاں کیوں آگئے ہیں۔ چلے جائیں پلیز!“

میری جیسے جان پر بن آئی تھی۔ عیسیٰ بھائی لان میں تھے۔ اور کسی وقت بھی یہاں آسکتے تھے پھر اس کے بعد..... میں سوچ کر ہی ہول رہی تھی۔“

”بتایا تو ہے یا تمہارے اس خوبصورت روپ کو دیکھنے آیا ہوں۔ وہ کیا خوب کہا ہے شاعر نے کہ.....

ہزار چیزوں میں تیری شباہتیں ملی مجھ کو
پر دل کی مرضی ہے اگر تو نہیں تو تجھ سا بھی نہیں
”فضول باتیں مت کریں مجھ سے۔“ میں چیخ پڑی تھی۔

”یہ فضول باتیں ہیں؟“

وہ یکا یک سنجیدہ ہوئے تھے۔ میں برہمی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”جائیں یہاں سے۔“

”اگر نہ جاؤں تو.....؟“ وہ ایک دم غصے میں آکر مجھے گھورنے لگے۔ مگر میں خائف نہیں ہوئی تھی۔

جواباً انہیں گھور کر کسی قدر تنک کر بولی تھی۔

”تو میں گارڈ کو بلاؤں گی اسے کہو گی وہ آپ کو دھکے مار کے یہاں سے نکال دے۔“

میرے اندر جتنا طیش تھا جتنی تلخی تھی وہ میرے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔ ایک لمحے کو ابوداؤد کا رنگ

پھیکا پڑ گیا تھا۔ پھر انہوں نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

”کون سے گارڈ کو؟ جو گیٹ پر ہے اسے یا جو لان میں ہے۔ بلاؤ جسے بلانا ہے۔ ابھی اسے

تمہارے سامنے ڈھیر نہ کر دیا تو کہنا۔ خالی ہاتھ نہیں آ رہا ہوں میں بھی۔“

ان کے کاٹ دار لہجے میں گہرا طنز اور سفاکی اتر آئی۔ میں سرتاپا کانپ اٹھی۔ اس کا مطلب وہ عیسیٰ

بھائی کی گھر میں موجودگی سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے لگا خوف کی زیادتی سے میرا وجود پسینہ اگلنے لگا ہے۔

”اب کیوں رنگ فق ہو گیا ہے؟ بہت پیارے ہیں نا تمہیں اپنے بھائی! اور میں..... میری جگہ تو

کہیں نہیں ہوگی دل میں.....؟“

ان کا لہجہ عجیب تھا یا مجھے لگا میں بے دم سی ہو کر وہیں ڈھے سی گئی۔ بے بسی کا شدید احساس میرے

بہتے ہوئے آنسوؤں سے عیاں تھا۔

”روتی کیوں ہو؟“

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے آنسو چن لیے۔ میں خاموشی سے سسکیاں لیتی رہی وہ میری طرف

ذرا سر کے پھر بہت نرمی بہت دھیرے سے مجھے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ میں اتنی بے بسی محسوس کر رہی تھی کہ

مزاحمت تک نہ کر سکی۔ حالانکہ ان کا یہ اقدام مجھے ناگوار محسوس ہوا تھا۔

”پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میں تم سے ملنے اور کچھ دیر کو اچھا وقت گزارنے آیا تھا۔“

”آپ چلے جائیں ابوداؤد کوئی آجائے گا۔“

یہ میری بے بسی کی انتہا تھی کہ میں ان کی منت کر رہی تھی۔

میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ کچھ بھڑک کر بولے۔ ان کا ہاتھ میرے نقوش کو ٹٹول رہا تھا۔ میں سسک اٹھی۔
”مگر میں ڈرتی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے نا۔“

”تم کھانا کھانے لگی تھیں نا؟ کھاؤ نا۔ مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ آؤ کچن میں چلتے ہیں۔“
میں انہیں دیکھ کر رہ گئی؟ عجیب کھسکا ہوا انسان تھا۔ کوئی ڈر خوف نہیں تھا جبکہ میری جان ہوا ہو رہی تھی۔
”ابو داؤد میرے ساتھ اس طرح مت کریں۔“

میں بے تحاشا زچ ہوئی تھی۔ دبے ہوئے لہجے میں چیخ اٹھی۔ انہوں نے چونک کر اور کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا۔

”کیا کر رہا ہوں؟ حالانکہ دل کچھ کرنے کو مچل رہا ہے۔“

ان کا پر تپش لہجہ اور لودیتی آنکھیں مجھے کچھ اور مضطرب کرنے لگیں۔

”کھانا نہیں کھلاؤ گی اپنے ہاتھ سے؟ ویسے آج مجھے ضد ہو گئی ہے۔ سالا صاحب کی شادی ہے نا کھانا یہاں سے کھا کر ہی جاؤں گا۔ کیا سمجھتے ہیں مجھے نہ بلا کر میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ویسے بیوی تم خواہ مخواہ دیر کر رہی ہو۔ اگر سالا صاحب آگئے واپس اپنی نئی نوپلی دہن کے ساتھ تو مجھے اپنی دہن کے ساتھ دیکھ کر سلطان راہی کی طرح بھڑک اٹھیں گے۔ پھر کیا ہو گا اندازہ تو ہو گا کچھ کچھ آپ کو۔“

وہ بے نیازی سے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ میں سہم کر انہیں دیکھنے لگی۔ پھر اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ ان کا ہاتھ پکڑے کچن کی جانب آگئی۔ کچن میں موجود ڈائیننگ ٹیبل کی ایک چیر کے نزدیک لا کر انہیں کھڑا کیا۔
”بیٹھیں یہاں میں کھانا گرم کرتی ہوں۔“

میں جان گئی تھی وہ ضد کا پکا انسان اپنی منوا کر چھوڑے گا جیسا ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

”تم بیٹھو نا میں گرم کر لیتا ہوں۔ ایسی حالت میں کام کیسے کرو گی۔“

وہ ایک بار پھر میرا بھرپور جائزہ لے رہے تھے۔ نظریں ایسی تھیں کہ میں ایک بار پھر کھسیا کر رہ گئی۔
”ڈونٹ وری یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔“

میں نے کسی قدر خشک انداز میں کہا تھا۔ میں جلد از جلد گویا ان سے خلاصی چاہ رہی تھی۔ جیسا معمول سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے کام کیا تھا۔

شروع کریں۔ میں نے نفاست سے کھانا ان کے سامنے چن دیا۔ بریانی چکن روسٹ جلفریزی اور کباب کے علاوہ سیلٹ اور راستہ! اور خود فریج سے کھیر کا باؤل نکالنے لگی۔

”تم بھی آؤ نا۔“

وہ دونوں بازو ٹیبل پر رکائے بہت اطمینان بھرے انداز میں مجھے تک رہے تھے۔ جبکہ میرے اندر جیسے پنکھ لگ گئے تھے۔

”نہیں۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔“

”مجھے دیکھ کر اڑ گئی ہے نا؟“ وہ خفیف سا ہنسے میں نے جواباً خاموشی اختیار کی تھی۔

”کھا کیوں نہیں رہے؟“ میں جھلانے لگی۔

تم کھلاؤ گی تو کھاؤں گا نا۔ انہوں نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں تو میں دانت کچکچا کر رہ گئی۔

کچھ کہے بغیر ان کے نزدیک آئی اور باقاعدہ نوالے بنا کر ان کے منہ میں ڈالنے لگی۔ انداز میں کسی

قدرت نمایاں تھی۔ دوسرے لقمے پر انہوں نے میرا ہاتھ تمام لیا تھا۔

”جان چھڑانا چاہ رہی ہونا مجھ سے؟“

میں نے چونک کر انہیں دیکھا ان کی آنکھوں میں عجیب نا فہم سا تاثر تھا۔ میں اس قدر درست قیاس

پر سن رہ گئی۔

”نہیں؟“

”جھوٹ مت بولو۔“ انہوں نے میرا ہاتھ تمام لیا۔ کچھ دیر تک مجھ کو دیکھا پھر گہرا طویل سانس کھینچا تھا۔

”یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے بیوی! سالہا صاحب کی واپسی تک مجھے یہاں رہنے دو۔ وہ آتے ہی مجھے

پہلی فرصت میں شوٹ کر دیں گے۔ تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔“

”فضول مت بولیں۔“ میں نہایت غصے سے ٹوک گئی تھی۔

”وہ شخص ہر صورت جیتنا چاہتا ہے حجاب! مگر میں جیتے جی ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ وہ تمہیں مجھ

سے چھین لینا چاہتا ہے۔ مگر.....“

انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ چند گہرے سانس بھر کے جیسے کسی شدید کیفیت پر قابو پایا تھا۔

”تمہیں پتا ہے اس نے تمہاری طرف سے مجھے خلع کا نوٹس بھیجا ہے۔“

انکشاف ایسا تھا کہ میں پوری ہستی سمیٹ کر مل کر رہ گئی تھی۔

”اے منع کر دینا حجاب! ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں تمہیں یہی سمجھانے آیا تھا۔“

وہ کسی قدر تلخی اور رعوت سے بولے تھے۔ میں نے دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھا تھا۔

”اے کہنا مجھے دوسرا نوٹس نہیں ملنا چاہیے۔ میں کورٹ جانے سے نہیں ڈرتا، بات تمہیں

چھوڑنے کی ہے۔ میں کسی صورت ایسا نہیں کروں گا۔ اگر اس نے ایسا زبردستی کرانے کی کوشش کی تو پھر تم مجھے

جانتی ہو۔ میں اسے شوٹ کر دوں گا۔“

ان کے لہجے میں اتنی سفاکی اتنی برودت اور تلخی تھی کہ میں گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ میر

جواباً کچھ کہتی کہ ایک دم سے زبیدہ حواس باختہ سی اندر آ گئی۔

”وہ وہ جی بھی بارات آ گئی ہے وہیں کورخصت کرا کے۔“

اس کی نظریں میری بجائے ابوداؤد پر تھیں۔ میں حراساں ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ چلے جائیں ابوداؤد!“

میری لرزتی آواز میں التجائیں درآئی تھیں۔

”موقع اچھا ہے میرا خیال ہے سالہ صاحب سے یہیں دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“

وہ غراہٹ زدہ آواز میں کہتے ایک جھٹکے سے اٹھے میں تڑپ کر ان کے سامنے آگئی تھی۔

”فارگاڈ سیک ابوداؤد فارگاڈ سیک! آپ جائیں یہاں سے۔“

میں نے دونوں ہاتھ ان کے آگے جوڑ دیئے تھے۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا تھا پھر جانے کس

جذبے کے تحت مجھے تھام کر اپنے ساتھ لگایا بلکہ بھینچ لیا۔

”اسے کہہ دینا میرے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ اس گھر سے کسی ایک کا جنازہ

لازمی اٹھ جائے گا۔“

ان کے سر دلچے میں کسی اڑدھے کی سی پھنکار تھی۔

”ابھی تو جا رہا ہوں مگر میں پھر آؤں گا۔ تمہیں لینے کے واسطے سنا تم نے۔“

انہوں نے جھک کر سرگوشی کی اور مجھے آہستگی سے الگ کرتے پلٹ کر پکن سے نکلے تھے اور تیزی

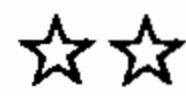
سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ میرا پورا وجود تھر تھرا کانپتا رہا۔ کسی کے دیکھ لیے جانے اور تصادم ہو جانے کی صورت

میں اٹھنے والے طوفان نے مجھے سراسمگی اور دہشت کا شکار کیے رکھا۔ مگر خیریت گزری تھی ایسی کوئی صورت حال

پیدا نہیں ہوئی تو مجھے از سرے نو ابوداؤد کی دھمکیاں یاد آئیں۔ میں بے ساختہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی تھی اور

روتی چلی گئی۔ معاً میری یہ سسکیاں پہلے کراہوں میں بدلی تھیں پھر دبی دبی چیخوں میں، مجھے لگا تھا میں مر رہی

ہوں۔ درد تھا شدید درد، میں بے ساختہ چیختی چلی گئی۔



پھر ہوش اور بے ہوشی کے جانے بکتے مراحل طے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب میں مکمل حواسوں

میں لوٹی تو قدرت نے جنت میرے قدموں تلے بچھا دی تھی۔ بچے کی پیدائش کی جو ڈیٹ ڈاکٹر ز نے دی تھی وہ

اگلے ماہ کی تھی۔ مگر اس رات اچانک طبیعت خراب ہو جانے کے باعث قبل از وقت آپریشن کرنا پڑ گیا تھا۔

”بیٹا بہت مبارک ہو ہنی! ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔ معصوم فرشتہ!“

عیسیٰ بھائی اور ثانیہ بھابھی تھے میرے پاس جب میں ہوش میں آئی۔ نقاہت میرے ہر احساس پر

حاوی تھی میری دھیمی مسکراہٹ بھی بہت بوجھل تھی۔

”دیکھو بیٹے یہ کتنا پیارا ہے۔“

ممانے گلابی کمبل میں لپٹا بچہ جو روتی کے گالے جیسا تھا میرے پہلو میں لٹایا۔ میری نگاہ بے ساختہ بچے

کے نقوش میں الجھ گئی۔ کشادہ پیشانی، غلانی آنکھیں اور کھڑی ناک۔ وہ ہو بہو ابوداؤد کی تصویر تھا۔ جھک کر بچے کی

پیشانی پر ہونٹ رکھتے ہوئے جانے کس احساس سمیت میری آنکھیں چھلک گئیں تھیں۔ اور جب میں سب کی نظر بچا

کر آنسو پونچھ رہی تھی میری نگاہ سامنے اٹھ گئی تھی۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ سلور فریم گلاسز کے پار بڑی بڑی آنکھوں میں رتجگوں کا خمار لیے عون بھیا بے حد خاموش اور سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ چونک سی گئی۔

”عون بھیا! کیسے ہیں؟ آپ“

”یہ بات تو مجھے پوچھنی چاہیے ہنی!“

ان کی آواز بہت بوجھل تھی۔ میں آہستگی سے مسکرا دی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“

اور جواب میں کچھ کہے بنا بس وہ مجھے دیکھتے رہے تھے۔

”روشی کیسی ہے؟“

جب وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھے تھے میں نے انہیں بغور تکتے ہوئے پوچھا تھا۔ جواب میں ان کے چہرے پر موجود گھمبیر تاثر میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ کہے بنا وہ نگاہ کا زاویہ بدل گئے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں کچھ دیر کو کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”آپ اسے بھی ساتھ لے آتے۔“

خاصی تاخیر سے میں کچھ بولنے کے قابل ہوئی تو قدرے حوصلے کو مجتمع کر کے کہا تھا۔

”جاؤں گا تو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ڈونٹ وری!“

”عیسیٰ بھائی آج عون بھیا کا ولیمہ ہے نا؟“

عون بھیا اٹھ کر گئے تب میں نے عیسیٰ بھائی کو مخاطب کیا تھا۔ جو مسلسل بچے کو گود میں لیے اسی میں مگن تھے۔

”ہاں مگر رات کی تقریب ہے۔“

”آپ سب لوگ تو یہاں ہیں انتظامات کون دیکھ رہا ہے؟“

”ارے پریشان کیوں ہوتی ہو ہنی! پپا کے علاوہ فیضی بھائی اور موسیٰ بھی ہیں۔ میں بھی ابھی آیا ہوں ورنہ تو عون بھیا ہی یہاں موجود رہے ہیں۔“

”عون بھیا رات سے یہاں ہیں گھر واپس نہیں گئے؟“

”نہیں۔ حالانکہ ہم سب نے بہت اصرار کیا تھا۔ مگر وہ بہت آپ سیٹ تھے تمہاری طبیعت کی وجہ سے۔“

”اوہ نو! یہ تو اچھا نہیں ہوا روشی کیا سوچتی ہوگی؟“

مجھے عجیب سی خجالت نے آن لیا۔ بھابھی نے مسکرا کر ہاتھ تھام کر تھپکا تھا۔

”کم آن حجاب! روشی ایسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ ایسا ویسا کچھ نہیں سوچے گی۔ بلکہ وہ تو تمہاری وجہ سے

خاصی پریشان رہی ہے۔ بار بار اس کی کالز آتی رہی ہیں۔“

”پھر بھی بھابھی! مجھے عجیب لگ رہا ہے کہ میری وجہ سے۔“

”ارے نہیں۔ یہ تو قدرت کے کام ہیں۔ روشی بھی عون بھیا کی تمہارے ساتھ محبت اور جذباتی وابستگی سے آگاہ ہے۔“ بھابھی نے پھر مجھے تسلی دی تھی۔ مجھے خاموش ہونا پڑا۔

”آپ زبیدہ کو میرے پاس چھوڑ دیں بھابھی! روشی کو پارلر وغیرہ بھی جانا ہوگا۔ آپ گھر چلی جائیں۔“ بھابھی میری پریشانی اور تشویش کو محسوس کر کے مسکرا دی تھیں۔

”تم خواہ مخواہ کانشش ہو رہی ہو حجاب! روشی ان سب باتوں کو سمجھتی ہے۔ وہ غیر نہیں ہے۔ بہت اپنائیت ہے اس کے ہر انداز میں ڈونٹ پوری ہنی! بلکہ وہ تمہاری وجہ سے از حد پریشان تھی۔“

ابھی ہمارے بیچ یہ باتیں ہو رہی تھیں جب میرون بڑی سی شال میں نکھری نکھری سی روشانی پیا کے ساتھ وہاں چلی آئی۔ میں تو اسے دیکھ کر ہی حیران ہونے لگی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے حجاب! اور بیٹا بہت مبارک ہو۔“

اس نے جھک کر مجھے اور بچے کو باری باری پیار کیا۔ پھر اپنے سبک حنائی ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”تم نے کیوں زحمت کی روشی! مجھے کل یا پرسوں بہر حال گھر آ جانا تھا۔“

”ارے.....“ وہ ذرا سا ہنسی پھر بچے کو جھک کر ایک بار پھر پیار کیا تھا۔

آپ کو دیکھے بغیر تو شاید رہ لیتی مگر آپ کے بے بی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ بہت کیوٹ ہے یہ۔“ واضح رہے یہ حجاب کا بیٹا ہے عون بھیا نہیں۔“

ثانی بھابھی نے مذاق کیا تھا۔ روشانی نے جھینپ کر رہ گئی۔

”ویسے سچ بتاؤ بچے کو دیکھنے آئی ہو یا اپنے دولہا کو؟“

بھابھی نے آنکھیں نچا کر پوچھا تو روشانی نے خجالت سے سرخ پڑتی ہنس دی تھی۔

دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیوں بھیا!

عینی بھائی نے اس شرارت کو طول دیا تھا عون بھیا جو اسی سمت آرہے تھے ذرا چوٹے پھر جھکی پلکوں اور شرمائی شرمائی سی روشانی نے کو دیکھ کر ان کی کشادہ صبح پیشانی پر ایک شکن نمودار ہوتی تھی۔ مگر کچھ کہے بنا انہوں نے ہونٹ بھیجنے لیے تھے۔ پیا کے پاس رک کر انہوں نے کچھ بات کی تھی پھر پلٹ کر چلے گئے تھے۔

”روشانی بیٹے آپ ایسا کرو عون کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ کوشش تو ہماری یہی ہے کہ شام تک ڈاکٹر سے بات کر کے حجاب کو بھی گھر لے جائیں۔“

جی پیا! روشانی جھکی پلکوں سمیت بولی تھی۔ تبھی ایک بار پھر عون بھیا ڈاکٹر کے ساتھ آتے دکھائی دیے تھے۔ ڈاکٹر نے چیک آپ کیا تھا پھر رسائیت سے گویا ہوا۔

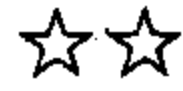
پیشنٹ کی طبیعت بہتر ہے مگر آپ ابھی انہیں ڈسچارج نہ کروائیں میرا مشورہ یہی ہے۔ بی کا ز جو نگہداشت انہیں یہاں مل سکتی ہے وہ گھر پر نہیں۔

ڈاکٹر بڑے بھیا اور عینی بھائی سے اس موضوع پر کچھ دیر بات کرتا رہا تھا۔ طے یہی پایا کہ مجھے ابھی

کمر نہیں لے جایا جائے گا۔ عون بھیا نے ولیمہ منسوخ کرنے کی تجویز بھی پیش کی جسے پیانے رد کر دیا تھا۔
یہ کسی طور بھی مناسب بات نہیں ہے۔ حجاب بیٹی ٹھیک ہو کر انشاء اللہ آپ لوگوں کی خوشیوں میں
شریک ہوتی رہیں گی یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ عون اب آپ گھر جاؤ بیٹے! انکار نہیں ہونا چاہیے۔ حجاب بہتر
ہے۔ پریشانی کی بات نہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔
پیانے کچھ اتنی قطعیت سے کہا تھا کہ عون بھیا جو انکار کرنے والے تھے خاموش رہ گئے۔
”اور فیضان سے کہنا مجھے کال کر لے۔“

”جی بہتر! مگر یہ ابھی تو آئی تھیں۔ اتنی جلدی کیا ہے ذرا رک کے آجائیں۔“
عون بھیا نے ایک اچھتی ہوئی نگاہ روشانے پر ڈال کر پیانے سے کہا تھا۔ روشانے کے چہرے پر
تاریک سا سایہ لہرا گیا۔
”ارے نہیں بیٹے ایک رات کی دہن ہے۔ مناسب نہیں لگتا یہاں خواجواہ بیٹھنا تم ساتھ لے کے
جاؤ۔ اب کے ممانے ٹوکا تھا۔“
”جاؤ بیٹے فی امان اللہ!“

انہوں نے ایک فدیہ نہ نگاہ بہو بیٹے پر ڈالی تھی اور مسکرا کر کہا۔ روشانے سر جھکائے کھڑی عون بھیا
کے لمبے تڑنگے سراپے کے سامنے نازک سی گڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ مجھے ان دونوں کو ساتھ دیکھنے کا یہ پہلا تجربہ
تھا۔ وہ واقعی جیسے ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔ میں بے ساختہ مسکرا دی۔



کیوں رات کی ریت پر بکھرے ہوئے
تاروں کے کنکر چنتی ہو
کیوں سنائے کی سلوٹ میں لپٹی آوازیں سنتی ہو
کیوں اپنی پیاسی پلکوں کی جھالر میں خواب پروتی ہو
کیوں روتی ہو؟
اب کون تمہاری آنکھوں میں
صدیوں کی نیند اٹھیلے گا
اب کون تمہاری چاہت کی ہریالی میں کھیل کھیلے گا
اب کون تمہاری تنہائی کا آن دیکھا دکھ جھیلے گا
اب ایسا ہے

یہ رات مسلط ہے جب تک
یہ شمعیں جب تک جلتی ہیں

یہ زخم جہاں تک چبھتے ہیں
یہ سانسیں جب تک چلتی ہیں
تم اپنی سوچ کے جنگل میں
راہ بھٹو اور پھر کھو جاؤ

اب سو جاؤ

چند گھنٹوں کی بات تھی۔ میں نے سب کو مطمئن کر کے بھیج دیا تھا۔ اب صرف زبیدہ میرے پاس تھی۔ اور میں جانے کیوں ایک بار پھر تکلیف دہ یادوں میں گھر کر جیسے اذیتوں کے سمندروں میں غوطہ زن تھی۔ مستقبل کا خوف مجھے وحشت زدہ کر رہا تھا۔ بھیا کی سوچ مجھ پر عیاں ہو چکی تھی اور ابوداؤد کی بھی۔ مجھے پھر لگا تھا یہ دو مردوں کی انا کی جنگ تھی جس میں پہلے میں برباد ہوئی تھی اور اب میرا بیٹا بھی۔ کیا میں یہ سب برداشت کر سکتی تھی؟ مگر میرے پاس کوئی راہ کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔ بے بسی کے مظہر آنسو میرے بالوں میں جذب ہونے لگے۔ امید کی معمولی کرن بھی دور دور تک نہیں تھی۔

”حجاب!“

ابوداؤد کی آواز اپنے بے حد نزدیک سن کر میرے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا۔ میں نے برعت سے آنکھیں کھولیں اور انہیں رو برو پا کے جیسے میری روح فنا ہو گئی تھی۔

”لیٹی رہو۔ آئی نو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

ایک خوفزدہ نگاہ ان پر ڈال کر میں بچے کو مضطرب ہو کر جیسے ہی اٹھانے لگی انہوں نے میرے کاندھوں پر دباؤ ڈال کر نرمی سے ٹوک دیا۔

”بے فکر رہو۔ میں تم نے اپنے بچے کو چھیننے نہیں آیا۔ تمہارے ساتھ ساتھ اسے بھی ایک نظر دیکھنے کی خواہش تھی لیکن اگر تم اجازت دو۔“

میں حق دق سی انہیں دیکھنے لگی۔

میں جانتا ہوں تم مجھے بہت برا سمجھتی ہو مگر حجاب ایک آدمی میں سب برائیاں ہی ہوں ضروری تو نہیں۔

وہ اس نرمی و حلاوت سے بولے تھے۔ میں بے اختیار نظر چرا گئی۔

”تمہیں مجھ پر ٹرسٹ بھی نہیں ہے۔ گدا!“

وہ اپنی بات کے اختتام پر جیسے خود پر طنز کر کے ہنسے۔ کچھ دیر ہونٹ بھیچے رہے پھر رخ پھیر کر کاٹ سے بچے کو اٹھا لیا۔ میری جیسے روح جسم کے اندر پھڑپھڑانے لگی۔ وہ ابوداؤد تھے۔ بے حس، سفاک اور عہد شکن، جھوٹے۔ مجھے ان پر بہر حال اعتماد نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل انہوں نے کہا تھا وہ میری اجازت سے بچے کو دیکھیں گے اب کچھ دیر بعد وہ اپنی کہی بات بھول گئے تھے۔ یہی حقیقت تھی ان کی۔ میں نے زبیدہ کی طرف دیکھا۔ بیچ پر کشن سر کے نیچے رکھے وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اگر ابوداؤد بچے کو لے جانا چاہتے تو شاید میں کچھ

اگر
اگر نہ کر پاتی۔ خوف میرے وجود کو سرد کرنے لگا۔

”تم نے کچھ نام سوچا؟“

انہوں نے اچانک سر اٹھا کر مجھے بغور دیکھا۔ میں ٹکڑ ٹکڑا نہیں تکتی رہی۔

”اسامہ کیسا نام ہے؟“

”پتا نہیں میں نے کچھ اور نام سوچا ہے۔ میں وہی رکھوں گی۔“

میرے انداز میں میرے لہجے میں ایک طرح کی ہٹ دھرمی اور تلخی تھی۔ میں انہیں ایک بار پھر اٹکاتا چاہتی تھی بچے سے یا مجھ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

”یار تم وہ اگلی مرتبہ رکھ لینا۔ اس کا نام اسامہ ہی رکھتے ہیں۔ مجھے پسند ہے نا۔“

ان کی بات پر مجھے بے تحاشا ناؤ آیا تھا۔

”یہ کمپرومائز آپ کیوں نہیں کرتے؟“ میں جیسے پھٹ پڑی تھی۔

”یار جو ہمارے حالات ہیں۔ لگتا تو نہیں ہے اس کا کوئی اور بہن بھائی آپائے۔ سالا صاحب شاید

اس سے پہلے ہی اسے یتیم کر دیں۔“

وہ جھک کر بچے کو پیار کرتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ میرے دل پر جیسے گھونسا پڑا تھا۔ میں یک

ہل ہونٹ بھیجنے کی نظر میں پھیر گئی۔ انہوں نے بچے کو میرے پہلو میں لٹایا پھر کوٹ کی جیب ٹٹول کر ایک مٹیلیں

اٹس نکالا تھا۔ میں لاشعوری طور پر متوجہ ہو گئی تھی کچھ حیران رہ گئی۔

”یہ تمہارے لیے۔“

”بٹ وائے؟“ میری پیشانی پر بل پڑنے لگے تھے۔

گفٹ کے جواب میں گفٹ دینا چاہیے یا محبت بڑھتی ہے۔ وہ بے حد خوشدلی سے جواب دے

رہے تھے۔

”میں نے آپ کو کوئی گفٹ نہیں دیا سمجھے آپ!“

”اسامہ سے بڑھ کر اور کیا اچھا گفٹ ہوگا۔ پہلے تم صرف میری بیوی تھیں مگر اب میرے بچے کی

ماں بھی ہو۔“

”نہ میں آپ کی بیوی تھی نہ آپ کے بچے کی ماں ہوں۔ مجھے اس خیرات کی ضرورت نہیں۔“

مجھے کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔ میں کچھ بھول بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ابو داؤد کا چہرا

غیر ہوا تھا۔

”حجاب بہتر ہوگا تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔“

”میں آپ سے کہوں گی آپ مجھے اور میرے بیٹے کو بھول جائیں۔ جان چھوڑ دیں ہماری!“

میں چیخ اٹھی مگر پھر بے ساختہ کراہتے ہوئے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اسٹینک میں کھینچاؤ کے

باعث درد کی تیز لہریں اٹھی تھیں۔ ابوداؤد نے بے اختیار مجھے تمام لیا۔

”رینیکس حجاب! کام ڈاؤن!“

میں نے ان کے ہاتھ زور سے جھٹک دیئے۔ اور دبی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

”آپ چلے جائیں یہاں سے۔“

حجاب! وہ کس قدر غصے سے بولے تھے انداز میں گویا تنبیہ تھی۔ مگر میں خائف نہیں ہوئی۔

”میں نے کہا نا آپ چلے جائیں میں صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی آپ کی۔“

میں پھر چیخی اپنی تکلیف کی پرواہ کیے بنا ابوداؤد نے ہونٹ بھیج کر مجھے دیکھا تھا پھر اسی خاموشی سے

ایک جھٹکے سے پلٹ کر چلے گئے۔



پانچواں حصہ

ان کے جانے کے بعد میری نگاہ اس جیولری کیس پر پڑی تھی۔ جسے وہ میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔
 میں نے کچھ دیر دھند آلود نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اور اٹھا کر دیوار سے مارا تھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی۔

☆☆

موسم بدل گیا تھا۔ اب شامیں طویل ہونے لگی تھیں۔ فضا میں موجود خشکی جسم کو بھلی لگنے لگی تھی۔ مگر
 اس کے باوجود ماما کی خاص تاکید ہوتی اسامہ کو سردی سے بچایا جائے۔ دھوپ ڈھل رہی تھی جب میں اسامہ کے
 ماتھ واپس کمرے میں آگئی تھی۔ اسامہ کو زیادہ تر روشنی ہی سنبھالتی تھی۔ ثانی بھابھی پریگنٹ تھیں ان کی
 بیعت گری گری رہا کرتی۔ روشنی نے ہی گھر کی تقریباً ساری ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں ایسے میں ثانی بھابھی
 بھی وہی خیال رکھتی۔ اتنی نازک تھی پھر بھی سارا دن بھاگ بھاگ کر ہر کسی کی خدمت پر کمر بستہ رہتی اور ذرا
 ٹھکتی ہو۔ ماما نے اسے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا مگر اس نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔

”کیوں نہیں پڑھنا روشنی۔ ایم اے تو کسلا۔ ساری زندگی کام ہی کرنے ہوتے ہیں۔“

میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”تمہارے بھیا صاحب جو ہیں نا تمہیں کے کوچن سے کہیں بڑھ کر گھمبیر ہیں میرے لیے۔ انہیں

مجھ لوں، جان لوں۔ سمجھ لینا ساری ڈگریاں سمیٹ لی میں نے۔“

وہ تمہارے ساتھ ٹھیک تو ہیں نا؟

میں اکثر فکر مند ہو جایا کرتی۔

”خراب ہو کر تو دیکھیں۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ روشا نے خان نام ہے میرا۔“

جواباً وہ کل کل کر کے ہنستی اور میں مطمئن ہو جایا کرتی۔ عون بھیا کا رویہ نارمل تھا۔ ان کے کسی بھی

از سے ہم یہ اخذ کرنے میں نا کام رہے تھے کہ روشا نے کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہیں؟ روشنی کو بچے بہت

بھے لگتے تھے اسی وجہ سے وہ اسامہ کو ہر وقت لپٹائے رکھتی کام کرتے ہوئے بھی اکثر اسامہ اس کی گود میں ہوتا۔

”اگر تمہیں بچے اتنے اچھے لگتے ہیں تو پھر خود جلدی سے اماں بن جاؤ نا۔“

ایک دن میں نے اسے چھیڑا تھا۔ اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا شدید

سہاں ہوا تھا مگر روشنی نے اس کے بعد بہت خوبصورتی سے مجھے ٹال دیا تھا۔

”حجاب!“

میں اسامہ کے کپڑے چینج کر رہی تھی جب روشی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ میں نے مصروف رہ کر سوالیہ نظروں سے ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔

”تمہیں عون بلار ہے ہیں ڈرائنگ روم میں۔“

”خیریت! کون آیا ہے؟“

میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی مگر کچھ اخذ کرنے میں ناکام رہی تھی۔

”لاؤ اسے میں کپڑے پہنا دوں تم جاؤ۔ آؤ بیٹے!“

اس نے اسامہ کو مجھ سے لے لیا۔

”روشی کون آیا ہے؟“

میں تذبذب کی کیفیت میں کھڑی تھی۔ روشا نے مجھے نظر بھر کے دیکھا۔

”ہاں آیا بھی ہے۔ عون وہاں بلار ہے ہیں تمہیں۔ شاید کچھ بات کرنی ہے۔“

میں نے محسوس کیا روشا نے مجھے کچھ بتانے سے کتر رہی ہے۔ میں پیروں میں سیلر ڈالے کچھ پریشان کچھ الجھن میں مبتلا ڈرائنگ روم میں گئی تو ایک دم ٹھٹھک گئی۔ ماما، پاپا، فیضی بھائی، عون بھیا، عیسیٰ بھائی کے ساتھ ابوداؤد بھی تھے۔ میرے قدم ٹھٹھکنے کی وجہ ابوداؤد کی موجودگی تھی۔ آف وائٹ ٹوپس سوٹ میں ملبوس بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ سگریٹ کے کش لیتے کسی قدر سرد مہر، لا تعلق اور بے نیاز نظر آ رہے تھے مگر میرے اندر قدم رکھتے ہی ان کی اس لا تعلق اور بے نیازی کی جگہ گہری توجہ اور دلچسپی نے لے لی۔ وہ بغور مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں سخت جزبزی ہو گئی ان کی اس فضول حرکت پر وہ بھی سب کی موجودگی میں۔

”اسامہ کدھر ہے؟ اسے کیوں نہیں لائی ہو تم؟“

انہوں نے براہ راست مجھے مخاطب کیا تھا۔ کسی کی خاص پرواہ کیے بغیر۔ میرے اندر موجود تلخی اور الجھن کچھ مزید گہری ہو گئی۔ میں نے ہونٹ بھیختے ہوئے سوالیہ نظروں سے عون بھیا کو دیکھا تھا۔

”بیٹھ جاؤ ہنی! مجھے بات کرنا تھی تم سے اینڈ ریلیکس!“

عون بھیا نے کسی قدر سنجیدگی اور متانت سے کہا تھا۔ میں کچھ کہے بغیر عون بھیا کے پہلو میں خالی جگہ پر کچھ مضطرب سی بیٹھ گئی۔

”یہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔ ان کا خیال ہے ہم نے زبردستی تمہیں اپنے پاس روکا ہوا ہے۔“ کچھ دیر کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد عون بھیا کی آواز گونجی تھی جس میں کچھ اور سنجیدگی کچھ اور بھی تلخی در آئی تھی۔ میں نے کچھ اضطراب کی کیفیت میں سر اٹھا کر عون بھیا کو دیکھا تھا۔ وہ میری طرف ہی متوجہ تھے۔ متانت اور بردباری سے گویا ہوئے۔

”یہ بات تمہارے علم میں ہوگی کہ ہم نے کورٹ میں خلع کا کیس دائر کیا ہے۔ انہیں یہ شک ہو رہا

ہے یہ تمہارا فیصلہ نہیں ہے۔ عدالت سے پہلے فیصلہ سنا چاہتے ہیں۔ تم انہیں اپنی مرضی سے آگاہ کر دو۔“

عون بھیا کی بات پر میں کچھ دیر خالی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو تکتی رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ ابوداؤد سے ہدائی کے اس لمحے میں آپ سیٹ ہو رہی تھی۔ میری حیثیت انہوں نے اپنی زندگی میں جو واضح کی تھی مجھ پر اس کے بعد اس تعلق میں محبت کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ بہر حال مجھے بھی ایک عزت دار لڑکی ہونے کے ناطے اپنی انا اور پندار کے ساتھ عزت نفس عزیز تھی۔ مگر معاملہ اس وقت عون بھیا کا تھا۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ ابوداؤد عون بھیا کے دشمن تھے دونوں ایک دوسرے کے حریفوں کے طور پر ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ میرا فیصلہ کسی ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست بن سکتا تھا۔ ابوداؤد کے لیے میں محض ٹرپ کا ایک پتہ تھیں مگر عون بھیا کے ساتھ میرے بہت سے احساس وابستہ تھے۔ محبت، عزت، مان اور بھروسے کے۔ میں عون بھیا کو اس مقام پر کسی صورت بھی تنہا نہیں کر سکتی تھی۔ جی میں بولی تو میرے لہجے میں ٹھہراؤ اور رسائیت کا عنصر بے حد واضح تھا۔

”آپ کا فیصلہ میرا ہی فیصلہ ہے عون بھیا! میں خلع چاہتی ہوں۔“

عون بھیا نے بغور جبکہ ابوداؤد نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔ باقی تمام نفوس ایک دم خاموش تھے۔

”مگر انہیں کیسے یقین آئے کہ یہ بات تم کسی پریشر کے بنا کہہ رہی ہو؟“

عون بھیا کے لہجے میں خفیف سی کاٹ تھی۔ میری بے ساختہ نگاہ ابوداؤد کی سمت اٹھی جو غصیلی اور پریش نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ معاوہ ایک دم ایک جھٹکے سے اٹھے اور میرے سامنے آگئے میں ان کے انداز کی جارحیت پر گھبرا کر کھڑی ہوئی تھی انہوں نے جھپٹ کر میرا بازو پکڑا اور مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ بکو اس کرتی ہو۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم مجھ سے علیحدگی چاہتی ہو۔“

وہ شاید حواسوں میں نہیں رہے تھے۔ مجھے خفت اور شرمندگی نے آن لیا۔ میں کرنٹ کھانے کے انداز میں انہیں دھکیل کر سرعت سے فاصلے پر ہوئی۔

”واٹ نان سنسن! تمیز سے بات کریں آپ سمجھے؟“

میں نے عون بھیا کو تلملا کر ابوداؤد کی سمت بڑھتے دیکھ کر فیض بھائی کو متلعجی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ فیض بھائی فوری حرکت میں آئے اور عون بھیا کا بازو پکڑ کر واپس بٹھانے کی کوشش کی مگر وہ پھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”آئی کانٹ بلیواٹ! میری آنکھوں میں دیکھو پھر کہو یہ بات!“

ابوداؤد سرخ چہرے کے ساتھ دھاڑے۔ طیش سے ان کی آواز بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ میں نے تیز مگر بے حد خفا نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یہ کسی فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے مسٹر ابوداؤد! جوڈ ایلاگ جھاڑے جائیں پلیز گو! اب ہماری ملاقات کورٹ میں ہی ہوگی۔“

عون بھیا نے کسی قدر تلخی اور حقارت سے جواب دیا تھا۔ ابوداؤد نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں وہ اپنی لہورنگ آنکھوں سے مجھے گھورتے رہے تھے۔

”تم نے اچھا نہیں کیا حجاب! میں اس انسلٹ کو بھولوں گا نہیں۔“

اسی طیش بھرے انداز میں کسی قدر ہنڑک کر کہتے وہ آندھی طوفان کی طرح پلٹ کر دروازے کی جانب چلے گئے میں ساکن کھڑی تھی۔ عون بھیا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے ساتھ لگایا۔

”اس کی دھمکی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے! میں ساتھ ہوں تمہارے!“

میں کچھ کہے بغیر گالوں پر پھیل آنے والی نمی پونجھنے لگی تھی۔ عون بھیا نے میرا سر تھپکا مانتھا چوما پھر پلٹ کر وہاں سے چلے گئے۔ فیض بھائی اور عیسیٰ بھائی ان کے ساتھ تھے۔ میں بے دم سی وہیں بیٹھ گئی۔ یہ مجبوری کا فیصلہ نہیں تھا۔ دل کا بھی پتا نہیں پھر بھی میں اتنا نڈھال کیوں ہو رہی تھی۔ شاید کوئی بھی عورت اپنا گھر ٹوٹنے پر یونہی بکھرتی ہے۔ پیا کچھ دیر سر جھکائے بے حد خاموش سے وہاں بیٹھے رہے پھر آہستگی سے اٹھے اور ٹولے قدموں کے ساتھ باہر چلے گئے۔ اب کمرے میں میں اور ماما تھے۔ ماما نے کچھ کہے بنا مجھے اپنے ساتھ لگایا تو جانے کیسے میری سسکیاں فضا میں گونجنے لگی تھیں۔

”اپنا نہیں تو اپنے بیٹے کا خیال کیا ہوتا۔“

ان کی بات پر مجھے جھٹکا لگا تھا میں نے سر اٹھا کر دھند آلود نظروں سے انہیں دیکھا!

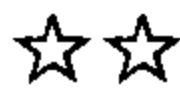
”آپ نہیں چاہتیں کہ میں!.....؟“

”پتا نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔ کتنے ارمان تھے اپنی اکلوتی بیٹی کے حوالے سے دل میں۔ سب کو آگ لگ گئی۔ اس لڑکے نے تو ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہنے دیا۔ اب جو ہونے جا رہا ہے وہ پتا نہیں کتنا صبح ہے کتنا غلط! مگر بیٹا! مجھے ڈر لگتا ہے۔ یہ بہت خطرناک آدمی لگتا ہے۔ انجام کی پرواہ کیے بنا کچھ بھی کر ڈالنے والا۔“ وہ ماں تھیں خدشات کا شکار ہونا کچھ ایسا عجیب بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر نرمی سے دبایا۔

”آپ پریشان نہ ہوں ماما! اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”پتا نہیں۔“

وہ بے حد اس تھیں اسی دل گرنگی سے بولیں۔ میں محض انہیں لا چاری سے دیکھ کر رہ گئی۔



ساتھ دل کے چلے دل کو نہیں روکا ہم نے

جو نہ اپنا تھا اسے ٹوٹ کے چاہا ہم نے

اک دھوکے میں کئی عمر ہماری ساری!

کیا بتائیں کسے کھویا کسے پایا ہم نے

میں لان میں آئی تو ماما ثانیہ بھابھی اور روشی کے ساتھ وہیں کچھ متفکر سی بیٹھی تھیں۔ آپس میں ہر

بات چیت چل رہی تھی وہ بھی مجھے دیکھنے کے بعد خاموشی کی نذر ہو گئی۔ مجھے ایک دم بہت اجنبیت کا احساس

وا۔ کچھ کہے بغیر میں وہیں سے پلٹ گئی۔

”حجاب!“

روشی نے صرف پکارا نہیں تھا۔ بھاگ کر میرا راستہ بھی روک لیا۔

”جی!“ میں نے لمحہ بھر کو نظریں اٹھائیں۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی کسی قدر الجھ کر۔

”واٹ ہینڈ! تم واپس کیوں پلٹ گئی تھیں؟“

”نہیں ایسے ہی۔“ میں نے نظر پھیر لی۔ مجھ جیسی انا پرست لڑکی کو یہ اعتراف کہ مجھ سے کوئی بات

بھپائی جا رہی ہے۔ اپنی ہی انسلٹ کے مترادف تھا وہ بھی خود اپنے منہ سے جو بہر حال مجھے گوارا نہیں تھا۔

”یہاں آؤ۔ روشی نے میرا ہاتھ پکڑا تھا پھر اپنے ساتھ کھینچتی وہیں لان چیرز کے پاس لے آئی

یہاں ماما اور ثانی بھابھی بیٹھی ہوئی تھیں۔“

”تم سمجھ رہی ہو ہم تم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ ہمارا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا۔“

ثانیہ بھابھی رسائیت سے بولیں تو میں نے پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

”ایسی کیا بات ہے؟“

”ابوداؤد نے اسامہ کو اپنی کسٹڈی میں لینے کا کیس کورٹ میں دائر کر دیا ہے۔ ماما اسی وجہ سے ٹینس

ورہی تھیں۔ جبکہ میں انہیں سمجھا رہی تھی۔ یہ کیس نہایت کمزور ہے ابوداؤد کے لیے۔ اتنے چھوٹے بچے کو کورٹ

بھی بھی ماں سے چھین کر باپ کے حوالے نہیں کرتا۔“

ثانیہ بھابھی کی کچھ دیر توقف کے بعد وضاحت سے کی گئی بات پر میں نے گہرا سانس بھر کے سر

و بارہ جھکا لیا۔ ابوداؤد بھی انہی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے جو اس معاشرے میں اس قسم کی پجوشیز میں

ملا ہونے والا ہر دوسرا مرد محض ٹارچہ کرنے کو اپناتا ہے۔

”حجاب تمہیں اس بات کو لے کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں پریشان نہیں ہوں۔“ میں نے روشی کی بات کے جواب میں رسائیت سے کہا تو وہ

بے ساختہ مسکرائی۔

”گڈ گرل! کل تمہیں کورٹ بھی جا ہے۔ کیس کی سماعت ہے۔“

ثانیہ بھابھی نے لگے ہاتھوں مجھے اہم اطلاع بھی دے دی۔ جسے سن کر میرے چہرے کا رنگ پھیکا

ہو گیا تھا۔

”میں اسامہ کو دیکھوں وہ اٹھ گیا ہوگا۔“

”میرا انداز صاف کترانے والا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی تو کمرے کی خاموش

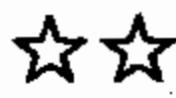
خفا میں سیل فون کی بیل کا شور گونج رہا تھا۔ اسامہ کاٹ میں لیٹا ہوا اس آواز سے ڈسٹرب ہو کر بار بار کسمساتا تھا۔

میں نے تیزی سے لپک کر سیل فون اٹھایا۔ مگر اسکرین پر نگاہ پڑتے ہی میں کچھ پل کو کنفیوژ ہو گئی تھی۔ فون ابوداؤد کا

تھا۔ میں نے ہونٹ بھیچے اور کال ڈسکنک کر دی۔ محض چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر زور و شور سے بیل بول چلی گئی۔ میں نے پھر کاٹ دیا تھا۔ نگاہ کا زاویہ بدل کر اسامہ کو دیکھا وہ کسمسا کر پھر سو گیا تھا۔ میں نے بیل فون کو سائلٹیٹ پر لگایا تھا۔ یہ طے تھا مجھے ابو داؤد کی اب کوئی بات نہیں سننا تھی۔ جس وقت میں بیل فون تکیے پر ٹکا چکی تھی اس پل اسکرین پر ابو داؤد کا مسیج نمودار ہوا تھا۔ جانے کس خیال کے تحت میں نے اس مسیج کو کھول لیا۔

”حجاب بیگم! یہ بات تو کنفرم ہے کہ تمہارا ہر راستہ مجھ تک آتا ہے انہی راستوں پر جتنے مرضی کاٹے بولو آنا تو تمہیں میرے پاس ہی ہے۔ مگر جب لوٹو گی تو میں ان گستاخیوں پر سرزنش کرنے کو تمہارے زخمی پاؤں کے ٹھیک ہونے کا انتظار نہیں کروں گا کہ تم اپنی اس تکلیف کی ذمہ دار خود ہو۔“

میں نے بغیر کسی تاثر کے مسیج ڈیلیٹ کر دیا تھا۔ میرے نزدیک ان کا یہ زعم محض ایک خوش فہمی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھا۔ میں ہرگز اب ان سے تجدید تعلق کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔



وہی رنجشیں، وہی حسرتیں
نہ ہی درد دل میں کمی ہوئی
عجب سی ہے میری زندگی
نہ گزر سکی نہ ختم ہوئی

وہ عجیب دن تھا سو گوار بوجھل اور زرد زرد سا فضا میں سناٹا تھا۔ کورٹ کی فضا میں ٹھن تھی۔ وہاں کے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ عجیب نظروں سے دیکھنے والے۔ اسامہ کو ممانے میرے ساتھ نہیں آنے دیا تھا اور بہت اچھا کیا تھا۔ میں ایک بڑی سی چادر میں لپٹی لپٹائی بڑے بھیا کے ساتھ ساتھ سہمی ہوئی چلتی ہوئی جب عدالت کے مین دروازے پر پہنچی تو کوئی ایک دم سے میرے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ میں اگر بروقت قدم نہ روک لیتی تو یقیناً اس چٹائی وجود سے ٹکرا جاتی۔ سر اٹھا کر دیکھنے پر میرے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ ابو داؤد تھے۔ ہمیشہ کی طرح اکھڑے اور تنے ہوئے۔ وہ اس جگہ بھی ویسے ہی گردن اکڑائے ہوئے کھڑے تھے۔ البتہ چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔ ان کی نظروں کا محور میں نہیں تھی وہ عون بھیا کو گھور رہے تھے۔

”راستے سے ہٹو!“

عون بھیا نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دو قدم پیچھے کھینچا پھر سرد پھنکارتی آواز میں بولے تھے۔
”تم کیا سمجھتے ہو جیت گئے تم؟ میں نے قسم کھائی ہے عون مرتضیٰ کہ اب تمہیں زندگی کے کسی مقام پر خود سے جیتنے نہیں دوں گا۔ اور اگر قسمت سے تم مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو بھی گئے تو میں جان لے لوں گا تمہاری مار ڈالوں گا قسم سے۔“

وہ ایک بار پھر طیش میں تھے۔ وہ ایک بار پھر حواسوں میں نہیں تھے۔ میں نے دہل کر سہم کر عون بھیا کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی سلگ اٹھی تھیں۔

”اس کا مطالب تمہیں اپنی شکست کا پہلے سے یقین ہے۔ گدا!“

ان کا لہجہ صاف چڑانے والا تھا۔ ابو داؤد کا غیض و غضب مزید بڑھ گیا۔

”چیلنج کرتا ہوں عون مرتضیٰ تمہیں۔ آج جس کے ساتھ کھڑے تم مجھے بار کا یقین دلار ہے ہوتا اگلی

بار اسی کورٹ میں یہ میرے پہلو میں کھڑی ہو کر میرے حق میں بولے گی۔“

عون بھیانے اس بات کے جواب میں جو قہقہہ لگایا اس میں بہت واضح تمسخر تھا۔ ”فیضان بہت

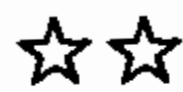
جنبش لار ہے۔ اگلی پیشی تک غالب امکان ہے۔ تم ہماری حسب منشا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ ہار اور سبکی

تمہارے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ مسٹر ابو داؤد!“

عون بھیانے جھنجھلا کر کہا اور مزید کوئی بات کیے بنا میرا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ گئے۔ میں سر تاپا

کانپ رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا کورٹ میں کیا کارروائی ہوئی۔ مجھے بیان کو بلایا گیا تو میں نے کیا بیان دیا تھا۔ میرا

دماغ ماؤف اور حالت غیر تھی۔ میں واپس گھر آئی تو اس ٹینشن میں بخار میں مبتلا ہو چکی تھی۔



یہ تمہیں بتا دوں میں

چاہتوں کے رشتوں میں پھر گرہ نہیں لگتی

اور لگ بھی جائے تو

وہ کشش نہیں رہتی

ایک پھیکا پھیکا سارا رابطہ تو ہوتا ہے

تازگی نہیں رہتی

روح کے تعلق میں

زندگی نہیں رہتی۔

بات وہ نہیں رہتی

دوستی نہیں رہتی

لاکھ بار مل کے بھی دل سے دل جہیں ملتے

ذہن کے جھروکوں میں

یاد کے درپچوں میں

تیلیوں کے رنگوں کے

پھول پھر نہیں کھلتے

اس لیے میں کہتی ہوں

اس طرح کی باتوں میں احتیاط کرتے ہیں

اس طرح کی باتوں سے

اجتناب کرتے ہیں

میں نے بے خیالی میں نظم پڑھی تھی۔ پھر اسی گم صم کیفیت میں بک کو بند کر کے رکھ دیا۔ یہ کتاب روشی ابھی پڑھتے ہوئے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ مجھے جس چیز نے پریشان کیا تھا وہ روشی کے الفاظ تھے۔ اس نے یہ نظم عون بھیا کو ڈیڈ کیٹ کی تھی۔ ان دونوں کے تعلق میں کچھ مسنگ تھی۔ عون بھیا کا رویہ بظاہر جتنا بھی نارمل ہوتا مگر کچھ ایسا تھا جو کھلتا تھا۔ روشی کی آنکھیں ہزار کوشش کے باوجود بھی بجھی ہوئی لگی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ میں بے ساختگی نہیں تھی۔ کیا وہ بھرم رکھ رہی تھی عون بھیا کے ساتھ ساتھ خود اپنا بھی۔

”کیا سوچتی رہتی ہو؟“

مجھے سوچوں سے نکالنے والی بھی روشی تھی۔ میں نے خالی نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ دیر یونہی دیکھتی رہ گئی۔

”تم عون بھیا کے ساتھ خوش نہیں ہوتا؟“

میرے سوال نے روشی کو گڑبڑا کے رکھ دیا۔

”کیا مطلب بھی یہ شک کیوں؟“ وہ ہنسی مگر اس ہنسی میں کھوکھلا پن تھا۔ میں اتنی مضطرب ہوئی کہ بے ساختہ آگے بڑھ کے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”مجھ سے کچھ مت چھپاؤ روشا نے پلیز!“

میری آواز بھرا سی گئی تھی۔ روشی نے بے ساختہ ہونٹ بھیج لیے۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر یاسیت سے بولی تھی۔

”کیا کر لوگی جان کر بھی؟“

وہ بے دردی سے ہونٹ کچل رہی تھی۔ جیسے ہر ممکن طریقے سے آنکھوں میں اتری نمی کو گالوں پر بہہ جانے سے روکنا چاہتی ہو۔ میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

”کچھ ہے ناروشی؟“

میں بے ساختہ رو پڑی۔ یہ احساس میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھا کہ روشی خوش نہیں ہے۔ یعنی عون بھیا خوش نہیں ہیں۔ عون بھیا جن سے مجھے اپنے بھائیوں میں سے سب سے زیادہ محبت تھی۔

”وہ شاید مجھے اچھی لڑکی نہیں سمجھتے۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتے ہیں حجاب!“

میرے دل پر جیسے کسی نے گھونسا دے مارا تھا۔ حواسوں پر بجلی سی گر پڑی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”ان کے خیال میں یہ بے شرمی کی انتہا ہے کہ میں نے عیسیٰ سے ان کے لیے پسندیدگی کا اظہار

کیا۔ شاید لاشعوری طور پر وہ خود کو عیسیٰ سے شرمندہ بھی محسوس کرتے ہیں۔“

وہ سوسوں کرتی آنکھیں پونجی کہہ رہی تھی۔ میں نے کسی قدر غصے سے اسے دیکھا۔
 ”یہ تو کوئی بات نہیں۔ تم نے بتایا نہیں عیسیٰ بھائی خود تم میں انٹر سٹڈ نہیں تھے؟ پھر کیا کسی سے محبت کرنے یا پسند کرنے کا اختیار صرف مردوں کو ہے۔ عورت یہ کام کرے تو مجرم کیوں بن جاتی ہے؟ چاہے وہ کتنا ہی جائز راستہ اختیار کرے۔“

میں جانے کیوں شدید طیش میں آ کر زور زور سے بولنے لگی۔ روشی نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔
 ”ریلیکس حجاب! کم آن یا تم تو ٹینس مت ہو۔“

اس نے میرا ہاتھ تھپکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتی اندر سے فیضی بھائی اور عیسیٰ بھائی تیز تیز قدموں سے نکل کر پور رٹیکو کی جانب جا تے نظر آئے۔ چوڑکانے والی بات ان کے چہروں پر نظر آئی پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔
 ”خدا خیر کرے۔“

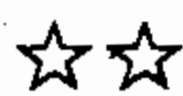
میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں یکلخت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
 ”کیا ہوا؟“ روشی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں جواب میں کچھ کہے بغیر پور رٹیکو کی جانب لپکی مگر اس سے پہلے اندرونی حصے سے باہر آتیں ثانیہ بھابھی نے مجھے آواز دے لی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر کچھ عجلت میں انہیں دیکھا ان کا چہرہ ابھی اندرونی خلفشار سے پھیکا پڑا ہوا تھا۔ انہونی کا احساس یکدم گہرا ہو گیا۔ میں لپک کر ان کی جانب آئی تھی۔
 ”بھابھی خیریت؟ یہ عیسیٰ اور فیض بھائی کدھر جا رہے ہیں؟“

”خدا سے خیریت کی دعا کرو حجاب! عون بھیا کا بہت شدید ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ ہاسپٹل میں ہیں۔ ابھی فیضی کو فون آیا ہے۔ ماما تو بہت رو رہی ہیں۔ پلیز انہیں آ کر سنبھالو۔“

بھابھی نے سستے ہوئے چہرے کے ساتھ جو اطلاع دی تھی اس نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔ مجھے لگا تھا جیسے کوئی تیز روٹرین میرے اوپر سے دھڑ دھڑاتی ہوئی گزر گئی ہو۔ ایسی ہی بجلی روشی پر بھی گری تھی۔ وہ وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ بے تحاشا زرد پڑتا چلا گیا تھا۔

”میں روشی کے پاس ہوں۔ تم ماما کو دیکھو جا کے پلیز!“

ثانیہ بھابھی نے مجھے پتھر اے ہوئے دیکھ کر تقریباً چیخ کر کہا تھا میں ہولتے دل کے ساتھ گرتی پڑتی ہوئی پٹی تھی۔



بات دن کی نہیں مجھے رات سے ڈر لگتا ہے
 گھر کچا ہے میرا مجھے برسات سے ڈر لگتا ہے
 اس نے تحفے میں دیئے مجھے خون کے آنسو
 زندگی اب تیری ہر سوغات سے ڈر لگتا ہے

عمون بھیا ایک ہفتہ تک ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہے تھے۔ جب تک وہ اپنے پیروں پر چلنے پھرنے نہیں لگے۔ ہماری جان جیسے مٹھیوں میں رہی تھی۔ جس روز عمون بھیا ڈسچارج ہو کے گھر لوٹے۔ پاپا نے صدقات خیرات کے علاوہ گھر پر محفل نعت اور قرآن خوانی کا بھی اہتمام کیا تھا۔ وہ سارا دن بہت مصروف گزارا تھا۔ دل و دماغ پر جو اتنے دنوں سے بوجھ تھا وہ ذرا سا کم ہوا تھا مگر دو دن بعد کورٹ میں جو پیشی تھی وہ مجھے ریلیکس نہیں ہونے دے رہی تھی۔ اس روز مجھے فیض بھائی کی زبانی پتا چلا تھا کہ ہمارا کیس مضبوط ہے۔ امید واثق ہے کہ اگلی نہیں تو اس سے اگلی پیشی میں ابوداؤد کو طلاق دینا پڑے گی۔ اس خبر نے میرے اندر کیا احساس جگایا اس بات سے قطع نظر میں آنے والے وقت سے خائف رہی تھی۔ عمون بھیا نے مجھے اسپیشلی اپنے پاس بلا کے ہمت بندھائی تھی۔

”بس گڑیا! تھوڑی سی ہمت اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یاد رکھنا تمہاری زندگی کا سفر ابھی شروع ہونا ہے۔ ابوداؤد کو ایک بھیا نک خواب سمجھ کر بھلا دینا۔

تب میرا جی چاہا تھا میں ان سے ایک بات منوالوں۔ ان سے اس چیز کے بدلے روشی کی خوشیاں مانگ لوں۔ مگر میں ایسا نہیں کر پائی اس موقع پر مجھے وہ اہم قول یاد آ گیا تھا۔

”ہمیشہ اپنے خالق سے مانگو جو دے تو رحمت اور نہ دے تو حکمت، مخلوق سے مت مانگو جو دے تو احسان نہ دے تو شرمندگی۔

مجھے عمون بھیا کے ریسپانس کا علم نہیں تھا۔ میں ان کی بجائے روشی کے لیے خوشیاں خدا سے مانگنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ ان کے پاس سے اٹھ کر میں کمرے میں آئی تو ارادہ وضو کر کے نماز ادا کرنے کا تھا۔ مگر میل فون پر کسی انجان نمبر سے کال آرہی تھی۔ میں نے کچھ تذبذب کے بعد کال ریسو کر لی۔

کیسی ہیں وائف! نئے نمبر سے اس لیے کیا فون کہ تم میرا نمبر دیکھ کر کال پک نہ کرتیں۔

ابوداؤد کی زندگی کے احساس سے بھرپور چمکتی آواز سن کر میں نے بے ساختہ ہونٹ بھیج لیے۔

”میرا بیٹا اسامہ کیسا ہے؟“

”فضول کی باتوں سے اجتناب برتا کرو وہ بات کریں جس کے لیے فون کی زحمت کی ہے۔“

میں برس پڑی تھی جواب میں ان کی ہنسی سنائی دی تو میرا خون کھولنے لگا۔ میں یقیناً فون بند کر دیتی مگر انہوں نے گویا میرے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔

”عمون مرتضیٰ اب کیسے ہیں؟ حالانکہ میں نے اس جھنجھٹ میں پڑنے والا کام تو نہیں کیا تھا کہ بعد میں خیرت دریافت کرنی پڑے۔ موصوف ہمارے راستے کا سب سے بڑا کانٹا ہیں۔ میں تو اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے پر آمادہ تھا۔ مگر بہت سخت جان ہے کم بخت!“

الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ۔ مجھے لگا تھا مجھے کسی نے اچانک برزخ میں دھکیل دیا ہو۔

”ک..... کیا مطلب؟“

میرے حلق سے آواز پھنس کر نکلی تھی۔ جواباً وہ بڑے سکون سے کچھ دیر ہنسے پھر طنز سے بولے تھے۔

”اتنی سیدھی اور صاف بات بھی نہیں سمجھتی ہو بیگم صاحبہ! میں نے کہا تھا نا اگر مجھے بار کا اندیشہ بھی ہوا تو میں سالا صاحب کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا اگلی مرتبہ دوسرا سانس نہیں لے پائیں گے سالا صاحب! پھر ہم تم ہوں گے۔ رومانس ہوگا۔ اور ہمارے ڈھیر سارے بچے ہوں گے۔ تمہیں پتا ہے مجھے فیملی پلاننگ سے نفرت ہے۔“

وہ پتا نہیں کیا اوٹ پٹانگ بکواس کر رہے تھے۔ میں نے سراسیمگی سے سنا ضرور مگر سمجھنے کی صلاحیت ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

”آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے داؤد میں نے کہا آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“
میں فون پر ہی بلک اٹھی تھی۔ دہشت اور خوف نے میرے اعصاب شل کر ڈالے تھے۔
”کیا نہیں کروں گا؟ ہاں؟ پہلی بات یا آخری؟“

وہ شاید پھر ہنس رہے تھے۔ میں زار و قطار روتے ہوئے چیختی۔

”آپ بڑے بھیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

”اس کا مطلب تم سے رومانس کر سکتا ہوں ہے نا۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔ گڈ۔ مگر میری جان اس کے لیے تمہیں میرے پاس تو آنا پڑے گا نا۔ اگر وہاں آکر کرنے کی کوشش کی تو سالا صاحب سے پھر جھگڑا ہوگا۔ اور جھگڑے میں تمہیں پتا ہے میں پاگل ہونے لگتا ہوں۔“

وہ پھر بے مہار ہو رہے تھے۔ میں نے یونہی روتے ہوئے سر کو زور زور سے نفی میں جنبش دی۔
مم میں..... میں آ جاؤں گی۔ خود آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ مگر آپ بڑے بھیا کو کچھ نہیں کہیں گے۔ وعدہ کریں۔“

”وعدہ کیا جان من تمہارے صدقے اپنے جانی دشمن کو بھی چھوڑ دیں گے تم کب آؤ گی۔ ابھی آ جاؤ نا۔“
وہ بہکے ہوئے لہجے میں بولے میں اس وقت اتنی بدحواس اس قدر ذہنی اذیت کا شکار تھی کہ فی الفور آنے کی حامی بھر لی۔

”ٹھیک ہے میں آ جاتی ہوں۔ لیکن آپ بھیا کو کچھ نہیں کہیں گے۔“
میں بس یہی یقین حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔

”کہہ دیا نا نہیں کہوں گا۔ سنو گھر میں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں اسامہ کو لے کر بس خاموشی سے اٹلو میں باہر گاڑی میں تمہیں ملتا ہوں۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“
وہ گویا پھنکارے تھے۔ میں خائف ہونے لگی۔

”مگر وہ سب پریشان ہوں گے۔ میں روشی کو بتا دیتی ہوں۔ وہ بہت نائس ہے سمجھ سکے گی میری بات۔“
”بکواس مت کرو۔ یہ روشی ٹوٹی اسی سانپ کی بیوی ہے نا۔ خبردار جو یہ حماقت کی۔ بس خاموشی سے نکلو۔“
انہوں نے بے دریغ جھاڑ پلائی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ ان کی ہدایت

پر عمل کروں۔ سو میں نے وہی کیا تھا جو وہ چاہ رہے تھے۔ ایک بار پھر ایک مجبور اور بے بس عورت قربان ہوئی تھی۔ اپنے رشتوں کی خاطر اپنوں کی بقا پر مگر پتا نہیں یہ قربانی بھی جن کی خاطر پیش ہوئی تھی انہیں پسند آتی تھیں یا نہیں۔

☆☆

نہ گلہ ہے کوئی حالات سے
نہ شکایتیں تیری ذات سے
خود ہی سارے ورق جدا ہوئے
میری زندگی کی کتاب سے
میری وحشتوں کی راہ میں
محض منزلوں کے سراب تھے
کئی عمر جن کی تلاش میں
میری رتجگوں کے وہی خواب تھے
یوں بھٹک بھٹک کے تمام عمر
کبھی اثر ہی نہ ہوا
جنہیں کھو دیا تیرے عشق میں
وہ سنے بے حساب تھے

میں نے ڈرینگ روم کا دروازہ کھولا اور بے دلی سے قدم باہر رکھا۔ بیڈ روم میں ٹائٹ بلب روشن تھا۔ جہازی سائز بیڈ پر ابوداؤد کے پہلو میں اسامہ بے خبر سو رہا تھا اور ابوداؤد میرے منتظر تھے۔ میرے قدم جیسے من من بھر کے ہو گئے۔ ان کی فرمائش پر میں نے نیٹ کی پیازی ٹائی پہنی تھی اور خود کو خوشبوؤں میں بسایا تھا۔ اور ایسا کرتے میرا دل روتا رہا تھا۔ ایک قبرستان میرے اندر آباد ہونے جا رہا تھا۔ اس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے زندہ انسانوں کی فہرست سے نکل جاتی۔ وہ شخص جس نے مجھے گالی دی تھی۔ مجھے میری نظر میں حقیر کر دیا تھا۔ جس سے اس کے بعد میں نے نفرت کی تھی۔ جس کی قربت کے تصور سے بھی مجھے گھن آتی تھی۔ آج اس شخص کے آگے حالات نے پھر مجھے ہاتھ پیر باندھ کر پھینک دیا تھا۔ پتا نہیں حالات نے اتنی ستم ظریفی کیوں برتی تھی۔ ابوداؤد نے مجھے ایک بار پھر میرے رشتوں کی نظر میں گرا دیا تھا۔ مجھے شرمناک انداز میں گھر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور یہاں اپنے گھر لے آئے تھے۔ پھر انہوں نے فون پر یہ اطلاع یقیناً بڑے بھیا کو دی تھی اور اپنی فتح کا جشن ڈرنک کر کے مناتے رہے تھے۔ وہ خوش تھے۔ ہاں وہ پھر جیت گئے تھے اور میں ایک بار پھر ہار گئی تھی۔ عون بھیا بھی ایک بار پھر ہار گئے تھے۔ اس ہار پر مجھے صرف عون بھیا کی زندگی نے مجبور کیا تھا۔ عون بھیا جو مجھے بے حد عزیز تھے۔ مگر اب وہ صرف میرے بھیا یا ماما پاپا کے بیٹے نہیں تھے وہ روشی کی خوبصورت آنکھوں کا سب سے حسین خواب تھے۔ وہ ان کی بیماری کے دوران کیسے پاگل اور وہمی ہوئی پھرتی تھی۔ ہر ہر

آہٹ پر سراسیمہ ہو کر چوٹکتی تھی۔ جدے کتنے دراز کر دیئے تھے وہ عون بھیا کو کھونے کے تصور سے کانپ جاتی تھی۔ پھر میں عون بھیا کو دانستہ کیسے خطرات میں گھرا چھوڑ دیتی میں اتنی خود غرضی بے حسی چاہنے کے باوجود نہیں اختیار کر سکتی تھی۔ اس کے لیے چاہے خود پر جیسی بھی قیامت ٹوٹ جاتی میں سہنے کو تیار تھی۔

”بیگم صاحبہ! مائی لولی وائف! کن خیالوں میں کھوئی ہو؟ اتنے مہینوں کا فراق ہے ترس رہے ہیں ہم اور آپ کو خیال ہی نہیں۔“

ابوداؤد نے بلند آواز میں کسی قدر بد مزگی سے کہا تھا۔ میں چونک گئی اور نا فہم نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ کسی قدر جھلائے اور بیڈ سے اٹھ کر کسی قدر جارحانہ انداز میں مجھے جھپٹ کر بیڈ پر واپس آئے تھے۔

”تم محبت کرنے کے لیے بنائی گئی ہو جتنی نازک ہو جتنی خوبصورت مگر حرکتیں تمہاری اڑیل گھوڑوں جیسی ہیں۔ مجھے زبردستی اور بد تمیزی پر خود تم اکساتی ہو۔“

وہ کسی قدر برہمی سے سلگ کر بولے۔ ان کے ہر انداز میں مخصوص قسم کی جارحیت تھی۔ جبری جسارتوں میں حاکمیت کا احساس غالب تھا۔ میں نے اپنے حلق میں گرتے آنسوؤں سمیت آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ بہت مظلوم بنتی ہونا۔ جیسے میں تم پر بہت ظلم کرتا ہوں۔

ان کے لہجے میں گھن گرج تھی۔ ہزار ہاضبہ کے باوجود بھی میری آنکھیں بہہ پڑیں۔

”نفرت کرتی ہونا مجھ سے۔ اسی لیے میرے نزدیک آتے ہی آنسو بہانا شروع کر دیتی ہو۔ مجھے تمہارے انہی آنسوؤں سے نفرت ہے۔“

انہوں نے کسی قدر تلخی سے کہتے ہوئے پہلے میرے منہ پر تھپڑ مارے پھر بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ میرے آنسوؤں میں روانی آئی تھی مگر منہ سے آہ نہیں نکلنے دی۔

”بہت پھنے خان بنتی تھیں نا اپنے بھائی کے پاس جب تھیں۔ اونہہ خلع لوں گی۔ تمہاری قسمت میں صرف میرا دل بہلانا اور میرے بچوں کو پالنا لکھا ہے بس!“

ان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کا ہاتھ بار بار مجھ پر اٹھتا تھا۔ طعنے، طنز، تشدد اور اذیت بے پناہ اذیت، وہ بہت بُری رات تھی۔ وہ بہت طویل رات تھی۔

☆☆

اگلے روز میں نے اپنے بدن کی حدتوں کی پرواہ کیے بغیر اٹھ کر نماز ادا کی تھی۔ وہ بے حسی جوائے حالات میں ضرور مجھ پر طاری ہو جانی تھی وہ ہو چکی تھی۔ جس اذیت اور کرب سے کل کے فیصلے کے بعد اور پھر رات میں نے گزاری تھی اس کے بعد ہر تکلیف اپنی اہمیت بہت کم کر چکی تھی۔ بے حقیقت اور حقیر، نماز کی ادائیگی کے بعد میں نے جدے میں جا کر ایک بار پھر اپنے گھر والوں کے لیے اپنی طرف سے صبر کی دعا مانگی تھی۔ اسامہ کاٹ میں سو رہا تھا۔ میں اس کی نیند خراب کیے بغیر کمرے سے باہر آ گئی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ فضا میں ہلکی خنکی تھی اور بے تحاشا نازگی۔ ماحول میں پرندوں کی چہکاریں تھیں۔ میں کچھ دیر لان میں نئے سرے سے ننگے پیر ٹہل

کر اپنے اندر لگی آگ کو بجھانے کی ناکام سعی کرتی رہی۔

”اسلام علیکم بیگم صاحبہ!“

میں اپنے دھیان میں پلٹی تو کاہی مائل بنر دوپٹے کے بالے میں نو خیز چہرے کو دیکھ کر ہنسی گئی اور ہونٹ آہستگی سے جواباً سلامتی بھیجنے لگے۔

”مجھے کل ہی صاحب نے بتا دیا تھا کہ آپ تشریف لا رہی ہیں۔ میں رات بہت دیر تک آپ کا انتظار بھی کرتی رہی مگر صاحب نے منع کر دیا تھا کہ اپنے کوارٹر میں رہوں۔“

وہ رضیہ تھی۔ ابوداؤد کی ملازمہ میں اس سے پہلے بھی مل چکی تھی۔

”کیسی ہو رضیہ؟“

میں نے نرمی سے پوچھا جواباً وہ کھل اٹھی۔

”میں ٹھیک ہوں جی! آپ کچھ کمزور ہو گئی ہیں مگر جی چلی بات ہے۔ ابھی بھی بہت سوہنی لگ رہی

ہیں۔ میں نے سنا ہے آپ کا بیٹا بھی ہوا ہے؟“

”ہاں اسامہ نام ہے۔ ابھی سو رہا ہے۔“

”اچھا جی جب اٹھ جائے تو مجھے بتا دیجیے گا۔ میں سنبھال لوں گی۔ اب ناشتہ بناؤں؟“

نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔

میں نے بے دلی سے جواب دیا اور چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ لابی میں پڑے ہوئے ٹیلی فون سیٹ پر

اسی وقت بیل بجنے لگی۔ میں نے بے خیالی میں بڑھ کر کال ریسو کر لی تھی۔

”اسلام علیکم!“

”تو تم واقعی وہاں ہو۔ میں سمجھی وہ کتا بکو اس کر رہا ہوگا۔“

”مما!“ میرا پورا وجود جیسے پانی بن کر بہہ گیا۔

مت کہو مجھے ماں! تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے ہمارے ساتھ۔ ارے اسی ذلت کی کسر رہ گئی تھی۔ حجاب

میں مر کیوں نہ گئی۔ یہ وقت دیکھنے سے پہلے۔ ارے کاش تو پیدا ہوتے ہی مر کھپ گئی ہوتی۔ اتنا کمزور تھا تیرا

نفس۔ اگر وہ بیوقوف تجھ سے برچھین رہا تھا تو تیرا انتظام بھی کرتا تا۔ ذرا صبر تو کیا ہوتا۔

یہ مما تھیں؟ مجھے جیسے یقین نہ آیا۔ اتنے رکیک الزامات! میری توقع کے عین مطابق وہ لوگ واقعی میرے

اس اقدام کی وجہ سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔ میرا پورا وجود طوفان کی زد پر آئے ہوئے پتے کی طرح کانپنے لگا۔ ریور

میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ آنسو، آہیں، سسکیاں مجھے اپنی بھی ہوش نہیں تھی جب ابوداؤد نے مجھے آکر پکارا۔

”کیا ہوا تمہیں؟“

ان کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار تھا۔ وہ جیسے گہری نیند سے اٹھ کر آئے تھے۔ میں کچھ نہیں

بولی میں جواب دینے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھی۔

کس نے رالیا ہے تمہیں؟ بتاؤ مجھے میں حشر بگاڑ دوں گا۔ اس کا۔
 انہوں نے رعونت زدہ لہجے میں پھنکار کر کہا۔ ان کی شعلے برساتی نظریں اسٹینڈ سے ٹٹکتے ریسور پر تھیں۔
 وہ پلوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئے تھے اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ انداز میں اتنی توجہ، ایسی بے
 مانگی اور اپنائیت تھی کہ رات کی کسی تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں نے پہلے آنکھیں پھاڑ کر پھر کسی قدر غصے سے انہیں
 دیکھا تھا اور اپنے ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑا لیے۔ اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ وہ میرے پیچھے آئے تھے۔
 ”تو ہمارے سرال سے فون تھا۔ کس سے بات ہوئی سالا صاحب سے؟“

وہ ایک بار پھر میرے پر سوار تھے۔ میں نے سختی سے اپنے آنسو پونجھ دیے۔ بہر حال میں ان کی
 مزید خوشی کا سامان نہیں کر سکتی تھی۔

”آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے سمجھے آپ!“
 میں زور سے چیخی تو انہوں نے رک کر بغور مجھے دیکھا پھر بے ساختہ ہنس دیے۔ میرے چہرے پر
 لگاتار شہادت پھیری اور ٹھہرے ہوئے انداز میں گویا ہوئے۔

”ایک بات بتاؤں راز والی؟ تم دنیا کی انوکھی حسین اور جاذب نظر لڑکی نہیں ہو۔ تم جیسی بے شمار
 لڑکیاں میرے ایک اشارے کی منتظر رہتی ہیں مگر تم میں اٹریکشن پتا ہے کیا ہے؟ تمہاری اکڑ تمہاری بے نیازی۔
 تمہیں جتنا مرضی توڑ مروڑ لو تم ماش کے آئے کی طرح اینٹھی کی اینٹھی رہتی ہو۔ تمہیں بار بار توڑنے کو دل کرتا ہے
 تمہیں بار بار توڑ کر مزا آتا ہے۔“

میں سن کھڑی رہ گئی اتنی سفاکی اتنی بے رحمی پر۔ مجھے احساس تک نہ ہوا اور میری آنکھوں سے ٹپ
 پ آنسو برستے چلے گئے۔ وہ جیسے چونک اٹھے۔

”نہ..... نہ میری جان عرف دھان پان! پہلے ہی اتنی سی جان ہے۔ یوں خود کو ہلکان مت کرو۔ بس
 کام کرو۔“

اپنی حسین آنکھوں میں چھپا لو مجھ کو
 محبت اگر کرتے ہو تو چرا لو مجھ کو
 کھونے کا اگر خوف ہے تو
 دل کی ہر دھڑکن میں بسا لو مجھ کو
 دھوپ ہو یا صحرا ہو تیرے ساتھ چلیں گے
 یقین نہ آئے تو آزما لو مجھ کو
 تیرے دکھ کو سہہ لیں گے ہنس کر ہم
 اپنے بدن کی چادر بنا لو مجھ کو
 وہ مسکرا مسکرا کر گنگناتے رہے۔ جتنے فضول خود تھے۔ اس قدر گھٹیا فرمائشیں تھیں۔ میں ہونٹ بھیچنے ناگواری

کے شدید احساس سمیت ان کا ہاتھ جھٹکتی وہاں سے چلی گئی۔ وہ گنگناتے ہوئے پھر سے بیڈ پر لیٹ گئے تھے۔

☆☆

میری روح میں سمٹتا تو بھول جاتے اسے
وہ اتنے پاس نہ آتا تو بھول جاتے اسے
انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھتے ہوئے شعر پڑھا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر میرا دوپٹہ کھینچ لیا۔ میں نے سخت
جھنجھلا کر انہیں دیکھا تھا۔

ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو مر جاؤں گا
او جانِ جانِ مر جاؤں گا
ان پر مستی سوار تھی۔ میں زچ ہونے لگی۔ اسامہ کے یہ سونے کا وقت تھا اور وہ مکمل پر سکون ماحول
میں سونے کا عادی تھا۔

”پلیز کچھ دیر کو باہر چلے جائیں۔ اسامہ ڈسٹرب ہو رہا ہے۔“

میں نے تنگ آ کر مگر تحمل سے کہا۔

”اے رضیہ کے حوالے کرو۔ رقیب روسیہ کو۔ میں سخت جلیس ہو رہا ہوں۔“

انہوں نے نخوت سے کہا ساتھ ہی رضیہ کو بلانے لگے۔ میں شیشا سی گئی۔

”کیا کرتے ہیں۔ اسامہ صرف میرے پاس سونے کا عادی ہے۔ روئے گا بہت۔“

”عادی تو میں بھی صرف تمہارے پاس سونے کا ہوں۔ مگر تمہیں پرواہ کہاں ہے۔“

وہ عجب بہکے ہوئے انداز میں بولے۔ مجھے کوفت ہونے لگی۔ بس نہیں چل رہا تھا ان کی فضول
نظروں فضول باتوں سے دور بھاگ جاؤں۔

اتنے ظالم نہ بنو کچھ تو مروت سیکھو

تم پر مرتے ہیں تو کیا مار ہی ڈالو گے ہمیں؟

انہوں نے یقیناً میرے چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھ لیے تھے۔ آہ بھر کے کسی قدر عاشقانہ انداز میں
بولے میں محض ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔ اسامہ اس رات بہت جلدی سو گیا۔ حالانکہ میری خواہش تھی اس ساری
رات اسامہ نہ سوتا اور اس کی کمزور آڑ مجھے ایک شیطانی قربت سے دور رکھتی مگر ہر خواہش پوری ہونے کو نہیں ہوتی۔
”تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے نا؟ تم مجھ سے عاجز رہتی ہو نا؟“

میں سوئے ہوئے اسامہ کو جھک کر کاٹ میں ابھی لٹا ہی رہی تھی جب ابو داؤد نے مجھے کمرے
بازوؤں میں بھر لیا۔ مجھے لگا تھا۔ جیسے مجھ سے کوئی مگر مجھ اپٹ گیا ہو۔ بے بسی لا چاری کے ساتھ گھن کا احساس اتنا
شدید تھا کہ میں آنکھوں کو نم ہونے سے کسی طور نہیں بچا سکی۔

بتاؤ نا؟

اصرار بڑھتا جا رہا تھا گرفت سخت ہو رہی تھی۔ میرا سانس گھٹنے لگا۔
 ”میں تم سے محبت کرتا ہوں بنی! تمہیں کبھی یقین نہیں آئے گا اس کے باوجود یہ سچ ہے۔ محبت کے
 جواب میں محبت پانا میرا حق ہے۔ مجھے بتاؤ تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“
 ان کی آواز سرگوشی سے مشابہ ہونے لگی جذبات سے بوجھل۔ مگر میرے لبوں پر لگی مہر نہیں ٹوٹی۔
 میری بے بسی، میری التجا، میری ضبط آہ پر نظر تو کر
 مجھے مسکرا کے نہال یوں میری زندگی کا سوال ہے
 ان کے انداز میں واقعی التجا تھی یا مجھے محسوس ہوئی مگر میں نے کان نہیں دھرا میں اپنے اندر کی کیفیت
 اگر عیاں کر دیتی تو شاید ان کے قبر کو آواز دیتی پھر کیا خاموشی بہتر نہیں تھی۔
 ”کچھ بولو نا بنی! میں تمہیں سننا چاہتا ہوں۔“

ایک اور فرمائش ہوئی تھی مگر بے حد انوکھی۔ میرے چہرے پر زہر خند پھیل گیا۔
 ”کیا کہوں بھلا؟“

”کچھ بھی کچھ بھی۔“ وہ میرے لائے بالوں کو چوم کر مستی میں بولے۔

”چاہے کچھ مانگ لوں؟“

میں نے ایک بار پھر اسی تلخی سے پوچھا وہ بھی اسی کیفیت میں بولے تھے۔

”ہاں مانگ لو۔“

”جو مانگوں دیں گے؟“

”یار اب آزادی نہ مانگ لینا۔“

وہ ذرا سا جھینپے تھے ہنس کر کہا۔ میں نے چہرے کا رخ پھیر لیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ ہنستے
 ہوئے بے حد اچھے لگتے تھے۔ اتنی نفرت کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان کی مسکراہٹ بہت
 فسی نیک تھی۔

نہیں۔ آزادی نہیں کچھ اور ہے۔

”مانگو نا جان من!“ وہ بے چین سے ہونے لگے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی

شکل دی اور کسی قدر سنجیدگی سے کہا تھا۔

”کل کورٹ میں مجھے اپنے ساتھ نہ لے کر جائیں۔ میں بھیا کے خلاف بیان نہیں دینا چاہتی۔ پلیز!“

میں نے خاموش ہو کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا مگر پھر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ابو داؤد کے چہرے

تاثرات دیکھتے ہی دیکھتے بے حد خوفناک ہو گئے تھے۔ ہونٹ بھیج گئے ابرو تن گئے۔ اور چہرہ جیسے تانبے کا ہو گیا

تھا۔ وہ بولے تو ان کی آواز بھی یکسر بدلی ہوئی تھی۔

”کتیا! ہونا اس کم ظرف کینے آدمی کی بہن! جس نے ہمیشہ مجھے منہ کے بل گرانے کی کوشش کی،

مجھے اذیت دی۔ میرا نقصان کیا۔ تم کیسے میرا بھلا چاہ سکتی ہو؟ بھیا کے خلاف بیان نہیں دے سکتی۔ تمہیں دینا ہے بیان، سنا تم نے، تم نے دینا ہے۔ ورنہ میں تمہاری بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔“

وہ اتنی زور زور سے دھاڑ رہے تھے کہ کمرے کی دیواریں لرزنے لگیں۔ وہ جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ مجھے لاتیں گھونسنے اور تھپڑ مار مار کے بھی ان کا غصہ ختم نہیں ہوا تو اسی دیوانگی کے عالم میں کمرے کی ایک ایک چیز اٹھا کر خود اپنے ہی اوپر پھینکنے لگے۔ پھر یونہی چلاتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔ میں حواس باختہ اٹھل پھل سانسوں کے ساتھ گرتی پڑتی اٹھی اور نیبل پر پانی کے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر منہ سے لگالیا۔ جانے کیسی پیاس تھی ایک کے بعد دوسرا گلاس پی جانے کے باوجود تشنگی برقرار تھی۔ میں وہیں بے دم سے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کا مطلب تھا میری آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی مجھے اپنوں کی نگاہوں میں مزید ذلیل ہونا تھا۔ ابھی مجھے اپنی موت آپ پھر مرنے کا تھا۔ ابوداؤد کی وعدہ خلافی کم ظرفی سے قطع نظر مجھے ابھی یہ سوچ کر ہول آرہے تھے کہ یہ سب کیسے ہوگا کیسے؟



اگر وہ مہرباں ہوتا
تو میری آنکھوں میں نہ یہ نمی ہوتی
نہ میرے دل کی وادی میں
خزاں کا قافلہ رکتا
اگر وہ مہربان ہوتا
میری بے نور آنکھوں میں
ستارے قید کر دیتا
میری زخمی ہتھیلی پر کوئی پھول وہ رکھتا
میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ یہ کہتا
محبت روشنی ہے
رنگ ہے
خوشبو ہے
ستارہ ہے
قسم مجھ کو محبت کی
مجھے تو سب سے پیارا ہے
مگر ایسا وہ تب کہتا
اگر وہ مہرباں ہوتا

میں نے سر پر اسکارف باندھا اور تلخی نگاہوں سے ابوداؤد کو دیکھا۔ وہ لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے

وئے سگریٹ سلگانے لگے۔ میں کاندھوں پر دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی۔ جب ابو داؤد نے رضیہ کے حوالے اسامہ کو کرتے ہوئے اسے کچھ ہدایات دی تھیں۔ پھر میری جانب مڑے۔

”چلیں؟ تم تیار ہونا؟“

”ابو داؤد!“ میں جیسے کراہی تھی۔ ان کی مستقرانہ نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔

”میرے ساتھ ایسا مت کریں پلیز!“ میں سسک اٹھی تھی۔

”کیا کر رہا ہوں؟“

ان کی نظریں بھی سرد ہو گئیں ان کے لہجے کی طرح

”یہ یہ کورٹ لے جانا اور اور بھیا!!.....“

میری بات ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی بدولت ادھوری رہ گئی۔ ایسا زناٹے کا تھپڑ تھا کہ میں الٹ کر اور جا کے گری تھی۔ میرے حواس جھنجھلا اٹھے۔

”اب کرو بکواس۔ زبان نہ کھینچ لی میں نے تمہاری! بد بخت عورت تو بھول کیوں نہیں جاتی کہ تو اس دود کی بہن ہے۔ تو بس میری بیوی ہے تمہیں یہ کیوں یاد نہیں رہتا؟“

مجھے سنبھلنے کا موقع دیئے بنا انہوں نے مجھے جھپٹ کر اٹھایا تھا اور میرا چہرہ اپنے سخت فولادی پنچے میں لٹک کر اپنے نزدیک کرتے ہوئے غرانے کے انداز میں بولے تھے۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو تم! مجھے ہر صورت آج کی تاریخ میں سالا صاحب کو نیچا دکھانا ہے ہر قیمت اس پر اپنی برتری اور فتح واضح کرنی ہے۔ اگر تم نے وہاں جا کے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہیں پہلے ہی رہا ہوں کہ آج تم پھر اپنے لاڈلے بھیا کی شکل زندگی میں آخری بار دیکھو گی۔ صرف تم ہی نہیں اس کی کم عمر حسین بی اور تمہارے باقی گھر والے بھی۔ اس کے بعد وہ زندہ نہیں بچ سکے گا۔ اور مجھے کچھ نہیں کہنا اب چلو میرے ساتھ۔“

اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے حقارت بھرے انداز میں مجھے جھٹک دیا تھا۔ پھر سب کچھ ویسا ہی رہا جیسا انہوں نے چاہا۔ اس عدالت میں ایک مرتبہ میں پہلے بڑے بھیا کے ساتھ گئی تھی۔ تب ابو داؤد نے بھیا کو ایک چیلنج کیا تھا۔ آج وہ اس چیلنج کو پورا کر چکے تھے۔ خوش میں اس روز بھی نہیں تھی مگر جتنی مجروح ج تھی جتنا آج دل مجروح تھا یہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہاں کون تھا میرے اپنوں میں سے۔ میں نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ابو داؤد کے حق اور بھیا اور اپنے گھر والوں کے خلاف بیان دیتے وقت میرے فوں کے میرے لیے کیا تاثرات تھے۔ میں نے دیکھنے کی خواہش نہیں کی۔ ایک سناٹا تھا جو اطراف میں تھا بول پر چھا گیا تھا۔ ایک سناٹا تھا جس نے میرے اندر بسیرا کیا تھا۔ ایک جامد چپ تھی جو میرے ہونٹوں پر آ کر ہر گئی تھی۔ واپسی پر ابو داؤد بہت خوش تھے اس خوشی کا اظہار انہوں نے اپنے انداز میں مجھ سے محبت جتلا کر کیا کہ میری خاموشی نہیں ٹوٹی مجھے لگا میں آج واقعی مر گئی ہوں۔ آخری بار..... چلو شکر ہے اب مجھے دوبارہ اور بار مرنا تو نہیں پڑے گا۔ اس بار بار کی موت میں بھی بہت اذیت ہوتی ہے۔ یہ وہی جان سکتا ہے جس نے موت

کو بار بار سہا ہو برداشت کیا ہو۔

☆☆

ہاں سنو دوستو

جو بھی دنیا کہے اس کو پرکھے بنامان لینا نہیں

ساری دنیا یہ کہتی ہے پر بت پر چڑھنے کی نسبت اترنا بہت سہل ہے
کس طرح مان لیں؟

تم نے دیکھا نہیں

سرفرازی کی دھن میں کوئی آدمی

جب بلندی کے رستے پر چلتا ہے تو

سانس تک ٹھیک کرنے کو رکنا نہیں

اور اسی شخص کا عمر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے پاؤں اٹھتا نہیں

اس لیے دوستو جو بھی دنیا کہے اس کو پرکھے بنامان لینا نہیں

ہم کھلی آنکھ سے جو بھی کچھ دیکھتے ہیں وہ ہوتا نہیں

راستے کے لیے

آدمی اپنے خوابوں کو بھی کاٹ دیتے ہیں لیکن!

سلگتا ہوا راستہ پھر بھی کتنا نہیں۔

اس لیے دوستو جو بھی دنیا کہے اس کو پرکھے بنامان لینا نہیں

میں نے پڑھا تھا۔ مرد کی ذات ایک سمندر سے مشابہہ ہے۔ اس میں ہمیشہ پرانے پانی بھی رستے

بستے ہیں اور نئے دریا بھی آکر گلے ملتے ہیں۔ سمندر سے پرانی وفا اور نیا پیار علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ان دونوں

کے لیے کٹ مرے گا۔ لیکن عورت جھیل کی مانند ہے جس کا ہر چشمہ اس کے اندر سے ہی نکلتا ہے۔ ایسے میں

جب جھیل کی زندگی اور ہے اور سمندر اور طرح سے رہتا ہے۔ تو ان دونوں کا ہمیشہ یکجا رہنا کس قدر مشکل ہے۔

مچھلی اور ابا نیل کے خجوک کی طرح ان میں ہمیشہ نظریے کے اختلاف کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ میرے اور اس

کے بیچ بھی وجہ اختلاف تھی۔ وہ شبنم تھی۔ میں شعلہ، وہ پانی تھی میں آگ۔ یہ اس کی مہک تھی جس نے مجھے جکڑ لیا

تھا۔ تب جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ پھر میں نے اسے سلگا دیا وہ اور بھی مشکوہ ہو گئی اتنی زیادہ کہ

میرے حواسوں پر کچھ اس طرح چھائی کہ مجھے کچھ سمجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں بتاؤں وہ مجھے کتنی اچھی لگنے لگی تھی کہ

اس کے بغیر زندگی ادھوری اور بے معنی لگنے لگی۔ مگر نہیں یہ تو شاید داستان کا اختتام ہے۔ اگر میں نے یہاں سے

شروع کر دیا تو آپ اُلجھے رہیں گے۔ تعلقات کے ریشم میں پنہاں رشتے ریشم ہی تو ہوتے ہیں۔ نرم گداز

لچھوں کی طرح ہر تند الگ الگ اور سلجھا ہوا اپنی اپنی جگہ پر جتنا بھاتا ہے اگر باہم اُلجھ جائے گندم ہو جائے تو اتنی

ہی کوفت الجھن اور بے زاری ہوتی ہے دیکھ کر۔ ایسے میں اگر نرمی احتیاط سے سلجھانے کی بجائے عجلت اور مہمچھلاہٹ میں پکڑ کر کھینچ تان کی جائے تو تند ٹوٹ جاتے ہیں بکھر جاتے ہیں اور باقی کچھ نہیں بچتا میں نے بھی یہی غلطی کی میں نے بھی جھٹک دیا توڑ دیا۔ اور اور سب بکھر گیا۔

افوہ میں پھر کہانی کے اختتام میں الجھ گیا۔ میں شروع سے بتاتا ہوں جب اس کہانی کا آغاز ہوا۔ میں ابوداؤد ہوں اس کہانی کا دوسرا اہم کردار آپ جانتے ہیں یا مجھے؟

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں کالج سے نیا نیا یونیورسٹی میں گیا۔ ہم جیسے پیڈ واسٹوڈنٹس کے لیے تو اسکول کے بعد کالج ہی ایک عجوبہ تھا۔ ایک نئی خود مختار آزاد دنیا جو اتنی پیاری تھی کہ ہم تب ہی آپ سے باہر ہو گئے تھے۔ اکثر کلاسز بنک کرتے اور گرلز کالج کے باہر کھڑے ہو کر لڑکیاں تاکتے، آواز بے کستے اور کسی ایک آدھ پری وٹ کو با حفاظت ڈائیلاگز کی بوچھاڑ میں اس کے گھر تک بھی پہنچا کر آتے۔ مگر یہ یونیورسٹی تھی۔ مخصوص یونیفارم کی قید سے آزاد طرحدار پری وٹوں اور مہ نازوں کے جلوؤں سے بھرتی ہوئی۔ میرے تو صحیح معنوں میں وہاں آ کر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ ہم جو خود کو شاید افلاطون سمجھنے لگے تھے۔ وہاں اکثر بے حد پر اعتماد اور مین ٹین لڑکے لڑکیوں کے کسی نہ کسی مذاق کا نشانہ بن جاتے۔ مگر ہم پھر بھی خود کو ایک چیز سمجھنے سے باز نہیں آتے تھے۔ میں گاؤں کے ماحول میں پلا بڑھا تھا۔ بابا نے بچپن میں مجھے اپنے بے اولاد بھائی کو دے دیا تھا۔ جو وسیع جاگیروں کے مالک تھے۔ تاؤ تائی یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ تب وہ وسیع جاگیریں میرے نام منتقل ہو چکی تھیں۔ محض سترہ سال کی عمر میں میں اپنے بابا سے زیادہ صاحب جائیداد تھا اور قد میں صرف چار فٹ ایک انچ سترہ سال کی عمر تک میرا قد چار فٹ سے نہیں بڑھ سکا۔ اسی چھوٹے قد کی وجہ سے لوگوں نے مجھے ٹیڈی کے نام سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے گھر والوں کا خیال تھا میں موچھا (بونا) رہ گیا تھا۔ مگر میری عمر کا اٹھارواں سال جبکہ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھا حیرت انگیز ثابت ہوا۔ میرا وہ قد جو پچھلے دس سالوں سے وہیں اٹکا ہوا تھا جو بڑھنا شروع ہوا تو چھ فٹ پر بھی نہیں رکا۔ سوا چھ فٹ قد کے ساتھ اگر مجھے کوئی فائدہ ہوا تھا تو نقصان اس سے بھی زیادہ سامنے آیا۔ کہ اب میں بونا تو نہیں رہا۔ البتہ میری قابل رشک صحت خطرے کے حد تک سوکھے پن میں بدل گئی۔ اب میں شہتیر کی طرح لمبا اور سوکھا ہوا تھا اتنا کہ اس لمبائی سوکھائی اور رنگت کی سیاہی کی بدولت اکثر مذاق کا نشانہ بننے لگا۔ میں جس میں اعتماد تو پہلے بھی نہیں تھا کچھ اور بھی عدم اعتماد کا شکار ہو کر رہ گیا۔ کالج کے بعد یونیورسٹی میں مجھے مشکلات کا سامنا یوں بھی ہوا کہ یہاں چالاک مکار لڑکے ہی نہیں ویسی ہی تیز طرار لڑکیاں بھی تھیں۔ حسین خوبصورت اور طرحدار۔ جن کی جانب ظاہر ہے دل تو میرا بھی کھینچا کرتا تھا۔ شکل و صورت کے برعکس میں فطری تقاضوں سے مبرا تو نہیں ہو سکتا تھا نا۔ اور یہ دل پہلی بار اگر کسی لڑکی کے لیے باقاعدہ دھڑکا تو وہ سبرینہ تھی۔ میری پھپھی زاد سبرینہ علی شیر جسے دکھا کر میری اماں نے ایک بار میرے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔ ”یہ ہمارے خاندان کی سب سے سونی کڑی ہے اور اسے میں ہر قیمت پر تیری دلہن بناؤں گی۔“

خوابِ صورت آنکھوں سیاہ گھینرے بالوں اور موم کی گڑیا جیسی وہ قیامت خیز حسن کی مالک تھی۔ جسے اس دن سے میں نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی ملیت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات اماں نے مجھ سے تب کہی تھی جب ہم خاندان کی ایک تقریب میں مدعو تھے۔ اور میں فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا تب وہ بے حد شوخ تلی جیسی لڑکی مری کاؤنٹ میں پڑھتی تھی۔ فر فر انگلش بولتی ہوئی۔ میں کیا اس کے پیچھے تو خاندان کا ہر کا پیلا لڑکا لگ گیا تھا مگر وہ شاید ہم جیسوں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتی تھی لیکن یہ کوئی بد دل یا مایوس ہونے والی بات نہیں تھی۔ میری اماں کے گھر کے سے جو واقف تھے وہ جان سکتے تھے کہ ان کے منہ سے نکلی بات حرفِ آخر ہوا کرتی ہے۔ سو سے زیادہ مرتبے کے مالک بیٹے کی ماں تھی وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ خاندان میں اس کی نور تھی ایک ٹہکا تھا۔

خیر ذکر سبرینہ کا ہو رہا تھا۔ سبرینہ سے میری دوسری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ اس کا تصور تو ان تین چار سالوں میں ہر لمحہ میرے تصور میں بسا تھا جہی اسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ نہیں لگا تھا۔ وہ ویسی ہی تھی۔ بے حد پر اعتماد اور شوخ و شنگ۔ کتنے دوست تھے اس کے اسی کی طرح امیر طر حدار پر اعتماد اور شوخ۔ جن میں لڑکے یا لڑکیوں کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ میں اسے دور دور سے دیکھا کرتا۔ پاس جا کے بات کرنے کا حوصلہ مجھ میں ناپید رہتا۔ مجھے یہ خدشہ لاحق رہا کرتا اگر اس نے تعارف کے باوجود مجھے نہ پہچانا تو کیا ہوگا۔ مجھے یہ احساس طمانیت بخشتا رہتا کہ وہ جلد یا بدیر میری ہی ہوگی۔ خوابوں میں تو میں ابھی بھی اس پر حکمرانی کرتا تھا۔ وہ میرے لیے کھانا بناتی تھی کپڑے دھوتی تھی۔ میرے کام کرتی تھی۔ ملازماؤں کی فوج کے باوجود میں اس معاملے میں بڑا دقیا نوسی تھا ہر کام بیوی سے کرانا میرا بھی شوق تھا۔ یا شاید ہر مرد کا ہوتا ہے۔

مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے انداز ہو رہا تھا۔ سبرینہ کو دور سے دیکھ کر میری تسلی نہیں ہو رہی۔ دل کے تقاضے کچھ اور تھے۔ اب میں خوابوں سے نکل کر حقیقت میں بھی اس پر حکمرانی کا خواہاں تھا۔ پھر سب سے بڑی بات اس کے دوست تھے۔ جن میں لڑکے بھی شامل تھے۔ وہ ان سے بے تکلف تھی۔ ہنستی بات کرتی تھی۔ میرے جیسے غیرت مند جو شیلے لڑکے کے لیے یہ ناقابل برداشت بات تھی کہ میری ہونے والی بیوی مختلف لڑکوں سے میل ملاقاتیں کرتی پھرے۔ یہ بے چینی کبھی کبھی طیش میں بھی بدل جاتی۔ انہی دنوں جب میں اماں سے بات کرنے والا تھا گاؤں جا کے، وہاں سے مجھے ان کی بیماری کی خبر آ گئی۔ میں حویلی پہنچا تو اماں کی حالت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ بستر مرگ پر اماں کو آخری سانسیں لیتے دیکھنا میری برداشت کا بہت کڑا امتحان تھا۔ اس روز اماں کی موت پر میں بہت رویا تھا۔ مجھے اگلے کئی دنوں تک صبر نہیں آ سکا تھا۔ اماں نے مجھے اتنی محبتیں دی تھیں کہ مجھے کبھی کسی اور رشتے کی ضرورت ہی نہ پڑ سکی تھی۔ اماں کے چہلم کے بعد میں واپس کراچی آ گیا۔ یونیورسٹی آ جانے کے باوجود میں جیسے اماں کی یاد سینے سے لگائے پھیرتا تھا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ میں بھی سنبھل گیا۔ بس یہ قلق رہ گیا تھا کہ اماں سبرینہ کو میری دلہن بنانے کی خواہش پوری نہ کر سکیں۔ دھیرے دھیرے یہ خلش بھی جاتی رہی سب کچھ معمول پر آ گیا۔ سبرینہ کے لیے میری دیوانگی کچھ اور

بڑھ کئی تھی۔ وہ انگلش کے مضامین میں ماسٹر زکریا تھی جبکہ میں پشیمال سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا مگر میں گمنوں انگلش وی پارٹمنٹ جا کر وہاں بریٹنہ کی ایک جھلک کا منتظر رہا کرتا۔ پھر انہی دنوں مجھ پر وہ تکلیف دہ انگلشاف ہوا تھا۔ جس نے مجھے وحشت زدہ سا کر ڈالا۔

عون مرتضیٰ جو اپنی بے حد ڈشنگ پرسنالٹی کے باعث پوری یونیورسٹی میں اپنی ذہانت قابلیت کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ بریٹنہ کے لیے بے حد خاص اہمیت کا حامل تھا۔ ساری یونیورسٹی کی لڑکیاں اگر عون مرتضیٰ پر مرتی تھی تو کیا ضروری تھا ان میں ایک بریٹنہ بھی ہوتی۔ کیا ضروری تھا عون مرتضیٰ ساری لڑکیوں کو چھوڑ کر اگر کسی کو اپنی نگاہ التفات سے نوازتا تو وہ بریٹنہ ہی ہوتی۔ یہ ضروری نہیں تھا مگر ایسا ہو گیا تھا اور جب ایسا ہو گیا تھا تو پھر عون مرتضیٰ اس گستاخی کا مرتکب ہونے کے بعد میرا دوست کیسے رہ سکتا تھا۔ عون مرتضیٰ کے ساتھ اپنی منگیترا اور ہونے والی بیوی کا گھومنا پھرنا میرے پیش کو آواز دیتا رہتا مگر میں اس طیش کو دبائے رکھنے پر بھی مجبور تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ عون مرتضیٰ کی ایک حیثیت تھی۔ وہ ہر دلعزیز تھا۔ یہ جامعہ تھی۔ کوئی ہمارا گاؤں یا حویلی نہیں تھی جہاں میرا حکم یا راج چلتا ہو۔ مجھے برداشت کرنا ہی تھا۔ البتہ میں ہر وقت جلتا کڑھتا۔ بریٹنہ کو عون سے چھیننے کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ بالآخر ایک طریقہ میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ میں نے گاؤں جا کر بابا کو بتانے کا فیصلہ کیا۔ شادی نہیں تو کم از کم اب باقاعدہ منگنی ضرور ہو جانی چاہیے تھی۔ بریٹنہ کو میری اہمیت کا تو اندازہ ہوتا۔ اگلے روز ہی میں گاؤں حویلی پہنچ گیا۔ مگر ان دنوں شاید میرے ستارے ہی گردش میں تھے۔ یا پھر یہ ایک بڑا بگاڑ ہونا طے ہو چکا تھا کہ حالات موافق ہونے کی بجائے بگڑتے چلے گئے۔ حویلی پہنچ کر مجھے شاک لگا تھا۔ بابا دوسری شادی کر چکے تھے اور ایک ہٹی کٹی خزانہ عورت حویلی میں میری اماں کی جگہ لے چکی تھی۔ صرف وہی نہیں اس کے رنگ برنگے چار پانچ بچے بھی حویلی میں دندناتے پھرتے تھے۔ یہ میرے قبر کو آواز دینے والی بات تھی۔ میں نے حویلی میں خوب ہنگامہ مچایا بابا سے تو تکار جھگڑے تک جا پہنچی۔ پتا چلا تھا کہ بابا یہ شادی کئی سال سے کیے ہوئے تھے بس اماں کی وجہ سے چھپا رکھی تھی۔ میں نے بابا کی بیوی بچوں کو حویلی سے چلتا کیا اور بابا کو سختی سے اس حویلی میں انہیں گھسانے سے منع کرتا ہوا اسی جھنجھلاہٹ میں واپس آ گیا۔ بریٹنہ کو پانے کی جو تھوڑی بہت امید بچی تھی۔ وہ بھی اندھیرے میں ڈوب گئی کہ بابا سے جیسے اب میرے تعلقات تھے ان میں بابا سے یہ بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر میں نے خود بریٹنہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جو بھی تھا اب میں مزید صبر کر سکتا تھا نہ عون مرتضیٰ کی دیدہ دلیریاں برداشت کر سکتا تھا۔ ان دنوں ہمارے فائل ایکزیم قریب تھے مگر میں پڑھائی کی بجائے بریٹنہ کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ میں جانتا تھا لڑکیاں دولت مند امیر لڑکوں کو شادی کے لیے پسند کرتی ہیں۔ میرے پاس عون مرتضیٰ جیسی متاثر کن شخصیت نہیں تھی مگر دولت بہت زیادہ تھی میں اسی دولت سے بریٹنہ کو عون سے چھین سکتا تھا۔ میں نے کچھ سوچا پھر فیصلہ کر لیا۔ اگلے دن میں نے کراچی کے سب سے مہنگے جیولر شاپ سے پلائیم کی ڈائمنڈ سے منرین رنگ بریٹنہ کے لیے پسند کی تھی۔ میرا ارادہ بریٹنہ کو اپنا تعارف کروانے کے لیے اسے پوز کرنے کا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اب جو بھی کرنا تھا مجھے خود ہی کرنا تھا۔

اگادون میری زندگی کا بے حد اہم دن تھا۔ میں اس روز خصوصی طور پر تیار ہو رہا تھا۔ جینز کے اوپر کھدر کا کرتا پہن کر میں نے بالوں کو سیلتے سے جمایا تھا۔ اور آدھی بوتل پر فیوم کی خود پر انڈیل کر میں بہت ترنگ میں یونیورسٹی آگیا۔ میرے کرتے کی جیب میں موجود ڈائمنڈ رنگ مجھے بے پناہ اعتماد بخش رہی تھی۔ اس کی موجودگی کے باعث یقیناً سبرینہ مجھے رو نہیں کر سکتی تھی۔ اس روز انگلش ڈیپارٹمنٹ کے باہر خوش قسمتی سے مجھے سبرینہ کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شانوں پر جھولتے کٹے ہوئے ریشمی بالوں کو جھٹکتی وہ اپنے دھیان میں مگن میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھ رہی تھی جب میں بہت سرعت سے اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”ایکسیو ز می مس سبرینہ!“

میں نے اس کا راستہ روک کر اسے مخاطب کیا تو بے تکلفی کے اس مظاہرے پر اس نے بھنویں سکڑ کر کسی قدر حیرانی سے مجھے دیکھا۔

”آپ فری ہیں تو میرے ساتھ چائے پینے چلیں۔ مجھے آپ سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔“

میرے خیال میں یہ ایک مہذبانہ آفر تھی۔ عون مرتضیٰ کے ساتھ میں نے اسے یونیورسٹی کنٹین میں ہی نہیں متعدد بار ریسٹورنٹس میں بھی دیکھا تھا۔

”سوری میرا چائے کاموڈ نہیں ہے۔ کیا بات کرنی ہے بولو؟“

اپنی سڈول کلائی پر اسٹائلش سی نازک رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے جیسے بادل ناخواستہ کہا اس کے بے نیاز قسم کے تاثرات اور وہی ازلی اعتماد مجھے زورس کرنے لگا تھا۔ مگر میں اس اہم موقع کو گنوانے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے خود کو کمپوز کیا اور کڑتے کی جیب ٹٹولی کر دلی شپ بلڈ ریڈ کلر کا وہ ننھا سا کیس نکال لیا جس میں بے حد مہنگی انگٹھی تھی۔

”یہ یہ آپ کے لیے ہے۔ اچھو کلی آ آپ مجھے اچھی لگتی ہو۔ مم میں آپ کو پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔“

ایک بار پھر میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ میری ہکلاہٹ نے مجھے بتا دیا تھا۔ میرے ہاتھ کی انگلیوں میں دبے کیس پر انگلیوں کی لرزش بے حد واضح تھی۔ سبرینہ کی حیرت سے ساکن آنکھوں میں کیا کچھ نہ تھا۔

غیر یقینی۔ تحیر استعجاب۔

پھر اس نے مجھے بغور دیکھا۔ اور ایک دم ہنس پڑی۔ میں خوشی و مسرت سے گنگ ہونے لگا۔ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ دولت میں بڑی طاقت تھی۔ میں نے اپنی سوچ کو داد دی۔ ابھی میں ڈھنگ سے خوش بھی نہیں ہو پایا تھا کہ سبرینہ کی آواز نے مجھے بھک سے ہواؤں میں اڑا دیا۔ مجھے لگا میری سماعتوں نے غلط سنا ہے۔ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابھی وہ ہنسی تھی۔ یعنی خوش تھی۔

”تم نے کبھی اپنی شکل دیکھی ہے؟“

اس نے شاید میری شکل پر برستی حیرانی کو پالیا جیسی اپنی بات کو دہرایا تھا۔ مگر اس مرتبہ اس کا لہجہ صرف تمسخرانہ نہیں تھا۔ وہ زہر خندی پھنکاری تھی۔

”جی!!“

میں چکرا سا گیا تھا۔ احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کیھنے لگا۔ وہ پھٹ پڑی۔

”جی نہیں کہو۔ اگر دیکھی ہوتی تو تم یہ حماقت نہ کرتے۔ مان سنس! ناؤ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر!“

یہ الفاظ نہیں تھے۔ توپ کے گولے تھے۔ جنہوں نے میرے وجود کے پرچے اڑا کے رکھ دیئے۔

اس سے قبل میں کبھی اتنا ہرٹ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب چھوٹے قد کی وجہ سے لوگ مجھے ٹیڈی، کوڈو اور بونے جیسے گھٹیا ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ برینہ مجھے ذلیل کرنے کے بعد وہاں سے جا چکی تھی۔ پھر یہ سلسلہ اگر وہیں پر ختم ہو جاتا شاید تب بھی ٹھیک تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ چند روز اس سوگ میں مبتلا رہنے کے بعد جب میں یونیورسٹی آیا تو عون مرتضیٰ جیسے میرا ہی منتظر تھا۔ میں کلاس اٹینڈ کرنے کی بجائے برگد کے بوڑھے پیٹر کے چوڑے تنے سے ٹیک لگائے سر جھکائے بیٹھا گھاس کے تنکے سے کچی زمین پر اپنے نام کے ساتھ برینہ کا نام لکھنے میں مگن تھا جب خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر بھی چونکے بنا اپنے کام میں محو مگن رہا تھا۔ اس کام میں خلل تب پڑا جب میرے ہاتھ کے اوپر ایک چمکدار سیاہ بوٹ آ کر جم گیا۔ میں نے ٹھٹھک کر سراونچا کیا۔

بلیو جینز پر سفید براق شرٹ پہنے عون مرتضیٰ کے وجہہ خوب وچہرے پر غیض و غضب کی لالی تھی۔

”ہاؤ ڈیر یو؟“

انگشت شہادت سے مجھے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ غضبناک انداز میں غرایا۔

”اپنی اوقات سے واقف ہو دو ٹکے کے انسان! برینہ کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی تمہاری جرات کیسے ہوئی۔ بولو۔ بتاؤ؟“

میرے گریبان میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے مقابل کرنے کے بعد اس نے پے در پے مجھے کئی تھپڑ مارے تھے۔ میرا گریبان بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ لمبا ترنگا اور تند مند تھا جبکہ میں اسی قدر نمی اور نحیف اس نے صحیح معنوں میں مجھے فٹ بال بنا کر ٹھوکروں کی زد پر رکھ لیا۔ اتنی تکلیف مجھے عون مرتضیٰ کی ٹھوکروں اور گھونسوں نے نہیں دی جتنی اطراف میں جمع ہونے والے اسٹوڈنٹس کے تماشائی مجمع نے۔ ان میں کوئی ایک بھی میرا حامی نہیں تھا۔ وہ سب عون مرتضیٰ کے دوست اور پرستار تھے۔ سکی، توہین، بے بسی، غم و غصہ اپنی جگہ مگر اس بل میں ہر طرح سے شکستہ اور کمزور تھا۔ چاہنے کے باوجود میں اپنا دفاع نہ کر سکا اور عون مرتضیٰ نے مجھے تنکے کی طرح مسل کر رکھ دیا۔

”عون لیٹس موو۔ سر جاوید از ہیر۔ انہیں اس ہنگامے کی اطلاع مل گئی ہے۔ کوئی کم آن؟“

میں نیچے گرا ہوا تھا جب میں نے مجمع میں سے کسی کی بدحواس تیز آواز سنی تھی۔ مجمع تیزی سے چھٹنے لگا۔ عون مرتضیٰ نے مجھے ایک بار پھر ٹھوکری ماری اور مجھے زندگی بھر برینہ سے دور رہنے کا حکم دیتا وہ بھی پلٹ کر کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔ شاید میں اس درجہ سکی کے سامنے ہمت ہار کر حواس کھو گیا تھا۔

پھر وہ یونیورسٹی میں میرا آخری دن ثابت ہوا۔ اس درجہ سبکی اور تضحیک آمیز سلوک کے بعد عون مرتضیٰ کے ساتھ ساتھ پوری جامعہ میں بھی گویا کسی کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا پھر میری تعلیم اگر ادھوری رہ گئی تھی تو بھی وجہ عون مرتضیٰ تھا۔

اگر سبرینہ مجھے نہیں مل سکی تھی تو بھی اس کی وجہ صرف عون مرتضیٰ تھا۔

اپنے گھر میں کئی اگلے دن میں بھوکا پیاسا پڑا اپنی تذلیل اور شکست کا غم مناتا رہا تھا۔ بہت دنوں بعد جب میں ذرا سانسجھا تو بستر چھوڑ کر اپنے کمرے کے قد آدم آئینے کے سامنے آکر رک گیا تھا۔ پتا نہیں میری آنکھوں میں اتنی تاریکیاں تھیں یا وہ آئینہ دھندلا گیا تھا۔ جو بھی تھا بہر حال مجھے اپنا عکس بہت بد صورت دکھ رہا تھا۔ یہ احساس بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کہ آپ میں کوئی کمی ہے کوئی بہت بڑی خامی پھر وہ خامی بھی ایسی کہ جسے آپ چھپانے میں بھی ناکام رہیں۔ بھلا اس بد صورت چہرے کو میں دنیا کی نظر سے کیسے چھپا سکتا تھا۔ اس روز میں اماں کے مرنے کے بعد اور بڑے ہونے پر دوسری مرتبہ رویا۔ پھوٹ پھوٹ کر۔

تڑپ تڑپ کے

بچوں کی طرح ہلکتے ہوئے

اس روز میرے نزدیک خود مجھ سے زیادہ کوئی اور قابل رحم نہیں تھا۔ گہری سانولی رنگت ماندرو دھنسی آنکھیں نحیف کمزور سالاغہ چہرہ۔ سوکھا چرخ جسم یہ سب میرے لیے نئے اور انوکھے تو نہیں تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ایک ایک احساس دھچکا پہنچا رہا تھا۔ انجانے درد میں مبتلا کر رہا تھا۔ اگر میں ایسا نہ ہوتا تو سبرینہ مجھے کبھی ذلیل نہ کرتی۔ اگر میں ایسا نہ ہوتا تو عون مرتضیٰ مجھے کبھی اس طرح دھنک کے نہ رکھ دیتا۔

پچھتاوے کے ناگ مجھے لمحہ لمحہ ڈنگ مار رہے تھے۔ تب میں نے اس روز کوشش سے اپنی قسمت بدلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انجام سے قطعی بے نیاز رہ کر۔ میرا سب سے پہلا ٹارگٹ اپنی ذات کا بدلاؤ تھا۔

☆☆

سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا کچھ میڈیسن کے ساتھ میں نے بہترین ڈانٹ کے ساتھ جم بھی باقاعدہ گی سے جوائن کر لیا۔ خود کو بہتر بنانے اور بدلنے کی مجھ پر ایک دھن سوار ہو چکی تھی۔ جو کسی حد تک جنون کا انداز اختیار کر رہی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح ویٹ بڑھانے مسلا بھارنے والی مشینوں کے ساتھ مصروف رہنے لگا۔ خواہش کوئی بھی ہو۔ جنون کا رخ اختیار کرے تو پھر راستے میں آنے والی چٹانیں بھی تنگ بن کر اڑ سکتی ہیں۔ میں نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک سال بہت صبر آزما اور مشقت میں گزارا تھا میں نے۔ ایک سال بعد میں نے دل کڑا کر کے آئینہ دیکھا تھا۔ اور تنقیدی جائزہ لیتا رہا۔ کہیں بھی ایک سال پہلے والے ابو داؤد کی جھلک نہیں تھی۔ نقوش میرے جاذب نگاہ ہی تھے۔ سارا کام خراب حد سے بڑھے ہوئے سوکھے پن اور سانولی رنگت نے کیا تھا۔ ایک سال کی محنت رنگ لائی تھی۔ اب آئینے میں جو عکس تھا وہ ایک دراز قدریسلر نماڑ کے کا تھا۔ جس کا چہرہ پر کشش تھی۔ نہت گندی!

میں اپنے آپ کو دیکھ کر بہت خوش نہیں ہوا تھا۔ یہ پہلا ٹارگٹ تھا جسے میں نے اچھو کیا تھا۔ اصل اور اہم کام ابھی میرے پیش نظر تھا۔ اور وہ تھا عون مرتضیٰ سے بدلا چکانے کا کام۔

☆☆

میں نے اپنی گاؤں کی اراضی کا کچھ حصہ فروخت کیا اور بزنس کا آغاز کر دیا۔ اپورٹ ایکسپورٹ کے کام کا مجھے کوئی اتنا خاص تجربہ نہیں تھا مگر میں نے شروع میں نقصان کو برداشت کیا اور کام جاری رکھا اگلے ایک سال مزید کاروبار کے ساتھ میں نے اپنی پچھلے سال کی روٹین (جم اور اچھی ڈائنٹ) میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔ بزنس کے دوسرے سال نقصان کی جگہ منافع نے لی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ دو گنا چو گنا ہوتا چلا گیا۔ نظام قدرت ہے وقت کی گردش بدلتی رہتی ہے۔ کل مجھ پر اگر بُرا وقت تھا تو آج میرے لیے بہترین تھا کل دنیا مجھے مذاق کا نشانہ بناتی تھی۔ اب میری جانب رشک آمیز نظروں سے دیکھتی تھی۔ میں دولت مند تھا۔ پرکشش تھا۔ لڑکیاں دیوانہ وار مجھ پر نثار ہوا کرتیں۔ میں بھی شرافت کے جامے سے اکثر باہر ہوتا رہتا۔ اب میں وہ مرد تھا جس کے لیے کائنات تخلیق کی گئی ہے۔ جس کی راحت و تسکین کی خاطر ہی صنف نازک کو بنایا گیا ہے۔ یہ دنیا خوبصورت لوگوں کے لیے تھی۔ اور میں خوبصورت تھا۔ جہی میں ہر خوبصورتی سے حصہ وصول کرنے لگا۔ میں سمجھتا تھا یہ میرا حق ہے میں ہر چیز فتح کر سکتا تھا دولت ہے۔ اپنی ایک جنبش ابرو سے۔ میرے پاس دولت کی طاقت تھی۔ میرے گرد ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا۔ رنگین آنچلوں کی ہوا، رنگ و بو کا سیلاب رواں رہنے لگا۔ اور نفرتی قبہتھوں کی جلت رنگ۔ میں جہاں بھی جاتا سراہا جاتا۔ پسند کیا جاتا کیونکہ دولت کو میں نے ہمیشہ نہایت فراخ دلی سے لٹایا تھا۔ مجھے کبھی احساس ہی نہ ہوا کہ میں خود کسی کو نہیں سراہتا۔ یا شاید کبھی سبرینہ والے واقعہ کے بعد اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔ صنف نازک میں میںیں سنگ دل اور ہر جانی مشہور ہونے لگا۔ ڈال ڈال منڈ لانا میری فطرت تھی یا عادت بن گئی تھی مجھے سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔ لڑکیاں مجھے بے حس بھی کہتی اور مجھ پر فدا بھی ہوتی پھرتیں۔ میری زندگی میں لاتعداد لڑکیاں آئیں سبرینہ کے بعد مگر میں کسی سے محبت نہ کر سکا۔ مگر پھر کچھ عجیب ہو گیا۔ ایک دم پانسہ پلٹ گیا۔ فتح کرنے والا مفتوح ہو گیا۔ سراہے جانے والا خود کسی کو سراہنے لگا پہلے میں نے یہ مجبوری میں کیا تھا۔ جبراً محض مصلحت کے تحت مگر پھر پتا نہیں کیسے یہ میری ضرورت بنی اور پھر خواہش افوہ میں پھر کہانی کے اختتام پر جا پہنچا۔ آپ کو کیسے پتا چلے گا کہ وہ کون لڑکی تھی۔ کیوں مجھے مجبوراً اس کی جانب بڑھنا پڑا؟

ہاں وہ عون مرتضیٰ کی بہن تھی۔ اکلوتی بے حد چارمنگ حسین بہن! اس کا نام حجاب تھا۔

☆☆

حجاب سے پہلے میری ملاقات اس کے بھائی سے ہوئی تھی یعنی عون مرتضیٰ سے۔ میں اکثر بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر جاتا رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں میں ان دنوں سری لنکا میں تھا جب ایک شاپنگ مال میں خریداری کرتے وقت میرا کسی سے زوردار تصادم ہو گیا تھا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں میرے ہاتھ میں موجود

شاپنگ بیگز اور سیل فون جس پر میں اس وقت بات کرنے میں مصروف تھا زمین بوس ہو گئے تھے۔ اپنی اشیاء اٹھانے کی بجائے میں نے گھور کر ٹکرانے والے کو دیکھا تھا۔ تب ہی جیسے میرے ذہن میں عون مرتضیٰ اپنی تمام تر اکھڑ بے نیازی اور خود سزی کے ساتھ اسپارک کرنے لگا۔ ہاں وہ بلاشبہ عون مرتضیٰ تھا۔ بلیک لائنگ کوٹ اور بلیو جینز میں ہمیشہ کی طرح اسپارٹ، گڈ لکنگ اور ڈشنگ!

میں ساکن کھڑا تھا جبکہ وہ جھکا میری چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ پھر وہ سیدھا ہوا اور نہایت مہذبانہ انداز میں بہت شائستگی سے مجھ سے معذرت کی اور میرا سامان میری جانب بڑھا دیا۔ میں تب بھی پتھر ائے ہوئے انداز میں کھڑا رہا۔ میری ساکن آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”تم پاکستانی ہو؟“

اس نے مسکرا کر یہ سوال انگلش میں کیا تھا۔ تب میں چونکا اور بنا جواب دیئے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسے وہیں حیران چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ میں جانتا تھا میں نے ایک غیر اخلاقی حرکت کی ہے۔ مگر یہ غیر اخلاقی حرکت اس غیر اخلاقی حرکت کے مقابل کچھ بھی نہیں تھی جو عون مرتضیٰ کچھ سال پہلے یونیورسٹی میں میرے ساتھ کر چکا تھا۔

میری آنکھیں، میرا چہرہ، میری روح حتیٰ کہ میری پور پور سلگ اٹھی تھی۔ وہ ہزیمت، وہ سبکی، وہ توہین کچھ بھی بھولنے والا نہیں تھا۔ اس دن میرا موڈ رات گئے تک خراب رہا۔ یہ تین دن بعد کی بات ہے۔ میں سری لنکا کے ایسے ہوٹل میں موجود تھا جہاں پاکستانی کھانے دستیاب ہو جاتے ہیں چکن روٹ میں بہت رغبت سے کھانے میں مصروف تھا جب میں نے ایک بار پھر اپنی زندگی کی سب سے ناپسندیدہ آواز سنی تھی۔

”ایکسیکوزمی! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

میں نے سراونچا کیا۔ میرے روبرو عون مرتضیٰ کا لمبا چوڑا سراپا تھا۔ آج وہ بلیو پیٹ کوٹ میں تھا اور اس سوٹ میں اس کی رنگت بے تحاشا چمک رہی تھی۔ مگر میرے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔ چھری اور کانٹا پلیٹ میں زوردار آواز کے ساتھ ٹپخ کر میں نے سلگتی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے سرکوفی میں جنبش دے کر بد اخلاقی کا ایک عظیم مظاہرہ بڑی بے نیازی سے کیا تھا اور خود جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

”اوہ اب تو میں ضرور بیٹھوں گا۔ چاہے آپ اجازت نہ دیں۔“

وہ بھرپور طریقے سے مسکرایا اور جیج کرسی کھینچ کر میرے مد مقابل بیٹھ گیا۔ میری تیوری جڑھ گئی۔ وہ آج بھی اتنا ہی پر اعتماد نظر آتا تھا جیسا کبھی ہوا کرتا تھا۔ مگر مجھے اس کے اعتماد سے ہی نفرت تھی۔ مجھے اپنے چہرے سے بھاپ نکلتی محسوس ہوئی۔

”ویسے اس روز میری غلطی اتنی بڑی تو نہیں تھی کہ آپ اتنا مائنڈ کر جائیں۔ جبکہ میں معذرت بھی کر چکا تھا۔“ وہ اب کے کسی قدر سنجیدہ تھا۔ میں تنفر بھرے انداز میں اٹھا اس کی بات پر کان دھرنے کی میں نے قطعی

کوشش نہیں کی تھی۔ کرسی کو پیر کی ٹھوکر رسید کر کے میں کاؤنٹر کے پاس گیا۔ بے منت کرنے کے بعد میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا گلاس ڈور تک پہنچا ہی تھا کہ عون مرتضیٰ وہاں بھی عجلت میں لپکتا ہوا میری جانب آ گیا تھا۔

”پلیز مسٹر آپ میری بات تو سنیں؟“

اس نے کسی قدر زور دیا تھا اپنی بات پر میرا جی چاہا میں عون مرتضیٰ کو اٹھا کر باہر سڑک پر دے ماروں۔

”پلیز اس مس بی بیو کی وجہ بھی تو بتا دیں۔ ایک چوکی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے سے کسی کو خفا نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ میرے ساتھ ساتھ تیز تیز چلتا ہوا روڈ پر آ گیا تھا۔ اب یہ موقع تھا کہ میں اس پر اپنی نفرت کی وجہ آشکارا کرتا مگر میں چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکا تھا تو اس کی وجہ مجھے بعد میں سمجھ آئی تب جب میں نے اس کی اکلوتی بہن کو دیکھا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

میں نے اپنی زبان سے اپنی کیفیت کے متضاد فقرہ ادا ہوتے سنا اور خود ہی جھنجھلا گیا۔ جبکہ عون مرتضیٰ اسی قدر خوش ہونے لگا تھا۔

”اوہ ریلی!“

وہ یوں بولا جیسے پتا نہیں کیسا بوجھ اتر گیا ہو سرے۔ میں محض بے زار نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ سر کھجا کر مجھے بغوردیکھتے ہوئے بولا۔

”یار مجھے کیوں ایسا بُرا رہا ہے جیسے میں آپ کو پہلے دیکھ اور مل چکا ہوں؟“

میرا حلق کڑوا ہٹ سمیٹ آیا۔ وہ مجھے پھر میرا تلخ اور ناگوار ماضی یاد کرارہا تھا۔

لگتا تو مجھے بھی ہے لیکن یاد نہیں آ رہا۔

پتا نہیں میرے جواب اتنے مصالحانہ کیوں ہو رہے تھے۔ حالانکہ یہی وہ شخص تھا جسے میں نے کبھی رعایت سے نہیں سوچا تھا۔

”تو یار تم مجھے اپنا تعارف کراؤ نا؟ تمہارا نام کیا ہے؟ ویسے میں عون مرتضیٰ ہوں۔“

اس کا انداز دوستانہ لب و لہجہ شائستگی لیے ہوئے تھا۔ مجھے تمام تر ناگواریت کے باوجود اس کا مصافحہ کو بڑھا ہوا تھا ہاتھ منا پڑا تھا۔

”اپنا نام بتاؤ نا؟“

وہ مجھے گہری متبسم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرمجوش گرفت میں اپنائیت تھی۔

”ابوداؤد!“

میرا جواب مختصر تھا۔ میں نے اس کے تاثرات دیکھے تھے۔ وہ کچھ چونکا اور زیر لب میرا نام دہرایا۔

”ابوداؤد وہی نا جو بہت لمبا اور دبلا پتلا سا ہوا کرتا تھا اور.....“

معاؤہ بات ادھوری چھوڑ کر خفیف سا ہو کر مجھے تکتے لگا۔ میں لب بھینچ کر نگاہ کا زاویہ بدل گیا تھا۔

”سوری یار میں پہچان نہیں۔ کا تمہیں۔ تم ایک دم بدل گئے ہو۔ بہت بینڈ سم اور شاندار میں کیا کوئی اور بھی تمہیں اتنی آسانی سے ہرگز نہیں پہچان سکتا تھا۔“

پتا نہیں وہ کیوں خفت زدہ سا وضاحتیں پیش کر رہا تھا۔ میں تب بھی خاموش اور اکتایا ہوا کھڑا رہا۔
”اب میں جاؤں؟“

میرا الجہ یقیناً طنز یہ تھا۔ جس پردھیان دیے بنا اس نے کاندھے اچکا دیے تھے۔
”شیور، لیکن یارا اگر تم مانیڈ نہ کرو تو مجھے پلیز ڈراپ کر دو۔ یہاں سے میرا پارٹمنٹ کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔“

میں اپنی گاڑی کا لاک کھول رہا تھا۔ جب اس کی بے تکلفانہ انداز میں کی گئی فرمائش نے شدید ناگواری میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر میں ایک بار پھر جانے کیوں رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گیا تو وہ دوسری جانب سے گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔ اس کے بتائے گئے راستے پر گاڑی ڈالتے ہوئے میں خاموش تھا وہی بولتا رہا۔ جس میں مجھے کام کی بات ایک بھی سننے کو نہ ملی تو میں نے جانا اسے بولنے کا ضبط تھا۔
”آؤنا؟ ایک کپ کافی ساتھ پیتے ہیں۔“

جیسے ہی گاڑی رکی وہ اصرار کرنے لگا۔ میرے ہزار منع کرنے کے باوجود وہ ضدی رہا تو میں اس وقت کو کوستا جب یہ مجھے ٹکرا گیا تھا گاڑی لاک کرتا اس کے ساتھ چلا آیا۔ اس کا پارٹمنٹ فل کارپٹ اور بیش قیمت سامان سے آراستہ تھا۔ گوکہ سری لنکا میں میرا بھی پارٹمنٹ تھا مگر اسے فرنشڈ کرنے کا خیال مجھے اس لیے بھی کبھی نہیں آیا تھا کہ میں کبھی کبھار وہاں آتا تھا وہ بھی بزنس کے سلسلے میں۔
”تم بیٹھو میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتا ہوں۔“

کورٹ اتار کر جھٹکنے کے بعد ہینگ کرتے ہوئے اس نے ایک اچھے میزبان کی طرح خوش اخلاقی سے کہا تو میں کچھ کہے بنا بائو مٹھلیں صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ کمرے کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے میری نگاہ کارنس پر رکھی اس فوٹو گراف میں الجھ گئی تھی جو خوبصورت سے فریم میں آویزاں تھی۔ وائیٹ شیفون کے کڑھائی والے سوٹ میں دوپٹہ سلیقے سے شانوں پر پھیلائے وہ پندرہ سولہ سال کی بے حد پرکشش لڑکی کی تصویر تھی جس کی لائبریل پلکوں والی آنکھوں اور معصوم آنکھوں میں خوفزدہ سی ہرنی کی آنکھوں کا تاثر ٹھہرا ہوا تھا۔ لائبریل بے انتہا سلیکی بال کانوں کے پیچھے سے ہو کر شانوں سے ہوتے پشت پر گر رہے تھے۔

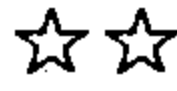
”میری بہن ہے حجاب!“

میں تصویر کا جائزہ لینے میں مگن تھا۔ عون مرتضیٰ کی آواز پر گڑ بڑا سا گیا۔ وہ کافی کاگم میری جانب بڑھائے ہوئے تھا۔

”ہم سب بھائیوں سے چھوٹی ہے اور اکلوتی بھی۔ جی بہت عزیز ہے ہم سب کو۔“

وہ بہت پیارا اور شفقت سے اس کا ذکر کر رہا تھا۔ اور میرے حواس الرٹ ہو گئے تھے۔ عون مرتضیٰ کو

لیا پتا تھا اس نے مجھے اپنے گھرا کے کیا غلطی کی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا اس نے مجھے کیا کچھ نہ سوچھا دیا تھا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور اس کا کچھ نہ جانتا ہی میری کامیابی کی ضمانت تھا۔



میں بزنس اور اپنی دلچسپیوں میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ اپنی فیملی کو بالکل ہی بھول بیٹھا۔ بابا کے انتقال کی خبر نے مجھے جھنجھوڑا تھا اور میں ہر مصروفیت ترک کر کے گاؤں حویلی چلا آیا۔ وہاں سوتیلی اماں ان گزرنے والے سالوں میں مکمل حکمرانی اپنے اختیار میں لے چکی تھیں۔ داور بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اور سنیہ بھابھی دن رات اماں اور بہنوں کے آگے تختہ مشق بنی ہوئی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے داور بھائی کو حویلی سے اکالا۔ لاہور میں انہیں کوٹھی لے کر دی اور کاروبار کرادیا۔ سنیہ بھابھی کو اماں اور آپاؤں کے ظلم و ستم سے نجات ملی تو میری احسان مند ہو گئیں۔ وہ لوگ اکثر مجھ سے ملنے آجایا کرتے اور بھابھی ہر مرتبہ مجھے بہت خلوص سے شادی کا مشورہ دیا کرتیں۔ مگر میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ عون مرتضیٰ سے اگلی ملاقات بھی اتفاقی تھی۔ وہ برسات کا سیزن تھا میں تقریباً چھ ماہ بعد داور بھائی اور بھابھی کے اصرار پر لاہور ان لوگوں سے ملنے آیا تھا۔ چند دن گزار کر جب واپسی کا قصہ کیا تو ایک دم بارشیں شروع ہو گئیں۔ اگلے روز میری فارن امپلیکیشن سے بہت اہم میٹنگ تھی اور موسم کی خرابی کے باعث ہوائی سفر ممکن نہ رہا تھا۔ مجبوراً مجھے ٹرین کے ذریعے واپس آنا پڑا۔ داور بھائی مجھے اسٹیشن چھوڑنے ساتھ آئے تھے۔ کراچی جانے والی ٹرین کچھ لیٹ تھی اور چھاپھم برستا آسمان مسافروں کو بوکھلائے دے رہا تھا۔ بارش کے باعث سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے زبردستی داور بھائی کو واپس بھیجا اور خود وزیٹنگ روم میں آ گیا۔ ایمر جنسی میں میں ٹکٹ لے نہیں لے سکا تھا اب جیسے تیسے سفر کرنا تھا۔ انہی سوچوں میں گھرا ہوا میں اندر آیا تو میری پہلی نگاہ جس پھرے پر پڑی وہ عون مرتضیٰ کا تھا۔ میں ہرگز بھی اس وقت اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا جیسا کہ اس کی نگاہ ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ اُلٹے قدموں پلٹتے ہوئے میں نے غیر شعوری طور پر مڑ کے دیکھا اور میری نگاہیں ہندوستانیوں کو جم کر رہ گئیں تھیں۔

عون مرتضیٰ کے ساتھ وہ نازک سی لڑکی حجاب کے سوا یقیناً اور کوئی نہیں تھی۔ بلیک اسٹاکش سے سوٹ پر فینسی شال اپنے گرد لپیٹے وہ اپنی تصویر سے کہیں بڑھ کر دلکش اور حسین نظر آ رہی تھی۔ چیونگم چباتے اپرواہی سے کسی بات پر زور سے ہنستے اس لڑکی کی ہر حرکت سے بچپنا عیاں تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچے اور پلٹ کر وزیٹنگ روم سے باہر آ گیا۔ پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے سگریٹ کے کش لیتے میں عون مرتضیٰ سے ہونے والی اس اتفاقی ملاقات پر غور کرنے لگا۔ اس کا بار بار کا سامنا یونہی بے وجہ نہیں تھا۔ قدرت خود مجھے میری منزل کے قریب کر رہی تھی۔



چھٹا حصہ

برستی بارش میں خود سے غافل سا انداز لیے میں جانے کب تک ٹہلتا رہا تھا۔ جب کسی مضبوط ہاتھ کا لمس میرے شانے پر آ کر ٹھہرا تو میں ایک دم سا کن ہو گیا۔ عون مرتضیٰ کو رو پانا مجھے اپنے ضبط کا ہمیشہ امتحان لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا وہ شاید ٹک شاپ سے کچھ لے کر نکلا تھا کہ نگاہ مجھ پر پڑ گئی تھی۔

”ابوداؤد! واٹ اے سر پر از یار!“

اس کا بشاش لہجہ بے حد خوشگواریت لیے ہوئے تھے
”تم یہاں کیسے؟“ وہ مجھے مسکرا کر دیکھتے استفسار کرنے لگا۔

”کراچی جا رہا ہوں۔“

میں نے سگریٹ پھینک کر جوتے سے مسلا اور رکھائی سے جواب دیا۔ میں نے سرسری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا بلیک ٹوپ میں اپنی غضب کی اسمارٹنس کے ساتھ وہ خوب رو لگ رہا تھا۔ مگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو مجھ سے کم۔ وہ قد اور جسم میں مجھ سے پیچھے تھا۔ مگر اس کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر تھا جو جکڑ لیتا تھا۔ جو مجھے بھی جکڑنے کی کوشش کرتا تھا میں اس کے سامنے خود کو مسمرائز ہوتا محسوس کیا کرتا اور یہی بات میری شدہ جھنجھلاہٹ کا باعث بن رہی تھی۔ شاید میں لاشعوری طور پر آج بھی اس سے خائف تھا۔ یا پھر کہیں ذہن میں اس کی برتری کا احساس آج بھی موجود تھا۔ اور یہی بات مجھے خود پر تاؤ دلایا کرتی تھی۔

”یہاں بارش میں کیوں بھیگ رہے ہو؟ وہاں اندر آ جاؤ ہمارے ساتھ۔“

اس نے پھر اسی خلوص سے آفر کی جو شاید اس کی طبیعت کا خاصا تھا۔ مگر مجھے یہ سراسر اس کی منافقت لگتی تھی۔ جی میں نے نخوت بھرے انداز میں اس آفر کو انور کر دیا۔

”نو ٹھینکس! میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”جب تک ٹرین نہیں آ جاتی تم ہمیں جوائن کرو داؤدنی میرے ساتھ ہے میں تمہیں اس سے ملواتا

ہوں۔ بہت پیاری بچی ہے، چائے تو بہت ہی اچھا بناتی ہے۔ مگر خود نہیں پیتی۔

وہ خود ہی بولتا رہا خود ہی ہنسا۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو وہ کچھ چپ سا ہو کر بیٹھے

کچھ دیر دیکھتا رہا۔ توجہ کے تمام تر ارتکاز لیے۔

”ابوداؤد!“

میں جو اسے یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھا اس کے لہجے میں کچھ محسوس کر کے متوجہ ہونا نہ چاہتے ہوئے بھی ”تم کچھ بھولے نہیں ہونا؟“

بات ایسی تھی کہ میرا چہرہ متغیر ہو کر رہ گیا۔ اس کا اس درجہ درست قیاس وہ بھی منہ پر کہہ دینا عون مرتضیٰ کا ہی خاصا ہوسکتا تھا۔

”اگر ایسا ہے تو میں تم سے باقاعدہ ایکسکیز کر لیتا ہوں۔ آئی ایم ساری فارڈیٹ یا رازرا سی گنجائش رکھ کے سوچو وہ ہمارا بچپنا اور جذباتی عمر تھی۔ دماغ جو شیلے ہوا کرتے تھے۔ پھر بھی میں مانتا ہوں میں نے غلط بلکہ بہت غلط کیا تھا تمہارے ساتھ۔“

وہ کہہ رہا تھا۔ اور میں اس قدر شاکڈ تھا کہ گویا قوت گویائی کھو بیٹھا! کچھ وقت خاموشی کی نذر ہو گیا۔ ہ بارش میں میرے سنگ بھیگتا منتظر نظروں سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔ اور میں تو جیسے پھر پانچ سال پیچھے چلا گیا تھا۔ وہی ذلت، وہی بے بسی، مجھے اپنے وجود پر چٹنیوں کی گردش محسوس ہو رہی تھی۔

”تم نے کچھ کہا نہیں ابوداؤد!“

وہ مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ بے بس کر دینے والوں میں سے تھا۔ مگر اسے پتا نہیں تھا۔ میں اب بے بس ہونے والوں میں شمار نہیں ہوتا تھا مگر میں اپنا بنا بنایا کھیل بگاڑنا نہیں چاہتا تھا جیسی خود کو فی الفور منہ کالا اور بے ساختہ ہنس پڑا۔

”کم آن عون! تم غلط سوچ رہے ہو۔ اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ اس چھوٹی سی بات کو لے کر بیٹھا ہوں۔ سوریلکس! ٹیک اٹ ایزی یار!“

میں نے اس کا کاندھا تھپکا تھا اور بے حد نارمل انداز میں کہا بلکہ اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ اور میرے خیال میں عون مرتضیٰ ٹھہرا ہی گیا تھا کہ اس نے میری بات کا یقین کر لیا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنے ہمراہ نذر لے گیا۔

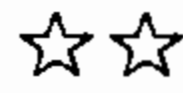
”کہاں رہ گئے تھے بھیا آپ؟ پتا ہے میں پریشان ہونے لگی تھی۔“

وہ مجھے نظر انداز کیے عون سے الجھنے لگی۔

”اف آپ تو سارے ہی بھیگ گئے ہیں۔“

اس نے تشویش بھرے انداز میں کہا پھر جھک کر ایک بیگ کی زپ کھول کر شاید ٹاول ڈھونڈنے لگی تھی اور میں اسے گنگ ساد دیکھتا چلا گیا تھا۔ میدے جیسی بے داغ دودھیارنگت میں چاندنی کا سا اجلا پن اور ہلک تھی۔ چمپے کی کلیوں کی سی نازک جلد میں اس کی کم عمری اور معصومیت کا مخصوص نکھار نگاہ کو ٹھٹھکائے دے رہا تھا۔ اٹھتی گرتی ریشمی پلکوں کی جھالریں اور لالہ بالوں کی کچھ موٹی لٹیں جو شمال سے نکل کر اس کے صبح چہرے کے بوسے لے رہی تھیں۔ وہ سحر طاری کر دینے کی حد تک دلربا تھی۔ اسے اتنے قریب سے دیکھ کر میرے اندر کا انتقام کی آگ میں جھلتا ہوا مرد جیسے بے چین ہو گیا۔ عون مرتضیٰ سے اس سے بڑھ کر بھی کوئی انتقام لیا جاسکتا تھا

اس کی عزت، محبت اور مان و زعم کو میں اپنے پیروں کی خاک بنا دیتا۔ اس حسین کانچ کی گڑیا جیسی لڑکی کو توڑ پھوڑ ڈالنے اور ریزہ ریزہ کر ڈالنے کا تصور ہی بڑا جاں افزا تھا۔ میرے ہونٹوں پر ایک جاندار مسکراہٹ بکھر گئی۔ عون مرتضیٰ نے میرا تعارف اس سے کروایا تھا۔ اس کی مجھ پر اٹھنے والی نگاہ میں وہی معصومیت بھری الاقلقی تھی۔ وہ سرسری سامتوجہ ہونے کے بعد پھر عون سے باتیں کرنے لگی تھی۔ دونوں بہن بھائی کی محبت مثالی تھی۔ عون کے ہر انداز سے اس کے لیے محبت اور شفقت ٹپک رہی تھی۔ اس لڑکی کے ہر انداز میں انریشن تھی۔ وہ بے حد خاص تھی میرے ٹارگٹ کی زد پر اب وہی تھی۔



بہت عرصے بعد میں ایک بار پھر مضطرب ہوا تھا۔ عون مرتضیٰ سے میری لاسٹ ملاقات کو بھی چھ ماہ ہونے والے تھے مگر میں اس دوران کوئی بھی ایسی کارگر ترکیب نہیں لڑا سکا تھا جس کے نتیجے میں حجاب پر مکمل دسترس حاصل کر کے میں عون کو نیچا دکھا سکتا۔ مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے میں اس لڑکی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ مجھے عون مرتضیٰ کو اس لڑکی کے ذریعے بے بس کرنا تھا۔ اس کی دکھتی رگ کو ہر ہر لمحے مسلنا تھا۔ تاکہ عون مرتضیٰ تڑپے چیخے روئے۔ مگر کیسے؟

میں چاہتا تو اپنا پروپوزل اس کے لیے بھیج سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت کم عمر تھی۔ مشکل سے اٹھارہ سال کی جبکہ میں تیس سال کا ہو چکا تھا۔ شاید عون کو اعتراض ہوتا۔ جبکہ میں ایک بار پھر اس سے انسلٹ کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اگر حجاب کو کڈ نیپ بھی کرا لیتا تب بھی۔ میری اپنی ساکھ خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ عون مرتضیٰ کے بھائیوں میں سے ایک نامور وکیل تھا جبکہ دوسرا ڈاکٹر۔ خود عون مرتضیٰ کا بزنس میں ایک ساکھ ایک نام تھا۔ یہ کام ہرگز آسان نہیں تھا۔ جبکہ میں عون کو معمولی زک تو پہنچانا چاہتا ہی نہیں تھا۔ لمحہ لمحہ کی موت اس کا نصیب بنانا ہی میری ازلی خواہش تھی۔ اس وقت میری سب سے بڑی الجھن یہی تھی جو سلجھ کے نہیں دے رہی تھی۔ اسی مسئلے میں الجھ کر میں بزنس کی جانب سے بھی غافل ہو رہا تھا۔ اور مجھے اس بات کی پرواہ بھی نہیں رہی تھی۔ اپنے بیڈروم میں بند میں سگریٹ پھونکتے ہوئے ٹہل رہا تھا جب ملازم نے مجھے ولید کی آمد کی اطلاع دی۔ ولید میرا بزنس پارٹنر تھا۔ چند ماہ قبل اس نے میری گارمنٹ فیکٹری میں اپنے شیئر انویسٹ کیے تھے۔ اس وقت میں ہرگز اس سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ملازم کو میں صاف منع کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ اسی دوران دندنا تا ہوا وہیں گھس آیا۔ میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے پتا ہے تم کسی ٹینشن میں مبتلا ہو۔ بہر حال مجھے بیٹھنے کا تو کہو ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام

بی آ جاؤں۔“

وہ چرب زبان تھا مجھے اسی خامی کی بدولت اکثر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ میں نے تند نظروں سے اسے گھورا ”مجھے تمہاری کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جب تمہیں پتا ہے میں تم سے ملنا نہیں چاہتا تو تمہیں واپس چلے جانا چاہتے تھا۔“

سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر میں نخوت سے بولا تو وہ جواباً خفت سے دو چار ہونے کے بجائے بے شرمی اور ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

”دوست کیوں نہیں مان لیتے ہو مجھے! یاروں کا یار ہوں۔ اک بار آزما کر تو دیکھو۔“

سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ جاٹاری سے بولا۔ مگر میری آنکھوں کی کوفت میں ہرگز کمی نہیں آئی۔ اسے رُخا کر میں نے چند دن مزید اسی الجھن میں بتائے تھے۔ پھر میں نے اتفاقی ملاقاتوں کے بعد عون مرتضیٰ سے ایک مدد دانستہ ملاقات کی تھی۔ اور ایک اور اہم کام کیا تھا۔ ڈائری لکھنے کا کام یہ بھی میری پلاننگ کا حصہ تھا۔ میں نے اہن پر زور ڈال کر اس دن اور تاریخ کو یاد کیا تھا جب عون مرتضیٰ اور حجاب سے اسٹیشن پر میری ملاقات ہوتی تھی۔ میں نے اسے بڑے جذباتی اور ڈرامائی انداز میں ڈائری کا حصہ بنا دیا تھا۔ اس کے بعد دو تین مزید عون سے ہونے والی ملاقاتوں نے میری رسائی عون مرتضیٰ کے گھر تک کر دی تھی۔ اگلی اور اہم ملاقات میری حجاب سے اس کے گھر پر اس کے گھر کے سبز سبز لان میں ہوئی تھی اور بڑے ہی فلمی انداز میں۔ مجھے معمولی فلو تھا جسے دانستہ میں نے بگاڑا تھا۔ طبیعت زیادہ خراب ہوئی تب میں عین ان لمحوں اس ریسٹورنٹ میں کافی پینے گیا جہاں مجھے پہلے سے پتا تھا آج وہاں عون ایک اہم مٹینگ میں شریک ہونے آرہا تھا۔ میں نے ٹائمنگ اس حساب سے رکھی تھی کہ عون مٹینگ سے فارغ ہو تب مجھ سے ٹکرائے۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ واپسی کو نکل رہا تھا جب اس کی نگاہ مجھ پر جا پڑی تھی۔ میں بیٹھا ہی ایسی جگہ اور ایسے زاویے پر تھا کہ وہ مجھے دیکھ سکتا۔ میں بار بار چھینکتا تھا اور رومال سے ناک رگڑتا کر اہتا ہوا کم از کم عون مرتضیٰ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ بے خبری کا تاثر دیتے بھی میری ساری توجہ اس پر مرکوز تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا تھا پھر میری جانب آنے لگا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے میرے دل کی دھڑکنیں غیر متوازن ہونے لگیں۔

”ہی ابو داؤد! آریواو کے؟“

وہ کسی قدر تشویش میں مبتلا ہو کر مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے چونکنے کی شاندار ادکاری کی تھی اور فناک سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور ذرا سا جھینپ گیا۔

”ہاں یاربس یہ معمولی زکام ہے۔ میرا ملازم بھی چھٹی پر تھا۔ کافی پینے کو یہاں آنا پڑا۔“

میں ہر ممکن طریقے سے اس کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے بغور تکتا ہوا میرے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا پھر میری پیشانی چھوئی تھی۔

”معمولی زکام! تمہیں اچھا خاصا ٹمپر پچر ہے۔“

وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر حتمی انداز میں بولا تھا۔

”اٹھو میرے ساتھ چلو۔“

”پگر کہاں؟؟؟“

میں مصنوعی حیرت سے بولا۔

”گھر۔ ملازم نہیں ہے تمہارے گھر تو دیکھ بھال اس بیماری میں کیسے ہوگی۔ بس تم میرے ساتھ چلو۔“

اس کا انداز حتمی اور دو ٹوک تھا۔ میں بوکھلا اٹھا منصوبے کی اس حد تک شاندار کامیابی کی تو مجھے بھی امید نہیں تھی۔ میں نے بظاہر بہتر ا جان چھڑانا چاہی۔ ہاتھ پیر مارے مگر وہ عون مرتضیٰ تھا اپنی منوانے کے فن جاننے والا مجھے اپنے ساتھ لیے بنا نہیں ملا تھا۔ اگلے دو دن اس نے اپنے گھر کی انیکسی میں میری جی جان سے تیمارداری اور خدمت کی تھی۔ اس کے دو چھوٹے بھائی فادر اور ماما بھی گاہے بگاہے مجھ سے خیرت دریافت کرنے آتے رہے۔ مگر میرا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ حجاب یا عون کی مسز کے ساتھ ملنے کی خواہش دل میں ہی دبی رہی تھی۔ اس روز میں قدرے بہتر تھا اور عون سے اپنے گھر جانے کی بات کر رہا تھا وہ آمادہ تو ہو گیا مگر جب تک میرا ملازم واپس نہیں آتا وہ میرے ساتھ اپنا ملازم بھیجنا چاہ رہا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے میرے قریب آیا تھا اور جتنی مجھے اہمیت دیتا تھا ہوتا تو یہ چاہتے تھے کہ میرا دل اس سے صاف ہو جاتا مگر میرے اندر لگی آگ تو جیسے کچھ اور بھڑک اٹھی تھی۔ عون مجھے وہاں چھوڑ کر جانے خود کدھر نکل گیا۔ میں اس کے انتظار میں بے زار ہوا تو بالکلونی سے ٹیرس پر نکل آیا۔ سبک ہوا کے سرمست جھونکوں نے میرا استقبال کیا تھا۔ سرمئی بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر اڑتے ہوئے پھر رہے تھے۔ موسم بہت سہانا ہو رہا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے سرسبز لان تھا مجھے جانے کیا سوچھی کہ ٹیرس سے اتر کر انیکسی کے لان میں آ گیا۔ انیکسی اور گھر کے لان کو علیحدہ کرنے کو درمیان میں سبزے کی تین فٹ اونچی باڑھ تھی۔ میں چہل قدمی کر رہا تھا جب کوئی اچانک بھاگتا ہوا میرے نزدیک آیا تھا۔

”بھیا بچائیں بچائیں اس ڈاگ سے پلیز!“

خونزدہ سی آواز عین میں نے اپنی پشت پر سنی تھی اور میں بُری طرح سے چونکا تھا۔ اس سے پہلے کہ پلٹتا کسی نرم و نازک گداز ہاتھ نے میرا بازو کہنی کے قریب سے دبوج لیا۔ میں ساکن سا اسی زاویے پر کھڑا رہ گیا۔ لمس کا اضطرابی دباؤ شدید خوف کا مظہر تھا۔ اب پلٹنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ میرے پورے وجود میں جیسے بجلی دوڑ رہی تھی۔ دیکھے بنا بھی میں جان گیا تھا وہ حجاب تھی۔ پلٹے بنا میں نے محض گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ میری بجائے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سحر انگیز چہرے سے نگاہ چھڑا کر میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ بل ڈاگ کچھ فاصلے پر کھڑا زبان لہراتا ہوا ہمیں گھور رہا تھا۔ اس غلط فہمی کی وجہ یقیناً میرے اور عون کے لباس کا ایک رنگ ہونا تھا۔ عون مرتضیٰ بھی بلیک جینز شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ جی وہ دھوکہ کھا گئی تھی۔ میں نے ایک نظر اپنے بازو پر مضبوطی سے جمی سفید مومی انگلیوں والے ہاتھ کو دیکھا جس کی لابی انگلیوں کے کنارے شدید ضبط سے سرخی مائل ہو رہے تھے۔ دوسری نظر اراداً اس کے چہرے پر ڈالی۔ گلابی کاشن کا سوٹ جس پر ہلکی شکنیں پڑ چکی تھیں۔ سادگی سے بنی چوٹی سے بال نکل کر اطراف میں اڑ رہے تھے۔ بغیر کسی آرائش کے اجلا رو پہلا روپ معصوم نوخیز چہرہ جس پر بہکا دینے والی بے خبری معصومیت اور خوبصورتی۔ مجھے اسی پل کسی انتہا سے گزر جانے پر اکسانے لگی۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ مگر وہ آج اس دن سے کہیں زیادہ حسین لگی تھی شاید وجہ یہ قربت تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کی مکمل بے خبری میں اسے اتنے نزدیک سے دیکھا تھا۔ جانے کس جذبے

کے تحت میں نے اپنا بازو اس کی نازک کمر کے گرد جھانک کیا۔ اور ایک دم پوری قوت سے بھیج ڈالا۔ وہ چونکی تھی اور پھر ٹھٹھک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اگلے لمحے اس کی آنکھیں حیرت، خوف اور غیر یقینی سے پھیل کر رہ گئیں۔ وہ کرنٹ کھانے والے انداز میں اچھل کر مجھ سے فاصلے پر ہوئی تھی۔ یقیناً اپنے بھیا کی جگہ وہ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ اس کے یوں بدک جانے پر میں محفوظ ہو کے مسکرایا تھا یوں جیسے وہ بہر حال مجھ سے بچ نہیں سکے گی کبھی نہ کبھی۔ مجھے زیر لب مسکراتے دیکھ کر وہ کچھ اور بدحواس ہو گئی تھی۔ پھر سراسیمہ نظروں سے مجھے تکتی وہ اُلٹے قدموں بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے نظر کی آخری حد تک اسے دیکھا تھا پھر اس کی ہراسگی کو محسوس کر کے مسکرانے لگا۔ عون مرتضیٰ کے واپس آنے تک میں خود کو سنبھال چکا تھا۔

☆☆

آنکھوں سے میرے اس لیے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی
اب عمر نہ موسم نہ وہ رستے کہ وہ پلٹے!
اس دل سے مگر خام خیالی نہیں جاتی!
مانگے تو اگر جان بھی ہنس کے تجھے دے دیں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی!

میں آفس سے گھر واپس جا رہا تھا۔ گاڑی کی فضا میں بھتی غزل کی مدھم موسیقی میں سیل فون کی بیپ کی آواز غالب آنے لگی۔ میں جو کسی خیال میں تھا ذرا سا چونکا اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا۔ ملک کرتی اسکرین پر عون مرتضیٰ کا نام تھا۔ مہرے چہرے پر سکوت چھا گیا۔ اس وقت اس ناپسندیدہ بندے سے بات کرنے کا میرا ہرگز موڈ نہیں تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ یہ ہی آدمی وہ سیڑھی تھا جس پر چڑھ کر میں اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے پہلے ٹیپ ریکارڈر آف کیا پھر کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو!“

”اسلام علیکم! کیسے ہوا بوداؤد؟“

اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح پر خلوص اور خوشگوار تھا۔

”فائن! تم سناؤ؟“ میں نے جبراً اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ جواباً اس کی ہنسی کی آواز گونجی۔

”اگر کہوں گا تمہیں یاد کر رہا تھا تو شاید یقین نہ کرو۔“

”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔“

میں نے رسان سے کہا اپنے اندر اٹھتے پھر سے برعکس۔

”یار آج میری برتھ ڈے ہے۔ میں نے سوچا تمہیں بھی انوائٹ کر لوں۔ عموماً تو ہم سیلیریشن

کرتے نہیں ہیں بس وش کر دیا جاتا ہے مگر اس مرتبہ ہنسی کی ضد ہے۔“

وہ اسی مشفقانہ انداز میں اپنی بہن کا ذکر کر رہا تھا۔ میرا دل اس اور موقع کو پا کر ایک دم مسرت سے بھر گیا مگر بظاہر کسی قدر سپاٹ انداز کو اختیار کیا تھا۔

”یہ خالصتا گھریلو تقریب ہوگی یا مناسب نہیں لگتا میرا شریک ہوتا۔“

”ارے۔ یہ کیا بات کی تم نے ابو داؤد! تم دوست ہو میرے! کبھی کبھار ملتے ہو۔ وہ بھی اتنی اجنبیت سے کہ میں نجل ہونے لگتا ہوں۔ یار دوستی میں تکلفات کہاں ہوتے ہیں۔ پھر بنی تو ہمارے لیے اولاد کی طرح ہے اس کی بات میں ٹال نہیں سکتا۔“

وہ پتا نہیں کیا کچھ بانک رہا تھا میں نے لا پرواہی سے سنا۔ میرے اندر زہر پھیلنے لگا تھا۔

”بڑھو بڑھو عون مرتضیٰ آگے بڑھو اس راستے پر۔ تم دیکھو میں کرتا کیا ہوں تمہارے ساتھ۔“ میں دل ہی دل میں پھنکارا۔

”پھر تم آرہے ہونا شام کو؟“

وہ بے حد اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی یہ لگاؤ، یہ توجہ، یہ محبت، مجھے اکثر حیران کر جاتی وہ فطرتاً کیسا تھا میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن اگر وہ اتنا ہی پیار لٹانے والا تھا تو اس سلوک کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی جو اس نے میرے ساتھ روارکھا تھا۔ جو بھی تھا میں اسے معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

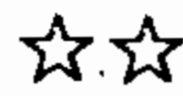
”آج شام کو؟ اوکے آ جاؤں گا۔“

میں نے نیم دلی سے جواب دیا تب اس نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ لیکن اس رات لی میری ساری جدوجہد ساری تیاری خاک میں مل گئی تھی۔ حجاب سے اس رات میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ عون مرتضیٰ نے اس کی بابت کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا۔ حالانکہ میرے نزدیک سب سے اہم بات ہی یہی تھی۔ میں چار گھنٹے وہاں رہا تھا۔ اور جس پل میں واپسی کو اٹھا میری جھنجھلاہٹ اور کوفت نقطہ عروج پر جا پہنچی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا میں عون کا سر پھاڑ ڈالوں۔ حالانکہ اس کی فیملی کے تقریباً تمام لوگوں نے مجھے ٹائم دیا تھا اور بہت اپنائیت اور محبت سے پیش آئے تھے۔ عون کی ممتا تو مسلسل مجھے شادی کر لینے کا مشورہ دیتی رہی تھیں۔ اسی روز مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ عون کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ اور اس کی بیوی کوئی اور نہیں سبرینہ ہی تھی۔ میں وہاں سے واپسی کو لوٹا تو میرے اندر اس انکشاف کی متضاد کیفیات تھیں۔ عون کی شادی کی ناکامی مگر محبت کی کامیابی کا زہر بھی میرے وجود کو نیلا کر رہا تھا۔ سبرینہ جو میرا خواب میرا پہلا ارمان تھی۔ وہ اس بدترین انسان کی بیوی بن چکی تھی۔ وہ اس کا ہر لحاظ سے فاتح تھا اور یہی بات مجھے کانٹوں پر گھسیٹ رہی تھی۔ عون کے ساتھ اس کے پپا اور بھائی میرے ساتھ پور نیو تک آئے تھے۔ میں ان لوگوں سے الوداعی مصافحہ کر رہا تھا۔ جب کھلے گیٹ سے ایک بایک زن سے ہمارے پاس سے گزر کر بیویوں میں جا کر رک گئی۔ میری سرسری طور پر اٹھی ہوئی نگاہ تمام حسیات سمیٹ لائیں۔ عون کے سب سے چھوٹے بھائی کے ساتھ نیلے خوبصورت پرنٹ کے شفیون کے سوٹ میں وہ وہی تھی۔ اپنی تمام تر جاذبیت اور دلکشی کے نکھار کے ساتھ۔ مگر اس کا چہرہ کچھ ستا ہوا محسوس ہوا۔ موسیٰ اسے

سہارا دے کر اپنے پیپا کے پاس۔ ”تیری طبیعت ہے بیٹا رعنابینی کی؟“
 ”وہ ٹھیک نہیں ہے پیپا! اس سڑنے اس کے حوالے سے کوئی امید نہیں والی۔ وہ بچ سکے گی پیپا!“
 وہ ان کے ساتھ لگ کر سسکی اور بھرا بٹ زدہ آواز میں بولی تھی۔ اس کی ریشمی پلکیں شفاف آنسوؤں
 سے جچی ہوئی تھیں۔ میں یک تک ماحول سے کٹ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اور جانے کب تک یوں ہی تکتا کہ عون کی
 کھنکار پر قدرے سنبھل گیا۔

”رعنا بیتی کی فرینڈ ہے۔ بلڈ کینسر ہے اے!“

وہ مجھے تاسف بھرے انداز میں بتا رہا تھا۔ میں اس بات کے جواب میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ
 گیا۔ وہ اپنے پیپا کے سہارے اندرونی حصے کی جانب چلی گئی۔ مجھ پر ایک نگاہ تک ڈالے بنا۔ مگر اس سے کیا فرق
 پڑتا تھا۔ اس کی تقدیر میں سیاہی میری وجہ سے ہی پتر نے والی تھی۔ وہ وقت دور نہیں تھا۔ جب ساری دنیا سے
 نافل ہو کر اسے صرف میں یاد رہ جاتا۔



طیب بن کے جو آ گئے ہو، میں نیم جاں تھا تو تم کہاں تھے
 تمہاری اُلفت کی بے حسی پر، میں نوحہ خوا تھاں تو تم کہاں تھے
 ہر ایک گل تھا خزاں رسیدہ، کہ آگ ہر سو لگی ہوئی تھی
 بہار آئی تو آ گئے ہو، یہاں دھواں تھا تو تم کہاں تھے
 اندھیرا جب تک طویل راہوں کا حکمراں تھا تو تم کہاں تھے
 شعورِ گفتار آ گیا ہے نہ میرے لہجے میں زہر گھو لو
 مجھے اب اپنی زباں ملی ہے میں بے زباں تھا تو تم کہاں تھے
 پچھلے کچھ دنوں سے میری طبیعت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ آفس بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایک عجب بے زاری
 طبیعت کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ عون مرتضیٰ کا التفات ایک طرف مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل رہی تھی۔
 خاک سمجھ نہیں آتی تھی کیا کروں۔ عون کی توجہ اور التفات کے لیے تو میں یہ پاڑ نہیں بیل رہا تھا۔ مجھے اس کا اچار
 نہیں ڈالنا تھا۔ غصہ، جھنجھلاہٹ میرے اعصاب کو ناکارہ کر رہا تھا جیسے مادہ مزید اسی ناکامی اور جدوجہد میں بے کار
 ہو چکے تھے۔ میرا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔ انتقام کی آگ مجھے جلا کر خاکستر کر رہی تھی۔ میں تو جل ہی رہا تھا
 اتنے سالوں سے اب اس آگ میں عون مرتضیٰ کے جلنے کی باری تھی۔ مگر کیسے کیسے؟

اسی جھنجھلاہٹ میں میں سگریٹ پھونک رہا تھا جب میرے سیل پر ولید کی کال آنے لگی۔ ایک تو یہ
 بندہ ہر وقت جان کو آیارہتا تھا۔ یہ عون کا کزن تھا اور عون سے متعلق ہر شے سے مجھے نفرت تھی شدید نفرت، میں
 نے کال ڈسکنکٹ کر دی اور فون سائلیٹ پر لگا دیا۔ اب مجھے سنجیدگی سے اس امر پر غور کرنا تھا کہ میں اس
 ولید کے بچے کے شیراز اپنی فیکٹری سے نکال دوں۔ سیل فون کی اسکرین روشن ہوئی اور ون میسج ریسیو کا سگنل آنے

لگا۔ میں نے بے خیالی میں مسج چیک کیا تھا۔

جگر تو مجھے پسند نہیں کرتا مجھے پتا ہے۔ مگر میں اس وقت بہت اہم اطلاع دینے والا تھا تمہیں عون آیا تھا تجھ سے ملنے۔ میں نے تیری بیماری کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ پریشان نظر آنے لگا۔ مجھے لگ رہا ہے وہ اب گھر آئے گا۔ ذرا دھیان سے ہاں۔“

ولید کا مسج تھا۔ میں پڑھ کر بُرا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ جیسا میرا موڈ تھا ہر گز بھی عون کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ معاً میں چونک گیا۔ سامنے ٹیبل پر وہی ڈائری پڑی ہوئی تھی جسے میں نے کبھی اپنی پلاننگ کا حصہ بنانے کی خاطر بڑے جتنوں سے لکھا تھا۔ عون آرہا تھا اور اس کے خیال میں مجھے اس کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ کسی خیال نے میرے اندر جیسے پارہ بھر دیا۔ میں سرعت سے اٹھا اور الماری سے ڈھونڈ کر حجاب کی وہ تصویر نکال لی جو میں عون کے گھر سے اڑا لایا تھا۔ کیسے یہ ایک الگ داستان تھی۔ میں نے عجلت میں تصویر پر چند پھڑکتے اور کسی حد تک قابل اعتراض اشعار لکھے اور اسے ڈائری کے اندر رکھ دیا۔ پھر قلم اٹھایا اور آج کی تاریخ لکھ کر پروین شاہ کے جذبات کو اپنے منہ زور جذبوں کی ترجمانی دے دی۔

کوئی رات میرے آنگن میں مجھے یوں بھی تو نصیب ہو
نہ خیال ہو لباس کا وہ اتنا میرے قریب ہو
اپنے بدن کی گرم آنچ سے میرے بدن کو آگ دے
میرا جوش بھی بہک اٹھے میرا حال بھی عجیب ہو
تیرے چاشنی وجود کا میں سارا رس نچوڑ لوں
پھر تو ہی میرا مرض ہو پھر تو ہی میرا طبیب ہو

اس کے بعد میں نے حجاب کے حسن جہاں سوز کو خاصے بے باک انداز میں خراج عقیدت اور خراج تحسین پیش کیا تھا۔ میرا مقصد محض تب عون مرتضیٰ کو آگ لگانا تھا۔ اور مجھے یقین تھا اسے آگ لگ جانی تھی۔ میں تب اتنا جذباتی اور پاگل ہو رہا تھا کہ اس کے بعد عون کا رسپانس اور بعد کا انجام میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ ڈائری میں نے تکیے پر اس انداز میں رکھی جیسے لکھتے لکھتے اچانک اٹھا ہوں اور خود بے تابی سے ٹہلتے ہوئے عون کا انتظار کرنے لگا۔ محض چند منٹ بھی جان لیوا ثابت ہوئے تھے اس کے بعد گیٹ پر عون کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے ذرا سا پردہ سرکایا۔ عون کی سفید مارگلہ گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے سکون سے دیکھا تھا۔ گاڑی ڈرائیوے پر پھیلی گول ستونوں والے پورٹیکو کے نیچے جارکی۔ وہ باہر نکلا تھا اور چوکیدار سے کچھ بات کی تھی۔ پھر قدم بڑھاتا اندرونی حصے کی جانب آنے لگا۔ مجھے پتا تھا وہ سیدھا میرے روم میں آئے گا۔ وہ اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ آچکا تھا اور میں نے اسے کبھی ہاؤس کی طرح درجنگ روم میں نہیں بٹھایا تھا اسے گھرانے سے بھی پہلے میں اپنا پورا منصوبہ پلان کر چکا تھا جس پر آج عمل ہونے جا رہا تھا۔ میں زہر خند سے مسکرایا اور پلٹ کر واش روم میں گھس گیا۔ شاور کھولا اور اطمینان سے باتھ لینے

لگا۔ عون کے کمرے میں آجانے کے بعد سب کچھ یقیناً میرے حسب منشا ہونا تھا۔ سارا نہ سہی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ تک شاور لینے کے بعد میں باتھ گاؤن پہن کر باہر آیا تو عون مرتضیٰ کمرے میں نظر نہیں آیا تھا میں تیزی سے آگے لپکا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ڈائری دیکھ چکا تھا۔ وہ تصویر بھی یقیناً اس کی نگاہ سے بچ نہیں پائی ہوگی۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ ڈائری سے حجاب کی تصویر غائب تھی اور وہ صفحات بھی جن پر میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھ چکا تھا۔ عون مرتضیٰ انہیں اکھاڑ کر پرزہ پرزہ کر کے وہیں کارپٹ پر پھینک گیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے انٹرکام پر وائچ مین سے کانٹیکٹ کیا۔

”ابھی کوئی آیا تھا یہاں؟“

”جی سر! عون صاحب تھے۔ آپ سے ملنے آئے تھے۔ مگر کچھ دیر بعد ہی چلے گئے۔“

”کیوں؟ میں باتھ لے رہا تھا وہ مجھ سے ملا کیوں نہیں؟“

میں نے کسی قدر مکاری سے کہا تھا۔ جواباً وائچ مین ذرا آواز دبا کر بولا تھا۔

”پتا نہیں سر! عون صاحب بہت غصے میں لگتے تھے۔ میں نے جلدی لوٹنے کی وجہ پوچھی تو جواب

نہیں دیا۔ حالانکہ جب آئے اس وقت موڈ ایسا تو نہیں تھا۔“

اوکے۔ میں نے نخوت سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے عون کے رسپانس کو جاننے کی بے چینی لگ گئی

تھی۔ مگر یہ فوری ممکن نہیں تھا مجھے صبر سے انتظار کرنا تھا کہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ جی میں نے خاموشی

منتھار کیے رکھی۔ مزید ایک ماہ اسی طرح گزرا تھا۔ اس دوران عون کا کوئی فون یا کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

میں اس صورتحال سے اکتا گیا تھا۔ جی کچھ اور دلچسپیاں ڈھونڈنے لگا۔ اس روز بہت دنوں بعد میں مین ٹین ہو کر

انٹ کلب چلا گیا تھا۔ وہاں ایک عرصے بعد میری علینہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ علینہ سے کبھی میری بہت زیادہ دوستی

ہو چکی تھی۔ وہ امیر گھرانے کی پابندیوں سے مبرا بے باک آزاد لڑکی تھی۔ وہ مجھے بہت پسند کرتی تھی۔ بہت سا وقت

م نے نیویارک میں بھی ایک ساتھ گزارا تھا۔ اب یہاں مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے چنگھاڑتی ہوئی آکر مجھ سے لپٹی تھی۔

”ابو داؤد کہاں تھے تم؟ ہاں“

اس نے اپنے ہاتھ کا مکہ میرے سینے پر ناز سے مارتے ہوئے مجھے مصنوعی غصے سے گھورا میں مسکرا دیا۔

”اور بھی غم ہیں دنیا میں رومانس کے سوا۔“

”یعنی.....؟“ وہ مجھے گھورنے لگی

”مثلاً غم روزگار۔“

”شادی کر لی تم نے؟“

وہ ایک کانٹیش ہو کر بولی تو میں نے کاندھے اچکا دیئے۔

”ساری زندگی ایسے ہی گزارو گے۔ چلو مجھ سے کر لو نا۔ ریلی تمہاری خاطر پابند بھی ہو جاؤں گی۔“

تمہارے بچوں کی بھی ماں بنوں گی۔“

اس نے میرے گلے میں بازو جھانک کر دیئے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھا

”تم جیسی عورتیں نہ گھر سنبھالتی ہیں نہ ما میں بنتی ہیں۔ اگر بن بھی جائیں تو نہ پرورش کر سکتی ہیں نہ ماں ہونے کا حق ادا کر پاتی ہیں۔“

میں پتا نہیں کیوں اتنا زہر خند ہو رہا تھا۔ علینہ کے ماتھے پر ایک شکن نمودار ہوئی تھی۔

”وہ کیسی عورتیں ہوتی ہیں؟“

وہ کسی قدر سرد پن سے بولی تھی۔ میں نے ہنکارا بھرا۔

”ملا دوں گا کبھی موقع ملا تو۔“

”ایسی عورت سے ہی شادی کرو گے؟“ وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آف کورس!“

”تو کیا پاک دامن معصوم عورتوں کا کال پڑ گیا ہے پاکستان میں۔“

وہ گہرے کاٹ دار لہجے میں کہہ کر طنزیہ ہنسی تو میں نے گہرا کش لے کر بہت سارا دھواں اسی کے منہ

پر چھوڑ دیا۔

”کال تو نہیں پڑا مگر ایسی عورتیں اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آیا کرتیں۔ باقاعدہ جتن کرنے پڑتے ہیں۔“

میرے تصور کے پردے پر آپوں آپ ہی حجاب کا نازک بے نیاز اور گھبرایا ہوا سراپا لہرانے لگا۔

کتنے روپ تھے اس کے اور ہر روپ دوسرے سے زیادہ اثر یکتا اور دلکش۔ وہ واقعی بہت خاص تھی۔ مگر یہ اس کی بد نصیبی تھی کہ وہ عون مرتضیٰ کی بہن تھی۔

”ہاں صحیح کہتے ہو تم جیسے گھاگ اور خبیث مردوں کو ایسی عورت کے لیے تگ و دو کرنی ہی پڑتی ہے

مگر یہ کتنے تاسف اور حیرانی کی بات ہے ناکہ تم جیسے جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں وہ بھی بیوی پاک باز اور ان

چھوٹی چاہتے ہیں ہاؤ فنی۔“

اس بات کے جواب میں میں نے اسے باقاعدہ گھور کر دیکھا تھا۔

”تم مجھے بد کردار کہہ سکتی ہو مگر فاحش نہیں سمجھیں؟“ اکتیس سال کا ہو گیا ہوں مگر آج تک کسی عورت

سے تعلق استوار نہیں کیا۔ تم گواہ ہو نیویارک میں تم نے مجھے کتنا بہکانے کی کوشش کی مگر ایک حد سے آگے بڑھنا مجھے

گوارا نہیں تھا۔“ میں نے جیسے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی آئینہ دکھایا تھا۔ وہ کچھ کھسیا کر رہ گئی۔

”چھوڑو یہ موضوع بہت تلخ ہے۔ اگر اس پر مزید بات ہوئی تو ہمارا جھگڑا یقینی ہے۔“

وہ دانستہ کترا گئی۔ میں نے بھی بحث مناسب نہیں سمجھی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ڈانس کی خواہش

ظاہر کی تھی۔

”چلو آج ایک بُری عورت کے ساتھ ہی تھوڑی دیر کو وقت پھر رنگین کر لو۔“

”میں اس کی خاص خواہش محسوس نہیں کرتا۔“

میرا لہجہ پھر خشک ہونے لگا۔ وہ پھر کھسیائی۔

”چلو ایسے نہ سہی تم ایک غلط عورت کو اس کی لمحاتی خوشی ہی دے دو۔ پونو میں تم سے محبت کرتی

ہوں۔ اور یہ سچ ہے۔“

اس نے بات کے دوران اپنا سر میرے بازو سے ٹکا دیا۔

”ہاں یہ کسی حد تک قابل غور بات ہے۔“

میں اب کے ذرا سا ہنسا تھا۔ پھر ہم دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈانسنگ فلور پر آگئے کچھ دیر

اس کے ساتھ ڈانس کرنے کے بعد میں واپس اپنی ٹیبل پر آگیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے بے حد اکتاہٹ محسوس

ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنے لیے شمپین کے آرڈر کی اور وہیں بیٹھے بیٹھے ڈرنک کرنے لگا۔

”ہائے داؤد ہاؤ آریو؟“

میں نے نظر اٹھائی میرے سامنے زوما کھڑی تھی۔ یہ بھی میری اچھی دوست تھی۔

”فائن! بیٹھو۔“

میں نے کرسی کی جانب اشارہ کیا تو وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے کچھ حیرانی سے اس کی صورت دیکھی۔

اس ٹیبل کے ساتھ ایک ہی چیئر ہے داؤد اس پر تم براجمان ہو اب میں کیا تمہاری گود میں بیٹھوں؟ وہ

اٹھلا کر بولی تھی میں نے جواباً قہقہہ لگایا۔

”بیٹھ جاؤ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں اعتراض تمہارے اس گاؤ دی شوہر کو ہوگا۔ ڈائی ورس نہ کر

دے تمہیں۔“

”اونہہ! وہ کیا ڈائی ورس کرے گا۔ میں نے خود چھوڑ دیا اسے۔“

اس نے تنفر سے جواب دیا تو میں نے اسے سراہا تھا۔

”گڈ بہت اچھا کیا وہ تھا ہی کھڑوس“

”تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟ شادی کی؟ کتنے بچے ہیں؟“

”اف اتنے سوال ایک سانس میں؟“ میں گھبرایا وہ پھر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی بہت خوبصورت تھی۔

ہے اونچے پہاڑ سے جھرنا بہتا ہو۔

”شادی نہیں کی۔ تمہیں پتا ہے ہم جیسوں کو شادیاں راس نہیں آتیں شاید اس لیے۔“

”مگر سب کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا نا ابوداؤد!“

وہ متفق نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کاندھے اچکائے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں جا رہے ہو؟ بیٹھو نا ابھی باتیں کرتے ہیں۔“ وہ بے چین سی ہوئی۔

”نہیں بس چلوں گا۔ مجھے نیند آرہی ہے کچھ تھک بھی گیا ہوں۔“

”او کے یہ کارڈ رکھ لو۔ پرسوں میرا برتھ ڈے ہے۔ ضرور آنا او کے۔ ورنہ خفا ہو جاؤں گی۔“

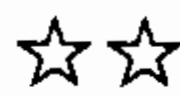
اپنے شولڈر بیگ سے اس نے بلڈ ریڈ کلر کا ایک خوبصورت کارڈ نکال کر بڑھایا جس پر سنہرے حروف جگمگا رہے تھے۔ بہت خوبصورت کارڈ تھا میں کھول کر دیکھنے لگا۔

”آؤ گے نا؟“ وہ یقین چاہ رہی تھی۔

”کوشش کروں گا۔“ میں نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

”نہیں لازمی آنا مجھے بہت اچھا لگے گا۔ ویسے میں کال کر کے تمہیں یاد بھی کرا دوں گی۔ اپنا سیل نمبر دونا۔“

میں نے اسے سیل نمبر لکھوایا تھا اور وہاں سے نکل گیا۔ مجھے لگا تھا۔ میری خود کو اس طرح بہلانے کی یہ کوشش بڑی طرح ناکام ہوئی ہے۔ دل و دماغ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ عون مرتضیٰ سے انتقام کی دھن۔



تمہیں تقسیم کر دے گا یہ ہر اک دل میں گھر کرنا

تم اب کی بار یوں کر لو کہ بس میرے ہی ہو جاؤ

علینہ کا میسج تھا میں نے بغیر کسی تاثر کے پڑھا اور ضائع کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس کی کال آنے لگی۔ میں اس وقت راستے میں تھا اور گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ لہذا نظر انداز کر دیا۔ اگر ایسی بات نہ بھی ہوتی تب بھی میں اسے اتنی اہمیت دینے کو پھر بھی تیار نہیں تھا۔ میں اپنے من پسند ریستورنٹ سے لنچ کرنے آیا تھا۔ گاڑی ریستورنٹ کی پارکنگ میں روک کر میں باہر نکل رہا تھا جب میرے سیل پر میسج ٹون بجی میں نے میسج کھول کر دیکھا۔

وہ تجھ کو بھولے ہیں تو تجھ پر بھی لازم ہے

خاک ڈال آگ لگا، نام نہ لے، یاد نہ کر

ایک بار پھر علینہ کا ہی میسج تھا۔ اس بار تو گویا اس نے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ میں بے ساختہ ہنس دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے سنجیدہ ہونا پڑا تھا۔ عین اس پل عون مرتضیٰ اور فیضان مجھے اسی سمت آتے نظر آئے۔ میں دانستہ وہاں رک کر انہیں تنکے لگا۔ ایش گرے کھدر کے بہترین شلوار سوٹ میں عون مرتضیٰ بہت ڈیسنٹ اور اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ مگر اگلے لمحے یوں نظر انداز کیا جیسے سرے سے جانتا نہ ہو۔ اس کی یہ حرکت میرا خون کھولا کے رکھ گئی۔

”عون مرتضیٰ بہت چھوٹا ظرف ہے تمہارا۔ بھول گئے کیا کیا تھا تم نے میرے ساتھ۔ بدلاتو دینا پڑے گا تمہیں۔“ میں دل ہی دل میں تلملاتا آگے بڑھ کر ان کے راستے میں آ گیا۔ میری اس دانستہ حرکت نے اس کے چہرے کے زاویے بگڑے تھے۔ مگر اس حرکت کا جوائڈ وائیج میں لینا چاہ رہا تھا وہ مل چکا تھا۔ فیضان مجھے دیکھتے ہی خوشگواریت سے مسکرایا تھا۔

”ارے داؤد صاحب! کیسے ہیں آپ؟“

مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے خوشدلی سے کہا تو میں جواباً بے حد جوش سے بولا تھا۔

”خیریت سے ہوں جناب! آپ سنائیں؟“

کن اکھیوں سے عون کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے میں دل ہی دل میں ہنسا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھیچے ہوئے تھے وہ جیسے خود پر ضبط کر رہا تھا۔

”آپ بھی یقیناً لنچ کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں جوائن کریں نا۔“

عون مرتضیٰ کے گھر میں جب جاتا تھا۔ عون کے بھائی ہمیشہ مجھے خصوصی پروٹوکول دیا کرتے تھے۔ اب بھی وہ ہمارے اختلاف سے بے خبر مجھے خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ میں نے پھر ترچھی نگاہوں سے عون کو دیکھا وہ سخت جزبز ہو رہا تھا۔

”اوہ شیور۔ مائی پلزر۔“

اندھا کیا چاہے دو آنکھوں کے مصداق میں اسی وقت مان گیا۔ عون کا چہرہ کچھ اور بھی سپاٹ ہو گیا۔ اس تبدیلی کو دیر سے سہی مگر اس کے بھائی نے بھی محسوس کیا تھا۔

”بھیا کیا بات ہے۔ آپ بہت خاموش ہیں؟“

نو..... اس اوکے۔ وہ کس قدر روڈ لہجے میں بولا۔ ہم اکٹھے ٹیبل تک آئے۔ فیضان نے مجھ سے پوچھ کر لنچ کا آرڈر کیا۔

”عون سے بھی پوچھو نا ان کی پسند؟“

میں اسے بولنے پر اکسانا چاہ رہا تھا۔ مگر فیضان گاؤدی نے بات بننے نہیں دی۔

”مجھے ان کی چوائس کا پتا ہے۔“

وہ آرڈر کر چکا تھا۔ چکن روسٹ، نان، رائے اور پیسی۔ آرڈر سرو ہونے تک فیضان سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر میرا دھیان عون کی طرف لگا تھا۔ میں گا ہے بگا ہے اس پر پُرسوج نگاہ ڈال لیتا تھا۔ وہ بہت الجھا ہوا نظر آتا تھا کسی حد تک آپ سیٹ۔ کھانا بھی برائے نام ہی کھایا۔ میں اندر ہی اندر حیران بھی تھا کہ ایسی کیا مجبوری اس کے ساتھ لگی تھی آخر کہ وہ میرے ساتھ یہ مروت برت رہا تھا۔ کھانے کے بعد فیضان کسی کام سے اٹھ کر گیا تو ٹیبل پر ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ میں تو جیسے ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اسے دیکھا تو وہ والٹ نکالے کچھ نوٹ گن کر پلیٹ میں رکھنے کے بعد اٹھنے کی تیاری میں تھا۔

”عون پلیز!“

میں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بے خیال سا تھا کچھ چونک کر متوجہ ہوا مگر میرے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔

”دس ازناٹ فیئر۔“

نگاہیں چراتے ہوئے میں نے اپنی آواز میں مقدور بھر شرمندگی کا تاثر بھرنے کی کوشش کی تھی مگر

آسانی سے پھنس جائے گا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔

☆☆

میں نے اسی دن گاؤں حویلی میں اماں سے کانٹیکٹ کیا تھا اور انہیں پہلی فرصت میں اپنے گھر آنے کا آرڈر کر دیا۔ دوسرا فون میں نے داور بھائی اور بھابی کو کیا تھا۔ اب میں مزید دیر نہیں چاہتا تھا۔ اس ایمر جنسی بلاوے کی وجہ میں نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ اس شام زوما میرے کچھ اس انداز میں پیچھے پڑی کہ مجھے اس کی برتھ اے میں شرکت کرنا پڑی۔ میں جب گیا تو بے دلی کا احساس میرے ساتھ تھا مجھے تب ہرگز اندازہ نہیں تھا حجاب سے میری اگلی ملاقات وہاں ہو جائے گی۔ دوران تقریب ویسا ہی ہلاکھ اور ہنگامہ پارٹی کا حصہ بنا رہا تھا۔ زوما اور ملیہ کے علاوہ بھی مجھے وہاں کئی پرانے دوست مل گئے تھے۔ جیسی وقت اچھا گزر گیا۔ جس پل میں واپس آ رہا تھا۔ زومانے زبردستی روک لیا یہ کہہ کر کہ میں اس کے کمرے میں جا کے بیٹھوں اسے مجھ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔

”کیا بات؟؟“

”بتاتی ہوں نا.....“ وہ سنجیدہ تھی مجھے بادل ناخواستہ اس کی بات ماننا پڑی کہ وہ تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کی متمنی تھی۔ میں اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ ویل آف فیمیلی سے تعلق رکھتی تھی یہ اس کا میکہ تھا۔ کمرے کے آئینے کے انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ میں کچھ دیر میں اکتا گیا۔ بھلا میں وہاں بیٹھ کر کیا کر سکتا تھا جیسی اٹھ کر ٹیرس پر نکل آیا۔ ٹیرس پر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ہلکی نم آلود مگر خوشگوار ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لیتے ہوئے ریلنگ کے پاس آ گیا۔ یہاں سے لان کا ایک حصہ نمایاں تھا۔ سوئمنگ پول کے کنارے کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ تنہا اور کسی قدر اداس۔ ذرا سا غور کرنے پر وہ کسی لڑکی کا سایہ محسوس ہوا تھا۔ رات کا پہرہ تھا اور چوہودیس کی شب تھی۔ پورا چاند آسمان کے عین وسط میں چمک رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کا حسن ایسے میں کچھ اور نکھر گیا تھا۔ لائے بال پشت پر بکھرائے اس مدھم روشنی میں وہ حسین اور مادرائی تاثر پیش کر رہی تھی۔ چاند کی روشنی کا عکس اس کے بے انتہا جلے چہرے پر پھیلا تھا۔ سوئمنگ پول کا پانی ہولے ہولے ہل رہا تھا اور اس ہلتے ہوئے پانی کی سطح پر اس لڑکی کا عکس بھی لرز رہا تھا۔ ایک پل کے لیے مجھے لگا گویا چاند کے ساتھ اس کے چہرے کا بھی روپ تالاب کے پانی میں چھلک آیا ہے۔ پانی کی بے ترتیب سطح روشنی اور نور سے بوجھل تھی۔ یہ ایک طلسمی سماں تھا۔ جیسے سارے پانی میں سونا بکھر گیا ہو۔ اس لڑکی کے حسین چہرے کا سونا۔

”کیا بہت خوبصورت ہے جو اتنا محو ہو گئے؟“

زوما کی آواز میں نے بہت قریب سے سنی تو ایک دم سنبھلا پھر مسکرایا۔ وہ جانے کب آگئی تھی مجھے خبر نہیں ہو سکی تھی۔

”بلاشبہ بہت فیسے نیلک ہے محترمہ! ہے کون؟“

میری بھانجی کی فرینڈ ہے شاید حجاب نام ہے۔ اپنے بھائی کا ویٹ کر رہی ہے لان میں رک کر، ویسے بھی کچھ شرمیلی قسم کی ہے پوری تقریب میں کمٹی سٹائی رہی۔ یار بہت چھوٹی ہوگی تم سے۔ کیا کرو گے انوشی

گیشن لے کر۔؟“

سنجیدگی سے بات کرتی وہ آخر میں کچھ شریر ہو گئی تھی۔ جبکہ میں اس کے بتائے نام میں الجھ گیا تھا۔
”حجاب!!!“

میں نے رک کر اور پلٹ کر ایک بار پھر وہاں دیکھا۔ اب اس کے پاس کوئی دوسری لڑکی بھی آ کھڑی ہوئی تھی دونوں باہم بات کرتی رہیں پھر اس لڑکی نے حجاب کو خود لپٹا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا تھا وہ گیٹ کی جانب پلٹی تو میں اسے پوری طرح دیکھ سکا تھا۔ اس پل ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کے لائے بے انتہا نرم سلکی بال پیچھے کی جانب اڑنے لگے۔ وہ اتنی پیازی اتنی دلربا لگی کہ ایک پل کو مجھے اپنا دل تھمتا ہوا محسوس ہوا۔
”جانتے ہو اسے؟“

میری بے تاب لپکتی ہوئی نظروں نے گیٹ تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ زوما کے سوال پر میں معنی خیزی سے مسکرانے لگا۔

”عنقریب یہ تمہاری بھابی بن جائے گی۔“

”واٹ؟“ مگر میرے بھائی کی آل ریڈی شادی ہو چکی ہے۔“ اس نے منہ پھلا کر مجھے اطلاع دی۔

”یہ تمہارا بھائی جو تمہارے سامنے کھڑا ہے اس کی بیوی بنے گی یہ۔“

میں بد دستور ذومعنی انداز میں مسکرا رہا تھا۔ وہ زور سے بدکی۔

”یہ کیسا مذاق ہے ابو داؤد؟ میں کہہ چکی ہوں نا لڑکی میری بھانجی کی دوست ہے۔ یعنی ہم سے

خاصی چھوٹی۔“

”میں بھی بڑھا نہیں ہو گیا ہوں۔ ابھی تیس سال کا ہوں یار۔“

میں ہنسنے لگا۔ وہ مجھے عجیب و غریب انداز میں گھورتی رہی۔

”تم سیر لیس ہو؟“

”آف کورس؟ یہ لڑکی میرے دوست کی چھوٹی بہن ہے۔ میں آج کل میں اپنا پروپوزل بھیج رہا

ہوں“ میں نے کسی قدر سنجیدگی سے بتایا تو اس نے ٹھنڈا سانس بھر لیا تھا۔

”او کے خیر! مبارک ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے اریبہ نے مجھ سے انٹروڈیوس کرایا تھا میں نے سرسری سا

دیکھا اگر پتا ہوتا تو اچھی طرح ملتی۔“

”اٹس او کے یار۔ اچھی طرح ملنے کو میں ہوں نا۔“

میں نے خبیث انداز میں ایک آنکھ دبا کر کہا تو جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔

”مجھے پتا ہے گنوں کے پورے ہوتے۔ خیر چھوڑو آؤ میں کچھ ڈسکس کرنا چاہ رہی ہوں تم سے“ اس

نے موضوع بدل دیا تو میں بھی کاندھے جھٹک کر اس کے ہمراہ ہولیا تھا۔

میں آفس سے گھر لوٹا تو عام روٹین سے ہٹ کر گھر میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ اماں آپاؤں کے ساتھ تشریف لا چکی تھیں۔ بھابھی اور بھائی بھی پہنچ چکے تھے۔ میں نے بس بھابھی اور بھائی سے ہی سیدھے منہ بات کی۔ اماں اور آپائیں تو بس مجبوری میں بلوائیں تھیں۔ مگر اماں کا ساری بہنوں کو اکٹھا کر لانا مجھے ناگوار خاطر ہوا تھا۔ اور میں نے یہ بات بلا دروغ اماں سے کہہ بھی دی تھی۔ ”یہ آپ اپنی پلٹوں کیوں اٹھالائیں؟ ابھی پروپوزل لے کر جانا تھا بارات روانہ نہیں ہو رہی تھی۔“ میرے یوں منہ پھاڑ کر کہہ دینے پر اماں اچھی خاصی کھسیا گئیں۔

”تم نے خود ہی کہا تھا۔“

”میں نے کسی ایک آدھ کو لانے کو کہا تھا نا کہ ساری فوج کو، اپنی وے اب ان کے گھر سب کو جانے کی ضرورت نہیں بھابھی بھائی کے ساتھ آپ اور کسی ایک اپنی بیٹی کو لے جائیے گا۔ وہ ڈینٹ لوگ ہیں مناسب نہیں لگتا۔“

میں نے اسی ناگواری سے اگلا آرڈر جاری کیا تھا۔

”ابھی سے یہ حال ہے۔ بعد میں پتا نہیں کیا کر ڈالیں موصوف! ہم جاہل ہو گئے وہ ڈینٹ ہیں اونہہ!“ سارہ آپا بددائیں۔ میں نے گھور کر انہیں دیکھا۔ البتہ کچھ کہا نہیں وہ میری ان پر تپش نگاہوں سے ہی دباک سی گئی تھیں۔ رات کو کھانے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں جانے لگا تو بھابھی نے مجھے روک لیا تھا۔ ان کا ارادہ مجھ سے باتیں کرنے کا تھا۔ مجھے رکنپڑا بہر حال میں ان کا بہت لحاظ کرتا تھا۔

”اچھا تو تم اب شادی کرنا چاہتے ہو۔ گڈ! اس کا مطلب آہی گئی تمہیں کوئی لڑکی بھی پسند“

”جی آگئی۔“ میں آہستگی سے مسکرایا یہ الگ بات کہ میرے اندر تناؤ اترنے لگا تھا۔ کون جانتا تھا میں یہ شادی کتنی خوشی سے کر رہا تھا۔

”ہے کیسی؟ مجھے تو سنتے ہی اشتیاق ہو گیا اسے دیکھنے کا۔“

”آپ جارہی ہیں نا کل! خود دیکھ لیجیے گا۔“

میں نے اپنی رائے محفوظ رکھی تھی۔ وہ مجھے کسی قدر شوخ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”نہیں تم بتاؤ نا؟ کیسی ہے وہ؟“

”اگر آپ شکل و صورت کے حوالے سے پوچھ رہی ہیں تو بہت خوبصورت ہے۔“ میں سنجیدگی سے بولا تو وہ ہنس دیں۔

”وہ تو ظاہر ہے ہوگی ہی۔ تمہارے معیار پر پورا اترنا آسان تھوڑا تھا۔ کہاں دیکھا کیسے ملی؟ اس کے بارے میں اس طرح کا خیال کیسے آیا؟“

”میرا یونیورسٹی فیلو ہے اس کی بہن ہے۔ اور خیالات کا نہ پوچھیں بڑے نیک ہیں محترمہ کے متعلق۔“

میں نے پھر ڈھکی چھپی بات کی تو انہوں نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں نے عون مرتضیٰ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ میں اسے کل اماں وغیرہ کی آمد کے سلسلے میں بتانا چاہ رہا تھا۔ پہلی

سے دوسری ٹیل پر کال ریو ہو گئی۔ دوسری جانب سے کھلتی ہوئی نسوانی آواز میری سماعتوں میں اتری تھی۔
 ”ہیلو السلام علیکم! کیسی ہو؟“

میں کچھ گڑبڑا سا گیا اور ناگواری سے سیل فون کان سے ہٹا کر باقاعدہ گھورا۔

”زارہ بولتی کیوں نہیں ہو۔ اگر فون کر ہی لیا ہے کنجوس!“

وہ ہنس رہی تھی ایسی ہنسی جیسے دور کسی ویرانے میں موجود مندر میں اچانک گھنٹیاں بج اٹھیں میں
 خواجواہ کھنکارا۔ وہ یقیناً حجاب تھی۔

”محترمہ میں زارہ نہیں ابوداؤد ہوں۔ بالکل ویسے جیسے کیسی نہیں کیسا ہوں۔“

میرے شوخ لہجے میں شرارت اتر آئی تھی۔ وہ اگر غیر متوقع طور پر فون پر دستیاب ہو گئی تھی تو بات
 کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ مجھے لگا دوسری سمت وہ میری بات اور آواز سن کر گڑبڑا گئی ہو۔

”اوہ سوری جی! اچھو کلی میں آپ کو اپنی فرینڈ سمجھی۔“

”کوئی مضائقہ نہیں میں آپ کا فرینڈ ہی ہوں۔“ میں نے پھر اسی شوخی کا مظاہرہ کیا۔
 ”جی!!“ وہ شپٹائی تھی۔

”آپ شاید بھیا کے دوست ہیں یہ انہی کا سیل ہے نا۔ میں انہیں دے کر آتی ہوں۔“
 ”اررے رے رے پلیز بات سنیں۔“

اس سے پہلے کہ وہ سلسلہ منقطع کرتی میں نے بے ساختگی میں پکار لیا تھا۔
 ”جی!!“ اس نے جیسے مارے بندھے کہا تھا عجیب پھنسی سی آواز تھی۔

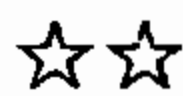
”تم حجاب ہونا؟“

”آپ کون ہیں؟“

”بتایا تو ہے ابوداؤد!“

”آپ بھیا سے بات کر لیں۔“

اس نے کسی قدر زور دے کر پن سے کہا اور کال منقطع کر دی۔ میں ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔ اس کا یہ ہرگز
 گریز میرے اندر ایسے آگ لگا گیا تھا۔ اس پر دسترس حاصل کرنے اور اسے کسی تنکے کی مانند توڑ مروڑ دینے کی
 جنونی خواہش نے مجھے جیسے پاگل کر دیا۔ میں نے طیش کے عالم میں سیل فون دور پھینک دیا تھا اور کھولتے ہوئے
 دل و دماغ کے ساتھ اٹھ کر بیئر کاشن پیک نکال کر اس کی سیل توڑ کر منہ سے لگا کر ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ اب یہی
 چیز مجھے ذرا غافل اور پرسکون کر سکتی تھی۔



اگلے دن اماں وغیر عون مرتضیٰ کے گھر چلے گئے۔ واپسی پر اماں اور آپا بے حد متاثر جبکہ بھابھی
 بہت خوش تھیں۔

”اُف داؤد تمہاری چوائس اتنی اعلیٰ ہے کہ میں تو حیران ہی ہو گئی جیسے! اتنی معصوم اتنی سادہ، اور پیاری لڑکی ہے کہ کیا بتاؤں۔ ابھی بچی سی لگتی ہے۔ تم تو بہت لمبے ہو۔ وہ بہ مشکل تمہارے کاندھوں تک آئے گی۔ گڑیا جیسی ہے بالکل!“

وہ اس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہی تھیں۔ میں بے تاثر چہرے کے ساتھ سنتا رہا۔

”پتا ہے جب مجھے تمہارے بھائی نے بتایا کہ داؤد کسی لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے اور شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ تو میں حیران ہوئی تھی۔ داؤد اور محبت؟ مجھے یقین نہیں آ سکا تھا۔ مگر داؤد اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے یقین کرنا پڑا۔ وہ اتنی انوسینٹ ہے اتنی چارمنگ ہے گویا محبت کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ بس اس کا بہت خیال رکھنا۔ وہ بہت حساس لگتی ہے۔“

میں نے پھر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ ان کی آخری بار کوئی الفور ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا تھا۔ بعد کے مراحل بہت تیزی سے طے ہوئے تھے۔ بھابھی کا خیال تھا اب ہمیں عون مرتضیٰ کے گھر والوں کو اپنے ہاں ڈنر پر بلانا چاہیے تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے عون مرتضیٰ کو یہ دعوت دے دی تھی۔ اگلے روز وہ لوگ رات کے کھانے پر ہمارے ساتھ تھے۔ وہیں میرے کیے کہنے پر اماں اور بھابھی نے منگنی کی ڈیٹ عون اور اس کی فیملی سے ڈسکس کر کے مقرر کر دی تھی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تھا۔ اماں عون کی ماما کو ہماری گاؤں کی اراضی کے قصے سنا کر متاثر کرنے کی فضول کوشش میں مصروف تھیں مجھے غصہ آنے لگا۔ جب وہ لوگ واپس جانے کو اٹھے تو بھائی کے ساتھ میں بھی مروٹا انہیں پورٹیکو تک چھوڑنے آیا تھا۔

”ابو داؤد تم چلو نا ہمارے ساتھ۔ کافی ساتھ پیتے ہیں۔“

جب میں نے مصافحے کو عون کی جانب ہاتھ بڑھایا اس نے اچانک یہ بات کر کے مجھے حیران کر دیا تھا۔

”اب؟ اس وقت؟“ میں نے تھیر آ میز انداز میں اسے دیکھا تو وہ جواباً ازلی اعتماد سے مسکرایا تھا۔

”کیوں کیا اس وقت تم کافی نہیں پیتے ہو؟“

اور میں خجل ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ کہے بغیر ان لوگوں کے ساتھ آ گیا۔ عون مرتضیٰ میرے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں وہ مجھے حجاب کے متعلق چیدہ چیدہ باتیں بتاتا رہا تھا۔ اس کا بچپن، اس کی تعلیم اور اس کے مستقبل کے حوالے سے بہت ساری نیک تمنائیں اس نے مجھ سے شیر کی تھیں۔

وہ مجھ سے جانے کیا سننا چاہتا تھا مگر میرے اندر زہر دوڑتا رہا تھا میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ابھی ہم صرف منگی کریں گے ابو داؤد۔ شادی دو سال بعد کم از کم! اچھوٹکی ابھی حجاب بہت امیچور ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ گھر سنبھالنے کی اہلیت ابھی رکھتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس نے مجھے دیکھا تھا میں گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”ایز یوش! ویسے یار لوگوں کا خیال ہے۔ شادی کے لیے میں پہلے ہی اوور اتج ہو رہا ہوں۔ دو سال مزید لیٹ کر کے بوڑھا نہ ہو جاؤں۔“

میں نے جبراً مسکرا کر کہا تھا۔ عون مرتضیٰ بھی جواباً مسکرا دیا تھا۔ ایسی ہی باتوں کے دوران گھر آ گیا تھا۔ میں عون کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آتے ٹھٹھک گیا تھا۔ شکن آلود گیلے کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی یقیناً حجاب ہی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سے پریشان وہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے کھڑی میری پوری توجہ اپنی جانب مبذول کروا گئی۔ عون کو میں نے نجل سا محسوس کیا۔ وہ لپک کر اس کے نزدیک گیا تھا اور شاید اسے ڈانٹنے لگا تھا۔ اس نے قدرے چونک کر مجھے لمحہ بھر کو دیکھا پھر پلٹ کر تیزی سے اندر چلی گئی۔

”آؤ داؤد پلیر!“

عون کی آوازیں مجھے ہوش کی دنیا میں کھینچ کر لائی تھیں۔ ہال کمرے میں ایک بار پھر اس سے سامنا ہو گیا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں نیوی بلیو قمیض شلوار میں اس کا شعاعیں بکھیرتا ہوا روپ نگاہ کو چندھائے دے رہا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں تھی میری جانب پلٹی تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لہرانے لگی تھی۔ فیضان میرے ساتھ ساتھ تھا۔ مگر اس کے باوجود مجھے جیسے اپنی کیفیت پر قابو نہیں رہا۔ میں نگاہوں میں اسے چیرتا پھاڑتا رہا تھا۔ اسے رو برو پا کے جانے کیوں مجھ پر ایک جنونی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ وہ یقیناً میری نظروں سے خائف ہوئی تھی۔ جیسی تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ فیضان اور عون کے ساتھ موسیٰ نے بھی مجھے بھرپور کمپنی دی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی چائے آگئی اچھا خاصا اہتمام تھا۔ مگر میں نے چائے کے علاوہ کچھ نہیں لیا۔ ان تینوں کے اصرار کے باوجود کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں جانے کو اٹھا تھا۔ میں عون مرتضیٰ کے سامنے زیادہ دیر تک اپنا ضبط نہیں آزما سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے خون میں ابال ہی ایسے اٹھا کرتے تھے۔ وہ تینوں پورٹیکو تک مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ مجھے عون مرتضیٰ کی خود کو یہاں لانے کی منطق قطعی سمجھ نہیں آ سکی تھی۔ دل ہی دل میں مجھے طیش آرہا تھا جب میں اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تب بالائی منزل کے ایک کمرے کی روشن کھڑکیوں کے پیچھے میں نے کسی کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ شاید وہ حجاب تھی۔ وہ مجھے شاید چھپ کر دیکھ رہی تھی میرے اندر تمسخرانہ ہنسی پھیل گئی۔ ساری لڑکیاں احمق ہوتی ہیں۔ بظاہر جتنی بھی مضبوط بنیں مگر درحقیقت بودی اور محبت کی خواہش مند، محبت تو میں بھی اس سے کرنے والا تھا مگر صرف اس کے جسم سے۔ کیا یاد کرے گی وہ۔ میں بہت سے خطرناک عزائم اور زہریلی سوچیں لیے وہاں سے لوٹا تھا۔

☆☆

اپنے لیے بس ایک محبت ہی بہت
ہم کوئی بھی غلطی ہو دوبارہ نہیں کرتے
جب تک وہ سلامت ہے عداوت کا مزا ہے
دشمن کو ہم جان سے مارا نہیں کرتے

میرے گھر والے سب یہی سمجھ رہے تھے۔ حجاب سے میں محبت جیسی خرافات میں مبتلا ہوں۔ جیسی وہ ہر کام ہر بات کو بے پناہ اہمیت دے رہے تھے۔ چونکہ منگنی کی تقریب اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی تھی اور بیچ میں دن بھی زیادہ نہیں تھے جیسی میں نے بھابھی اور اماں وغیرہ کو رک جانے اور تیاریاں وغیرہ کرنے کا کہہ دیا تھا۔ اماں بھابھی اور آپا

ذوق و شوق اور جوش سے شاپنگ میں لگن ہو گئی تھیں۔ وہ ہر روز آفس سے واپسی پر میرے سامنے جیولری کیڑوں اور پتا نہیں کیا الالہ کے ڈھیر جمع کر دیا کرتیں۔ میں کبھی سرسری نگاہ ڈال لیتا کبھی وہ بھی نہیں۔ اس روز بھی میں آفس سے تھکا ہارا لوٹا تو بھابھی نے ایک بہت شوخ اور جھلملاتا ہوا لباس میرے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ کیسا ہے داؤد؟“

”مجھے کیا پتا۔ آپ نے خریدا ہے تو اچھا سمجھ کے لیا ہوگا۔“

میں سیل فون پر مصروف تھا کچھ ناراضی سے بولا۔

”ارے تمہاری دلہن کے لیے خریدا ہے۔ تمہیں تو پسند ہونا چاہیے۔ دیکھو اسے اور ذرا تصور کر کے بتاؤ وہ اس ڈریس میں کیسی لگے گی؟“

بھابھی کے لہجے میں شوخی و شرارت تھی میں ان کے انداز پر کچھ جھپٹ سا گیا۔ جبکہ وہ ہنسنے لگی تھیں۔

”اب کیوں شرم آرہی ہے۔ ساری رات جیسے اس کے تصور میں نہیں بتاتے ہونا۔؟“ وہ پھر مجھے چھیڑ رہی تھیں میرے چہرے پر ایک دم کرخنگی چھا گئی۔

”اتنا فارغ نہیں ہوں کہ اس فضول کام میں نیندیں خراب کروں۔“

”اچھا اب ہم سے پردہ داری کی ضرورت نہیں۔ سچ بتاؤ نہیں سوچتے ہوا ہے؟“

بھابھی میرے لہجے پر غور کیے بنا پھر اسی انداز میں بولیں تو میں نے گہرا سانس بھر لیا تھا۔ اگر وہ میری سوچوں تک رسائی پا جاتیں تو حجاب کے حشر کا سوچ کر لرز جاتیں جس انداز میں میں اس کے متعلق سوچتا تھا۔ میرا ذہن زہر سے بھرنے لگا۔ میرے تاثرات ایسے لمحات میں اس قدر غصیلے ہو جاتے تھے کہ دیکھنے والا صاف محسوس کر سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ بھابھی اس حساس موضوع پر میرے اندر کی کیفیت کو پائیں اور الرٹ ہوں جی میں وہاں سے دانستہ ہٹ گیا تھا۔ اگلے دو تین دن خیریت سے گزرے تھے جب ایک روز بھابھی نے عجیب فرمائش کر دی۔

”باقی کی خریداری تو ہم نے کر لی ہے داؤد! تم ایسا کرنا انگی جمنٹ رنگ خود لے آنا۔ لانے کو تو ہم بھی لا سکتے تھے مگر میں چاہتی ہوں تم اپنی پسند سے خریدو۔ ویسے مجھے حیرانی ہے تم نے حجاب کی کسی چیز میں بھی اپنی پسند کو ترجیح نہیں دی۔ ورنہ لڑکوں کو تو بہت شوق ہوا کرتا ہے۔“

”منڈے نے کڑی پسند کر لی ہے کیا یہ کافی نہیں؟ سب سے اہم معاملہ تو اس نے خود پنپایا ہے۔“

داؤد بھائی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ میں نے بھنوں کو جنبش دے کر گویا ان کی تائید کی تھی۔

”اچھا لے آؤ گے نا انگوٹھی! مجھے تو بتا دو؟“

جب میں اپنے کمرے میں جانے کو اٹھا بھابھی پھر میری جان کو آئیں۔ ان کی یہ عادت بالکل اچھی نہیں تھی وہ کسی بات کے پیچھے پڑ جاتیں تو کرا کے دم لیا کرتی تھیں۔

”جی لے آؤں گا۔ ڈونٹ وری!“

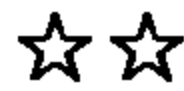
مجھے حامی بھرنا پڑی تھی۔ پھر یہ اس سے اگلے دن کی بات ہے شاید، جب میں اپنی شاپنگ کرتے

ہوئے خیال آنے پر جیواری کی شاپ کی جانب آگیا تھا۔ شکر تھا کہ مجھے اچانک یاد آگیا تھا ورنہ بھابھی کی سخت ست سننا پڑتیں اور جو وہ شک کرتیں وہ الگ کہ میں ویسا خوش نظر کیوں نہیں آتا جیسا پسند کی منگنی ہونے پر مجھے نظر آنا چاہیے وغیرہ۔ اپنے دھیان میں مگن میں شاپ کے اندر داخل ہوتے وہیں ٹھٹھک گیا تھا۔ وہ حجاب ہی تھی اپنی ماما کے ہمراہ کاؤنٹر کے پاس کھڑی ہوئی۔ ان کے سامنے شوکیس کے اوپر درجنوں جیواری باکس کھلے پڑے تھے۔ وہ یقیناً یہاں جیواری خریدنے آئی تھیں۔ میں وہیں رک کر اسے دیکھنے لگا۔ بوٹل گرین باریک شیفون کے سوٹ میں اس کی نفرتی چاندنی جیسی رنگت کچھ اور بھی کھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ معصوم چہرے پر لانی ریشمی پلکوں کا اٹھتا گرتا جال، وہ مبہوت کر دینے کی حد تک دلکش تھی۔ سحر طاری کر دینے کی حد تک دل آویز تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میں خود سے تو کیا اطراف سے بھی یکسر بیگانہ ہو گیا تھا۔ پھر اس کی ماما نے ایک باکس سے بندیا اٹھائی تھی اور اسے اس کی صبح پیشانی سے لگا کر دیکھا۔ وہ ایک دم جھینپ گئی تھی۔ اس پل اس کے چہرے پر رو پہلے سبنوں کے کتنے رنگ اترے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کتنی جھلملاہیں در آئی تھیں۔ میں بس اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اتنی انوکھی ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ مجھے ایک پل کو اپنا دل اپنے مضبوط سینے میں ڈالنا ہوتا محسوس ہوا۔

”کیا تھی یہ لڑکی اس قابل کہ اسے کسی اندھے انتقام کی بھیٹ جڑھا دیا جاتا۔؟“

محض ایک پل ایک لمحے کے لیے میرے دل میں یہ خیال آیا تھا مگر اگلے لمحے میں پھر ویسا تھا۔ جابر، سفاک اور بے حس!

ہاں وہ اسی قابل تھی کہ اس سے بدترین انتقام لیا جاتا۔ اس لیے کہ وہ ایک قابل نفرت انسان کی بہن تھی۔ میری پور پور زہریلی ہوتی جارہی تھی۔ میں انگوٹھی خریدے بغیر واپس آگیا تھا۔



انگلیجمنٹ کی تقریب عون مرتضیٰ کے گھر پر ہونا تھی۔ اور اس میں میری شرکت نہیں تھی جبکہ میں کسی قیمت پر یہ موقع گنونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جو لائحہ عمل ترتیب دیا تھا اس میں میرا بھی اس تقریب میں شریک ہونا لازمی تھا۔ یہی سوچ کر میں عون سے خود بات کرنے اس کے آفس پہنچ گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران نظر آیا مگر اظہار نہیں کیا۔ البتہ اس نے میرا استقبال بہت تپاک سے کیا تھا۔

”بیٹھو ابوداؤد!“

مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے وہ اثر کام پر چائے کا آرڈر کرنے لگا۔ میں نے اپنی افطاری کیفیت کو سگریٹ کے دھوئیں میں مدغم کرنا چاہا تھا۔ اور اس سے بات کرنے کو مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگا۔

”اینی پر اہلم ابوداؤد! تم مجھے کچھ الجھے ہوئے لگ رہے ہو۔“

میں چونکا تھا اور اسے دیکھتے ہوئے ایک اور گہرا کش لیا۔

”پہلے تو تم یہ آگ سے کھیلنا ترک کرونا۔ سخت کوفت ہوتی ہے تمہیں انجن کی طرح ہر وقت دھواں

اڑاتے دیکھ کر۔“

اس کے لہجے میں نئے استوار ہونے والے رشتے کا مان تھا۔ میرے اندر کا تنفر تمسخر میں ڈھلنے لگا۔ البتہ کسی تاثر کے بغیر میں نے سگریٹ الٹش ٹرے میں بجھا دیا تھا۔ اس دوران چائے آگئی تھی۔ اس نے بھاپ اڑاتا ملک میرے سامنے کیا۔

”چائے لو۔“

پھر مجھے بغور دیکھتے ہوئے رسائیت سے بولا تھا۔

”داؤد جو بھی بات ہے کہہ دو یا ر! تم ابھی تک غیریت برت کر مجھے فاصلوں کا احساس دلا کر اذیت دیتے ہو ریلی!“

اس کے اپنائیت آمیز لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ اور میں دانت جھینچ کر رہ گیا تھا۔

”ابھی کہاں اذیت! ابھی تو تم اذیت سہو گے، تڑپو گے مگر میں تمہیں پانی بھی نہیں دوں گا۔ دیکھنا تو سہی، میں نے حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی مگر جب بولا تو میرا لہجہ مارل تھا۔“

”تھنگ یا ر اماں اور آپا وغیرہ کی خواہش تھی کہ انگیجمنٹ کی تقریب میں میں بھی شریک ہوں۔ ایکچو کلی شادی میں تو ابھی دیر ہے نا۔ تو وہ لوگ بس اپنے ارمان نکالنا چاہتی ہیں کچھ رسموں وغیرہ کے ذریعے لیکن اگر تم مائینڈ نہ کرو۔“

میں نے بھرپور احتیاط کا دامن تھام کر کہا تھا۔ وہ جو نہایت سنجیدگی سے میری بات سن رہا تھا ایک دم سے ہنس پڑا۔

”بس اتنی چھوٹی سی بات! کم آن یا ر تم تو شرمانے میں لڑکیوں کو بھی مات دے گئے۔ ہمیں کیوں اعتراض ہوگا بھی! تم اماں سے کہہ دینا وہ لازمی اپنے تمام شوق پورے کریں۔ میں پپا سے بات کر لوں گا۔ آئی تھنک انہیں بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ کوئی اور بات؟؟“

اس نے ہلکے پھلکے اپنائیت آمیز انداز میں کہا تھا۔ میں متحیر رہ گیا۔ شاید مجھے اس کے اتنی سہولت سے مان جانے کی امید نہیں تھی۔ خیر میں نے سکھ کا سانس بھرا تھا۔ البتہ یہ مسئلہ ختم ہوا تو طیش، غصہ اور جھنجھلاہٹ میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی۔ مجھے اس کی شرمانے والی بات نے بھڑکا دیا تھا۔ ”گھٹیا آدمی! میں کوئی شرما تا ورمانا نہیں ہوں۔ اور دیکھنا ایک بار میرا مقصد حل ہو جانے دو پھر جو جرات اور بے باکی کے مظاہرے میں کروں گا انہیں تم سہارا نہیں پاؤ گے پناہ مانگو گے مگر پناہ نہیں ملے گی۔“

میرے اندر جیسے اثر دھا پھنکارتا رہا تھا۔ میرے اعصاب بے حد کشیدہ ہو گئے تھے۔ وہ مجھ سے مسلسل ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں محض بے دلی سے ہوں ہاں کرتا رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کسی طرح وقت کو مات دے دوں اور حجاب میرے قابو میں ہو پھر پھر... میری سوچیں پراگندہ، میرے خیالات تلخ تھے میں پور پور سلگ رہا تھا ختم ہو رہا تھا۔ میں اس آگ آگے میں تنہا نہیں جلنا چاہتا تھا۔

منگنی کی تقریب میں میں نے اپنی تیاری پر خصوصی توجہ دی تھی۔ بلیک کلر مجھ پر بہت سوٹ کیا کرتا تھا۔ اور لڑکیاں مجھے اس رنگ میں دیکھ کر پاگل ہونے لگتی تھیں اور آج کے اس اہم دن میں صرف ایک لڑکی کو پاگل کرنا چاہتا تھا اور وہ حجاب تھی۔ صدیوں سے یہ روایت رہی ہے۔ مردوں کی دشمنی، بغض اور نفرت کے معاملوں میں عورت سے انتقام اور بدلہ چکایا جاتا ہے میں کوئی منفرد اور بڑا کام نہیں کر رہا تھا۔ میرے خیال میں اس میں ایسی کوئی بزدلی نہیں تھی۔ وہ غیرت تھی عون مرتضیٰ کی، اور اس کی عزت اور غیرت ہی تو مجھے تار تار کرنی تھی۔ ویسے ہی جیسے کبھی اس نے مجھے ذلیل و رسوا کر دیا تھا۔

اماں سے میں دو ٹوک انداز میں پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ حجاب کو رنگ میں خود پہناؤں گا۔ اس پل عون مرتضیٰ یقیناً انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا جی میں نے اسے پہلے سے آگاہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مقررہ وقت سے خاصا بعد ہم لوگ اچھا خاصا انتظار کروا کے پہنچے تو ہمارا وہاں بہت پروقار انداز میں خیر مقدم کیا گیا۔ مجھے ہر سمت خصوصی اہمیت سے نوازا جا رہا تھا اور میں گردن تانے حق سمجھ کر اسے قبول کر رہا تھا۔ وہاں بیشتر نگاہوں میں میرے لیے ستائش تھی۔ واضح ستائش، عون مرتضیٰ گو کہ اس روز مصروف تھا مگر اس کے باوجود اس نے مجھے کمپنی دینے کی کوشش کی تھی۔ گو کہ میرے دوست ہی کافی تعداد میں میرے اطراف جمع تھے مگر مجھے عون کا اپنے آگے پیچھے پھرنا ایک کمپنی سی خوشی سے ہمکنار کر رہا تھا۔ کیمروں کی آنکھیں ہر جانب سے مجھے فوکس کر رہی تھیں جی میں مجھے اپنے تاثرات پر خصوصاً دھیان دینا پڑ رہا تھا۔ تبھی وہ چلی آئی تھی۔ مووی میکرز مجھے چھوڑ کر اس کی جانب لپکے میں بھی متوجہ ہوا تھا کسی ریاست کی شاہزادی کی سی تمکنت کے ساتھ وہ سچ سچ قدم رکھتی اسی سمت آرہی تھی۔ اس کا کامدانی لباس میچنگ کے کندنی زیورات اور پھولوں کے گہنوں نے جو آرائش کی تھی وہ ایک طرف اسے تو قدرت نے ہی بڑی محبت اور شوق سے بنایا تھا۔ وہ خوبصورت ہے میں جانتا تھا مگر وہ اس درجہ حسین ہوگی یہ انکشاف اسی رات مجھ پر ہوا تھا۔ اس کا شعاعیں بکھیرتا ہوا حسن نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ میں جیسے اگلے کئی ثانیوں تک خود اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ وہ سچ مچ کوئی ساحرہ تھی جس نے مجھے مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے اسٹیج تک لایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہاں اس کے گرد یوں خواتین اور لڑکیاں جمع ہو گئیں جیسے شہد کے چھتے کے گرد مکھیاں بھنھناتی ہیں۔ وہ میری نگاہ کی زد سے دور ہوئی تب میں بھی جیسے حواسوں میں لوٹا تھا۔ گہرا سانس بھر کے میں نے یوں سر جھٹکا جیسے خود اپنی کیفیت پر خود کو سرزنش کی ہو۔ میرے دوست شرارتی نظروں سے مجھے دیکھتے مجھ پر ذومعنی فقرے اچھال رہے تھے۔ میں اندر سے جتنے بھی تناؤ کا شکار تھا مگر ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ چپکائے رکھی کہ یہ وقت کا تقاضا تھا۔ میں اپنی طرف سے ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے کوئی بھی خاص طور پر عون مرتضیٰ مشکوک ہو۔ اس کے بعد دانستہ میں نے حجاب کی جانب دیکھنے سے گریز کیا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے خود پر، اپنی نگاہوں پر قطعی اختیار نہیں رہا تھا۔ میری نظریں بھٹک کر بہک کر اسی سمت اٹھ رہی تھیں۔

اندھیری رات کے لمحے شمار ہونے تک

تمہیں ہی سوچتا رہتا ہوں صبح سے شام ہونے تک

اس مہین آواز نے مجھے چونکا تھا جو میرے واسنے پہلو سے بڑے اسٹائل سے ابھری تھی میں نے بے ساختہ گردن موڑی اور علیحدہ کورو برو پا کے کچھ حیران رہ گیا۔
”تم؟؟“

میں ایسا جسم ہوں جس کی روح بھی تو ہے
اندھیری رات ہوں میں تیرے نام ہونے تک
اس نے میری بات کے جواب میں بھی شعر لڑھکایا۔ اس کی آنکھیں خمار آلود اور سرخ تھیں۔ شاید وہ بہت ڈرنک کر چکی تھی۔ آج کل اس کی میرے لیے دیوانگی جنونیت کی سمت بڑھ رہی تھی۔ میں اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے خائف تھا جیسا اے دانستہ اس تقریب میں انوائیٹ نہیں کیا تھا۔ مگر اب وہ کسی حسین چڑیل کی طرح میرے سامنے تھی مجھے غصہ آنے لگا۔
”تم یہاں کیسے آگئیں؟“ میں نے دانت کچکپائے۔ میں بنانا یا کام ہرگز بگاڑنا نہیں چاہتا تھا مگر جو اس کی حرکتیں تھیں اور لازمی رنگ میں بھنگ ڈالتیں۔

تیری آواز نہ سن لوں تو دل نہیں لگتا
تڑپتا رہتا ہوں تجھ سے ہمکلام ہونے تک
میری بات کا جواب ایک بار پھر نثار دیا تھا۔ وہ مکمل طور پر خبطی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اب غصے کی بجائے تشویش نے آن لیا۔ میرا بس نہیں چلا اس مصیبت کو اٹھا کر اس جگہ سے دور پٹخ دوں۔
”کیا عون سے تمہارا کوئی ریلیشن ہے؟ کس کے انویشن پر آئی ہو تم؟“
تیری نظر کی قیمت پر بک رہا ہے کوئی
اسے خرید لے تو مہنگے دام ہونے تک
اس نے پھر بہکے ہوئے انداز میں شعر پڑھا تو میرا ضبط جواب دے گیا۔
”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ گھٹیا عورت! اتنے سستے ہیں تمہارے جذبات تو جاؤ کسی کوٹھے پر بیٹھ جاؤ
بہت چاہنے والے مل جائیں گے۔“

میرا دماغ صحیح معنوں میں الٹ گیا تھا۔ میرے منہ میں جو آیا میں نے کہہ ڈالا۔ وہ ایک دم چپ ہوئی تھی۔ کچھ دیر لہو رنگ مگر نرم آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر ہنس پڑی۔ وہ عجیب ہنسی تھی۔ جس میں کچھ ٹوٹنے کی آواز تھی۔ نوحہ تھا۔

”کم آن داؤد! ڈرتے کیوں ہو؟ مجھے زومانیے بتایا تھا اس ویڈنگ کا تمہاری! بس تمہاری دلہن دیکھنے کے شوق میں چلی آئی۔ ڈونٹ وری ڈونٹ وری! میں ہرگز تمہاری منگنی تڑوانے والی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔ پراس یار!“

اس نے میرے گال کو تھپک کر کہا تھا۔ مجھے جیسے کرنٹ لگا۔ اس کا ہاتھ زور سے جھٹکتے ہوئے میں

بدک سا گیا

”اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ انڈرا سٹینڈ!“

میں آنکھیں نکال کر غرایا۔ وہ جواباً زور سے پھر ہنس پڑی۔ ویسی ہی عجیب ہنسی۔

”اتنے پارسا تو نہیں ہو داؤد! کم آن!“

اس نے منک کر کہا تھا میں دانت بھیچے اسے گھورتا رہا۔

”تم فوراً سے بیشتر یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ یہاں میری کوئی عزت

ہے جسے میں بہر حال تمہاری وجہ سے داؤ پر نہیں لگا سکتا۔“

میں نے پھنکار کر کہا تو وہ مجھے ڈوبتی نظروں سے تکتے لگی۔

”تمہاری یہاں عزت ہے ہماری تو کہیں بھی نہیں ہے سب لوگ کہتے ہیں جس کے پاس بہت سارا

پیسہ ہو اس کے پاس عزت خود بخود آ جاتی ہے۔ داؤد میرے پاس پیسہ تو ہے مگر عزت.....

”عزت صرف پیسے سے نہیں کردار اور اعمال سے بھی بنتی ہے اور تمہارے کرتوت ہرگز عزت پانے

والے نہیں ہیں۔“

میں نے حقارت، بھری نظر اس کے سراپے پر ڈال کر کہا تو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ مگر میں

پرواہ کیے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ میں اتنا جھنجھلا رہا ہوا تھا کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ میں عون کے ساتھ ہی ایک

چیز پر جا بیٹھا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ وہ خاموش تھا اور سنجیدہ نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا تھا۔ مجھے اس بات کی

خبر جب ہوئی تو میں ایک دم کچھ شپٹا گیا۔

”خوامخواہ جان کو آ جاتی ہیں ایسی عورتیں۔ نان سنس!“

مجھے لگا تھا جیسے عون مجھے علیحدہ کے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں ہرگز نہیں چاہتا

تھا جیسی ایک طرح سے اپنی پوزیشن کلیئر کی۔

”کس قسم کی عورتیں؟“

وہ اب براہ راست مجھے تکتے لگا۔ اس کے چہرے پر کچھ خاص تاثر نہیں تھا۔ سپاٹ سا انداز تھا۔

”یہ علیحدہ!“ میں نے بڑا سامنے بنایا اور ایک اور گہرا کش لیا۔

”مگر اس نے تو اپنا تعارف تمہاری دوست کی حیثیت سے کرایا ہے۔“

عون مرتضیٰ نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ جیسے ایک شکایت خاموش شکوہ اپنی نگاہ سے میری نگاہ

تک منتقل کیا۔ میں جزبہ ہو کر رہ گیا۔

”بکو اس کرتی ہے یار! اس قسم کی عورتوں سے میں کیوں دوستیاں گانٹھنے لگا۔“

میرے تضحیک آمیز لہجے میں کڑاوہٹ بھی شامل ہو گئی۔ عون مرتضیٰ کے چہرے پر خفیف سی سرٹلی

جھلکی۔ شاید اسے میری گفتگو کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا۔

بہر حال میں کچھ سنبھل سا گیا۔

”جاؤ وہاں اسٹیج پر تمہیں بلایا جا رہا ہے۔“

اس نے کسی قسم کا تبصرہ کیے بغیر موضوع بدل دیا۔ میں بھی اماں کی آواز سن چکا تھا وہ مجھے یقیناً رسم کے لیے بلا رہی تھیں مگر میں نے دانستہ انکسور کر دیا تھا۔ پر اب میں اٹھا تھا پھر مسکرا کر عون کو دیکھا۔

”آؤ نا اکٹھے چلتے ہیں۔“

اس نے کچھ چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر اسی سنجیدگی سمیت سرکونفی میں جنبش دی تھی۔

”میں وہاں کیا کروں گا۔ تم جاؤ۔“

وہ مجھے کچھ الجھا ہوا لگا تھا۔ مگر اس کے فقرے نے میرے اندر ایک دم کمینگی بھردی میں نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا۔ بیچارا صحیح کہتا تھا۔ اب اس کے اختیارات سمٹ رہے تھے اور میرے لامحدود ہو رہے تھے احمد و سمجھتے ہیں نا؟ یا ہا ہا!

میری ہر سوچ نے جیسے عون مرتضیٰ کو بیچارا سمجھ کر اس کا مضحکہ اڑایا تھا اور اسٹیج کی سمت دیکھا اور جیسے میرے دل کی کلی کھل اٹھی وہ سامنے ہی باوقار انداز میں بیٹھی نظر آ گئی۔ اس کی کچھ گھبرائی کچھ الجھی نظریں مجھ پر ہی اٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھرپور اور جاندار انداز میں مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا انداز ایسا جان لیوا تھا گویا نظروں کے رستے ہی اس کی روح کھینچ لینا چاہتا ہوں۔ وہ یقیناً سٹپٹا گئی تھی۔ جیسی فوراً سے بیشتر سر جھٹکا لیا۔ میں دل ہی دل میں ہنسا اور پھر سے عون کو دیکھا۔ وہ کچھ گم صم سا سا نیوڑائے بیٹھا تھا۔ میں نے کاندھے اچکائے اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا اوپر آیا اور حجاب کے ساتھ صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اب وہ براہ راست میری نگاہوں کی زد پر تھی۔ میں اسے آج گویا اپنی نگاہوں کی حد توں سے ہی جلا کر خاکستر کر دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ نروس ہو رہی ہے اس کا ہولے ہولے کانپتا سراپا مجھے انوکھی لذت سے ہمکنار کر رہا تھا۔ اماں نے مجھے انگوٹھی تھما کر رسم کرنے کا کہا تھا۔ میں نے رنگ کیس ہاتھ میں لے کر سامنے دیکھا۔ عون اپنی جگہ پر موجود تھا اور میری سمت متوجہ بھی۔ اس کی آنکھوں کی خفیف سی سرخی مجھے اتنے فاصلے سے بھی محسوس ہوئی۔ میں باقاعدہ جتلانے والے انداز میں مسکرایا اور رنگ کیس ذرا سا لہرا کر ایک فقرہ اس کی جانب اچھالا تھا۔

”اجازت ہے؟“

عون مرتضیٰ نے کچھ دیر سا کن پلکوں سے مجھے دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔ کچھ توقف سے اس نے بھیجے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ یہ اس کی میرے سامنے باقاعدہ اور پہلی فکست تھی۔ میرے اندر جیسے ایک طویل مضحکہ خیز قہقہے کی گونج بھر گئی۔ اس کے بعد میں نے اپنا روئے سخن اس کی بہن کی جانب کر دیا تھا۔ آج میرا ارادہ تھا دونوں بہن بھائی کو جی بھر کے زچ کرنے کا۔ یہ وہ وقت تھا جب اوپر والے نے مجھے کھل کر کھیلنے کا موقع دیا تھا اور میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میری نگاہیں گستاخانہ انداز میں حجاب کے فلو و خال سے لپٹ رہی تھیں اور وہ اسی قدر پزل ہوئی جاتی تھی میں نے اس کا سفید موی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا

تھا۔ مہندی کے عربیک نقش و نگار سے سجایہ بے حد خوبصورت ہاتھ تھا۔ وہ مضطرب سی ہوئی تھی اور اپنا ہاتھ میری گرفت سے نکالنا چاہا میرے اندر جیسے طیش کا طوفان اُبل پڑا۔ گرفت مضبوط کرتے ہوئے میں نے اس کو شش کونا کام بناتے ہوئے در پردہ اسے کچھ بتلانے کی سعی کی تھی۔ ایسے میں بھابھی نے حجاب کی حالت کے پیش نظر مجھے خفیف سا ڈانٹا تھا اور انگوٹھی پہنانے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے کاندھے اچکائے اور اسے رنگ پہنا دی۔ اطراف میں مبارک باد کا شور اُٹھ کھڑا ہوا میں نے حجاب کے ہاتھ کے گداز اور نرمی کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے اماں کو دیکھا تھا۔

”اماں جائیں عون سے بات کریں۔“

میں گھر سے روانہ ہونے سے قبل اماں پر اپنا ارادہ آشکارا کر چکا تھا۔ میں آج حجاب سے نکاح کرنے کا متمنی تھا۔ میرا خیال تھا ایسی صورتحال میں عون انکار کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اور میں مزید وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اماں کا رنگ اڑ سا گیا۔

”بیٹے تم خود بات کرو نا۔“

وہ خائف سی بولی تھیں۔ میرے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں میں نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں گھورا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے لہجے کو کنٹرول رکھا۔

نہیں آپ کہیں اسے جا کر ویسے میں نے داور سے بھی کہا ہے۔ وہ نیچے ہے وہ بھی بات کرے گا۔ میں نے انہیں یونہی گھورتے ہوئے اُٹھا کر دم لیا۔ وہ کچھ خائف، کچھ جزبزی نیچے گئی تھیں۔ تب دوسری مصیبت نازل ہو گئی۔ علینہ اپنی کسی جاننے والی کے ساتھ اسٹیج پر دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھ آئی تھی۔ میرے خفا سے چہرے کو دیکھ کر وہ دانستہ مسکرائی۔ پھر اس نے جانے کس دل سے حجاب کو سراہا تھا۔ میں اس کی کیفیت محسوس کر کے ہنسنے لگا۔ اور جوابی وار اس پر طنز کر کے کیا تھا۔

”سمجھ دار ہو۔ میرے خیال میں وضاحت کی ضرورت نہیں۔“

اس کا چہرہ ایک بار پھر پھیکا پڑ گیا مگر وہ خود کو سنبھال کر حجاب سے مخاطب ہو گئی تھی۔ اس نے جو کچھ حجاب سے کہا وہ اس کی تشنگی اور بے بسی کا مظہر تھا مگر مجھے اس پر ترس نہیں آ سکتا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی کو اس کا یہ انداز ناگوار خاطر گزارا تھا جیسا کہ وہ اسے جھڑکتی ہوئی زبردستی پکڑ کر پھر نیچے لے گئی۔

”میں نے منع بھی کیا تھا نا۔ ایسی کوئی فضول بات نہیں کرنی مگر تم.....“

وہ ہنوز علینہ کو ڈانٹ رہی تھی۔ میں نے اپنی توجہ ان پر سے ہٹا کر حجاب کو دیکھا وہ ابھی تک کچھ متحیر سی علینہ کو تنگ رہی تھی۔ میں دانستہ کھنکھارا۔ مقصد اس کی توجہ حاصل کرنا تھا جس میں کامیابی بھی ہوئی۔ میں نے کمال جرات کا مظاہرہ کرتے اس کا ہاتھ ایک بار پھر اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اس کی تعریف کی۔ وہ کچھ جزبہ ہوئی تھی میں اسے کچھ اور حرا ساں دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ میں نے اس پر اس راز کو منکشف کر دیا۔ وہ فق چہرے کے ساتھ مجھے خوفزدہ نظروں سے تکتے لگی۔ عجیب لڑکی تھی۔ بجائے شرمانے، لجانے کے وہ پریشان ہو رہی تھی مجھے طیش آنے لگا۔ مگر میں نے اپنے طیش کو دبایا تھا پھر اس پر جھک کر سرگوشی کرنے لگا۔ میں ہر قیمت پر اس کو

نی طرف مائل کرنا چاہتا تھا اور جانتا تھا لڑکیاں محبت کے سہرے جال میں کس آسانی سے آ پھنستی ہیں۔ میں سے ہجر و فراق کی داستان سنانے لگا تا کہ وہ پتھر جیسی لڑکی پگھلے اور پانی بن کر میرے قدموں میں بہہ جائے۔ مگر ہے اپنی یہ کوشش فی الحال تو نا کام ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سہمی ہوئی سی نظر آنے لگی۔ بلکہ اس نے میری منت بھی کی۔ کہ میں ایسا ارادہ ترک کر دوں۔ میرے اندر اتنی تلخی اٹھ گئی کہ اسے تھپڑ رسید کرنے کی خواہش نے پاگل کر دیا۔ ہونٹ بھیچے میں اپنے منتشر احساسات کو کنٹرول کرنے کی سعی میں مصروف تھا جب میری نظریں اسٹیج کے سامنے جا ٹھہریں۔ اماں اور دادا اور بھائی نے یقیناً اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔ اور معاملہ کشیدگی میں جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ صورتحال کی گھمبیرتا کو پاتے ہی میں سرعت سے اٹھ کر وہاں تک گیا تھا۔ عون مرتضیٰ کے چہرے پر واضح برہمی تھی۔ جبکہ دادا اور بھائی اور اماں کچھ دبے دبے لگ رہے تھے۔ عون مرتضیٰ کے پیٹ پر بھی کچھ خاموش اور سنجیدہ تھے۔

”خیریت کیا بات ہے؟“

میں نے پاس آ کر بڑے محتاط انداز میں صورتحال کو جانچنا چاہا تھا۔ عون مرتضیٰ نے سرد نظروں سے دیکھا تھا البتہ جواب دینے کی بجائے اس نے چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔ مجھے صحیح معنوں میں معاملے کے بڑا اندازہ ہوا تھا۔ میں ایک دم کانٹش ہو کر رہ گیا۔ میری سوچ اور توقع کے برعکس نتیجہ نکلا تھا۔ عون کا بے حد اب موڈ مجھے فکر مند کرنے کو کافی ثابت ہوا۔ مجھے لگا گیندا بھی پوری طرح میرے کورٹ میں نہیں آئی۔ میں نے اپنی جلد بازی اور حماقت کو کو سنا تھا۔

”بیٹے آپ کی والدہ صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ منگنی کی بجائے نکاح ہونا چاہیے۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی۔“

ملکڑوں لوگ جمع ہیں اور وہ منگنی کی تقریب میں شریک ہوئے ہیں۔ ہم کس کس کو وضاحت دیں گے اور پھر اس ہنگامی ح کی کوئی تک بھی تو ہو۔ خدا نخواستہ یہ تو اپنی بچی کی طرف خود سے لوگوں کی انگلیاں اٹھوانے والی بات ہے گویا“

عون مرتضیٰ کے پیٹ نے رواداری اور تحمل سے جواب دیا تھا۔ میں نے بے اختیار ہونٹ بھیچے۔

”اماں نے آپ سے نکاح کا کہا؟ اسٹریج۔ کیوں اماں آپ کو کیا ضرورت تھی یہ سب کہنے کی۔“

انخواستہ ہم دونوں میں سے کوئی کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ میری اس سلسلے میں بات ہو چکی تھی تفصیلی اور دی حجاب کی تعلیم مکمل ہونے پر طے پائی تھی۔“

میں نے جس طرح پینتر ابد لا تھا وہ اماں اور دادا اور بھائی کو بھونچکا کر کے رکھ گیا۔ وہ تحیر و غیر یقینی سے ان آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتے رہ گئے۔ مگر میں ہنوز برہم نظر آتا تھا۔ میں سمجھتا تھا میرے پاس اس وقت سرے سے مکر جانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس وقت سدھار کا طریقہ صرف یہی چال ہو سکتی تھی۔ جسے میں نے بڑی میاں بی سے چلا تھا۔ اماں اور دادا اور بھائی کی حیرانی کو نظر انداز کیے میں نے بہت شائستگی کے ساتھ عون مرتضیٰ اور کے فادر سے معذرت کی تھی اس کے باوجود کہ میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ بنانا کام جو بگڑ گیا تھا۔

ساتواں حصہ

مگر آنٹی اور بھائی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات انہوں نے تمہاری خواہش بلکہ ضبط پر کی ہے میں اپنے تئیں معاملہ سلجھا چکا تھا جب میں نے عون مرتضیٰ کی سرد آواز سنی۔ میں نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا وہ جا بختی کسی حد تک خفا نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں جو مکمل پر اعتماد اور بے باک انسان سمجھتا تھا خود کو، اس پل میں جیسے گڑبڑا سا گیا۔

”ایسے ہی کہہ دیا ہو گا یار! میں نے تمہیں بتایا تھا نا اماں کو میری شادی کا بہت شوق ہے“ خود کو با مشکل کمپوز رکھ کر میں نے جیسے طرارہ سا بھر کے اس کی بات کا جواب ہلکے پھلکے انداز میں دیا تھا۔ عون مرتضیٰ جواباً کچھ نہیں بولا اور یونہی بے حد سنجیدگی کے ساتھ وہاں سے ہٹ کر اسٹیج پر حجاب کے پاس چلا گیا۔ میں نے گھور کر اماں اور دادو بھائی کو دیکھا جو مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنے کھڑے بے حد خفت زدہ نظر آرہے تھے۔ میں نے انہیں وہاں سے ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود تشویش زدہ انداز میں عون کی سمت دیکھا۔ وہ حجاب کو وہاں سے یقیناً کمرے میں بجھوارہا تھا۔ دوڑ کیوں نے حجاب کو اٹھنے میں مدد دی اور پھر اس کا بھاری لباس ذرا سا اٹھا کر آہستگی سے چلاتیں اسٹیج سے نیچے لے آئیں۔ عون مرتضیٰ اس سے پہلے اسی سپاٹ چہرے کے ساتھ وہاں سے جا چکا تھا۔ میں دانستہ حجاب کے راستے میں آ گیا۔ میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ میں واقعی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جانے کیوں لگ رہا تھا معاملہ میرے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ میں عون کا محتاج بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں حجاب کو خود میں انوالو کرنا چاہتا تھا۔ اور میں سمجھتا تھا یہ مجھ جیسے سحر انگیز پر سنائی کے مالک شخص کے لیے قطعی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

عون کے موڈ میں جو سنجیدگی اتری تھی وہ ہماری واپسی تک برقرار رہی۔ البتہ اس کی باقی فیملی کا رویہ نارمل ہی تھا۔ میں نے عون کے رویے کو اتنا سر پر سوار نہیں کیا تھا مگر بہر حال تشویش کا لاحق ہونا ایک فطری عمل تھا۔ گھر واپس آنے تک میں نے دادو بھائی کے ساتھ اماں کا موڈ بھی خراب محسوس کیا تھا۔ وہ اپنے رویے میں جتنے بھی حق بجانب ہوتے مگر میں انہیں اہمیت دینے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر اماں نے شاید آپاؤں کو یہ بات بتادی تھی جی ان کی بڑبڑاہٹیں جو ناگواری لیے تھیں شروع ہو گئیں۔ ان کے خیال میں میں نے اپنے سرالیوں کے سامنے ان کی سبکی کھالی تھی۔ میں نے کسی قدر تلخی سے انہیں کچھ باتیں سنائی تھیں جواب میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ آپاؤں نے دادو بھائی کی طرح میری اس زیادتی کو چپ چاپ نہیں سہا تھا۔ وہ احتجاج کر رہی تھیں۔ میں نے اماں سمیت سب کی اٹھی خاصی انسلٹ کر دی۔ میں پہلے ہی جھنجھلا ایا ہوا تھا آپاؤں کی شکایت نے جیسے مجھ پر تیل ڈال کر بھانپڑ جلا دیے۔

”ہمیں نہیں رہنا ہے یہاں! اس کا نہیں کھاتے ہم۔ ارے ایسا قہر گھر بلا کے بے عزتی کرتا ہے۔“

بڑی صاف آج بابلہ انداز میں رونے پینے لگیں۔ میں نے سرخ آنکھوں سے انہیں گھورا تھا پھر انہیں خود اپنے سرے دفغان ہو جانے کا کہہ دیا۔ جھڑا چھ اور بڑھ گیا سب ہی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ ملازموں کو تماشا دکھانے والی بات تھی۔ میں نے سب کو جھڑک جھڑک کر خاموش کرایا اور خود تنہا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ کوٹ اور شرٹ اتار کر پھینکنے کے بعد میں نے اٹلے سیدھے جوتے بھی اتار کر پھینک دیئے۔ میرے اندر جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ عون مرتضیٰ نے ایک بار پھر مجھے ٹھانچے دے مارے ہوں۔

”او داؤد!!“

میں صوفے پر بے ترتیب پڑا شمپن کی بوتل کی سیل توڑ کر یونی منہ سے لگائے بڑے بڑے گھونٹ لے رہا تھا دوسرے لفظوں میں اپنے اندر لگی آگ بجھانے کی کوشش میں تھا جب میں نے داور بھائی کی سرسراتی آواز سنی تھی اور لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ دروازے میں کھڑے تھے اور ان کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ شاید وہ مجھے ڈر تک کرتے دیکھ کر پریشان ہو چکے تھے۔

”کیا بات ہے؟“

میں بد مزگی سے کہتا اٹھ کر بیٹھ گیا میری پیشانی پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔ مجھے اس پل ان کا اپنی تنہائی میں مخل ہونا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

”تتم یہ شراب بھی پیتے ہو؟“ ان کی آواز عجیب پھنسی پھنسی تھی جیسے شدید صدمے کے زیر اثر ہوں۔ میں نے اچاٹ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”تو کیا اس کام سے پہلے مجھے آپ کی اجازت حاصل کرنی چاہیے تھی؟“

میرا لہجہ از حد طنزیہ ہو گیا۔ داور بھائی نے پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ بے بسی سے مجھے دیکھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو داؤد! اور وہاں جو تم نے کیا؟ دس ازناٹ فیر۔“

”اچھا؟“ میں حقارت سے ہنسا۔

”نفیر کیا ہے یہ میں نے آپ سے نہیں پوچھا! آپ جائیں یہاں سے۔“

میں چیخ اٹھا تھا انہوں نے تاسف سے مجھے دیکھا پھر گہرا سانس بھر کے گویا ہوئے۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے جانا ہی چاہیے۔ اس وقت تم حواسوں میں نہیں ہو۔ پھر کبھی بات کریں گے۔“

میں نے تلخی سے سر جھٹک کر انہیں جاتے دیکھا اور بوتل میں باقی ماندہ سیال ایک ہی سانس میں حلق

سے اتار لیا۔ میرے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اور پیروں کے نیچے جیسے کسی نے کانٹے بچھا دیئے تھے۔ بوتل

کو کارپٹ پر ٹھکادیا اور خود اڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا واش روم میں بند ہو گیا۔ ایک گھنٹہ تک شاور لینے کے

موجود بھی میرا ذہن سویا سویا اور بو جھل تھا۔ میں سونا چاہتا تھا مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ تب مجھے یاد آیا مجھے حجاب کو

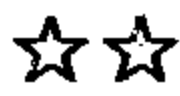
فون کرنا تھا میں نے اپنے بستر پر ہاتھ مار کر سیل فون کو تلاش کیا۔ وہ شاید میرے کوٹ کی جیب میں تھا پھر اٹھا اور

صوفے پر بے ترتیب پڑے کوٹ کی پاکٹ سے سیل فون نکالا اور لرزتی کانپتی انگلیوں سے حجاب کا نمبر ڈائل

کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری طبیعت شاید خراب ہو رہی تھی۔ میرے سارے وجود کو وقفے وقفے سے جھٹک لگ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں ایک نمبر ڈائل کر سکا تھا۔ دوسری جانب بیل جاری تھی مگر کال ریسو نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ دو مرتبہ پھر میں نے بار بار ڈرائی کیا مگر نتیجہ وہی رہا۔ میں ٹیش اور جنون میں جیسے پاگل ہونے لگا۔ میں نے ایک بار پھر ڈرائی کیا تھا اور سیل فون اپنے کانپتے ہاتھ میں دبوج کر کان سے لگائے حجاب کو گالیاں دینے لگا۔

”کتیا، سالی! فون اٹھا بات کر مجھ سے۔“

میں چیخنے لگا۔ ایک بار پھر نو آنسرنگ آنے لگا۔ میں نے ٹیش میں سیل فون دور پھینک دیا۔ اور مغلظات بکنے لگا۔ میری آواز بھرانے لگی تھی۔ غصہ میرے دماغ میں ٹھوکریں مار رہا تھا شکست کا احساس مجھے رو بانسا کر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر بارنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے بار کا خوف ڈرا رہا تھا۔ اتنا ڈرا رہا تھا کہ میں اسی خوف میں جتا گھٹ گھٹ کر رونے لگا تھا۔



اثر دل پر کرے شکوہ، شکایت ہو تو ایسی ہو
گلے لگ کر کوئی روئے، ندامت ہو تو ایسی ہو
یہی محسوس ہو جیسے، کئی صدیاں گزاری ہیں
فقط اک بل کی فرقت میں اذیت ہو تو ایسی ہو
مجھے کانٹا چبھے اور اس کی آنکھوں سے لہو ٹپکے
تعلق ہو تو ایسا ہو محبت ہو تو ایسی ہو

اگلے کئی دن تک میری طبیعت خراب رہی تھی۔ جو وجہ بھی ہوتی بات اصل یہ تھی کہ اماں اگلے دن ہی تمام آپاؤں کے ساتھ گاؤں رخصت ہو چکی تھیں۔ داؤر بھائی بھی یقیناً بھابھی کو لے کر چلے جاتے مگر میری طبیعت ہی اتنی خراب ہو گئی تھی۔ بھابھی اور بھائی نے مل کر میری تیمارداری کی تھی۔ کسی قسم کا کوئی شکوہ کیے بغیر انہوں نے دل سے میرا خیال اس طرح رکھا کہ میں خود اپنے رویے پر شرمسار ہو کر ان سے معذرت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”مجھے معاف کر دیں بھائی! اس روز میں نے واقعی آپ سے زیادتی کی۔ اکیچو کلی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ لوگ اس طرح کا بھی ری ایکشن دے سکتے ہیں۔ تب مجھے اس طرح ہی صورتحال کو سنبھالنا آیا تھا ہر شاید غلط تھا۔“

”اُس او کے داؤد! تم جانے دو ہر بات! مجھے پتا ہے تم حجاب سے بہت محبت کرتے ہو اور اے کھونے کے خیال نے تمہیں بوکھلادیا تھا۔“

جواب بھائی کی بجائے بھابھی نے دیا تھا ان کا انداز کسی حد تک شوخی سمیٹے ہوئے تھا۔ میں گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”بھئی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اتاؤلی اور خوفزدہ کر دینے والی۔ پھر حجاب تو بنائی ہی محبت کرنے کا

گئی ہے۔ اتنی پیاری ہے کہ چھونے سے میلی ہونے کا خدشہ محسوس ہوتا ہے۔“
 بھابھی کتنی دیر بیٹھی رہیں پھر میرے لیے سوپ بنانے چلی گئی تھیں۔
 ”میں نے تمہارے سر ایوں کو تمہاری طبیعت کا بتایا تھا۔ ہو سکتا ہے آج کسی وقت آجائیں۔“
 داور بھائی کی اطلاع پر میں جیسے سر پیٹنے والا ہو گیا۔
 ”افوہ کیا ضرورت تھی خواخواہ۔“

”خواخواہ کیوں؟ وہ اپنے ہیں تمہارے۔ اگر ہمارے علاوہ کہیں اور سے یہ بات پتا چلتی تو مناسب ہوتا بھلا؟“

انہوں نے رسائیت سے کہا تو میں جواب میں کچھ نہیں بولا تھا۔
 ”ویسے تمہیں ہوا کیا؟ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کوئی شدید دہنی ہیجان ہے جو تمہیں آپ سیٹ کرتا رہا ہے۔“
 داور بھائی کی بات کے جواب میں میرا چہرہ اتمتہا لگا۔ میں نے بے ساختہ ان سے نگاہ جرائی تھی۔
 ”کیا ٹینشن ہے داؤد بتاؤ نا میرے بھائی!“
 انہوں نے ایک دم میرا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ میں نے دیکھا ان کے چہرے پر
 میرے لیے فکر مندی، تشویش کے ساتھ ساتھ محبت کا رنگ بھی تھا۔ میں بے دلی سے جبراً مسکرایا تھا۔
 ”تھنگ بھائی! مجھے کیا ٹینشن ہوگی بھلا۔ میری لائف اسٹابلش ہے۔ کیا کمی ہے میری زندگی
 میں؟“ میں نے انہیں صاف ٹال دیا۔ وہ بھی شاید سمجھ گئے کہ میں انہیں بتانا نہیں چاہ رہا جی انہوں نے خاموشی
 اختیار کر لی۔ بھابھی سوپ لے کر آئیں تو اصرار کر کے مجھے پلایا تھا۔ بھائی نے خود میڈیسن کھلائی تھیں۔ پھر
 دونوں مجھے آرام کا مشورہ دیتے کمرے سے چلے گئے۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور تھکے ہوئے انداز
 میں لیٹ گیا۔ میرا سر جیسے ابھی بھاری تھا۔ لیٹے لیٹے کروٹ بدلنے پر میری نظر بیڈ اور ڈریسنگ کے بیچ خالی جگہ
 موجود اپنے ٹوٹے ہوئے سیل فون پر پڑی تو میرا ذہن ایک دم سے تناؤ کا شکار ہونے لگا۔ مجھے یاد آ یا رات میں
 نے حجاب سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے میری کال پک نہیں کی تھی۔ ایک واہیات گالی میرے
 ہونٹوں پر پھر آ گئی۔ طیش سے میری مٹھیاں بھیج گئیں وہ عون مرتضیٰ کی بہن تھی۔ میرے لیے اذیت کے سوا اور کیا
 ہو سکتی تھی۔ ایک بار پھر اسے توڑنے مروڑنے کی وحشت بھری خواہش نے میرے فشار خون کو بڑھا دیا۔ اس کے
 بعد بہت دیر تک میں کلستا جھلتا رہا تھا پھر میڈیسن کی وجہ سے مجھ پر غنودگی چھا گئی تھی۔ دوبارہ میری آنکھ کھلی تو
 کمرے میں کچھ شور تھا میں نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ عون مرتضیٰ کے ساتھ اس کے پپا تھے۔ یقیناً یہ بھائی کی
 اطلاع کا شاخسانہ تھا۔ میں خود کو کمپوز کرتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”السلام علیکم!“

پیشانی پر بکھرے بالوں کو میٹھے ہوئے میں نے درزیدہ نگاہوں سے عون مرتضیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ اس
 دن کی طرح خطرناک سنجیدگی کے حصار میں نہیں تھا۔ میں ذرا سار یلیکس ہوا۔

”وہیکم السلام! کیسی طبیعت ہے؟“

عون کے پاپے شفقت بھرے انداز میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں آہستگی سے مسکرا دیا۔
 ”مچ پیس! بھائی نے خواہواہ آپ کو زحمت دی۔ میری طبیعت کوئی اتنی بھی خراب نہیں تھی۔“ میرے
 لہجے کے تکلف پر عون مرتضیٰ نے ایک نگاہ مجھے دیکھا تھا البتہ کچھ کہنے سے اب بھی گریز برتا۔
 ”یہ تو بیگانگی کی باتیں ہیں بیٹے! آپ شاید ہم سے خفا ہیں۔“

عون کے پاپے اسی ٹھہرے ہوئے شائستہ انداز میں کہا تو میں ایک لمحے کو خفیف سا ہو گیا۔
 ”نہیں انکل پلیز! ایسی بات بالکل بھی نہیں بلکہ اماں کی بات سے جو پریشانی آپ کو سہنا پڑی میں
 اس پر شرمندہ ہوں۔“

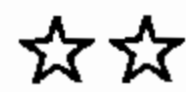
میں نے جواباً تہذیب اور فرمانبرداری کی حد کر دی۔ وہ رواداری سے مسکرائے۔ بھابھی نے چائے
 اور اسٹیکس سے ان لوگوں کی ضیافت کی تھی۔ ان دونوں نے صرف چائے پی تھی۔ پھر جانے کو اٹھ کھڑے
 ہوئے تھے میں انہیں باہر تک چھوڑنے کو اٹھا تو عون مرتضیٰ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔
 ”اس فارمیٹی کی ضرورت نہیں ہے داؤد! ریلیکس ہم چلے جائیں گے۔“

وہ اس دوران پہلی مرتبہ کچھ بولا تھا اور اس طرح کہ میرے اندر سنسناتے ہوئے تمام خدشے،
 واہے جیسے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔ میں جیسے یکا یک پرسکون ہونے لگا۔
 ”تھینکس عون!“

میں نے اس کا ہاتھ تھاما

”فارواٹ!“ اس نے استعجابی انداز میں بھنووؤں کو جنبش دی تھی۔

اور میں مسکرا دیا تھا۔ جواب میں کچھ بھی کہے بغیر ان لوگوں کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر بستر
 پر لیٹ گیا تھا۔ ایک بار پھر میں اپنے من پسند خواب سجا سکتا تھا۔ عون صاحب کو برباد کرنے کے خواب۔



تجھے ناز ہے تو حسین ہے تیرے گلستاں کی مثال کیا
 مجھے فکر ہے میں عشق ہوں جو جلا نہ دوں تو کمال کیا
 مجھے زندگی کی دعا نہ دے مجھے زندگی کی طلب نہیں
 میری موت کو جو ٹال دے اس زندگی کی مثال کیا
 مجھے منزلوں کی خبر نہیں مجھے رہگزار کی تلاش ہے
 اس راہگزر پر نکل پڑے تو عروج کیا اور زوال کیا
 تیرے پیار میں شکوے گلے تیرے اداؤں پر ہم مر پڑے
 جو حیات تھی تجھ پر وار دی اب اور سوال و جواب کیا

اگلی مرتبہ جب میں نے حجاب سے کانٹیکٹ کیا تھا تو اس کے سیل نمبر کو ٹرائی نہیں کیا۔ وہ شاید مجھ سے بات کرنے سے گریزاں تھی۔ میں نے لینڈ لائن نمبر پر رابطہ کیا۔ فون ان لوگوں کی ملازمہ زبیدہ نے اٹھایا تھا۔ میں نے اسے اپنا تعارف کرایا اور حجاب سے بات کرانے کی تاکید کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ حجاب کو یہ نہ بتائے کہ فون پر میں ہوں۔ جواباً وہ چمکی تھی اور ہنستے ہوئے بولی تھی۔

”ہماری چھوٹی بی بی لڑکوں سے بات نہیں کرتی ہیں جی! پر آپ تو ان کے منگیتر ہوتا۔ نہیں بتاتی جی! پر ہو سکتا ہے وہ آپ سے بھی بات نہ کریں۔“

وہ مجھے ہولڈ کرا کے چلی گئی تھی۔ میں نے سگریٹ کے کئی کش لیتے اپنے اندر کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی جو زبیدہ بیگم کی باتوں سے بے تحاشا بڑھ گیا تھا۔ مگر اس وقت میرا دماغ بالکل خراب ہو گیا تھا جب ملازمہ نے دوسری مرتبہ آکر مجھ سے بات کی اور منمننا کر بتایا کہ حجاب نے کیا کہا ہے۔ مجھے لگا تھا اگر میں بولا تو گالیاں ہی دوں گا۔ اتنا ہی غصہ آ رہا تھا مجھے مگر میں نے خود پر بے تحاشہ جبر کیا اور زبیدہ سے کہا وہ حجاب سے جا کر کہے اس کی دوست کا فون ہے۔ وہ پھر چلی گئی۔ حجاب کا گریز اور احتیاط مجھے اس کا طنطنہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی حرکتوں سے میرے غیض کو آواز دے رہی تھی گویا! میں نے اس کام کو جتنا آسان سمجھ لیا تھا۔ شاید یہ اتنا آسان تھا نہیں مگر یہ میرے لیے چیلنج تھا۔ میں ہر قیمت پر اب عون مرتضیٰ کے ساتھ ساتھ حجاب سے بھی اپنی انسلٹ کا بدلہ لینے کو تیار رہا تھا۔ میں یونہی پیچ و تاب کھا رہا تھا جب میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ محترمہ عزت دار صاحبہ فون پر تشریف لا چکی تھیں۔ ایک مرحلہ سر ہوا تھا ابھی اور مرحلے باقی تھے۔ اسے میں نے ابھی کچھ اور ذلیل کرنا تھا۔ اسے بہکا کر میں نے اپنے گھر تک پھر اپنے بستر تک لے کر جانا تھا۔ اپنی تلخ و ترش سوچوں اور خیالات کے برعکس میں نے اس سے بڑے رومینٹک انداز میں گفتگو کا آغاز کیا جس میں استحقاق کی واضح جھلک تھی۔ میں سے ہر قیمت پر اپنی جانب مائل کرنا چاہتا تھا۔ چند ایک باتوں کے بعد میں اپنے مقصد کی جانب آ گیا۔

”مجھے آپ سے ملنا ہے۔“

وہ جو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی اس فرمائش پر یقیناً مضطرب ہو گئی تھی۔ اب مجھے تڑ سے جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ آف کورس میری حیثیت اس کی زندگی میں واضح ہو چکی تھی۔ میں نے اسے متاثر کرنے بلکہ بے چین کرنے کو کچھ ڈائلاگز جھاڑ دیئے۔ اور پھر دوبارہ وہی تقاضا کیا۔ ملنے کا تقاضا! مگر وہ کترانے لگی۔ مگر میں بھی یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جہی کچھ جذباتی سے انداز میں پھر کچھ ڈائلاگز جھاڑے تھے۔ مگر اس وقت میرا دماغ کیلے دھوئیں سے بھرنے لگا تھا جب اس نے اچانک فون بند کر دیا۔ میں نے دانت بھینچ کر سیل فون پٹخ یا۔ پھر جیسے میں پاگل ہو گیا تھا بار بار اس کا سیل نمبر ٹرائی کرتے ہوئے، میں اسے وہ ساری گالیاں بار بار دیتا رہا تھا جو مجھے آتی تھیں۔ مگر اس نے کال ریسو نہیں کی۔ تب میں نے درد سے پھٹتے سر کے ساتھ اس کے نمبر پر کچھ میسجز سینڈ کیے تھے۔ جن میں شاعری کے علاوہ اپنی جذباتیت اور دیوانگی کا اظہار بہت گھمبیر انداز میں کیا گیا تھا۔ پھر تو جیسے مجھے ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ وہ میری کال پک نہیں کرتی تھی۔ مگر میرے میسجز ضرور پڑھ گئی میں

جانتا تھا اور فی الحال یہ ذریعہ بھی کافی تھا مقصد تو اس تک اپنے احساسات پہنچانا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں تھا کہ اس بڑکی کو لائن پر لانے کی خاطر مجھے بہت محنت کرنا تھی۔

☆☆

اگلے روز علینہ کی خودکشی کی کوشش کی خبر میرے اعصاب پر بم بن کے گری تھی۔ زو مانے بتایا تھا ایسا اس نے میری وجہ سے کیا ہے۔ میں ششدر رہ گیا۔

”میری وجہ سے کیوں؟“ مجھے جانے کیوں غصہ آیا تھا اس الزام پر۔

”تم نہیں جانتے؟“ زو مانے طنز یہ کہا۔

”وہ پسند کرتی ہے تمہیں۔ بلکہ پاگل ہو رہی ہے تمہارے حصول کی خاطر۔“

زو مانے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ میں جھنجھلانے لگا۔

”وہ کوئی ٹین ایجر نہیں ہے زو ما! تم بھی فضول بات مت کرو۔ یہ کوئی عمر ہے اس کی ایسی حرکتوں کی؟“

”عشق عمر کب دیکھتا ہے داؤد! پھر وہ بوڑھی تو نہیں ہو گئی۔“

”بتیس سال کی عمر میں تم اسے دوشیزہ بھی نہیں کہہ سکتی ہو۔ بہر حال میں اس بحث میں پڑنا ہی نہیں

چاہتا تھا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یہ سراسر اس کا اپنا فیصلہ، اپنی حماقت ہے۔“

میں بڑے آرام سے بری الذمہ ہو گیا تھا۔

”اتنے بے حس نہ بنو ابو داؤد! تمہاری ذرا سی توجہ اور ہمدردی اسے زندگی کی طرف مائل کر سکتی

ہے۔“ زو مانے جیسے منت کی تھی۔ میں حیران ہونے لگا۔

”کیسی توجہ اور ہمدردی؟“

”جیسی تم پہلے اسے دیتے تھے۔ نہ کرو اس سے شادی بھلے مگر اس سے ملو تو سہی بات تو کرو۔ وہ

لجابت سے بولی تو میں نے ٹھنڈا سانس بھر لیا تھا۔“

”دیکھو تم جانتی ہو میں اب انگلیڈ ہوں۔ اب میں یہ انورڈ نہیں کر سکتا۔“

”یہ کیا بیک ورڈ فیملی کی کسی لڑکی کی سی مجبوریاں بتلانے لگے ابو داؤد! کم آن تم مرد ہو اور آزاد بھی۔“

”تم مجھے بہکانا چاہ رہی ہو؟ شیم آن یو۔“

میں ہنس دیا تھا۔ وہ جواباً خفا ہونے لگی۔

”ابو داؤد وہ مرجائے گی پلیز!“

”او کے میں آج اسے مل لوں گا۔“ میں نے وعدہ کر لیا۔

”تھینکس! ویسے تمہاری فیانیسی بہت پیاری ہے۔ اگر وہ علینہ کے حوالے سے غلط فہمی کا شکار ہوئی تو

مجھے بتانا میں معاملہ کلیئر کرادوں گی۔“

”اس تعاون کے لئیے ایڈوانس میں شکریہ!“

میں نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ اس شام میں ذرا فارغ تھا۔ میں نے اسی شام علینہ سے ملنے کی ٹھان لی۔ میرا ارادہ اس سے مل کر ذرا اس کا دماغ ٹھکانے لگانے کا بھی تھا۔ وہ ابھی تک ہاسپٹل میں تھی۔ میں اسے ملنے پہنچا تو اس کی ہنسی ہوئی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر جیسے زندگی جاگ اٹھی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بے ساختہ رونے لگی۔ میں نے اس کا سر تھپکا تھا۔

”یہ کیا بیوقوفی تھی علینہ!“ میں نے گویا سرزنش کی تھی۔

”تم نے سب کچھ سچ کہا تھا ابو داؤد! میں واقعی بہت بڑی عورت ہوں۔ جس میں نہ وفا ہے، نہ ایثار، نہ قربانی، نہ کوئی اور خوبی! ابو داؤد ایسی عورت کو ماں بننے کا حق نہیں ہے نا؟“

وہ بے حد زور درنج ہو رہی تھی۔ مجھے لگا میں اس کے ساتھ زیادتی کر چکا ہوں۔ اس نے میری باتوں کا تاثر لے لیا تھا۔ میں آہستگی سے اس کے بیڈ کے کنارے ٹک گیا۔ اور اسے تسلی دی۔

”ریلیکس علینہ! پلیز ٹیک اٹ ایزی! میری باتوں سے تمہیں دکھ پہنچا، مجھے معاف کر دو۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ڈھلک کر میرے شانے سے لگ گئی تھی۔ میں نے اسے بازو کے حصار میں لے لیا تھا اور کسی بچی کی طرح تھپک کر تسلی دیتا رہا۔

”تم بیشک مجھ سے شادی نہ کرو ابو داؤد مگر مجھ سے اپنا تعلق ختم نہ کرو۔“

وہ التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی تو میں نے یونہی سرکواشات میں ہلا دیا تھا۔ تبھی میرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ میں نے جینز کی جیب سے سیل فون نکالا۔ عون مرتضیٰ کی کال تھی۔ میں کچھ حیران ہوا۔ علینہ ابھی تک میرے ساتھ چکی ہوئی بیٹھی تھی۔ میں نے کال پک کرنے سے قبل اسے دور ہٹانا چاہا مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ میرا دھیان اب ویسے بھی بٹ چکا تھا جہی میں نے توجہ دیئے بنا عون کی کال پک کی تھی یہ نوٹے تھا کہ وہ کبھی بھی مجھ سے متصادف ضروری بات کے فون نہیں کیا کرتا تھا۔

”کہاں ہو ابو داؤد؟“

سلام اور خیریت کے بعد اس نے چھوٹے ہی پوچھا تھا۔

”میں ہاسپٹل میں ہوں اپنے ایک دوست کی مزاج پرسی کو آیا ہوں۔ خیریت؟“

”کونسا دوست؟ میں جانتا ہوں اسے؟“

اس نے سرسری سا پوچھا مگر میں محتاط ہو گیا تھا۔

”نہیں تم نہیں جانتے! یہ ہمارے گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ خیر تم بتاؤ کچھ کام تھا؟“

میں نے ٹال کر دوسری بات کی۔

”نہیں کام تو نہیں تھا۔ بس ذرا فارغ تھا سو چاہتا ہوں طبیعت پوچھ لوں۔“

”تھینکس میں اب بہتر ہوں۔“ میں نے ممنونیت کا تاثر دیا۔ اس نے چند ادھر ادھر کی مزید باتوں

کے بعد فون بند کر دیا تو میں نے گہرا سانس بھر کے کاندھے اچکائے۔

”کون تھا؟“ علینہ نے بے تکلفی سے پوچھا!

”ہمارے سالا صاحب!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو جواباً وہ آنکلیں نچا کر بولی تھی۔

”اوہ پھر تو تمہارا یہ جھوٹ بنا تھا۔ ویسے مجھے اچھا لگا یہ سب!“

اس کا اشارہ پتا نہیں کس طرف تھا میں دھیان دیے بنا اُٹھ کھڑا ہوا۔

”جار ہے ہو؟“ وہ یکا یک اداس نظر آنے لگی۔

”اور کیا اب میں تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہوں؟“

میرے جیسا بندہ کسی سے اتنی مروت برت لے کافی تھی۔ میں ایک طرح سے اس پر برس پڑا۔

”کاش تم میرے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہتے۔ کاش میں علینہ نہ ہوتی حجاب ہوتی۔“

وہ جیسے خود تری کاشکار ہو رہی تھی میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر زہر خند سے بولا تھا۔

”پھر تو تم شکر ادا کرو کہ تم حجاب نہیں ہو۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ٹھٹھکی۔ میں نے تلخی سے سر جھٹک دیا۔

ہر بات سمجھانے کی نہیں ہوتی۔ آج سے چند سال بعد کبھی حجاب سے ملو تو تم میری بات کا مطلب

بہ آسانی سمجھ لو گی۔“

میں نے پھنکار کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ ہونٹوں کی طرح منہ کھولے بیٹھی تھی۔

☆☆

اگلے دن جب میں لنچ کے لیے اپنے آفس کے قریبی ریسٹورنٹ میں گیا تو وہاں غیر متوقع طور پر میری ملاقات حجاب سے ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کالج کی فرینڈز کے ساتھ تھی۔ اسے رو برو پانا میرے لیے ایک خوشگوار احساس تھا میں خود کو اس کے پاس جانے اور بات کرنے سے روک نہیں سکا۔ دوسرے لفظوں میں یہ سنہری موقع گنوا نا نہیں چاہتا تھا۔ مگر وہ مجھے رو برو پا کے بہت گھبرا اُٹھی تھی۔ میں نے اس کی فرینڈز سے اپنا تعارف کروایا اور ان کے ساتھ اسی ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نسبت اس کی تمام فرینڈز بہت پر اعتماد اور فرینک ہونے والی تھیں۔ شوخ مزاج اور چنچل میں نے ان کی باتوں کو واقعی انجوائے کیا تھا۔

تو سامنے ہے مگر تشنگی جاتی نہیں

یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

میں نے حجاب کو نظروں کے فوکس میں رکھ کر موقع کی مناسب سے ایک شعر اڑھکا دیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ مجھے مزادے رہی تھی۔ وہ کتنا شینا گئی تھی۔ خفت زدہ سی نظریں چراتی ہوئی۔ بہت حسین لگ رہی تھی کہ میں نے اسے کچھ اور زچ کرنے کو کچھ اور ستانے کو ایک اور شعر پڑھا۔

یہ کیا کہ ہمیشہ میری تھکن ہی تجھے صدا دے

کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ

یہ میری بے باکی کا مظاہرہ ہی تھا شاید کہ وہ روبانسی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی فرینڈ کی اطلاع پر کہ وہ روری ہے میرے اعصاب کی سرستی کی جگہ کشیدگی اور تناؤ نے لے لی۔ کیا سمجھتی تھی وہ خود کو؟ بہت عزت دار تھی۔ اور میں نے سرعام اس کی شان میں گستاخی کر دی تھی۔ میں خود کو کمپوز کرنے کی کوشش میں خاموش رہا تھا۔ یہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت کا ہی مظاہرہ تھا کہ وہاں سے واپسی کو جب میں اٹھا تو اسے تھوڑا سا سبق سکھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کی فرینڈز کو نر خا کر میں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح نظر آتی تھی۔ اسے میرے ارادے کی خبر بہت دیر سے ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میرے اندر کی شیطانیت ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ جس میں وحشت کا رنگ غالب تھا۔ میں نے اسے خوف زدہ ہوتے محسوس کیا مگر پرواہ نہیں کی۔ مگر جب وہ میری بے باکی سے متوحش ہو کر رونے لگی تب میں ذرا ہوش میں لوٹا تھا۔ اور پھر اپنی حرکت کا تاثر منانے کو بات بدل دی تھی۔ انداز بدل لیا تھا۔ وہ میرے یک بیک بدلتے موڈ سے ہراساں خائف ہوتی مجھے دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے یونہی روتے ہوئے مجھے اپنی ماں کا فرمودہ سنایا تھا جس کو سن کر میرے کشیدہ اعصاب مزید کشیدہ ہونے لگے۔ اس کا مطلب تھا اس کے دماغ میں گناہ و ثواب کا تاثر بہت گہرا تھا۔ اور مجھے آئندہ بہت مشکل پیش آنے والی تھی۔ میں نے جواب میں اپنا نقطہ نظر اس پر واضح کرنے بلکہ ٹھونسنے کی کوشش کی تھی کہ سچ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں اسے ہر قیمت پر اس راہ پر لانا چاہتا تھا۔ وہ راہ جس پر وہ چلتی تو عون مرتضیٰ کی عزت کی دھجیاں بکھر جاتیں۔ میں اس کے دل سے اس احساس کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ہر ممکن طریقے سے مگر وہ قائل ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ تب مجھے ایک بار پھر جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ میں اسے بتانے لگا وہ میرے لیے کیا ہے اور میں اس کے بغیر کتنا ادھورا ہوں وغیرہ وغیرہ مگر وہ عجیب خرد دماغ لڑکی تھی۔ ڈھیٹ، بے حس مٹی سے بنی تھی۔ کہ اس پر محبت کا، جذباتیت کا، اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں جھنجھلانے لگا۔ میرا موڈ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ گاڑی اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر روک کر میں نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ رونے دھونے کا کوٹا پورا کر چکی تھی شاید۔ اب مطلع صاف تھا۔ بھگی پلکیں آنکھوں کی سطح پر تیرتی خفیف سی لالی آنسوؤں سے دھل کر نکھرا ہوا چہرہ۔ آف وہ ہر روپ میں پہلے سے بڑھ کر دلکش نظر آتی تھی۔ مجھے لگا تھا میں اس تنہائی اور گستاخی پر آمادہ کردینے والی قربت میں اتنا زیادہ بہک جاؤں کہ حد نہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور نظر کا زوا یہ بدل لیا۔

”خود کو ریلیکس کریں حجاب! ورنہ دیکھنے والے پریشان ہی نہیں مشکوک بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ کی حالت ایسی ہی ہے۔“

پریشان بال آنکھ میں آنسو اتری ہوئی صورت

نصیب دشمنان ایسے میں آئے ہو کہاں ہو کر

میں مسکرایا اور وہ بوکھلا گئی تھی۔ چادر اور اپنا بیگ سنبھال کر اٹھنے لگی تھی جب میں نے بہت آہستگی

اور ملانمت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

نظر کے ساجنے حسن بیمار رہنے ”
 جمال دید کو پروردگار رہنے ”
 سوال شوق کا کوئی جواب ہو کہ نہ ہو
 بیمارے دل میں امید بیمار رہنے ”
 میں مسکرایا تھا بہت دل آویز انداز میں۔ پھر اس کا ہاتھ مدھم انداز میں دبا کر چھوڑ دیا۔ میرے خیال
 میں میں بہت نہیں بھی تو کچھ نہ کچھ اپنی شدت میں اس پر واضح کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

☆☆

اس سے کچھ دن بعد میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ میں اپنے تئیں اسے بے قرار کر چکا تھا۔ میری
 شخصیت کا سحر ایسا ہرگز نہیں تھا کہ مخالف پر اثر انداز نہ ہوتا مگر حجاب کے معاملے میں سب الٹ ہو رہا تھا میں جو
 اس کی طرف سے رابطے کا خطر تھا خود فون کرنے پر بھی جب اس نے بات نہیں کی تو ایک بار پھر میں آگ بگولہ
 ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر اپنے طیش پر قابو پانے کے بعد میں نے ایک بار پھر شاعری اور ٹیکسٹ کا سہارا لیا تھا۔

پھر میٹھی پیار کی باتیں ہوں

بحث و تکرار کی باتیں ہوں

جب جانے کی وفات کرے

اک دم سے بارش آجائے

اور یوں وہ کچھ بل ساتھ رہے

کوئی بات سنے کوئی بات کہے

بارش رکنے کی کوئی آس نہ ہو

دن ڈھلنے کا احساس نہ ہو

یوں باتوں میں ڈھکھو جائے

اے کاش کہ ایسا ہو جائے

اس چکر میں اتنا انوالو ہو گیا تھا کہ باقی کی میری دلچسپیاں جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ بھلے یہ انتقام کا
 کھیل تھا مگر تھا بہت دلچسپ۔ حجاب کا حسن ایسا نہیں تھا کہ انور کر دیا جاتا۔ وہ عام لڑکی بھی نہیں تھی جسے آسانی
 سے شکار کیا جاسکتا۔ اور مجھے مشکل کام خاص طور پر اتھری اور مغرور لڑکیاں ہی بھاتی تھیں۔ بچے ہوئے پھل کی
 طرح جھوٹی میں آگرنے کو تیار رہنے والی عورت میں مجھے کبھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ افسوس کا مقام تھا
 کہ آج کل ایسی عورتوں کی ہی تعداد زیادہ تھی۔ حجاب اپنے نام کا پورا ابھرم قائم رکھے ہوئے تھی۔ وہ واقعی حجاب
 تھی۔ اگر وہ عورتی مرقعہ کی بہن نہ ہوتی تو ایک بہترین شریک زندگی کے طور پر مجھے بہت سوٹ کرتی۔ مگر وہ عورت
 مرقعہ کی بہن تھی اور میرے لیے محض تسکین انتقام اور استعمال کی ایک چیز۔

حجاب کے رویے سے بد دل اور مایوس ہو کے میں نے ایک اور پولڈ اور حتمی قدم اٹھایا تھا۔ مجھے ہر صورت اسے ملنے تھا اور اس کے لیے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑتا۔ مجھے اور کچھ نہ سوچا تو میں اس کے کالج چلا آیا۔ اس کا انتظار اور اس کی کوفت سے بچنے کو میں فون پر مصروف ہو گیا۔ دوسری جانب زوما تھی جو مجھے علیحدہ کی حماقتوں کی داستانیں سنارہی تھی۔ مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں تو جیسے کوفت سے بچنے کو اس وقت اس سے بات کر رہا تھا۔ پھر وہ نکل کر آتی نظر آئی میں نے سیل فون جیب میں ڈالا اور اس کی جانب لپک کر آیا۔ وہ شاید مجھے دیکھ نہیں سکی تھی میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ مگر میں نے جب اس سے بات کی تو الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے کے مصداق بات کی تھی۔ وہ بے حد زور محسوس ہوئی شاید اسے اپنی پوزیشن کا احساس تھا۔ یہ احساس تو مجھے بھی تھا جیسی میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا کہا تھا۔ مگر وہ کبھی بھی میرے لیے آسان ہدف نہیں ہو سکتی تھی پھر اب کیسے ہوتی۔ میں نے اسے جتلیا تھا کہ وہ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہی۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتی۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ میں بڑی طرح سے زچ تھا۔ شاید اس پل میری کچھ اندرونی کیفیت میرے لہجے میرے چہرے سے چھلک گئی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار ذرا بے بس محسوس کیا۔ وہ کچھ کہے بغیر میرے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔ شاید اپنے تئیں اس نے مجھے اپنے بھروسے کا احساس بخشنا چاہا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی میں اس کے اس بھرم کو کیسے ریزہ ریزہ کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ وہ سنہری پروں والی وہ قتلی تھی جس کے رنگ میں اپنی پروں پر اتارنے کو پھل رہا تھا۔ گاڑی کو گھر کے راستے پر ڈال کر میں نے اس سے ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔ مقصد اس کی جھجک ختم کرنا اور خود سے فرینک کرنا تھا۔ اس کوشش میں میں نے ایک معمولی سی جسارت کی اس کے نرم بالوں کی کچھ لٹیں جو اس کے چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں میں نے انہیں ہاتھ میں لے کر ان کی نرمی کو محسوس کیا تھا۔ اس نے شاید برا منایا۔ وہ سمٹ سی گئی تھی۔ اس خوفزدہ ہرنی جیسی لڑکی کو مزید حراساں کر کے مجھے ہمیشہ ہی بہت تسکین ملی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میری کوشش اسے عون مرتضیٰ سے بدگمان کرنے کی بھی تھی۔ یہ کام بھی بہت آسان نہیں تھا مگر مجھے کرنا تو تھا۔ تب ہی ایک پھول بیچنے والا لڑکا مجھے پھول لینے پر اصرار کرنے لگا۔ میں نے پھول لے کر حجاب کو دیئے تھے ساتھ ہی اس کے گریز کو نشانہ بنا کر اپنی یاسیت کا بھی اظہار کر دیا۔ پھر اس کے بعد بھی میں اس سے اپنے مقصد کی باتیں کرتا رہا ایسی باتیں جو میں اس کی بجائے کسی اور لڑکی سے کرتا تو یقیناً وہ اپنے نصیب پر رشک کرتی۔ مگر وہ حجاب تھی ایک اچھی مہم، ایک ناقابل شکست لڑکی! جسے بالآخر میرے ہیروں کی دھول بن جانا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا وہ خود کو با اعتماد ظاہر کر رہی ہے جتنا اتنی ہے نہیں۔ وہ اندر سے خائف تھی۔ جیسی تو میرے گھر جانے کا سن کر سراسیمہ نظر آنے لگی تھی۔ میں اسے گھر لے آیا۔ اپنے بیڈروم میں۔ ایک کے بعد دوسرا مقصد پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا اعتماد رخصت ہو چکا تھا۔ وہ بالکل وحشت زدہ ہو کر رہ گئی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا اس گھر میں میں اکیلا ہوتا ہوں۔ اس روز میں ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ ایک طوفان باہر تھا اور دوسرا میرے اندر، اگر میں چاہتا تو تیسرا اور حتمی مرحلہ طے کرنا کچھ کٹھن نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر میری دسترس میں تھی اور میں ہر لحاظ سے اس کے اوپر حاوی تھا۔ مگر یہ جلد بازی مجھے وقتی فائدہ دے سکتی تھی اور عون کو معمولی تکلیف

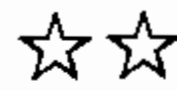
اور رسوائی۔ جبکہ میں اس کے لیے عمر بھر کی ذلت و رسوائی اور لمحہ لمحہ کی اذیت کا خواہش مند تھا۔

بیدروم سے باہر آ کر میں نے بٹلر کو چائے بنانے کا کہا اور خود پلٹ کر ایک بار پھر اندر آ گیا۔ وہ رخ پھیرے کھڑکی سے باہر متوجہ تھی۔ کمرے کی فضا میں گرد کی باس اور آندھی کا شور در آیا تھا۔ اس کا ریشمی اسکارف سر سے ڈھلک گیا تھا۔ اور نم ہوا کے جھونکوں سے بال پیچھے کی جانب اڑ رہے تھے۔ میں بے آواز قدموں سے اس کے بے حد نزدیک آ گیا۔ اتنا نزدیک کہ اس کے بدن کی مسحور کن خوشبو براہ راست میرے اعصاب کو جکڑنے لگی۔ میں نے نرمی اور ملائمت سے اس کے سیاہ مٹھلیں بالوں کو چھوا اور بے ساختہ تعریف کرنے لگا۔ وہ چونک کر ٹھٹھک کر مڑی۔ اور مجھے دیکھ کر متوحش نظر لگی۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں آج اس کی ہر کوشش کو نا کامی کا منہ دکھانا چاہتا تھا۔ میں اسے ہر قیمت پر اپنی ذات کی اہمیت بتانا چاہتا تھا۔ میرے اندر کی وہ ساری کیفیات جو اسی راہ پر چلتے ہوئے ہزیمت کی صورت میں نے برداشت کی تھی اس پل اعصاب شکن احساس کے ہمراہ میرے ساتھ تھی۔ اس نے بھی شاید میری کیفیت کو نوٹ کر لیا۔ میری بہکی ہوئی نظروں نے کچھ تو اسے جتایا تھا۔ جی وہ موسم کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر جانے کو کہنے لگی۔ مگر میرا دل کہاں بھرا تھا نہ اس کی ہراسگی سے نہ ہی اس کی گھبراہٹوں سے۔ میں کچھ اور بہکنے لگا اور وہ بھی دانستہ۔

وہ لمحے بہت خاص تھے جب عون مرتضیٰ کی عزت سے میرے ہاتھوں میں تھی۔

میں نے اسے اپنے نزدیک آنے کا کہا۔ میں اسے ہر طور پر آزمانا، بے بس کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ شدید خوف اور عدم تحفظ کے احساس کے باوجود ان فاصلوں کو پانے پر آمادہ نہیں تھی جو ہمارے درمیان حائل تھے۔ میرا جی مکر رہنے لگا۔ اس کا گھر لوٹنے کا تقاضا بڑھ رہا تھا۔ اس سحر انگیز موسم میں ایک بے حد ڈشنگ مرد کی قربتوں میں بھی وہ احمق لڑکی گناہ ثواب عزت اور وقار کے چکروں میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ واقعی بہت ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ مجھے پھر جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ جب میں ہر طرح سے اس سے دماغ کھپا چکا اور اس پر اثر ہوتا نظر نہیں آیا تو میرا دل اس کا گلا گھونٹنے اور جان سے مار دینے کی مجنونانہ خواہش سے بے تاب ہونے لگا۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ میں خود سے ہی خائف ہو کر رہ گیا۔ جی اور کچھ نہیں سوچا تو اسے واپس چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔ مگر جب ہم لان تک پہنچنے اور پورٹیکو کی جانب جا رہے تھے۔ موسم کی طوفانی شدت نے ایک کرشمہ دکھایا۔ بادل کی خوفناک گرج سے حجاب ڈری تھی اور میرے نزدیک آگئی خود سے۔ میں پہلے تو حق دق ہوا تھا۔ پھر میرا دل قہقہہ لگا کر ہنسنے کو چاہا۔ آہ کاش میں اس بات پر قادر ہوتا کہ اس پل یہ منظر عون مرتضیٰ کو دکھا سکتا۔ اس کی پارسا مغرور بہن اس وقت بغیر کسی شرعی رشتے کے اس کے جانی دشمن سے لپٹی کھڑی تھی۔ جسے ہمیشہ میرے چھو لینے پر بھی ناگواری ہوتی تھی وہ ایک ذرا سی بادل کی گرج سے اس کھو کر اپنا وہ حصار توڑ چکی تھی جسے باندھ کر رکھنے کا دعوہ وہ پچھلی ملاقات میں یہاں سے سامنے کر چکی تھی۔ یہ جذباتی کیفیت اور خوف کا احساس لمحاتی تھا وہ جلد سنہل گئی تھی مگر اس کا طنطنہ تو ٹوٹا تھا۔ میں نے تو کبھی پارسی کا دعوہ کیا ہی نہیں تھا۔ پھر میں ایسے لمحات میں کیوں خود پر پہرے بٹھاتا بلکہ میں نے اس موقع سے بہترین فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ میری وحشت بھری مجنونانہ گرفت میں ماہی بے آب کی مانند مچلی

تڑپی تھی اور پھر بے بسی کی انتہاؤں پر پہنچ کر رو دی تھی۔ میں نے اتنے کو ہی کافی جانتے ہوئے اسے آزاد کر دیا۔ میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی اس کے ساتھ بارش میں بھگینے کی مگر یہ تجربہ بہت دل آویز ثابت ہوا۔ وہ رو رہی تھی اور میرے جلتے دل پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے اسے چپ کرایا اور اس سے پہا سچ بولا میں نے اسے بتایا کہ میں ہر حد توڑنا چاہ رہا ہوں مگر خود پر صرف اس کی وجہ سے ضبط کے پہرے بٹھائے ہیں یہ سچ تھا۔ کس قدر گھائے کا سودا اور میں اب گھانا کھانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں اس نے میری بات کا کس حد تک یقین کیا تھا۔ مجھے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ آج کی اس ملاقات میں ہونے والے نفع نقصان پر غور کیے بنا میں مسرور تھا۔ وہ جاتے جاتے میرے پاس بہت حسین یادیں چھوڑ گئی تھی۔



بے بسی، بے خیالی، بے خودی دے گیا
کچھ نئے تجربے وہ ہم نشیں دے گیا
سوچنے کے لیے پل کی مہلت نہ دی
جاگنے کے لیے اک صدی دے گیا
لے گیا جان و دل جسم سے کھینچ کر
ہاں مگر روح کی تازگی دے گیا
اس کے آجانے سے ہر کمی مٹ گئی
جاتے جاتے وہ اپنی کمی دے گیا
اس کی سوداگری میں بھی انصاف تھا
زندگی دے گیا زندگی لے گیا

میں نے بڑی دل جمعی سے یہ غزل ٹائپ کر کے حجاب کے نمبر پر سینڈ کی تھی۔ معنی خیز حوالہ اس آخری ملاقات کا تھا۔ میں ہر ممکن کوشش کر رہا تھا اس کے دل میں جو تک لگا سکوں۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو جاتا تو پھر عون مرتضیٰ کی شکست یقینی تھی۔ مزید چند دن گزرے تھے جب مجھے بذریعہ کوریئر فیضان کی منگنی کا انویشن کارڈ ملا تھا۔ مجھے جیسے عون سے بات کرنے کا بہانہ مل گیا۔ میں نے اسی وقت اس کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

”ہیلو السلام علیکم!“

”وسلام!“ رابطہ ہونے پر میں نے عون کی سنجیدہ و متین آواز سنی تھی۔

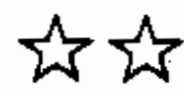
”کیسے ہو عون! بہت مبارک ہو فیضان کی منگنی کی۔ تم اس سے کیسے پیچھے رہ گئے۔؟“

میں پہلی مرتبہ عون سے اس درجہ خوشدلی اور فرینڈلی انداز میں بات کر رہا تھا تو وجہ اس کی ہار کا احساس مزادے رہا تھا جو عنقریب انشاء اللہ اسے میری طرف سے ملنے والی تھی۔

”تھینکس! میں سمجھا نہیں؟“

اس نے مختصر جواب دے کر الجھن آمیز انداز اختیار کیا تھا۔
 ”مطلب تم بڑے ہونا۔ تمہاری شادی پہلے ہونی چاہیے تھی۔“ میں نے بے تکلفی کی حد کر دی۔
 دوسری جانب کچھ لمحوں کو خاموشی چھا گئی۔
 ”میری شادی برسوں پہلے ہو چکی تھی۔“
 اس انکشاف نے مجھے دھچکا لگایا تھا۔
 ”اچھا کب؟ کس سے؟“
 چار پانچ سال پہلے۔ میری دوست تھی۔ مگر ہماری علیحدگی ہو چکی ہے۔
 وہ کچھ غیر معمولی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا بلکہ مجھ ایک دو بار تو شدت سے لگا جیسے وہ بارے
 بندھے جواب دے رہا ہو۔

”اچھا! تم نے بتایا ہی نہیں۔“ میں نے حیرانی کا تاثر دیتے ساتھ ہی شکوہ بھی کیا۔
 ”یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی جس کو ڈسکس کیا جاتا۔“
 اس نے کس قدر رکھائی سے کہا تو میں کچھ چپ سا ہو گیا۔
 ”او کے داؤد پھر بات ہو گئی آئی ایم بڑی ناؤ۔“
 اس نے جس طرح اچانک رابطہ منقطع کیا مجھے شدید دھچکا لگا تھا۔ یہ عون مرتضیٰ تھا؟ میں حیرانی اور
 کسی حد تک توہین آمیز انداز میں ساکن بیٹھا خود سے سوال کرتا رہا۔ پھر مجھے اتنی انسلٹ فیل ہوئی تھی کہ میں
 اگلے آدھے گھنٹے تک عون کو گالیاں دیتا رہا تھا۔ تب بھی میری بھڑاس نہیں نکلی تھی۔ جہی میں کھلتا ہوا سگریٹ سا
 کر گہرے کش لینے لگا۔ تب بھی سکون نہیں ملا تو میں نے ڈرنک کرنا شروع کر دی تھی۔ اور پھر خود سے بھی غافل
 ہو گیا تھا۔ ان دونوں بھائی بہن نے مل کر مجھے اور میری زندگی کو برباد کر دیا تھا۔



قرب میسر ہو تو یہ پوچھیں درد ہو تم یا درماں ہو
 دل میں آن بے ہو لیکن مالک ہو یا مہماں ہو
 دوری آگ سے دوری بہتر قرب کا انجام ہے راکھ
 آگ کا کام فروزاں ہونا راکھ ضرور پریشاں ہو
 میں اس قسم کے جذباتی اشعار اکثر حجاب کو سینڈ کیا کرتا تھا۔ آج کل تو ویسے بھی علینہ کی وجہ سے مجھے
 سہولت ہوتی تھی۔ وہ مجھے بھیبتی میں حجاب کو فارورڈ کر دیتا۔ اب پتا نہیں جس طرح علینہ کی توانائیاں جذبے اور
 سعی پر مجھ بے اثر تھی حجاب پر بھی اثر پذیر تھی کہ نہیں۔ میں تو بس کوشش کیے جا رہا تھا۔ فیضان کی منگنی کا فنکشن
 قریب آیا تو میں خصوصی تیاری کے ساتھ پہنچا تھا۔ عون مرتضیٰ کا رویہ و انداز مبہم تھا مگر میں نے زیادہ پروا نہیں کی
 تھی۔ مجھے حجاب وہاں کہیں بھی نظر نہیں آئی اور میں اسے دیکھنے کو بے قرار ہوا جا رہا تھا۔ عون کی ساری فیملی مجھے

خصوصی اہمیت دے رہی تھی عون کا وہ یہ البتہ مصالحانہ محسوس ہوتا تھا۔ مبہم، غیر واضح۔ اس کی وجہ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر میں پریشان نہیں تھا۔ عون ہمارے پاس سے اٹھ کر گیا تو میں اس کے والد کے ساتھ اور کچھ دیگر مہمانوں کے ساتھ بور ہونے کو رہ گیا۔ یہ بوریت کچھ مزید بڑھی تو میں عون کے بہانے درحقیقت حجاب کی تلاش میں اٹھ کر اندرونی حصے کی جانب آیا تھا۔ ہال کمرے سے ڈھولک بجنے اور گیتوں کی آواز ابھر رہی تھی۔ جانے کیوں میرے قدم اسی سمت بڑھ گئے۔ کیا حسب حال گانا تھا۔ میں تو حجاب کو رو برو پا کے ہی جیسے تروتازہ ہو گیا تھا اوپر سے یہ پذیرائی۔ اس کی تمام کزنز نے ایک خوشگوار اور لطیف قسم کا شور برپا کر دیا تھا۔ سستی خیزی، ذومعلیت، شرارت، مجھے بھی یہ سب بڑا نہیں لگ رہا تھا۔ حجاب کا حیا آمیز نگاہ چیر۔ اور اس پر اٹھتی گرتی سیاہ پلکوں کی جھالروں کی لرزش۔ وہ اس روز اپنی خصوصی تیاری کے ساتھ ایسے جگہ گاری تھی جیسے روشنیوں کے سیلاب پر نظر جاٹھرے۔ میں اس وقت سوچوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اس سے میرا دل کا کوئی رشتہ تعلق نہیں تھا تو اس روز اسے دیکھنے کی خواہش اور بے چینی کیوں اندر دھرائی تھی۔ اور تب جب میں وہاں سے پٹ رہا تھا میں نے اس کی اتنی ساری فرینڈز اور کزنز کی پرواہ کیے بغیر اس پر کچھ جتنا چاہا تھا۔

ذرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے
چٹ کے ٹوٹ گیا دل کا سخت ایسا تھا
یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک
کوئی نہ سہ سکے دل کا سخت ایسا تھا

یہ براہ راست ایک شکوہ تھا۔ جس نے حجاب کو صرف ٹپٹایا نہیں شرمندہ بھی کر دیا۔ اس کی ساری فرینڈز شور مچانے لگی تھیں۔

”یہ زیادتی ہے داؤد بھائی! ہماری کڑی پر آپ الزام لگا رہے ہیں۔ یہ ہرگز ایسی نہیں۔“
ایک لڑکی نے احتجاج کیا تھا۔ میں مسکرایا میری شوخ متبسم نظریں حجاب کے چہرے پر تھیں جو ہنٹ کاٹ رہی تھی۔

”اپنی نہیں میری بات کریں۔ جو یہ آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمارے لیے بالکل برعکس ہیں۔ آپ کے لیے یہ موم ہمارے لیے پتھر۔ آپ کے لیے شبنم ہمارے لیے شعلہ۔ آپ کے لیے مکان ہمارے لیے۔ باس۔۔۔!! کیوں حجاب ایسا ہی ہے؟“

وہ سب مختلف سوال کر رہی تھیں حجاب نے ایک نظر مجھے دیکھا ان آنکھوں میں اس بل مجھ سے ایک معصوم سا شکوہ تھا۔ ایسا شکوہ جو کسی بہت اپنے بہت پیارے کے لیے ہی ہو سکتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے محض ایک لمحے کے لیے، اس کی اس نگاہ کی تاثیر نے میرے مضبوط دل کو سینے کے اندر اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ مگر اگلے لمحے میں تارل تھا۔ جیسی زور سے منس پڑا۔

”ارے نہیں آپ انہیں کچھ مت کہیں۔ یہ ہمارا پرسل افیئر ہے، ہم خود سوا لو کر لیں گے۔ اوکے؟“

میں نے ایک گہری متبسم نگاہ حجاب پر ڈالی اور وہاں سے پٹ گیا۔ وہ سارا دن میرا خوشگوار گزرا تھا میں اس خوشگواری کو بھرپور تسکین میں بدلنا چاہتا تھا بھرپور کامیابی میں، جیسی میں نے بہت دنوں بعد ایک بار پھر اس کا نمبر زانی کیا تھا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس نے کال پک کر لی۔ البتہ آواز سے صاف ظاہر تھا گہری نیند سے جاگی ہے۔ میں اسے ڈگر پر لانے کو معنی خیز گفتگو شروع کر چکا تھا۔ مگر اس وقت مجھے شدید توہین اور خفگی نے دبوچ لیا جب اس نے میری بات کے جواب میں ایک طیش دلانے والی بات کہی تھی اور میری پکاروں کو نظر انداز کیے فون کاٹ دیا تھا۔ مجھے لگا تھا کسی نے مجھے نرم گرم بستر سے اٹھا کر کانٹوں بھری جھاڑیوں پر پھینک دیا ہو۔ میرا پورا وجود جل اٹھا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ مجھ سے اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی وغیرہ وغیرہ اور اس روز شدید طیش کے عالم میں میں نے قسم کھائی تھی کہ اس بات کی اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ خود سے نگاہیں نہیں ملا سکے گی۔

”تم میری خود منت بھی کرو نا حجاب بیگم کہ میں تم سے شادی کر لوں تو تب بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ آج تم نے خود میری زندگی میں اپنی حیثیت متعین کر دی۔ تم ساری عمر میری کیپ بن کر رہی رہو گی۔ یہی تمہارے غرور کی سزا ہے۔“

اس رات میں جب تک جاگتا رہا۔ سگریٹ پھونکتے ذر تک کرتے خود سے بار بار عہد باندھتا رہا تھا۔

☆☆

میں ہوں گردشوں میں گھرا ہوا مجھے آپ اپنی خبر نہیں وہ جو شخص تھا میرا رہنما اسے راستوں میں گنوا دیا مجھے عشق ہے کہ جنوں ہے ابھی فیصلہ نہیں ہوا میرا نام زینت دشت تھا مجھے آنندھیوں نے مٹا دیا اگلے روز میں بہت دیر تک خود سے غافل پڑا رہا تھا۔ صبح گیارہ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو وال کلاک پر نگاہ جاتے ہیں بڑا کراٹھ گیا۔ آج میری بہت اہم میٹنگ تھی ساڑھے گیارہ بجے۔ میں نے سیل چیک کیا ولید کی بیس مسڈ کالز تھیں۔ میں نے سیل پھینکا اور اٹھ کر واش روم کی جانب بھاگا۔ محض دس منٹ میں ایک افراتفری کی کیفیت میں تیار ہو کر میں عجلت میں باہر نکلا تھا جب اماں سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

”اکیلے جا رہے ہو داؤد؟ ہمیں بھی ساتھ لے جاتے۔“

”کہاں؟“ میں نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر سوال کیا۔ یہ مداخلت مجھے سخت ناگوار محسوس ہوئی تھی۔

”اپنے سرال! ہم بھی منگنی میں شریک ہو ہی آتے ہیں غالباً۔“

ان کا لہجہ طنزیہ تھا میرا برہم مزاج کچھ اور بھی برہم ہو گیا۔

”اطلاعا عرض ہے میں آفس جا رہا ہوں۔“

”ہائیں منگنی میں نہیں جاؤ گے؟“ وہ ٹھنٹھکیں۔

”میری فکر میں مت گھلیں آپ بھلتا میں اپنے کام۔“

میں نے کسی قدر سرد مہری سے کہا اور کتر کر نکال گیا۔ آفس سے میں ایک بجے تک فارغ ہو سکا تھا۔
 رے ذہن میں فیضان کا فنکشن تھا۔ پھر خود فیضان نے اس دوران دو مرتبہ کال کر کے مجھ سے نہ آنے اور تاخیر
 کا وجہ پوچھی تھی۔

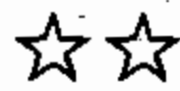
”فنکشن شام کا ہے نا۔ میں پہنچ جاؤں گا فیضان! اس وقت بڑی ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی
 دی۔ میں خود بھی لازماً جانا چاہتا تھا۔ حجاب کا دماغ میں وہاں جا کے ہی درست کر سکتا تھا۔ اس کی رات والی
 نینری کی وجہ سے میرا دماغ ابھی تک تناؤ کا شکار تھا۔ آفس سے اٹھ کر میں گھر پہنچا تھا اور تیار ہونے کے بعد
 ان کی رہائش گاہ پر۔ اماں وغیرہ مجھ سے پہلے پہنچ چکی تھیں مگر میری اپنی الگ حیثیت تھی۔ میں موسیٰ کے ساتھ
 ٹھہراتا کر رہا تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ پنک کا دانی شرارے اور دوپٹے کو اچھی طرح سے سیٹ کیے
 بڑے جھمکوں کے درمیان اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔ وہ اس روز
 بے بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ آج اسے ہر صورت میں تنبیہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مجھے موقع کی تلاش تھی
 یا حکمت عملی ہوتی اس پر فی الحال میں نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت میں ایک دم الرٹ ہو گیا جب میں نے
 ب سے اس کی ماما کو جیولری کی بابت بات کرتے سنا۔ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ حجاب سے تنہائی میں ملنے
 اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا مجھے اتنی جلدی موقع میسر آ جائے گا۔ اسے فیضان کے روم میں جانا تھا اور
 مان پارلر جا چکا تھا۔ میں نے موسیٰ سے ایکسکوز کیا اور سب کی نظر بچا کر بالائی حصے کی جانب چلا گیا۔ میں
 مان کے کمرے میں تو پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ البتہ عون کے کمرے میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ فیضان کا کمرہ اس
 کے برابر میں ہی تھا۔ جب میں فیضی کے کمرے میں داخل ہوا وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ اور اپنے
 بیان میں مگن وارڈروب کھولے کھڑی اپنے کام میں مصروف تھی۔ کمرے کے فرش پر کارپٹ موجود تھا جیسی
 رے قدموں کی چاپ اس تک نہیں پہنچی اور میں بنا آہٹ کے اس کے سر پر جا پہنچا۔ موتیے کے پھولوں کی
 ندھی ہوئی لڑی سے اس کی موٹی سی ناگن جیسی چوٹی کی آرائش کی گئی تھی۔ اس کے نزدیک جاتے ہی موتیے،
 مدی اور پرفیوم کی دلفریب مہک نے میرے احساس کو جھنجھوڑنا چاہا تھا مگر اس پل سب سے شدید احساس غصے
 توہین کا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں مڑی اور مجھ سے تصادم ہو گیا۔ مجھے اس طرح روبرو پا کے وہ فق ہوتے
 رے کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔ اس نے پیچھے ہٹنا چاہا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے کچھ کہے بنا اسے ایک
 اپنی جارحانہ وحشت بھری گرفت میں جکڑ لیا۔ مقصد اس پر ایک ساتھ بہت کچھ جتلاتا تھا۔ دھونس، استحقاق،
 زنی، طاقت پھر میں نے اسی وحشت بھرے انداز میں اس سے اس گستاخی کی وجہ دریافت کی تھی۔ مگر وہ اتنی
 اس باختہ تھی کہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں رہی۔ مگر مجھ پر تو جیسے کوئی پاگل پن سوار تھا۔ میں اسے نہایت
 کے عالم میں دبوچ کر اپنے مقابل لے آیا۔

پھر پہلے اسے آئندہ کے لیے تنبیہ کی تھی پھر معافی مانگنے کا کہا۔

وہ بے حد سراسیمہ اور خوفزدہ تھی۔ میری ہر ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے التجا آمیز انداز میں

اپنا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ وہ کسی کے دیکھ لینے کے احساس سے وحشت زدہ تھی۔ مگر مجھے جیسے اس لمحے کسی بھی بات کا خوف نہیں تھا طیش ہی ایسا تھا جو مجھے کوئی ڈھنگ کی بات سوچنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ جی میں نے غصے میں پھر کر اسے اپنے ساتھ گھیٹ لیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ عون کو بھی پتا چلنا چاہیے کہ تم خود بھی یہ چاہتی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ کچھ دیر خوفزدگی کے عالم میں مجھے دیکھتی رہی پھر اتنی بے بس ہوئی تھی کہ بے ساختہ رو پڑی۔ پھر جیسے وہ خوفزدہ سی لڑکی نہیں رہی۔ اس نے شدید طیش کے عالم میں مجھے دھکیلا تھا اور مجھ پر برس پڑی تھی۔

میں نے معاملے کی گھمبیرتا کو محسوس کیا تو پینتر ابدل لیا تھا۔ میں نے اسے جذباتی کرنا چاہا مگر وہ جانے کس مٹی سے بنی تھی۔ اس پر میری باتوں کا اثر نہیں ہوا تھا۔ الٹا وہ مجھے طعنے دینے لگ گئی۔ پھر وہ مجھے گھورتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ سارے دعوے جو میں نے کیے تھے پانی کا بلبلہ ثابت ہوئے اور میں جیسے تلملا کر رہ گیا۔ جیسے تیسے میں نے اس تقریب کو بھگتایا تھا پھر اگلے دو دن تک اسے منانے کی راہ راست پر لانے کی اپنی سی کوشش کرتا رہا مگر اس نے نرمی کا کوئی تاثر نہیں دیا اور اینٹھی رہی۔ مجھے جانے کیوں لگ رہا تھا میں نے اپنی جلد بازی اور جذباتیت میں معاملہ بگاڑ لیا ہے۔ عین اس وقت جب کامیابی کے امکان ستر فیصد روشن ہو چکے تھے۔ مجھے خود اپنے اوپر طیش آنے لگا۔ آفس میں بھی میں اکھڑا، اکھڑا اور اپنے ورکرز پر برستا رہا تھا۔ واپسی پر میرا ذہن بے حد کشیدہ ہو رہا تھا میں اس مقام پر آ کر ہرگز ہارنا نہیں چاہتا تھا مگر جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے عون کے ساتھ ساتھ میں نے حجاب کو بھی خود سے مشکوک اور بدگمان کر دیا ہے۔ اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ ایسی ہی پراگندہ سوچوں میں الجھا میں ڈرائیو کر رہا تھا میرا دھیان ڈرائیونگ کی جانب نہیں تھا شاید جی بھی وہ حادثہ پیش آ گیا۔ یہ سب اتنا شدید اور اچانک تھا کہ میں اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔



دوست ملتے جلتے ہیں

ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ساتھ ساتھ چلنے میں

رنجشیں تو ہوتی ہیں

رنجشوں میں بھی لیکن

چاہتیں تو ہوتی ہیں

چاہتوں کی بھی ہر پل اک عجب کہانی ہے

بھگی آنکھوں میں خواب جلتے بجھتے ہیں

درد کے سفر میں

کچھ موڑ ایسے آتے ہیں

خواب ٹوٹ جاتے ہیں

ساتھ چھوٹ جاتے ہیں

گر چیاں اٹھانے میں

وقت بیت جاتا ہے

دردِ جیت جاتا ہے

جانے کتنی طویل مدت تھی جو میں نے خود فراموشی کی کیفیت میں گزاری تھی۔ حواس بحال ہوتے تو صرف ایک احساس جاگتا تھا درد کا شدید احساس۔ اس وقت بھی میں درد اور تکلیف سے بے چین تھا جب میں نے حجاب کی آواز سنی تھی۔ دور کہیں گہری کھائی سے آئی ہوئی آواز، مجھے لگا جیسے میں نیند میں ہوں اور وہ مجھے بلارہی ہے۔ پھر میں نے اسے دیکھا۔ وہ نزدیک تھی میرے۔ شاید میرے لیے رو بھی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی نمی میں نے اپنے چہرے اپنے ہاتھوں پر محسوس کی تھی۔ وہ واقعی میرے لیے پریشان تھی۔ مجھے لگا جیسے میرا سارا درد اس کی پریشان متوحش آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ مجھے تو انائی محسوس ہوئی۔ مجھے لگا میں پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔ ابھی میں ہارا نہیں تھا۔ ہاں ابھی میں اگر ہارا نہیں تھا تو مجھے ابھی اور جینا تھا اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر۔

اگلے روز وہ آئی تو میں کسی حد تک بہتر تھا۔ ایک بات اس کے گھر والوں کی مجھے اچھی لگتی تھی۔ وہ اب آتی تو یہ لوگ ہمیں تنہائی میسر کرتے تھے اور میں تو دل سے یہ چاہتا تھا۔ وہ میرے قریب آئی تو میں نے بہت بے صبری سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
”کیسی ہو حجاب!“

میرے لہجے میں کچھ ایسی بے چینی اور لپک تھی جذبوں کی، جس نے اسے کچھ ٹپٹا دیا تھا۔
”آپ بتائیں کیسی طبیعت ہے؟“

”میں تو تمہارے سامنے ہوں تم بتاؤ نا کیسا لگ رہا ہوں؟“
میری سرخ آنکھوں میں مسکراہٹ جاگتی تھی۔ جواباً وہ کسی قدر اپنائیت بے تکلفی اور شرارت سے ہنسی تھی۔
”مجھے تو بہت بہتر لگ رہے ہیں بس اب جلدی سے بستر چھوڑ دیں۔“

مریضِ عشق ہوں ہاسپٹل اور میڈیسنز میں میری بیماری کا علاج نہیں ہے حجاب! تم ہو میری طبیب!“
میں نے ایک دیوانگی کی کیفیت میں اس کے ہاتھ کو تھام کر اسے بے تحاشا چوما تو وہ پہلے ٹپٹائی تھی پھر جھجک گئی اور کچھ دور سرک گئی مجھ سے۔ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

”حجاب اتنے قریب آ کر پھر سے دور مت ہو جانا میں مر جاؤں گا۔“
میں نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ وہ دہل کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں کے ہر اس کو دیکھا تھا اور دانستہ آنکھیں موند لیں۔

”میں تمہارے بغیر اب اور نہیں جی سکتا۔ عون کو یہ بات سمجھاؤ پلیز!“

”آپ ٹھیک ہو جائیں پھر باقی سب بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے اپنے تئیں مجھے تسلی دی تھی مگر میں کسی طور پر بھی مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ ”کیا تم مجھے مل جاؤ گی؟“ میں نے پر آس اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ کسی قدر شرما کر مسکرائی تھی۔

”مجھے اب کہاں جانا ہے داؤد! آپ ہی کی ہوں۔“

یہ ڈائیلاگ سن کر کوئی عاشق تو خوش ہونے کی حماقت کر سکتا تھا میں نہیں۔ میں نے ایک اضطراب کے عالم میں اس کے ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لیے۔

”حجاب میں نے کہا نا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کچھ کرو کچھ کرو ورنہ شاید میرے دماغ کی کوئی وین پھٹ جائے گی۔“

میری آواز میں ہیجان تھا میں بے حد وحشت زدہ ہونے لگا۔ اور وہ بے حد خائف!

”پلیز ایسی باتیں مت کریں۔ میں نے کہا نا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میری توقع کے عین مطابق وہ بے حد پریشان نظر آنے لگی۔

میں نے آنچ دیتی نظروں اور تیز ہوتے تنفس کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ بلکہ گھورا تھا۔

”کیا کرو گی تم! مثلاً کیا کر سکتی ہو تم؟“

میں نے اسے اکسانا چاہا تھا۔

”مم میں آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گی ابو داؤد!“

کچھ دیر بے بسی سے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا تھا اور میرا دل چاہا تھا میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑوں اگر میں اپنی خوشی کی قیمت اسے بتا دیتا تو شاید وہ دوبارہ میری شکل بھی دیکھنا گوارا نہ کرتی مگر میں احمق تھوڑی تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تھا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ کر ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کی اس بات کو کسی خاص وقت کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے یا نہیں مگر میں اس جنگ میں سب کچھ جائز کر لینے کا تہیہ کر چکا تھا۔

☆☆

جتنی دیر میں ہاسپٹل میں رہا۔ اسی جدوجہد میں مصروف رہا تھا کہ حجاب میرے نزدیک آ جائے جسمانی طور پر نہیں، قلبی و دماغی طور پر۔ اس طرح کہ پھر اس کی سانسیں بھی اٹکیں اگر مجھ سے کبھی جدائی کا خیال بھی کرے۔ اب پتا نہیں اس میں میری کوششوں کا کتنا عمل دخل تھا اور اس کے جذبے کا کتنا کہ میری یہ خواہش پوری ہو گئی۔ اس روز جب اس نے میرے سامنے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اپنی شکست اور محبت کا اعتراف کیا تھا میرا دل صحیح معنوں میں الٹی چھلانگیں لگانے کو چاہا تھا۔ مگر بظاہر خفگی کا مظاہرہ کیا۔ اور اس کے آنسوؤں کو نشانہ بنا کر تنقید کی تھی اور شک کا اظہار کیا۔ جواباً اس نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ یہ دکھ کے نہیں خوشی کے آنسو ہیں۔ وہ کتنی سادہ تھی، واقعی معصوم تھی کہ اس بات پر خوش تھی کہ خدا نے مجھے زندگی عطا کر کے اس کے لیے جیتا رکھا تھا۔

وہ اپنے آنے والے دکھوں سے بے خبر تھی۔ مجھے بے حد ہنسی آئی تھی۔ مگر اس کے برعکس میں نے اس کے اعتراف پر بڑی ترنگ میں آکر اس کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے مان و استحقاق بھری دھونس سے کہا تھا۔

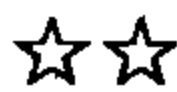
تجھے محبت کرتا ہوں تیری میں جان لے لوں گا

اگر ان جھیل آنکھوں کو کبھی پر خم کیا تو نے

میری اس دھمکی کو سن کر وہ پہلے ششدر ہوئی تھی پھر جھینپ کر ہنس دی۔ مجھے اب ہرگز بھی عون کی خاموشی، گم صم کیفیت اور بے نیازی کی فکر نہیں رہی تھی۔ میں نے وہ محاذ سر کر لیا تھا جس کی مجھے خواہش تھی اب عون مرتضیٰ کو کاری ضرب لگانے سے مجھے کون روک سکتا تھا۔ ڈسچارج ہونے کے بعد میں گھر چلا گیا۔ اماں اور داور بھائی وغیرہ ہاسپٹل بھی آتے رہے تھے ان کا ارادہ گھر پر بھی میرے ساتھ قیام کرنے کا تھا مگر میں نے منع کر دیا۔ اماں تو خاصی خفا ہو کر گئی تھیں۔ داور بھائی کی ناگواری خوشی وغیرہ کبھی مجھ پر ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے اور مجھے ان کی یہ بات اچھی لگتی تھی کہ وہ خواہ مخواہ رشتوں سے توقعات باندھتے تھے نہ ان کے ٹوٹنے پر واویلے کے عادی تھے۔ عون کے گھر والے وقتاً فوقتاً میری خیریت دریافت کرنے آجاتے۔ پتا نہیں حجاب ساتھ کیوں نہیں آرہی تھی۔ میں کچھ مضطرب ہونے لگا۔ جب یہ پریشانی تشویش میں بدلی تو میں نے حجاب کو فون کر لیا تھا۔ میں اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا رہا۔ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے حجاب کو منع کیا گیا ہے۔ اور ایسا کرنے والا عون کے سوا بھلا اور کون ہو سکتا تھا۔ مگر حجاب نے ایسی کسی بات کا اشارہ نہیں دیا۔ وہ جتنی سادہ اور اور سچی تھی میں اس کے متعلق کچھ غلط چاہتا بھی تو نہیں سوچ سکتا تھا مگر یہ بات ضرور تھی کہ عون کا رویہ مجھے محتاط ہی نہیں مشکوک بھی کر رہا تھا۔ میں حجاب کی طرف سے خدشات کا شکار ہو رہا تھا کہ اگلے روز اس کی آمد نے مجھے حیرت، خوشی اور مسرت کے احساس سے گنگ کر دیا۔ وہ یونین فارم میں تھی صاف ظاہر تھا گھر والوں کے علم میں لائے بغیر اس نے یہ بولڈ اسٹیپ لیا تھا۔ مجھے لگا جیسے عون مرتضیٰ کی عزت کی نیلامی کی پہلی بولی لگ گئی ہو۔ میرے اندر کوئی مسلسل بیجانی قہقہے لگانے لگا۔ وہ میرے ساتھ باتیں کر رہی تھیں مگر میرا دل و دماغ حاضر نہیں تھا۔ میں اسے قریب پا کے حواسوں سے اور تہذیب کے دائروں سے نکلنے کو مچل اٹھا تھا۔ میں نے اسے اپنے قریب بلایا تو وہ جھجک گئی تھی۔ اس کے نرم انکار پر بھی میں طیش اور ہیجان سے بھرنے لگا تھا۔ میں اس سے باقاعدہ جھگڑنے لگا۔ مجھے لگا ابھی کچھ دیر قبل جس کامیابی کے احساس نے مجھے مسحور کیا ہے وہ میری خام خیالی تھی۔ وہ مجھے ملنے ضرور آگئی تھی۔ مگر وہ نفس اور خواہش کی اتنی غلام نہیں ہوئی تھی کہ میری ہدایات پر عمل کر کے مذہب کی مقرر کردہ حدود کو پھلانگ جاتی۔ اس کے اسی گریز اور احتیاط نے مجھے طیش میں مبتلا کیا تھا۔ یہ طیش جنون کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں ہر قیمت پر آج من مانی چاہتا تھا اس گھٹیا لڑکی کی خاطر میں نے خود پر بہت جبر کیا تھا۔ کتنی وحشت کو سہا تھا میں نے، آج میں اس وحشت میں اسے مبتلا کرنے دینے کی اندھی خواہش میں جکڑا جا چکا تھا۔ میں نے اس خواہش پر عمل کیا تھا اور اسے زبردستی خود سے قریب کر لیا اتنا قریب کہ سارے فاصلے سمٹ گئے۔ اس کی سراسیمہ صورت، ہیجان زدہ دھڑکنیں، مجھ سے کتنی نزدیک آگئی تھیں۔ معاً میں

سنبھل گیا میں معاملے کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی دوستوں کو اندر سمیٹ کر میں نے اپنی گرفت میں نرمی کو شامل کیا۔ لگاوٹ اور محبت کو چاہے جھوٹی سہی۔ ایک بار پھر میں نے ڈائلاگز کا سہارا لیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کتنے جھوٹے اور کتنے سچے تھے میں اپنی پر سنائی کی سحر انگیزی سے آگاہ تھا میں اسے اسی سحر میں جکڑ لینے کا خواہش مند تھا وہ پریشان تھی۔ مضطرب اور بے چین بھی۔ اس نے میرے حصار سے نکلنے کو مزاحمت بھی کی تھی مگر میں آج اس کی چلنے دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ آج میں نے اپنا طریقہ واردات مختلف رکھا تھا۔ میں اسے زبردستی سے نہیں نرمی آسانی اور محبت سے لوٹنا چاہ رہا تھا اور میں نے دیکھا تھا مجھے اس میں کتنی کامیابی مل رہی تھی۔ میں نے گستاخی کی انتہا کر دی۔ میں نے جھک کر بار بار اس کی گردن اور چہرے کے مختلف نقوش کو چومنا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب ایک غیر متوقع حرکت ہوئی کیمرے کی مخصوص آواز کے ساتھ فلیش لائٹ چمکی تھی اور پہلے بعد دیگرے ہمارے کئی فوٹو بن گئے۔ حجاب سراسیمہ ہو کر مجھ سے فاصلے پر ہوئی میں خود بھی ٹھٹھک گیا تھا۔ ولید کے ہاتھ میں کیمرہ تھا اور وہ بڑی ذلیل قسم کی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے فتح مندانہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی بکو اس پر کان دھرے بغیر اسے سخت ست سنائی تھیں۔ جواباً وہ خائف ہوئے بغیر طنزیہ حقارت بھری نظروں سے حجاب کو دیکھ کر اپنے الفاظ کے نشتر اچھالنے لگا۔ میں شدید طیش میں مبتلا تھا۔ میرے لیے اگر اس سارے معاملے میں تشویش کی کوئی بات تھی تو وہ قبل از وقت عون تک یہ بات پہنچ جانے کی تھی۔ ورنہ حجاب بی بی کی عزت داؤ پر لگ جانے کی مجھے کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑ کر واپسی کو جاتے ولید کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ اور اسے کیمرہ وہاں چھوڑ دینے کا حکم دیا تھا۔ جواباً اس نے حجاب کے بعد مجھے بھی طنز کا نشانہ بنایا مجھے کہیں سے بھی وہ ولید نہ لگا جسے میں آج سے قبل جانتا تھا۔ اس کے متکبرانہ انداز نے مجھے غضبناک کر دیا تھا۔ میں آؤ تاؤ دیکھے بنا اس پر پل پڑا۔ وہ جو ہمیشہ میرے آگے بھیگا بلا بنا رہتا تھا میرے لیے مشکل ہدف ثابت ہونے لگا۔ شاید میں زخمی تھا اس وجہ سے اس نے مجھ پر جلد برتری حاصل کر لی۔ حجاب کے سامنے اس ہزیمت پر میں جیسے خود سے بھی نظریں چرا رہا تھا۔ طیش اور غم و غصے سے میں ہڈیاں بکنے لگا تھا۔ ولید پرواہ کیے گا کیمرے سمیت وہاں سے جا چکا تھا۔ حجاب شاکد کھڑی تھی۔ بالکل پتھرائی ہوئی۔ مجھے ایک پل کو اس پر ترس بھی آیا۔ میری تسلی کے جواب میں اس کی کیفیت میں فرق آیا اور وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے اور سسکنے اور ہلکنے لگی۔ میں نے اسے دلاسا دینا چاہا تھا مگر وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ میں نے بھی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ بھاڑ میں جائے اس کی نیک نامی اور عزت۔ ایک دن مجھے بھی تو اسے مٹی میں رولنا تھا نا۔ ذرا پہلے رل گئی تو غم کس بات کا؟



حجاب کے جانے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام ولید سے رابطہ کرنے کا کیا تھا۔ مگر وہ خبیث میرافون مسلسل کاٹ رہا تھا۔ مجھے غصہ آیا تھا۔ جیہی میں نے سیل فون پٹخ دیا تھا۔ اگلے دن میں اپنی بیماری کی پرواہ کیے بغیر آفس پہنچا تھا اور مینجر سے ایک اہم میٹنگ رکھی۔ اپنی فیکٹری سے ولید کے شیئرز علیحدہ کر دینے سے مجھے ہرگز کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس سے مکمل قطع تعلقی اختیار کر لینے کے بعد میں واپس گھر لوٹا تو پہلے

مضمحل تھا۔ اب پتا نہیں کیا ہونا تھا۔ حجاب والا معاملہ ایک بار پھر اتنا کا شکار ہو رہا تھا۔ اگر ولید عون کو وہ تصویریں دکھا دیتا تو یقیناً وہ کوئی بڑا قدم اٹھاتا جو سراسر میرے منصوبے کے خلاف جاتا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے ہرگز سمجھ نہیں آرہی تھی۔ دو تین دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ تیسرے دن ولید خود میرے پاس آن دھمکا۔ میں نے سر و نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ کچھ کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

”آپ نے اس روز بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ اچھو کلی میں نے وہ صرف ڈرامہ کیا تھا۔ آپ پر جو ہاتھ اٹھایا اس کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ تصویریں لے لیں۔ میرا خیال ہے ان کی سب سے زیادہ ضرورت آپ کو ہی ہے۔ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ میں نے تصویریں لینے کو ہاتھ نہیں بڑھایا۔ تو اس نے لفافہ میری گود میں رکھ دیا۔“

”دیکھیں تو سہی ابوداؤد صاحب! کیا شاہکار آئی ہیں۔“

اس کا انداز چالپو اسانہ تھا۔

”تم یہاں سے اپنی شکل لے کر دفعتاً ہو جاؤ۔ ورنہ تمہارا جو حشر میں کروں گا۔ خود کو پہچان نہیں سکو گے۔“

میں پھنکارا تو وہ جواباً ہنس دیا۔

”نہ جی دوستوں اور سجنوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں آپ حجاب بی بی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میں ہر بات کو جانتا ہوں جی! مجھے اندازہ تھا کہ آپ کو ان تصویروں کی ضرورت پیش آئے گی میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں اگر آپ کو پہلے سے حجاب بی بی کی آمد کا اندازہ ہوتا تو آپ تصویریں کیا خفیہ مووی کیمرے کا انتظام کر کے رکھتے۔ عون بھائی کو جو دکھانا ہوتا یہ ثبوت۔“

اس کے راز درانہ لہجے میں خباثت کمینگی اور بد معاشی سب کچھ تھا۔ میں نے چونک کر اسے پہلی بار بغور دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟ کیا بکو اس کر رہے ہو تم؟“

میں غرانے کے انداز میں بولا تو وہ خائف ہوئے بغیر مسکرایا تھا۔

”آپ نہیں جانتے مجھے لیکن میں جانتا ہوں۔ آج سے نہیں آٹھ سال پہلے سے۔ تب جب آپ اور عون بھائی اکٹھے یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد آپ کا جھگڑا ہوا تھا ان سے اور..... وہ ساری باتیں دہرا رہا تھا جو میرے دل و دماغ پر نقش تھیں جنہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور مجھ سے ایک سال جونیئر تھا۔“

”میں نے وہ ساری لڑائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ پوری جامعہ میں اگر آپ کا دل سے کوئی ہمدرد تھا تو وہ میں تھا داؤد صاحب! میں جانتا تھا آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ میں دیگر اسٹوڈنٹس کی طرح عون مرتضیٰ سے امپریس تھا نہ ہی ان کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس بات کو سالوں بیت گئے میں بھی فراموش کر دیتا اگر میں آپ کو دوبارہ عون بھائی کے ساتھ نہ دیکھتا۔ آپ یکسر بدل گئے تھے مگر آپ کی آنکھیں وہی تھیں۔ آپ کا نام وہی تھا۔ مجھے تب آپ کو دیکھ کر لگا تھا آپ کی آمد بے وجہ، بے معنی نہیں ہے۔ آپ یقیناً کسی خاص

مقصد سے آئے ہیں اور ایسا ہی ہوا۔ اس روز جب حجاب کو میں نے یہاں آپ کے ساتھ دیکھا تو میرے یقین کی تصدیق ہو گئی۔ میں آپ کا دوست ہوں داؤد صاحب! آپ سے بزنس میں شراکت بھی اسی وجہ سے کی تھی کہ میں آپ کے نزدیک رہنا چاہتا تھا۔ آپ کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔“

”مگر مجھے تمہاری کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاسکتے ہو۔“

میں نے اس کی طویل تقریر کو سن کر بھی بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تو وہ کچھ خائف نظر آنے لگا تھا۔

”آپ نے شاید میری باتوں کا یقین نہیں کیا۔“

”یقین کر بھی لوں تو تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“ میرا لہجہ ہنوز خشک تھا۔ چٹخا ہوا۔

”چلا جاتا ہوں داؤد صاحب! لیکن میں آپ پر اپنی سچائی ضرور ثابت کروں گا۔“

اس کے جذباتی ڈائیلاگ پر میں نے قطعی دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کا وہیں چھوڑا ہوا لفافہ چاک کر کے میں نے تصویریں نکال لی تھیں۔ اور بہت اطمینان بھرے انداز میں بغور تکتے لگا۔ حراساں متوحش اور سراسیمہ سی وہ میری جبری جساتوں کے آگے کتنی بے بس نظر آرہی تھی۔ ہر تصویر میں میں جتنا گستاخ اور بے باک تھا وہ اسی قدر مضطرب! میں مسکرا دیا۔ کسی مناسب موقع پر عون مرتضیٰ کے لیے یہ بہترین تحفہ ہو سکتی تھیں۔ وہ موقع کب اور کیسے آتا تھا یہ فی الحال میں نے سوچا نہیں تھا۔



میری طبیعت کچھ اور خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ملازم چھٹی پر تھا ایک لے دے کے وائچ مین تھا اسے ویسے بھی کچھ کرنا نہیں آتا تھا۔ رضیہ ویسے ہی بے وقوف تھی۔ مجھے اکثر بھی لگتا وہ مجھ سے کچھ خائف رہتی ہے۔ وقت کے وقت کھانا پہنچاتی کمرے کی ڈسٹنگ ایسے وقت میں کرتی جب میں واش روم میں نہا رہا ہوتا۔ مجھے اس کی احتیاط اور گریز پر ہنسی آتی۔ ایک تو وہ اتنی چھوٹی تھی دوسرے ایک حقیر اور غلیظ سی ملازمہ کو میں اپنے قریب لانے کا سوچتا بھی تو میرا جی متلانے لگتا تھا۔ میرا کافی کاجی چاہ رہا تھا مگر رات بہت ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں لگتا تھا رضیہ جاگتی ہوگی۔ دل پر جبر کر کے میں پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ تب ہی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا میرا سیل فون واہریت کرنے لگا تھا۔ نیم تاریک کمرے میں اس کی بلنک کرتی اسکرین اور تھر تھراہٹ نے میری توجہ فوراً اپنی جانب مبذول کی تھی۔ میں کچھ دیر سا کن لینا اسے گھورتا رہا پھر اٹھ کر کال پک کر لی تھی تو وجہ دوسری طرف حجاب کی موجودگی تھی وہ میرے لیے پریشان تھی مگر میرا موڈ اتنا خراب تھا کہ اس کی یہ تشویش بھی اچھی نہیں لگی۔

میں نے اسے ڈانٹا تھا جس کے جواب میں وہ رونے لگ گئی تھی۔

”ولید نے کوئی گھٹیا حرکت کی کوشش تو نہیں کی؟ آئی مین عون کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟“

”ابھی تک تو سب ٹھیک ہے میں خود بہت پریشان ہوں۔“

میں کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اسے تصویروں کے متعلق بتایا۔

”آکر لے جاؤ وہ تمہاری امانت ہے میرے پاس!“

اسے بلانے کو مجھے کوئی بہانہ تو چاہیے ہی تھا۔ جواباً وہ مہرا نے لگی تھی۔
 ”آپ انہیں ضائع کر دیں داؤد وہ ایسی تھوڑی ہوں گی کہ دیکھی جائیں۔“ وہ بے حد شرمسار اور
 مدہم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

چند ادھر ادھر کی باتوں اور مجھے اپنا خیال رکھنے اور اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کیا
 تو میرا موڈ کسی حد تک بحال ہو چکا تھا۔ مجھے اگلے دن کے انتظار میں وقت کا ٹٹا مشکل ہونے لگا۔ پتا نہیں وہ آتی
 بھی تھی یا نہیں؟ خوف کا احساس میرے اندر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ رات جیسے تیسے بیت گئی اگلی صبح میں چونکہ
 رات بھر کا جاگا ہوا تھا جی بھی آنکھ لگ گئی۔ تقریباً دس بجے میں جاگا تو سب سے پہلے انٹرکام پر واچ میں سے
 کانٹیکٹ کیا تھا اور اس نے حجاب کے بارے میں سوال کیا۔
 ”صاحب وہ بی بی تو ابھی تک نہیں آیا۔“

”او کے جب آئیں تو فوری میرے کمرے میں بھیج دینا۔“
 میں نے خصوصی تاکید کی تھی۔ اور اس کے بعد انٹرکام پر ہی رضیہ کو ناشتے کا آرڈر کیا تھا اور خود
 نہانے چلا گیا۔ بنیان اور شرٹ کا تکلف برتے بغیر میں صرف جینز پہن کر باہر آ گیا۔ موسم خراب ہو چکا تھا میرا
 اضطراب کچھ بڑھ گیا۔ اب شاید حجاب نہ آ پاتی۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے آفس مینجر کو فون کیا اور اسے کچھ
 ہدایات دی تھیں۔ پھر بستر سنبھال کر اپنا دھیان بٹانے کو ٹی وی آن کیا اور چینل سرچنگ میں مصروف ہو گیا۔ اس
 کام سے بھی جلد اکتاہٹ ہونے لگی تو جھنجھلا کر ٹی وی بھی آف کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری جھنجھلاہٹ کچھ
 اور بڑھتی انٹرکام کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سرعت سے جھپٹ کر ریور اٹھایا۔

”صاحب بی بی آ گیا ہے۔ ام نے اندر بھیجا ہے۔“
 ”اوہ!!!“ میرے جیسے اندر تک طمانیت ابھرا گئی۔ میں نے خود کو بیمار ظاہر کرنے کو لیٹنا ضروری
 سمجھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ میرے سامنے تھی۔ ایک بار پھر وہ گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک چکی تھی۔
 وہ یونیفارم میں تھی۔ مجھے اپنی فتح اور کامرانی کا احساس دو چند ہونے لگا۔ میں اس کو دیکھ کر اٹھ بیٹھا! وہ آ تو گئی تھی
 مگر جیسے خود سے بھی خائف اور گریزاں تھی۔ میں نے اس کے اس گریز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اسے اپنے
 پہلو میں بٹھالیا تھا۔ جب اس نے ایک عجیب بات کہی جو مجھے بے حد فضول لگی تھی۔ اس نے مجھے شرٹ پہننے کا
 کہا تھا۔ مجھے جیسے آگ سی لگ گئی۔ وہ بہت پارسا بننے کی کوشش کر رہی تھی اب تک، جبکہ وہ دوبار خالصتاً اپنی
 مرضی سے میرے مجبور کیے بنا مجھ سے مکمل تنہائی میں ملنے آ چکی تھی۔ میرا دل چاہا میں اس بات کے جواب میں
 اسے منہ کی ماروں مگر میں نے اپنا غصہ ضبط کر لیا تھا۔ اور کسی قدر شرارت بھرے انداز میں اپنے متعلق ٹڑکیوں کی
 دیوانگی جتلائی تھی مگر اس کے پر نخوت جواب نے ایک بار پھر مجھے ساگا کے رکھ دیا۔ میرا دل چاہا تھا دو تھپڑ مار کر
 اس کا عرش معلیٰ پر پہنچا ہوا دماغ ٹھکانے لے آؤں۔ کیا سمجھ رہی تھی وہ خود کو، اب وہ مضبوط کردار تھی نہ اب
 چھوٹی۔ میں متعدد بار اسے اپنی من مرضی سے چھوچکا تھا مگر اس کا طنطنہ تھا کہ تنوز برقرار تھا۔

مگر اپنے غصے کو قابو میں رکھ کر میں نے ایک بار پھر خود کو کمپوز کیا تھا اور اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر خود سے نزدیک کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ وقت تھا جب میں پوری طرح کھل کر اپنا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ اب مزید صبر تھا نہ وقت کہ میں ٹالے جاتا۔ مگر میری بے تکلفی کے مظاہرے نے اسے تپا دیا تھا۔ وہ شدید ناگوار تاثرات لیے مجھ سے اپنا آپ چھڑا کر اٹھنے لگی تھی کہ میں نے وحشت بھری بے صبری سے اسے پھر دبوچ لیا۔

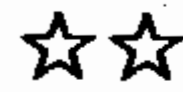
”کیا ہوا؟“

میں نے جتنی بھی لا تعلقی سے پوچھا ہو۔ وہ اسی حد تک تلخ ہو رہی تھی۔ جواب میں اس نے مجھے تند لہجے میں لعن طعن کی تھی تو مجھے بھی غصہ آنے لگا۔

”بد تمیزی کوئی کی ہے میں نے؟ تم بد تمیزی کا مطلب جانتی ہو؟“

میں نے جواباً تلخی اور درشتی سے اپنے دل کا غبار اچھی طرح نکالا۔ ابھی کچھ دیر قبل اسے دیکھ کر جو میری کیفیت ہوئی تھی وہ میں نے اسے نشتر بنا کر چھو دی میں نے اسے باقاعدہ طعنے دیئے تھے۔ اور کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی چادر اُتار کر دور پھینک دی۔ میرا انداز اس قدر تحقیر آمیز تھا کہ وہ بھونچکی رہ گئی۔ اسے شاید مجھ سے اتنے گرے ہوئے سلوک اور ایسے الفاظ کی توقع نہیں تھی۔ مگر میرے اندر تو آگ لگی ہوئی تھی میں اس آگ میں اپنے ساتھ اسے بھی جلا کر خاکستر کر دینے کے درپے تھا۔ طیش اور غیض نے مجھے بے قابو کر دیا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود کر دی تھیں۔ وہ بھی صدمے سے گنگ تھی شاید حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں تھی۔ میں اپنی من مانی کو آزاد تھا۔ میں نے اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا چاہا تھا۔ مگر میری قسمت ہی شاید خراب تھی۔ میں شاید جیتنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہی نہیں گیا تھا جیسا عین موقع پر جب میں جیت اور فتح سے ہمکنار ہونے جا رہا تھا۔ عون مرتضیٰ کی ناگوار انٹری نے مجھے سر تا پا جھلسا کے رکھ دیا۔ مگر آج میں ہرگز ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ جیسا عون مرتضیٰ کو آگ لگائے جلا کر خاکستر کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے حجاب کے بعد اسے بھی طعنوں کی زد پر رکھ لیا۔ حجاب میرے بازوؤں میں تھی اور میں کچھ اور گستاخ اور بے باک ہو رہا تھا۔ عون مرتضیٰ نے مجھے ملامت کی تھی اور مجھے برا بھلا کہا مگر مجھ پر کیا اثر ہونا تھا۔ پھر وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اور حجاب کو میری گرفت سے چھڑا کر فاصلے پر کر دیا۔ وہی لمحہ تھا جب اس پر میں اپنی اصلیت اور ارادوں اور عزائم کے ساتھ پوری طرح واضح ہوا تھا۔ پہلے تو شاید کوئی شبہ تھا جس کی وجہ سے وہ میرا لحاظ کرتا رہا تھا مگر اب جبکہ یہ لحاظ ختم ہوا تو ہم صرف دشمن تھے۔ کچھ دیر تک ہم نے ایک دوسرے کی ٹھکانی کر کے گویا اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ وہ شدید طیش میں تھا مگر اس طیش میں بھی اس کے حواس بحال تھے۔ جیسا حجاب کی مداخلت پر اس نے اسی غیض و غضب کی کیفیت میں اسے بھی ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ وہ شاید بے توازن تھی جیسا لڑکھڑا کر دور ہا گری۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر مجھے اس کی نظروں میں اچھا تو بننا تھا وہ بھی اس وقت جب اس کا بھائی اس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا تو اسی قدر جذباتی بھی۔ میں اس کے جذبات ہی تو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بازی جس طرح پلٹی تھی میری ہار کے امکان کچھ اور روشن ہو گئے تھے۔ عون مرتضیٰ خود مر کے

بھی حجاب کو میرے حوالے نہ کرتا۔ اگر حجاب میرا ساتھ دیتی تو یہ ہی میری فتح کی وجہ بن سکتی تھی۔ جی میں اس کی جانب لپکا تھا۔ مقصد محض اس کی ہمدردی اور توجہ حاصل کرنا تھا۔ مگر عون مرتضیٰ کو جیسے کسی نے آگ لگا دی۔ اس نے مجھے حجاب تک پہنچنے سے قبل دیوچ کر پھر اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ ایک بار پھر آٹھ سال پہلے والا عون مرتضیٰ تھا۔ ویسا ہی غصیلا۔ تند خو اور مار دھاڑ کا شوقین۔ اس نے میری مزاحمت اور دفاع کے باوجود مجھے اچھا خاصا پیٹ ڈالا۔ کچھ دانستہ بھی میں خود ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اس مقام پر جب حجاب وہاں تھی۔ اور مجھے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اٹھانی جانے والی ذلت، سبکی اور زخموں کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ میرے گھر میں اس وقت صرف تین ملازم تھے۔ واج مین، رضیہ اور بوڑھا مالی۔ رضیہ اور مالی تو خیر میری کیا مدد کرتے البتہ واج مین حواس باختہ تھا پھر اس نے ہی صورتحال میں خود کو سنبھالا اور عون مرتضیٰ کو اپنی گن کی زد پر لے لیا تھا۔ مگر وہ جیسے ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک اور ضرب لگائی تھی اور جاتے جاتے حجاب کی انگلی اتار کر گویا اس سے وابستہ میرا ہر رشتہ، ہر تعلق ختم کر گیا۔ مگر کیا اس کے اس طرح کرنے سے میں نے بھی ہر رشتہ ہر تعلق ختم کر لیا تھا۔



تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حال دل یار سے کہوں کیونکر

ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

چارہ دل سوائے صبر نہیں

سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

میں نے جب حجاب کے نمبر پر یہ اشعار سینڈ کر دیے تب مجھے خیال آیا تھا کہ اس کا سیل فون کہیں آف تو نہیں۔ میں نے اس کا نمبر ٹرائی کیا تو خدشہ درست نکلا تھا نمبر بند تھا۔ میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ مجھے قطعی سمجھ نہیں آرہی تھی ایسی حالت میں، ایسی چوہیشن میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جھنجھلاہٹ اور بے زاری میرے روم روم میں آن سائی تھی۔ مجھے لگا تھا جیسے میں منزل کے قریب پہنچ کر بھٹکا دیا گیا ہوں۔ روشنی کا سفر کرتے ایک دم گھٹا ٹوپ اندھیروں میں اکھڑا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی شکست اپنی ہار کسی طور بھی قبول نہیں تھی۔ اگلے دو دن حجاب سے کاتھیکٹ کی کوشش میں گزرے جو مسلسل ناکامی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کا لینڈ لائن نمبر ٹرائی کیا تھا۔ فون عون نے اٹھلایا تھا۔ مجھے لگایہ پہرا بہت سخت ہو۔ وہ کسی قیمت پر بھی اب مجھے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں دانت بھینچ کر رہ گیا۔ میرا دماغ سن ہونے لگا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے زوما کی خدمات حاصل کرنے کا سوچا علیحدہ طرف سے بھی کچھ خاموشی تھی یا میں اپنے مسائل میں کچھ اس بڑی طرح الجھا تھا کہ کسی اور کی خبر ہی نہیں رہی تھی۔

اس کام کے لیے میں نے زوما کو کال کی تھی۔ اور ہماری صورتحال اس کے سامنے رکھی مانشی کی بھید بھری داستان کے بغیر منگنی توڑنے کی اطلاع کے ساتھ میں نے چھ جذباتیتِ حجاب کے لیے ظاہر کرنا ضروری خیال کیا تھا۔

”اس کا بھائی میری اس سے بات نہیں ہونے دے رہا ہے زوما پلیئر ہیلپ می“

”کیا ہیلپ چاہتے ہو ابو داؤد؟“

اس نے گہرا سانس بھر کے پوچھا تھا میں اسے سمجھانے لگا۔

”تمہیں چھ بھی نہیں کرنا ہے زوما! اس کے گھر کے نمبر پر فون کر کے کہو مجھے حجاب سے بات کرنی

ہے۔ اس کی ایک دوست کا نام ثنا ہے تم خود کو ثنا ظاہر کرنا۔“

اس نے بلا تامل میری بات مان لی۔ مگر مجھے اس وقت شدید مایوسی اور دل گیری نے گھیر لیا جب

تسویٰ دیر بعد اس نے اپنی کوشش کی ناکامی کا مجھے مژدہ سنایا تھا۔

”کال اس کے کسی بھائی نے پک کی تھی ابو داؤد! اور بہت خشک انداز میں بات کی۔ وہ کہہ رہا تھا

حجاب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ابھی وہ بات نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا کب کرے گی یا وہ کالج کیوں نہیں آرہی تو

اس نے جواب دیئے بنا فون کاٹ دیا تھا۔“ میں نے خاموشی سے اس کی بات سنی تھی اور کچھ کہے بغیر سیل آف کر

دیا۔ مایوسی مجھے ہر سمت سے گھیر رہی تھی۔ اگلا ایک اور دن اسی بے زاری، اکتاہٹ اور جھنجھلاہٹ کی نذر ہو گیا۔

جی تو چاہتا تھا زبردتی گھس جاؤں عون کے گھر اور حجاب کو اٹھالاؤں مگر انجام بخیر ہرگز نہ ہوتا۔ عون کے جو تیور تھے

وہ مجھے شوٹ کر کے خود سولی چڑھ سکتا تھا۔ اور یہ مجھے کسی طور بھی گوارا نہیں تھا۔ میں زندہ رہنا اور عون مرتضیٰ کو ایسا

زخم لگانا چاہتا تھا جو اسے عمر بھر کی کسک اور شرمندگی سے دوچار کر دے۔ وہ ساری زندگی سکون اور عزت کو ترس

جائے۔ اور اس کے لیے مجھے جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت تھی۔ جی میں خود پر جبر کرتا رہا تھا۔ یہ اسی شام کی

بات ہے جب میرے سیل پر ولید کی کال آنے لگی تھی۔ میں نے اس کا نمبر دیکھا اور نظر انداز کر دیا میں جس قسم کی

صورتحال میں مبتلا تھا اس جیسے کھڑوس کی باتیں سننے کا ہرگز موڈ نہیں تھا۔ مگر وہ کسی کتے کی ہڈی کی طرح ڈھیٹ

تھا۔ باز آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مسلسل کال کیے گیا تو میں نے جھلا کر فون آف کر دیا تھا۔

مگر اس وقت میرا پارہ چڑھ گیا تھا جب ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد واج مین نے مجھے اس کی آمد کی اطلاع

انٹرکام پر دی تھی۔

”میں اسے ملنا نہیں چاہتا۔ اس خبیث سے کہو اپنی شکل سمیت دفنان ہو جائے۔ ورنہ میں اسے

شوٹ کر دوں گا۔“

میں بولا نہیں تھا غرایا تھا۔

”ابو داؤد صاحب! اتنے جذباتی نہ بنیں۔ میں آپ کا خیر خواہ اور دوست بن کر آیا ہوں۔ آپ کی اس

معاملے میں مداخلت کرنے جس کی وجہ سے آپ پریشان ہیں۔“

انٹرکام پر کچھ جھنجھٹا ہٹ کے بعد میں نے ولید کی متحمل آواز سنی تھی۔ وہ شاید واج مین کو زبردتی

پرے کر کے انٹرکام پر خود آ گیا تھا۔

”بکو اس منٹ کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے مجھے!“

میں پھر چیخا مگر وہ خائف نہیں ہوا تھا۔

”ابو داؤد پلیز محض پانچ منٹ دیں مجھے۔ آپ کے فائدے کی بات نہ ہوئی تو جو چور کی سزا وہی میری۔“

اس نے بے حد کجی ہو کر کہا تو میں نے ہونٹ بھیجنے لیے تھے۔ کچھ سوچا پھر اس کی بجائے واچ مین کو

مخاطب کیا تھا۔

”اے آنے دو خان!“

واچ مین کو ہدایت کے بعد میں نے انٹرکام کا ریسورر کھ دیا۔ رضیہ اس وقت میری ہدایت پر مجھے کافی

دینے آئی تھی۔

”جو صاحب باہر آئے ہیں انہیں یہیں بھیج دینا۔“

میری تاکید پر وہ سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ اگلے پانچ منٹ میں ولید میرے سامنے تھا۔

”بکو کیا بکنا ہے؟“ میں نے زروٹھے پن سے کہا اور خشکیں نظروں سے اے گھورا۔

”میں جانتا ہوں آپ بہت خفا ہیں مجھ سے۔ مگر جو اطلاع میں آپ کے لیے لے کر آیا ہوں وہ

آپ کو ابھی پہنچانا کتنا ضروری تھا یہ آپ کو سننے کے بعد اندازہ ہو جائے گا میں حقیقتاً آپ کا دوست ہوں یا دشمن!

میں بتا چکا ہوں کہ اس دن جو ہوا وہ محض مصلحت.....“

”ٹودی پوائنٹ بات کرو۔ ادھر ادھر کی ہانکنے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے اسے ڈپٹ کر کہا تو وہ گہرا سانس بھر کے بولا تھا۔

”آپ کے لیے حجاب یقیناً بہت اہم ہیں آئی تھنک آپ اے کھونا نہیں چاہئیں گے۔“

اس کی ڈرامائی گفتگو کے جواب میں میں نے سر و نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

کیا کہنا چاہتے ہو؟

”حجاب کی شادی عون بھائی نے اپنے کسی واقف کار سے طے کر دی ہے۔ ڈائریکٹ نکاح ہوگا۔ وہ

بھی ہفتہ پندرہ دنوں کے اندر آپ کو اگر میری اطلاع پر شک ہے تو خود تصدیق کرا لیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ کو

اس معاملے میں میری ہیلپ کی ضرورت ہے تو بھی میں دل و جان سے حاضر ہوں۔“

وہ میری سماعتوں میں صور پھونک کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میں گم صم کھڑا تھا۔



آٹھواں حصہ

”ابوداؤد صاحب کیا آپ کو شک ہے میری بات پر؟ میں نے کہا نا جس قسم کی چاہے تصدیق کرا لیں۔“

اس نے مجھے ساکن پا کر میرے کاندھے کو باقاعدہ ہلا کر متوجہ کیا تھا۔ میں کیا کہتا اس کی فراہم کردہ اطلاع نے میرے حواس سلب کر لیے تھے۔ مجھے اپنی صلاحیتیں بے کار ہوتی محسوس ہوئیں۔ حجاب کی شادی کسی اور سے ہو جانا صرف میری انسلٹ نہیں تھی۔ عون مرتضیٰ کی ایک اور فتح اور میری ایک اور نا کامی ہوتی جس سے میں اب مر کے بھی دو چار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ آپ اس خبر کی تصدیق کرا لیں داؤد صاحب! پھر اگر یہ اطلاع غلط ہو تو بھلے جو مرضی سزا دیجیے گا۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا اور میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا کہا تھا نہ چائے پانی کا پوچھا وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا بھی گیا یہ کہہ کر کہ وہ میری طرف سے خدمت کے موقع کا منتظر رہے گا۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی میں کتنی دیر تک اسی کیفیت کا شکار رہا تھا پھر میں نے اپنے اعصاب کا تناؤ کم پڑتا محسوس کیا۔ اتنا تو میں جان ہی گیا تھا اب مجھے میرا جوش کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے ایک مگ مزید گرم کافیا کا اپنے اندر اٹھھیلا اور پھر ولید کا نمبر ملایا تھا۔

”ہائے داؤد صاحب! مجھے یقین تو تھا کہ آپ مجھ سے رابطہ کریں گے مگر اتنی جلدی اس کی توقع نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا ہے آپ حجاب سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“

اس کا لہجہ شوخی اور گھٹیا قسم کی شرارت لیے ہوئے تھا۔ ذومعیت الگ تھی۔

”سنو مجھے حجاب کی ایک ایک لمحے کی رپورٹ چاہیے۔“

”آپ نے میری خبر کی تصدیق کرا لی ہے نا؟“

”مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں نے جو ابار سائنٹ سے کہا تو وہ عجیب سے انداز میں ہنسا تھا۔“

”اچھا گڈ! مگر داؤد صاحب جب کسی کا کام کیا جاتا ہے تو آپ کو پتا ہی ہے مفت نہیں کیا جاتا آپ

سمجھتے ہوئے ہوں گے میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

اس نے جیسے اپنے مقصد کی جانب آتے ہوئے کہا تو میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

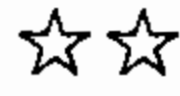
”تم جو کبھی گے میں دینے کو تیار ہوں۔“

او کے پھر آپ میرے شیئرز پھر سے اپنی فیکٹری میں شامل کریں۔ آپ تو جانتے ہیں داؤد صاحب

مجھے بزنس کا تجربہ ہے نہ کام کی عادت۔ بس آپ میرا منافع دیتے رہیے گا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ضرورت پڑی میں پھر آپ کو زحمت دے لوں گا۔“

اس نے خالص کاروباری انداز میں کہا تو میں نے ٹھنڈا سانس کھینچا تھا۔
 ”او کے فائن! تم مجھے حجاب کی شادی کی تاریخ پتا کر کے بتاؤ اس کے علاوہ بھی ہر بات، ہر بات سے مراد جانتے ہو؟ خاص طور پر یہ رپورٹ کہ وہ کب گھر سے نکلتی ہے۔“
 ”اس کی آپ فکر ہی نہ کریں داؤد صاحب! ہم خادم ہیں جی آپ کے۔ بس ہمارے اس احسان کو درکھیے گا۔“

وہ اپنے مخصوص سطحی انداز میں بولا تو میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سلسلہ کاٹ دیا تھا اب مجھے شدت سے اس کی اگلی رپورٹ کا انتظار تھا۔



دو دن بعد ولید نے بہت اہم اطلاع دی تھی کہ حجاب اپنے ہونے والی ساس اور نند کے ساتھ شادی کا شاپنگ کرنے جا رہی تھی۔ میں اس وقت سو کے اٹھا تھا اور بیڈٹی لے رہا تھا اس خبر نے اتنا طیش میں مبتلا کیا کہ میں نے غصے میں بے قابو ہو کر چائے کا ہاتھ میں پکڑا ہوا گلدستہ دیا تھا۔ ایک زور کا دھماکہ ہوا تھا اور ہر چیاں ہر سو بکھر گئی تھیں۔ رضیہ جو میرے کپڑے وارڈ روب سے نکالنے میں مصروف تھی سہم کر رہ گئی۔ میری آنکھیں یکبارگی جل اٹھیں تھیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور باتھ لیے بغیر گاڑی کی چابی جھپٹ کر باہر نکل آیا۔ ولید نے بتایا تھا وہ لوگ گھر سے نکل چکے ہیں۔ میں نے اسے ان پر نگاہ رکھنے کا کہا تھا۔ ولید نے میری ایت پر پوری طرح عمل کیا اور مجھے لمحہ لمحہ کی رپورٹ پہنچاتی تھی۔ صدر پہنچ کر وہ لوگ گاڑی سے نکل آئی تھیں۔ ب زادا اور نجیف محسوس ہوئی تھی۔ وہ کچھ گم صم اور ویران بھی تھی۔ اس کا مطلب تھا یہ جو کچھ ہو رہا تھا اس میں یقیناً اس کی رضا شامل نہیں تھی۔ مجھے ایک کمینی سی خوشی کے احساس نے اپنے حصار میں لے لیا۔ مختلف دوکانوں میں پھرتیں وہ جس بوتیک میں گھسی تھیں میں بھی وہیں چلا گیا۔ ولید کو میں اس سے پہلے فارغ کر چکا تھا۔ جس نے خود کو ان کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا وہ کپڑوں کی آرائش کے بڑے بڑے شوکیس تھے۔ ان کے بر دو بڑی قطاروں میں ہینگرز میں سجا کر ملبوسات اس طرح لٹکائے گئے تھے کہ ان کے درمیان جو جگہ تھی وہ ایک ایک اور تنگ سی گلی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ میں اس جگہ کپڑوں کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب بس مجھے موقع کی ش تھا جب میں اس سے بات کر سکتا۔ وہ ان دو تین مسکین سی خواتین کے ساتھ تھی جنہیں اس کی ساس نند وغیرہ نے کا خبط سوار ہوا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرا جی چاہا تھا ایک ایک جھانپڑا نہیں بھی رسید کر دوں مگر یہ بھرے بازار میں صنادہشت گردی کا واقعہ بن جاتا جس میں تماشا لگنے کے چانسز بہت حد تک نکلتے تھے اور میں ایسا ہی نہیں چاہتا۔ جیسی دل پر جبر کر لیا تھا۔ پھر مجھے وہ موقع ملا وہ اس جگہ کے پاس سے گزری جہاں میں تھا وہ تینوں خواتین آپس میں بات کرتے ہوئے آگے تھیں جبکہ حجاب ان کے پیچھے کچھ تھکی تھکی سی چل رہی تھی۔ ان عورتوں کے نکل جانے

کے بعد میں نے نہایت احتیاط اور چابک دقت سے حجاب پر گرفت کی تھی اور اس کے چیخنے کے خوف سے سب سے پہلے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر جمادیا تھا۔ اور اگلے لمحے وہ کسی مرغِ بکمل کی طرح میری بانہوں میں تڑپ رہی تھی۔ میں نے اسے جی بھر کے بہایا دھمکایا تھا پھر اسے سراسیمہ پا کے میں نے ایک دم اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا تھا۔ اور اس بے حد عجیب صورت حال کے باوجود میں نے مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں اس پر کچھ اشعار لڑھکائے تھے۔

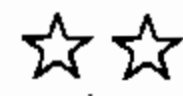
بے موسم بارش کی صورت دیر تلک اور دور تلک

تیرے دیارِ حسن پر میں بھی کن من کن من برسوں گا

شرم سے دہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بُندا بھی

بادِ صبا کے لہجے میں اک بات میں ایسی کہہ دوں گا

میرا مقصد اس پر اپنی برتری، اپنی زور آوری جتلانا تھا۔ اس لمحے میں بے حد گستاخ ہو گیا تھا۔ اور اس موقع سے کسی حد تک فائدہ اٹھا کر میں نے اس کی سراسیمگی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اسے وہاں — نیپ کے بعد میں ہاتھ جھاڑتا بہت ریلیکس انداز میں دوسری جانب سے نکل کر شاپ سے باہر آیا اور مگن انداز میں مارکیٹ کا چکر کھا کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ حجاب کوئی الحال چھوڑنے اور عون کو عبرت انگیز شکست دینے کا فیصلہ میں نے اس وقت کیا تھا کیسے؟ یہ میں سوچ چکا تھا۔



اگلا دن حجاب کے نکاح کی تقریب کا تھا جسے بہر حال انجام تک نہیں پہنچنا تھا۔ میں نے ولید سے باقاعدہ ایک طویل میٹنگ رکھی تھی۔

”تم سب کچھ جان تو چکے ہو کل جو موقع مجھے ملا میں اگر چاہتا تو اسی وقت حجاب کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے ہمراہ لاسکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا میری نفرت ایسے چھوٹے سے انتقام کی متقاضی نہیں ہے۔ عین نکاح کے وقت میں حجاب کو وہاں سے اٹھواؤں گا اور اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“

میں نے درزیدہ نظروں سے ولید کو دیکھا وہ اطمینان سے مسکرایا۔

”آپ فکر ہی نہ کریں داؤد صاحب! بس حکم کریں۔“

اس کے تابعدارانہ انداز نے مجھے تقویت دی تھی۔ میں نے اسے دو چار مسلح بد معاش ٹائپ غنڈوں کا انتظام کرنے کا کہا تھا جو اس وقت ہمارے ساتھ ہوتے۔ میں اس کام کے لیے ایک کثیر رقم ولید کو پہلے ہی آفر کر چکا تھا۔ مگر وہ بڑا کاروی آدمی تھا اس نے رقم دو گنا بڑھا کر مطالبہ کیا اور مجھے اطمینان دلایا ہر کام تسلی بخش ہوگا۔ اتنی رقم پر میں متذبذب ہوا تھا مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا میں نے اس کی مطلوبہ رقم کا چیک کاٹ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد مجھے رات کاٹنی اور اگلے دن کا انتظار بے حد کنھن اور دشوار محسوس ہوا تھا۔ خیر جیسے تیسے وہ وقت بیت گیا ولید مجھے لمحہ لمحہ کی رپورٹ دے رہا تھا۔ جس وقت اس نے مہمانوں کی عون مرتضیٰ کے ہاں آمد کی اطلاع دی تھی۔ میں اس کے بھیجے گئے بندوں کے ساتھ جو منتظر بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی میں ہم

عون مرتضیٰ کی رہائش گاہ کے عقبی سائیڈ پر پہنچے تھے۔ اگلے پانچ منٹ میں ولید بھی وہاں پہنچ گیا۔
 ”آپ نے بہت دیر کر دی ہے داؤد صاحب اب وقت بالکل نہیں ہے میرا خیال ہے نکاح شروع
 کا ہے۔ کوٹکلی اوکے۔“

وہ اہم اطلاع پہنچا کر خود غائب ہو گیا۔ اور میرے اندر جیسے پارہ بھر گیا تھا۔ اپنے مسلح ساتھیوں کے
 ساتھ میں بھی دیوار پھلانگ کر اندر گھسنا تھا اور ہم دندنا تے ہوئے ہال میں پہنچ گئے تھے جہاں ولید کی اطلاع کے
 قریب عین نکاح کا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔

”خبردار اونے کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا ورنہ بھون کے رکھ دیں گے۔“

مسلح ید معاشوں میں سے جن کے چہرے سیاہ ڈھانٹوں میں پوشیدہ تھے ایک کڑک کر بولا اور خوف
 کرنے کی نیت سے چند گولیاں ایک کھڑکی کے شیشے پر ماری تھیں۔ ایک زور کا چھٹکا ہوا اور شیشہ ٹوٹ کر
 پھیل گیا۔ خوف زدہ چیخوں کی آواز سے ہال کمر اگوںج اٹھا۔ میں نے مسکرا کر عون مرتضیٰ کی آنکھوں میں
 دیکھا تھا۔ وہ جیسے بھونچکا کھڑا تھا۔

”کیا خیال ہے سالاد صاحب! آپ کی عزت مآب بہن سے یہیں نکاح پڑھ لوں یا اپنے ساتھ لے
 جاؤں؟“

عون مرتضیٰ بے بسی سے مجھے دیکھ کر رہ گیا۔ اس وقت ایک مسلح بندے نے اسے اپنی گن کی زد پر
 ہوا تھا خود میرے پاس بھی لوڈ ڈسٹل تھا۔ مگر وہ پھر بھی خائف ہوئے بغیر دھاڑا اٹھا تھا۔ اس کی اس غراہٹ
 مجھے آپے سے باہر کر دیا۔ میں نے جواب میں اسے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں اور مسلسل آگے سے
 بے دیتا رہا۔ وہ جیسے بے بس ہو کر بھی بے بس نہیں تھا۔ مجھے صاف لگا جیسے وہ مجھے خواہ مخواہ الجھانا اور میرا وقت
 خرچ کرنا چاہتا ہو۔ جی میں نے حاضر دماغی سے کام لیا اور کچھ فاصلے پر سہمی ہوئی کھڑی حجاب کو ہاتھ سے پکڑ کر
 جانب کھینچ لیا۔ اس سے یقیناً میری یہ جسارت برداشت نہیں ہوئی تھی جی وہ زور سے چلایا تھا اور مجھ پر حملہ
 ہوا اس کے باوجود کہ وہ نہتا تھا اور میں مسلح۔ وہ نڈر اور بے خوف تھا مجھے ایک بار پھر اس کی جی داری کا
 سامنا ہوا۔ مگر اس بل اس کی بے خوفی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ میں نے حجاب کو سنبھالتے ہوئے
 مسلح بد معاش کو قمار کرنے کا کہا تھا۔ اس نے بلا جھجک میری ہدایت پر عمل کیا البتہ احتیاط یہ برتی گئی کہ قمار
 کی ٹانگوں پر کیا گیا تھا ایک دم ہر سو ہر اس اور چیخ و پکار مچ گئی۔ سب حجاب کو بھول کر عون کی جانب لپکے تھے
 باب بھی مگر میں اسے وہاں چھوڑنے کو نہیں آیا تھا میں نے سفاکی اور بے دردی کے ساتھ اسے اپنے ساتھ
 لے لیا تھا اور سرعت سے واپسی کے لئے مڑا۔ گھر کے ملازموں نے ہماری راہ روکنے کی کوشش کی تھی مگر یہ
 ٹھٹھ اور مزاحمت پریشان کن نہیں تھی۔ حجاب شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے اسے بڑے آرام سے
 سونے میں اٹھالیا۔ چند قدم کا فاصلہ طے ہوا تھا اور میں ایک بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب لوٹا تھا۔

کب تک رہو گے آخر یوں دور دور ہم سے

ملنا پڑے گا آخر اک دن حضور ہم سے

وہ حواسوں سے یکسر بیگانہ تھی۔ پہلے بے حد خوبصورت لباس میں وہ اپنے تباہ کن حسن کی تجلیوں کے ساتھ میرے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ گھر لاکے میں نے اسے بیڈروم میں بیڈ پر ڈال دیا۔ اس کا دوپٹہ اس کے تن سے جدا ہو گیا تھا۔ زہد شکن شعاعیں بکھیرتا روپ اپنی حشر سامانیوں کے ہمراہ بے خبری کے عالم میں میرے روبرو تھا۔ میں فتح کے نشے سے چور مسکرا دیا۔ اس کا چاند چہرہ اچھولوں کے زیورات کے ہالے میں اتنا روشن اتنا صبح لگ رہا تھا کہ میں اپنے آپ کو بہکنے سے روک نہیں سکا تھا۔ مگر اگلے لمحے میں سیدھا ہو گیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ یعنی بے خبر۔ اس طرح اس کا جو نقصان ہوتا وہ بے خبر رہتی۔ مجھے چھین جھپٹ کے بغیر کیا لطف آتا بھلا۔ مجھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا تھا میں پچھلے ایک دن سے بھوکا ہوں۔ میں کمرے سے نکلنے کے بعد دروازہ لاکڈ کر چکا تھا۔ کچن میں زرینہ مصروف عمل تھی۔ میں نے اسے کھانا تیار کرنے کا کہا اور خود لاؤنج میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ عون مرتضیٰ نے آرام سے نہیں بیٹھنا تھا میں جانتا تھا جیسی احتیاطا میں نے اپنی رہائش گاہ بدل لی تھی۔ اس جگہ کا پتا ولید کے پاس بھی نہیں تھا۔ میں اس معاملے میں بہت محتاط رہا تھا۔ جب تک زرینہ کھانا لے کر آئی میں نے عون مرتضیٰ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلی سے دوسری بیل پر اس نے میری کال پک کر لی تھی۔ ”کیسے ہیں سالا صاحب! اپنے ہونے والے بہنوئی صاحب سے بات کا اتنا اشتیاق؟ آف ابھی تو ہم نے آپ کی سسٹر کی نقاب کشائی بھی نہیں کی ریلی!“

”بکو اس بند کرو تم خبردار جو اپنی گندی زبان پر تم اس کا نام لائے۔“

وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ میں بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”کم آن عون! چلو ٹھیک ہے نہیں لیتا نام زبان سے مگر ہاتھوں سے تو اسے چھوؤں گا“ اس کے بغیر گزرا نہیں ہے۔ ویسے فکر نہ کرو میں چند دن گزارنے کے بعد تمہیں بہت جلد ماموں بننے کی بھی خوشخبری سناؤں گا۔“ میں نے کسی قدر خباثت سے کہا تو اس نے طیش میں فون بند کر دیا تھا۔ میں نے پھر ٹرائی کیا تیسری مرتبہ کی کوشش پر اس نے پھر فون ریسو کیا تھا۔ میں نے اس کی تھکی تھکی آواز سنی تھی۔

”ایسا مت کرو داؤد تمہاری دشمنی مجھ سے ہے عورت تو عزت ہوتی ہے اور عزت سب کی سانجھی۔“

اس کی آواز میں بھرا ہٹ تھی۔ میں مجنونانہ انداز میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”تمہیں سبرینہ یاد ہے عون مرتضیٰ! میں اس سے محبت کرتا تھا۔ لیکن تم نے اس کی وجہ سے مجھے

ذلیل و خوار کیا اور اسے مجھ سے چھین لیا۔“

”یہی تو میں کہنا چاہ رہا ہوں تمہارا مجرم میں ہوں۔ میں، ہر قسم کی سزا کے لیے تیار ہوں۔ مگر حجاب کو

چھوڑ دو۔ یہ عزت داروں کا شیوہ نہیں ہے۔ یہ سراسر بزدلی ہے۔“

”اچھا!!!“ میں نے دانت پیسے تھے۔

”مجھے سبق مت پڑھاؤ سمجھے! میں نے تو اسے عزت سے ہی اپنا نا چاہا سارا بگاڑ تمہارا پیدا کیا ہوا ب بھگتو۔“

میں نے پھنکارتے ہوئے کہہ کر فون بند کر دیا وہ مجھے پکارتا رہ گیا تھا۔ میں کچھ دیر کھولتا رہا تھا۔ نہ کھانے کی ٹرائی کے ساتھ پہنچی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بہت دنوں بعد میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ بڑے کا کافی کالک چڑھایا پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میری ہدایت کے مطابق زرینہ حجاب کے لیے کھانا لے کر لے آئی تھی۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور خود لپک کر حجاب کے کمرے کی جانب لپکا۔ سے دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ وہ یقیناً ہوش میں آچکی تھی۔ میں تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آیا اور درشتی سے پکڑ کر اپنی جانب رخ پھیرا۔

”کیا تکلیف ہے تمہیں کیوں چلا رہی ہو؟“

میں نے اسے سلگتی نظروں سے گھورا تھا۔ جواباً وہ بھری گئی تھی۔

”عون بھیا کو مار دیا نا آپ نے میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گی“ وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ بے پکڑتے سنبھالتے بھی اس نے اپنے لمبے ناخنوں سے مجھے کھرونج ڈالا تھا۔ اب اس قسم کی بدتمیزی سنت کرنا میری کوئی مجبوری نہیں تھی جی میں نے بلا درلغ اسے زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ وہ اُچھل کر جا کر گری اور ساکت ہو گئی۔ میں جو جھلکتی نظروں سے اسے گھور رہا تھا ایک دم ٹھٹھکا۔ اس کا یوں حواس کھو مجھے تشویش میں مبتلا کر گیا تھا۔ میں سرعت سے اس کے نزدیک پہنچا اور پنجوں کے بل جھک کر بیٹھتے ہوئے کا چہرہ تھپکا تھا۔ وہ مکمل طور پر غافل تھی۔ آنسوؤں سے تر چہرہ بھیگی پلکیں اور بکھرے بالوں کے ساتھ اس کی بڑی بڑی بالیاں پہنے وہ کسی طرح بھی مہندی کی دہن نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے پر رکھا اور اس کے سر کا پچھلا حصہ ٹٹولا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرے ہاتھ کی پوریں گاڑے اور سرخ خون سے بس۔ یہ چوٹ یقیناً اتنی گہری تھی جس نے اسے لمحوں میں ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ میں نے اسے ہٹ سے اٹھا کر بید پر منتقل کیا اور خود متفکر سا دواج مین سے رابطہ کرنے لگا۔

”بشیر یہاں قریب کوئی ڈاکٹر ملے گا۔“

”ملے گا صاحب! جی ٹی روڈ پر ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ خیریت؟“

”تم اسے یہاں لے کر آؤ فوری! کہنا امیر جنسی ہے۔“

”جی صاحب!“ اس نے تابعداری سے کہا تھا میں ریسور رکھ کر پلٹا وہ یونہی سا کن لیٹی ہوئی تھی۔

نے ٹہلتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا۔ تب ہی میرے سیل پر بیپ ہونے لگی تھی۔ میں فونک کر نمبر دیکھا۔ عون مرتضیٰ کا تھا۔ میں نے سردی نظر ڈال کر سیل فون سائلینٹ پر کر دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد انتظار کے بعد بشیر نے مجھے ڈاکٹر کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

”فوری اندر بھیجوا سے اور تم گیٹ پر ہی رہنا اور الرٹ رہنا کسی بھی قسم کا خطرہ ہو فوری مجھے اطلاع

دینا۔“ میں نے ایک بار پھر اسے وہی تاکید کی جو میں پہلے بھی کر چکا تھا۔
”آپ فکر نہ کرو صاحب۔“

اس نے کہا تھا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر حجاب کے اوپر کسبل پھیلا دیا۔ تب ہی ڈاکٹر دستک دے کر اجازت لیتا ہوا اندر آیا تھا۔ پھر اس کے سوالوں نے مجھے عاجز کر دیا تھا۔
”یہ آپ کی بیوی ہیں؟“

”انہیں چوٹ کیسے لگی۔“ وغیرہ وغیرہ اس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے میں نے خود کو کپہڑا رکھنے کی کوشش کی تھی اور بڑے دھڑے سے جھوٹ پر جھوٹ بول دیئے تھے۔ ڈاکٹر نے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد مرہم پٹی کر دی تھی۔ اور زخم کی جانب سے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

”انہیں ہوش کب تک آجائے گا ڈاکٹر صاحب!“

”میری تشویش اور پریشانی کم از کم مصنوعی نہیں تھی۔“

”میں نے انجیکشن دے دیا ہے کچھ دیر تک ہوش بھی آجائے گا۔ مگر بہتر ہوگا انہیں ذہنی ٹینشن سے محفوظ رکھا جائے۔“

مجھے ہدایتیں اور نصیحتیں دینے کے بعد ڈاکٹر رخصت ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا حجاب کو دیکھتا رہا پھر پلٹ کر باہر آ گیا تھا۔ زرینہ کو دودھ گرم کر کے لانے کا کہہ کر میں پھر اندر آیا تو حجاب دونوں ہاتھوں میں سر تھا مے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا پورا چہرہ ایک بار پھر آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھ کر میری جانب آئی اگلا لمحہ حیران کن ثابت ہوا۔ وہ میرے پیروں میں بیٹھ گئی تھی اور بار بار ایک ہی التجا کرنے لگی کہ میں اسے واپس بھیج دوں۔ میرے اندر جیسے زہر بھر گیا۔ ہونٹ بھیچنے میں نے اپنے قہر کو دبایا تھا اور اس سمیت اس کی التجاؤں کو بھی نظر انداز کر دیا۔ وہ تھک ہار کر چپ ہو گئی مگر اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔ میں پہلے خود صوفے پر بیٹھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا تھا میں نے اسے چپ ہونے کا کہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب اور بے بسی پھیل گئی۔
”آپ نے مجھے لانا تھا لے آتے مگر عون بھیا کو تو نہ مارتے۔“

میں نے اس کی بات پر جھلا کر اسے دیکھا تھا۔ پھر زہر خند سے پھنکار کر بولا تھا۔

یہ ماتم پھر کسی وقت کے لیے اٹھار کھو کیونکہ تمہارا چہتا ابھی زندہ ہے۔ پھر محض اسے یقین دلانے کی خاطر میں نے سیل فون اٹھا کر عون کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ میں ہر صورت اس کا رونا دھونا بند کرانا چاہتا تھا۔ اور اس لیے یہ ناگوار کام کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے کال پک کی میں نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔ کچھ دیر میں نے عون سے طنزیہ اور کلسانے والی گفتگو کی تھی۔ میرا لہجہ بے حیا اور بد لحاظ تھا۔ میرے خیال میں ابھی تو موقع آیا تھا اس سے بدلے چکانے کا، اسے تڑپانے کا۔ وہ مکمل طور پر میرے سامنے بے بس تھا۔ حجاب کچھ دیر سا کن بیٹھی رہی پھر میرے پاس سے اٹھ کر بیڈ پر جا بیٹھی۔ معاً اس کی نگاہ اپنے دوپٹے پر پڑی تو وہ جیسے چونک اٹھی تھی میں نے اسے خفت زدہ اور بے حد شرمندہ ہوتے دیکھا تو طنزیہ انداز میں ہنس پڑا تھا۔ وہ دوپٹہ اوڑھ رہی تھی اور میرے

اندرونی تسخرانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ میں اُٹھ کر اس کے نزدیک آ گیا۔
 ”کھانا کھا کر فریش ہو جاؤ۔ آج ان تمام فاصلوں کو میں ختم کر دوں گا جو تمہارے منحوس بھائی کی وجہ سے ہمارے درمیان ہمیشہ رہے ہیں۔“

اس نے چونک کر بلکہ خوفزدہ ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلنے لگا۔
 ”خبردار کسی قسم کی کوئی بکواس نہیں سمجھیں؟“ میں غرا اُٹھا تھا۔ مگر وہ خائف نہیں ہوئی۔
 ”تم جیسے اوباش اور لفنگے اس دنیا میں قدم قدم پر ملتے ہیں مگر ان کے منہ تو نہیں لگایا جاتا؟“
 اس کا لہجہ زہر آلود اور بے خوف تھا مجھے آگ لگنی ہی چاہیے تھی۔ میں نے ایک غضب کی حالت میں اسے جھپٹ لیا پھر اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر بے دردی سے جھٹکے دیتے ہوئے بولا تھا۔
 ”نہ لگنا منہ، گلے لگ جانا۔ منہ ہم خود لگالیں گے۔ ہونٹوں کو بھی خود لگالیں گے۔ تم خوبصورت ہو۔
 بلوریں جار میں چھلکتی ہوئی وہ مہنگی شراب ہو جسے پینے کو دل چل جاتا ہے۔ اگر تمہارا بھائی اتنا نہ اکڑتا تو آج تم اس انجام تک نہ پہنچی ہوتیں۔“

میں نے کسی قدر حقارت سے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے مگر کینہ تو ز نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے مجھ سے نگاہ ہٹا کر کچھ فاصلے پر پڑے کرٹل واز کو دیکھا تو میں بے ساختہ ہنس دیا تھا۔
 ”فارگاڈ سیک اب یہ واز اُٹھا کر میرے سر پر نہ دے مارنا۔ میں پاکستانی فلموں کے ولن کی طرح اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔“ میں نے گویا اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔
 ”آگے مت بڑھو، ابوداؤد میں کہہ رہی ہوں آگے مت بڑھیں۔“

جھپٹ کر کرٹل واز اُٹھاتے وہ حلق کے بل غرائی تھی۔ میں ایک بار پھر ہنس پڑا۔
 ”تو تم آؤ گی کیا؟ یا راجھا نہیں لگتا۔ پیش رفت رومانس میں مرد کی جانب سے ہی ہونی چاہیے۔“
 میں نے پھر اس کا تسخر اڑایا تھا۔ اس کی بات کا دانستہ الٹا مطلب نکالا اس کا چہرہ غم و غصے اور سبکی کے احساس نے بے تحاشا سرخ کر دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر مجھے اس پر کسی صورت بھی ترس نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اس پر گرفت مضبوط کی پھر اس کا منہ اپنے فولادی پنجے میں جکڑ کر پھینچتے ہوئے درشتی سے بولا تھا۔
 ”آئندہ اس قسم کی باتوں سے گریز کرنا۔ تم مجھ سے کسی طرح بھی جیت نہیں سکتی ہو۔ یہ تمہیں سمجھ جانا چاہیے آج کی رات ہے بس، اس کے بعد تمہارا یہ غرور اور طغیان بھی خاک میں مل جائے گا۔ پھر تو تم خود سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہو گی مجھ سے لڑنا جھگڑنا تو دور کی بات۔“

میرے لہجے میں ہی نہیں میری آنکھوں میں بھی تحقیر اور حقارت تھی۔ وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ میں نے اسے کھانا کھانے اور باتھ لینے کا حکم نامہ جاری کیا تھا۔ وہ تب بھی ساکن بیٹھی رہی۔ میں خود کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ تب ہی وہ اُٹھ کر میرے نزدیک آکھڑی ہوئی تھی میں چونک کر متوجہ ہوا۔ اور ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔
 اس نے مجھے آنسو بھری نظروں سے دیکھا تھا پھر جیسے تڑپ کر بولی تھی۔

”مجھ سے شادی کر لیں ابو داؤد فارغاڈ سیک مجھے ذلیل مت کریں۔“

میری ہنسی نکل گئی۔ اس سے جو سنگین قسم کی گفتگو میں نے کی تھی اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ وہ میرے آگے جھک جائے کجا مجھے اس کی منتیں یا زور زبردستی کرنی پڑے نکاح کو۔ نکاح میرے لیے صرف اس لیے ضروری تھا کہ میں قانوناً اس پر دسترس حاصل رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات تو میں بھی جانتا تھا کہ عون مرتضیٰ ہرگز ٹک کر بیٹھنے والا نہیں۔ جلد یا بدیر وہ حجاب کو لازماً مجھ سے چھڑانا چاہے گا۔ انسلٹ اور توہین کے ساتھ انتقام لے اس سلسلے کو وہ عمر بھر کو ہضم کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس پر اپنے تاثرات واضح نہیں کیے۔ اور مزید طنز کے تیر برسانے کے بعد اس پر احسان جتلانے والے انداز میں نکاح پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے اسے تیار ہونے کا علم دے دیا تھا۔ اس کے انداز میں بڑی واضح شکست تھی جو مجھے مسرت سے ہمکنار کر رہی تھی۔ پھر میں اٹھ کر نکاح کے انتظامات میں لگ گیا تھا۔ شام کے بعد رات سے پہلے پہلے ہمارا نکاح ہوا تھا اس کے بعد میں اس کے پاس کمرے میں آیا تو بلڈ ریڈ کمر کے کاہنی شرارے اور کاہنیز چولی میں وہ ساکن سی ڈیرینگ ٹیبل کے سامنے ایستادہ تھی اور زرینہ اس کے بھاری دوپٹے کو پنوں کی مدد سے اٹکانے کی کوشش میں مصروف۔ اس کا اناڑی پن صاف ظاہر تھا میں نے اسے ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا۔ پھر جب اس کی جانب متوجہ ہوا تو شرارت شوخی اور مسکان میرے ہر انداز سے عیاں تھی۔ میری نظریں جتنی بے لگام تھیں، لہجہ اس سے کہیں بڑھ کر گستاخی سمیٹ لایا۔

”تمہاری ڈیمانڈ پوری ہو گئی۔ اب میں اپنی خوشی پوری کر سکتا ہوں نا؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ خالی نظروں سے ٹکر ٹکر مجھے دیکھے گئی۔ میں مسکرایا پھر کسی قدر شوخی سے بولا تھا۔

”دیکھو آج میں نے تمہیں خراج تحسین پیش کرنے کو کتنے سارے انتظام کر رکھے ہیں۔ میں پلٹا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی شمپین کی بوتل اٹھا کر اس کی سیل توڑنے لگا۔ ایک بڑا گھونٹ بھرا پھر بوتل اس کی آنکھوں کے آگے لہرائی۔“

”ایک یہ..... اور ایک نظم جو ابھی تمہارے حسن کی نذر کروں گا۔“

میں زور سے ہنسا پھر مخمور نظروں سے اسے دیکھا۔ ایک اور بھی ہے مگر وہ سر پرانز ہے عین وقت ہ بتاؤں گا۔ پہلے نظم سنا دوں ہاں“

میں نے اکٹھے دو گھونٹ بھر کے اسے مسکرا کے دیکھا۔

اب اور نہیں میری جان!

چنچل ہوا آ کے مجھ سے کھیلے گی

چاند پھر اہتمام سے میرے کمرے میں اترے گا

کمرے میں بہاروں کا سماں ہوگا

میرا چاند گھونگھٹ میں چھپا ہوگا

اس کو گھونگھٹ سے جب میں آزاد کروں گا
چھپنے کی وہ مجھ سے فریاد کرے گا
آنکھ کا اجل
بکھرا آنجل

گجرا

مہندی

اور سنگھار

کتنے ہوں گے اس کے ہتھیار

اور میں ہوں کا خالی ہاتھ

خالی ہاتھوں جب میں اس کو مالا مال کر دوں گا

رات کا آنجل دھیرے دھیرے سرک کے دور ہو جائے گا

آسمان کا چاند مجھ سے جل کر دور کہیں چھپ جائے گا

میں نے نظم سناتے ہوئے اس سے درست درازی بھی شروع کر دی تھی۔ مگر وہ تو جیسے موم کی گڑیا

تھی۔ جس میں نزاکت اور لطافت تو تھی مگر جان نہیں۔ میں نے بغور رک کر اسے دیکھا اور دل جلانے والی

سکراہٹ سے بولا۔

”ویسے حیرت ہے تم نے تو شاید نہ شرمانے کی قسم کھالی ہے۔ یار شرماء! مجھے لڑکیاں شرماتی ہوئی

بھی لگتی ہیں“ میں نے اسے چھیڑا تھا۔ میری بات کے جواب میں اس کے وجود میں ایک تبدیلی آئی وہ تھا

لنگھوں سے آنسوؤں کا بے آواز بہنا۔

”افوہ اس کا مطلب تم بولو گی نہیں۔ مگر جان من میں تو گونگوں کو بھی بلوالوں تم تو کیا شے ہو۔

جاؤ شاباش۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور سہارا دے کے بیڈ تک لے آیا اس کا انداز میکاکی تھا۔ بیڈ پر

سے تقریباً دھکیل کر میں اس کے مقابل خود بھی گر گیا۔ پھر میں نے سیل فون اٹھا کر عون مرتضیٰ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

میں مرتبہ میری کال پک نہیں ہوئی میں جیسے پاگل ہونے لگا۔ گالیاں کوسنے دیتے میں چھٹی مرتبہ ٹرائی کر رہا تھا

ب کال ریسو ہو گئی۔ ورنہ جتنا طیش اور جنون میرے اندر اُترا ہوا تھا۔ اگر وہ ساری رات میری کال پک نہ کرتا

میں شاید ساری رات بار بار نمبر ملاتا اور اسے وہ سنواتا جو میں نے اسے سنوانے کی غرض سے کال کی تھی۔

ہیلو۔

عون مرتضیٰ کی بوجھل آواز میری سماعتوں میں اُتری تھی۔

”کیسے ہو سالا صاحب! مبارک ہو آج سے تم باقاعدہ میرے سالے ہوئے۔ تمہیں پتا ہے میں اس

وقت اپنی گولڈن ٹائٹ سلیم ریٹ کرنے جا رہا ہوں۔“

میں نے قہقہہ لگایا۔ رابطہ منقطع ہو گیا۔ مجھے حجاب کی سسکیاں سنائی دیں۔ جن پر دھیان دیئے بنا میں نے پھر اس کا نمبر ملایا دوبارہ، مگر وہ بہرہ بن گیا تھا۔ شاید، میں نے غصے میں پاگل ہوتے اے ایک ٹیکسٹ لکھا تھا۔

”شراب پی کر میں تمہاری بہن کی آج جی بھر کے توہین سے دو چار کرنے والا ہوں۔ سالہ صاحب! اگر غیرت مند ہو تو آ کر بچا لو اس کو ہا ہا ہا!!“

ٹیکسٹ اے سینڈ کرنے کے بعد میں حجاب کی سمت متوجہ ہو گیا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپنے بچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کا نازک وجود جیسے زلزلوں کی زد پر تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کاندھا دو چا پھر ایک جھٹکے سے اس کا رخ پھیر کر چہرہ اپنی جانب موڑ لیا۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک کپکپاتے ہوئے لب بھیگتی ہوئی ریشمی پلکوں کا مرتعش سایہ جو اس کے گالوں پر لرز رہا تھا میں اے کینہ تو ز نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اے اپنے نزدیک کرنے سے قبل میں نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی تھی۔ پھر میں تمہاری جارحیت و وحشت اور سفاکی اور وہ تھی اور اس کا احتجاج سسکیاں آہیں اور کراہیں۔ وہ جتنا ٹرپ رہی تھی مجھے اسی قدر تسکین مل رہی تھی۔ وہ جس قدر فریاد کر رہی تھی میں اس حد تک سفاکی کو چھونے لگتا تھا۔ میں نے آٹھ سالوں کی نفرت اور وحشت ان چند گھنٹوں میں اس کے وجود پر ثبت کر دی تھی۔ پھر جب میرے اندر لگی آگ کسی حد تک بجھ گئی تو میں کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔

☆☆

اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو حجاب میرے پہلو میں کروٹ کے بل لیٹی شاید سو رہی تھی۔ وہ شاید کچھ دیر قبل ہی سوئی تھی۔ ابھی تک اس کے نیم وا ہونٹوں سے وقفے وقفے سے سسکی ٹوٹ کر نکلتی تھی۔ چہرہ اور پلکیں ہنوز نم تھیں۔ آنکھوں کے پوٹے سوجن کا شکار تھے۔ شاید رات بھر اس نے رونے دھونے کا شغل جاری رکھا تھا۔ تبھی اس نے نیند میں کروٹ بدلی تھی۔ اور میری نظر اس کے گال کے نیچے سرخی مائل زخم کے نشان میں الجھ گئی۔ ایک زہر خند مسکان میرے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔ میں نے کچھ سوچا پھر سیل فون اٹھا کر عون مرتضیٰ کا نمبر ڈائل کیا۔ مجھے اس وقت بہت حیرت ہوئی جب وہ میرے منہ سے قابل اعتراض باتیں سن کر بھی اگلی مرتبہ فون پک کر لیا کرتا تھا۔

”کیسے مزاج ہیں سالہ جی؟“

رابطہ بحال ہوتے ہی میں نے کاٹ دار طنز فرمایا تھا۔

”ابو داؤد میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ حجاب کو چھوڑ دو۔“

وہ جیسے رو ہانسا ہو گیا تھا۔ میں ہنس پڑا۔

”اس کے باوجود کہ وہ اب ویسی نہیں رہی۔ سو رہی ہے ساری رات میں نے جگائے رکھا ورنہ

تمہاری بات کر دیتا۔“

”دیکھو اگر تم نکاح کر چکے ہو اس کے ساتھ تو بھی پلیز اس قسم کی گفتگو مت کرو۔ ہم تمہیں تمہارے

رشتے کی حیثیت سے قبول کر لیں گے۔“

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ میں پھنکارا۔

”اتنا بے وقوف سمجھتے ہو مجھے۔ اب وہ یہاں سے تب ہی نکلے گی جب وہ میرے کم از کم ایک بچے کی ماں بن جائے گی۔ اور سنو کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا چاہو تو تمہاری مرضی ہے ورنہ میں نے اس سے نکاح نہیں کیا انتقام کے کھیل میں عزتیں نہیں بخشی جاتی ہیں۔“

میرے لہجے میں حقارت اور زہر تھا۔ میں نے دانستہ غلط بیانی کی تھی۔ مقصد ظاہر تھا اسے زیادہ سے زیادہ دہنی اذیت پہنچانا۔

دوسری جانب کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر سلسلہ کاٹ دیا گیا تھا۔ تب حجاب ایک دم اٹھی تھی مگر اسی تیزی سے واپس پھر بستر پر ڈھے گئی۔ وجہ کیا تھی میں نہیں جانتا تھا البتہ میں نے اسے بہت سکون سے دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا تھا مگر میری توجہ پھر ہٹ گئی۔ اس کی وجہ عون کا فون تھا۔ میں نے زہر آلود نظروں سے اسکرین کو گھورا پھر سیل فون حجاب کی طرف بڑھا کر اسے بات کرنے کو کہا تھا۔

”تم بات کرو اس سے۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا کہ تم نے میری فتیں کر کے مجھ سے نکاح کیا ہے۔“ میں نے پھنکار کر کہا مگر اس کے انکار نے مجھے بھڑکا کے رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے تشدد کا نشانہ بنایا اور اپنی بات دہرائی تھی۔ اور عمل کروا کے دم لیا تھا۔ رات کے بعد پھر میری فتح ہوئی تھی۔ ہاں میری ہار کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اب مجھے پر سکون ہو جانا چاہیے تھا مگر میں پر سکون نہیں ہوا۔ مجھے صبر آ جانا چاہیے تھا مگر مجھے صبر نہیں یا۔ میرے اندر ہنوز وحشتوں کا راج تھا۔



سب کاٹ دو
بسل پودوں کو
بے آب سکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بے کل پھولوں کو
شاخوں پر بلکتے مت چھوڑو
یہ فصل امیدوں کی ہمد
اس بار بھی غارت ہو جائے گی
کھیتی۔ کوئے کھدروں میں
اپنے لبون کھا دھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رات کی فکر کرو

جب پھر اک بار اجڑتا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک یہی کچھ کرنا ہے

پتا نہیں کیا ہوا تھا اسے وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ بے ہوشی بھی ایسی، جس نے پریشان کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنے تئیں اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کی تھیں مگر سب بے کار گئی تھیں۔ مجبوراً ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف سے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس نے اس بے ہوشی کو خطرناک قرار دیتے ہوئے آئندہ اسے خوش رکھنے کی تاکید کی تھی۔ ڈاکٹر کو رخصت کر کے میں دوبارہ اس کی سمت متوجہ ہوا تو وہ بے دم سے انداز میں بستر پر پڑی تھی شکستہ، زخم خوردہ سا انداز تھا۔ جانے کیوں مجھے اس سے ہمدردی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے گال ہنوز بھیکے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ خشک کیا تھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں پھر خالی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے مجھ سے وہی التجا کی تھی۔

”مجھے چھوڑ دیں مجھے جانے دیں۔“

میں نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ یہ بات بہر حال میں ماننے سے قاصر تھا۔ میں نے اسے کچھ کھانے اور دوا لینے کی تاکید کی تھی۔ پھر زرینہ کو پکار کر اس کے کھانے کو کچھ منگولیا تھا اور اس ہمدردی میں اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔

”تمہیں اپنا خیال رکھا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

جواب میں وہ اگر خود ترسی کا شکار ہوئی تھی تو میں بے حسی پر اتر آیا۔ میں نے اپنے معمول کے کام نبھائے تھے۔ مگر ڈرنک نہیں کی، پتا نہیں کیوں؟ بس دل نہیں چاہا تھا۔ اس کے بعد میں سیل فون لیے باہر آ گیا۔ میں نے اب کی مرتبہ پھر عون کو کال کی تھی۔

”حیرت ہے تم ابھی تک پہنچے نہیں مجھ تک۔ یا تمہاری ڈیڑ سسٹر کے جسم پر کل رات میں نے گن کے اتنے زخم لگائے تھے جتنے تم نے یونیورسٹی میں لڑائی کے دوران مجھے لگائے تھے۔ میں بڑا انصاف پسند ہوں زیادتی مجھے پسند نہیں۔ آج میں اسے زیادہ اذیت نہیں دوں گا بس اتنی جتنی تم نے اس کے سامنے ہیرو بننے ہوئے مجھے دی تھی۔ اوکے فائن اینڈ گڈ بائے۔“

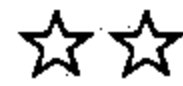
میں نے اس کے صبر کو ضبط کو اچھی طرح آزما کر فون بند کر دیا تھا۔ اور پلٹ کر اندر آ گیا۔ وہ بستر پر دراز تھی میں نے دیکھا اس کے بازو میں لگی ڈرپ ابھی کچھ دوا باقی تھی مگر میں نے اس کی نیڈل ہٹا دی۔ اور اس کے ساتھ بستر میں گھس گیا۔ اس کا رنگ بالکل فق ہو گیا تھا۔ جسے نشانہ بناتے ہوئے میں نے اسے کچھ دیر چھیڑا تھا۔ وہ آنسو بہانے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ سو آنسو بہانے لگی۔ یا پھر منت کر سکتی تھی اس نے وہ کام بھی کیا۔ وہ مجھے ریفریج نہیں کر رہی تھی محض مجھ سے پناہ مانگ رہی تھی۔ اس کے باوجود مجھے تو ہین محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا تھا پھر جب میرا طیش ذرا دھیمپا پڑا تو میں نے اس پر احسان عظیم کرتے ہوئے اسے سونے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ جان چھوٹ جانے پر حیران نظر آئی۔ مگر پھر وہ اتنی مطمئن ہوئی تھی کہ اگلے چند منٹ میں گہری

نیند سو گئی تھی۔ میں نہیں سو سکا اور جاگ کر کروٹیں بدلتا رہا۔ کچھ فاصلے پر موجود وجود میں میری ساری توجہ اٹکی ہوئی تھی۔ بالآخر میں نے مضطرب ہوتے اٹھ کر ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ مدھم روشنی نے گہرے اندھیرے کو نگل لیا تو حجاب کے خدو خال واضح ہونے لگے۔ سفید مرمریں رنگت، بے تحاشا حسین آنکھیں، کھلے ریشمی بال یوں چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے جیسے چاند کے گرد بدلیاں۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ حالانکہ کل رات وہ کتنی مضطرب تھی۔ مگر آج میں نے ذرا سی نرمی برتی تو کیسے وہ پر سکون نظر آرہی تھی۔ کیا شے بنایا ہے عورت کو خدا نے، ہر ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کی صلاحیت عطا کی۔ ہر سختی جبر سہہ جانے کی ہمت بخش دی۔ اماں کہا کرتی تھیں عورت بہت عظیم ہستی ہے۔ مجھے وہ واقعی عظیم لگنے لگی۔

مجھے کبھی کی پڑھی ہوئی ایک نظم اس پل شدت سے یاد آنے لگی۔

کبھی موسم بن کر پکھل جاتی ہیں
کبھی سورج کی تپش سے جل جاتی ہیں
یہ لڑکیاں کتنی عجیب ہوتی ہیں
سنجھل کے چلیں پھر بھی پھسل جاتی ہیں
اللہ نے رکھا ہے ان میں ایسا ہنر
جس سانچے میں چاہو ڈھل جاتی ہیں
کبھی ذرا سی بات پر کر لیتی ہیں آنکھیں نم
تو کبھی پہاڑ سے غم کو بھی سہہ جاتی ہیں
اتنی سادہ کہ اپنی رسوائی پر بھی
صبر کا تھام کے دامن سنجھل جاتی ہیں

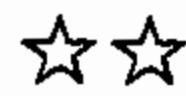
جانے کس جذبے سے مغلوب ہوتے ہوئے میں اس پر جھکا تھا اور اس کی صبح پیشانی کو نرمی سے چوم لیا۔ وہ کتنی حسین لگ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود جیسے بہت ہی ملائم سی روشنی کے ہالے میں مقید تھا۔ اتنی روشن، اتنی اجلی، اتنی حسین اور منفرد کہ میری نگاہ اس پر سے ہٹنا بھول گئی۔ پھر مجھے پتا ہی نہ چلا میں کیا کر رہا ہوں۔ بس میرا دل اس لمحے ایک اُلوہی احساس سے معمور تھا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کل رات اگر میں نفرت کی انتہا پر تھا تو آج رات میں محبتوں کی معراج کو چھو آیا تھا۔ کل میں سراپا قہر تھا تو آج سراپا محبت۔ میں نے شعوری یا لاشعوری طور پر ان تمام اذیتوں کو کم کرنا چاہا تھا جو اسے میری وجہ سے ملی تھیں۔



اگلی صبح میری آنکھ کمرے میں پھیلے نا مانوس شور سے کھلی تھی۔ میں نے آنکھیں مسل کر شور کے اس منبع کو کھوجا اور کسلمندی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر موجود سیل فون کی بیل چند لمحوں کو بند ہو کر پھر زور و شور سے بجنے لگی تھی۔ فون داور بھائی کا تھا ایمر جنسی تھی مجھے فوراً جانا پڑا۔ عجلت میں تیار ہو کر میں روم میں آیا تو حجاب

ابھی تک سو رہی تھی میں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے اوپر کبھل درست کرتا باہر آ گیا۔ زربینہ کچن میں مصروف تھی۔ میں نے اسے حجاب کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ اور گاڑی لے کر فوراً نکل گیا۔ ہسپتال میں بھابھی کے علاوہ داور بھائی اور اماں وغیرہ سب جمع تھے۔ مجھے اسی چکر اور پریشانی میں وہاں دو دن لگ گئے تھے۔ اس دوران میں نے ایک آدھ مرتبہ حجاب سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر چونکہ میں سیل فون گھر بھول آیا تھا جہی بیل ہوتی رہی مگر کال کسی نے پک نہیں کی تھی۔ دو دن بعد جب میں لوٹا تو میرا غصے سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ مگر پہنچتے ہی جو خبر مجھے سننے کو ملی اس نے مجھے ایک دم ہونٹ بھیج لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

حجاب کو عون مرتضیٰ وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں ٹینشن زدہ سا کمرے میں آ کر بستر پر گر گیا۔ اب ایک نیا محاذ شروع ہو چکا تھا۔ حجاب کو وہاں چھوڑنا میری انا کو گوارا نہیں تھا جہی میں مضطرب سا سوچنے لگا تھا اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ انہی سوچوں میں بتلا میں نے کروٹ بدلی تو میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا تھا۔ میں نے ٹول کر اسے اٹھایا تو وہ ایک طلائی جھمکا تھا۔ اسے میں حجاب کو پہنے دیکھ چکا تھا۔ میرے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ تمہیں ایک مرتبہ پھر یہاں آنا ہے حجاب ابو داؤد! صرف اس لیے نہیں کہ تم انتقام کی وجہ ہو۔ بلکہ تم خاص ہو۔ اب وجہ صرف انتقام تو نہیں ہے۔ کچھ اور بھی ہے ایک کمی کا احساس۔ میں نے سوچا تھا اور احتیاط سے اس کا جھمکا دراز کھول کر اس میں منتقل کر دیا تھا۔



آنکھ کی ندیا، اشک کی نہیا
یاد تمہاری چاند کی رات
جھرنات، جگنو، ٹم ٹم تارے
کتنی پیاری چاند کی رات
سوکھے پتے سرد ہوائیں
سونی سڑکیں میں اور تم
شاہ اور ملکہ ہاتھ ہیں تھامے
اور درباری چاند کی رات

وقت گزاری کو میں چینل سرچنگ کر رہا تھا۔ کہ ایک جگہ میرا ہاتھ تھم گیا۔ بہت مدھم میوزک اور چنچل آواز میں گیت چل رہا تھا میں دھیان سے سننے لگا جانے کیوں وہ لڑکی مجھے ٹوٹ کر یاد آئی جسے کبھی میں نے اپنے دل میں اہمیت نہیں دی تھی اور میرا ذہن بھٹکنے لگا۔

پتا نہیں وہ بھی مجھے یاد کر رہی تھی یا جان چھوٹ جانے پر شکر منار ہی تھی۔ میں کچھ ایسا مضطرب ہوا کہ ایک بار پھر ولید سے کانٹیکٹ کرنے لگا۔

یار وہ تیرا دوست پولیس آفیسر کیا جھک مار رہا ہے۔ اسے کہو میرے ساتھ چلے میں ہر صورت آج

حجاب کو لانا چاہ رہا ہوں۔

اس سے کانٹیکٹ ہوتے ہی میں جھلا کر بولا تھا۔ جواباً وہ فضول ہنسی ہنسنے لگا۔

”خیریت تو ہے نا جناب! کہیں آپ کو محبتِ شجبت تو نہیں ہوگئی؟“

”مقصد کی بات کرو ولید! مجھے مذاق پسند نہیں۔“ میں نے اسے ڈانٹ کے رکھ دیا تو وہ بھی سنجیدہ

ہو گیا تھا۔

”بات کر لی ہے جی! ایس پی صاحب جس کیس میں بڑی تھے وہ کامیاب ہو گیا ہے آپ کا کام اسی

وجہ سے لیٹ ہوا کہ میں ایس پی صاحب کو آپ کے ساتھ بھیجنا چاہتا تھا کہ عون بھائی کی اپنی بھی اچھی خاصی

سورس ہے یہ کام بیچ میں بھی اٹک سکتا تھا نا۔“

اس کی وضاحت نے میرے تئیں ہوئے اعصاب کو کسی حد تک ڈھیلا کر دیا۔ اس نے ایس پی سجاد

ملک سے میری بات کرائی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ حجاب کا بھائی اسے میرے ساتھ خوش نہیں دیکھنا

چاہتا وغیرہ وغیرہ۔ ایک فرضی داستان تھی جس سے میں نے اسے مطمئن کیا اور اپنے نکاح کے بابت بتایا اس

نے مجھے شام چار بجے آنے کا کہہ دیا تھا۔ میں چار بجے سے بھی پہلے تھانے پہنچ گیا۔ وہاں سے ہم عون مرتضیٰ

کے گھر پر گئے تھے۔ ایس پی سجاد ملک نے مجھے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا تھا اور خود ایک لیڈی پولیس کانسٹیبل اور

دیگر اہلکاروں کے ساتھ اندر چلے گئے۔

”آپ فکر نہ کریں ہم ابھی آپ کی ڈیوڈائف آپ کے حوالے کر دیں گے۔“

ایس پی نے جاتے جاتے کسی قدر شوخی سے مجھے مخاطب کیا تو میں دانستہ مسکرایا تھا انتظار کے یہ چند

منٹ بہت کٹھن تھے۔ دیکھا جاتا تو آج کی جوہار تھی وہ بھی کم سنگین نہیں تھی۔ کاش میں بھی اندر جا کر عون مرتضیٰ

کی بے بسی اور لاچاری کو دیکھ سکتا۔ وقت گزاری کو میں نے سگریٹ سلگالیا تھا۔ پھر وہ مجھے آتی نظر آئی۔ سرخ کمر

کے بے حد خوبصورت سوٹ میں ہمرنگ دوپٹے کو بدحواسی میں اوڑھے اڑتے بالوں کو سنبھالنے کی کوشش میں

ہلکان، وہ کتنی دلکش لگ رہی تھی مگر اس قدر حراساں بھی، میں نے اسے جی بھر کے دیکھا تھا اور اطمینان سے بھی۔

اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور ان کے کناروں پر شبی قطرے اٹکے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً روئی تھی۔ پولیس

اہلکاروں نے اسے میرے حوالے کیا اور وحش کرتے ہوئے رخصت ہوئے، میں نے اسے بہت وارنگی سے خود

سے لپٹا لیا تھا۔ پھر اسے ساتھ لیے واپس لوٹ آیا تھا مگر وہ گرم صم اور خاموش رہی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا اس کا یہ

سکتہ ٹوٹ گیا اور وہ بے تحاشا روتی چلی گئی۔ میرا اچھا بھلا خوشگوار موڈ غارت ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بے تحاشا

ڈانٹا تھا۔ مگر وہ بجائے خائف ہونے کے مجھ سے الجھ گئی تھی۔ پھر کیا تھا بس میرا دماغ الٹ گیا تھا۔ وہ پھری تو

میں بھی قہر بن گیا تھا۔ میں نے اسے وہیں اچھا خاصا دھنک کے رکھ دیا۔ اس بد دماغ عورت کو عزت راس ہی

نہیں تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے سارے نرم گرم احساسات جیسے کثیف دھوئیں میں بدل گئے تھے۔ میں اس

پر غصہ تو نکال چکا تھا مگر اس کی خراب ہوتی حالت نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ گھر پہنچنے تک میں ڈاکٹر سے

کنسلٹ کر چکا تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا میڈیسن دیں پھر مجھے عجیب نظروں سے دیکھ کر بولے تھے۔
 ”آپ کو شاید اپنی وائف کی زندگی عزیز نہیں ہے۔ میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ ان کے لیے ٹینشن فری ہونا از حد ضروری ہے۔ ان کا دل کمزور ہو چکا ہے وہ کوئی شاک برداشت کرنے کی پوزیشن میں فی الحال نہیں ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں ورنہ آپ انہیں موت کی طرف دھکیل گے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے تو میں واقعی حجاب کے لیے پریشان ہو چکا تھا۔ مگر میری توجہ التفات نے بھی اسے نہیں بہلایا تھا وہ بے حد زود رنج ہو رہی تھی۔ پھر اس نے جو باتیں کہیں وہ مجھے طیش دلا گئی تھی۔ عون مرتضیٰ نے اس سے غلط بیانی نہیں کی تھی میں اسے یہ سب کہہ چکا تھا مگر اسے حجاب سے بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“
 ”بولیں دیا نہ آپ نے مجھے دھوکہ۔ ایک عزت ہی تو مانگی تھی میں نے آپ سے گنہگار ہونے سے بچنا چاہا تھا نا بس؟“

وہ سک رہی تھی۔ میں نظریں چرا گیا۔

”یہ سچ نہیں ہے حجاب!“

”تو کیا عون بھیا جھوٹ بول رہے ہیں؟“ وہ چیخی

میں نے اسے ٹیڑھ کرنے کو غلط بیانی کی تھی۔ میں نے اسے اصل بات بتادی مگر وہ شاید مجھ پر اعتماد کھو چکی تھی۔ پھر ہمارے بیچ جھگڑا طول پکڑتا چلا گیا۔ وہ صدمے میں تھی تو میں طیش میں۔ اور اسی طیش میں میں نے اسے بے نقط سنادی تھیں ایک بار پھر میں غصے میں آپے سے باہر ہو کر اول فؤل بک گیا تھا۔ وہ گنگ ہو گئی تھی۔ میں اس کے احساسات کی پرواہ کیے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔



پھر میں اس سے بس اپنا مقصد حاصل کرتا رہا تھا۔ میں نے اپنی کہی بات ثابت کر دکھائی تھی کہ اس کی حیثیت میری کیپ سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر میں اسے لے کر لاہور چلا آیا تھا۔ میں اکثر اس میں اٹریکشن محسوس کرتا۔ کبھی کبھار مجھے لگتا وہ ایک ساحرہ ہے جس نے مجھے اپنے سحر میں دھیرے دھیرے جکڑنا شروع کر لیا ہے۔ کراچی سے لاہور کا سفر بائی روڈ ہوا تھا اسی لیے ایک دو جگہ پر قیام بھی کرنا پڑا۔ وہاں ہوٹلز میں میں نے اس کے ساتھ کو بہت انجوائے کیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے لگا وہ بس محبت کرنے کو بنائی گئی ہے۔ اماں اور بھابھی وغیرہ کے لیے حجاب سے میری شادی ایک انکشاف ہی تھا۔ پھر وہاں بھی ہمارا آپس میں دو تین مرتبہ اختلاف اور جھگڑا ہوا۔ پتا نہیں کیوں اس نے ہر معاملے میں میرے ساتھ ضد باندھ لی تھی۔ شاید وہ مجھ سے اس طرح بدلہ لینے کی کوشش کرتی تھی۔ جو بھی تھا اب میرے اندر کا اُبال ختم ہوتا جا رہا تھا اور میری خواہش تھی میں اس کے ساتھ ایک اچھی اور بھرپور زندگی گزاروں۔ مگر وہ میری اس کوشش پر پانی پھیر دیتی تھی۔ اس نے مجھ سے حد سے بڑھی ہوئی بدتمیزی کی تھی جس کے نتیجے میں میں نے اسے بہت بے دردی سے زد و کوب کیا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں رکنا نہیں تھا۔ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا اگر میں وہاں مزید رہا تو شاید اسے زندہ نہ چھوڑوں، میں ان دنوں

اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ جی میں واپس کراچی آ گیا۔ وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا مگر ایک کی کے احساس سمیت، شروع میں میں اس کی کمی کو سمجھ اور جان ہی نہ سکا۔ میں بے حد مصروف رہنے لگا تھا۔ پچھلے دو سالوں سے تقریباً میں اپنے کام سے اتنا غافل ہوا تھا اس فضول لڑکی کے چکر میں الجھ کر اچھا خاصا نقصان ہو چکا تھا۔ میں دن رات ایک کر کے بزنس کو توجہ دینے لگا۔ ولید سے اب بھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس نے جو تعاون کیا تھا میں اس پر دل و جان سے اس کا مشکور تھا۔ وہ عیاش طبع انسان تھا کام سے جی چرانے والا، میں ہر ماہ اس کا منافع اسے دے دیا کرتا تھا۔ ایک بار میں نے اس کا خصوصی شکریہ ادا کیا تھا اور ذرا کریدنے کی کوشش بھی کہ عیون یا حجاب کے ساتھ اس کی ایسی کیا دشمنی تھی جس کی بنا پر اس نے میرا اس حد تک ساتھ دیا۔ جواب میں وہ اول تو بات گھما گیا تھا میرے اصرار پر اس نے صرف اتنا بتایا تھا۔ ان لوگوں کی طرف اس کے ذاتی قسم کے کچھ حساب نکلتے تھے۔ میں سمجھ گیا خاندان میں اس قسم کی رنجشیں اور تلخیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جن میں سے کچھ کینہ پرور لوگ فریق ثانی کو زیادہ اور ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا کرتے ہیں۔ خیر عیون مرتضیٰ سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

کراچی آ کے میں نے اپنا آفیشل نمبر آن کر لیا تھا۔ جب میں نے ڈبل سم والا مٹی میڈیا سیل لیا تو دوسرا پرسنل نمبر بھی آن کر لیا۔ یہ اسی روز کی بات ہے جب میں آفس میں تھا تو حجاب کی کال آنے لگی تھی۔ میں میٹنگ میں تھا جی دھیان نہیں دیا مگر وہ متعدد بار ٹرائی کر رہی تھی اس کے باوجود میں نے اس کی بات سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ فی الحال میں اپنے دل میں اس کی گنجائش نہیں رکھتا تھا۔ اماں جیسی فطرت کی عورت اور سائرہ آپا کے ساتھ گزارا کرنا عام بندے کے بس کا روگ نہیں تھا۔ مجھے اندازہ ہو سکتا تھا وہاں کیسی زندگی گزار رہی ہوگی۔ اس کے باوجود میں نے دانستہ اس سے گریز اور تغافل برتا تھا۔ مقصد اسے اذیت اور سزا دینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ مزید چند منٹ گزرے تھے کہ بھابھی کا فون آ گیا۔ انہوں نے مجھے حجاب کی حالت زار سنائی اور اسے لے جانے پر اصرار کرنے لگیں۔ میں جھنجھلا کر رہ گیا۔

”وہاں کیا مسئلہ ہے بھابھی!“

”مسئلہ ہے نا بتایا تو ہے۔ اماں اور سائرہ نے اس کا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ اوپر سے اس کی حالت بھی ایسی، سارا دن کچن میں کھڑی ہو کر کام کرتی ہے۔“

”تو کرنے دیں۔ موم سے نہیں بنی کہ پکھل جائے۔“ میں نے تندہی سے جواب دیا اور ادھر کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔

”داؤد وہ ماں بننے والی ہے تمہارے بچے کی۔ ایسی حالت میں عورت بہت حساس، کمزور اور سہارے کی متلاشی ہوتی ہے۔ ہمدردی کے دو بول بھی اس کی سیروں کے حساب سے ہمت بندھانے ہیں۔ تم نے اسے مشقت اور ظلم کے حوالے کر دیا۔ یہ کیسی محبت ہے تمہاری؟“

”آپ سے کس نے کہہ دیا مجھے اس سے محبت ہے۔ اونہہ! محبت تو کیا مجھے تو اس سے ہمدردی تک نہیں ہے۔ جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ بلکہ میں اماں سے کہوں گا ذرا اس پر ہاتھ اور سخت کریں۔ بہت منہ پھٹ

ہیں محترمہ!“ میں اس وقت اتنا غصیلا اور بد مزاج ہو رہا تھا کہ اس خوشخبری نے بھی مجھ پر اثر نہیں دکھایا۔ بھابھی یقیناً میری باتیں سن کر سکتے میں آگئی تھیں پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ پھر تاسف زدہ انداز میں بولی تھیں۔

”اگر تم اس سے محبت نہیں کرتے تھے داؤد تو اتنے پاڑنیل کے شادی کیوں کی؟“

”یہ کوئی اور چکر ہے بھابھی! ضد انتقام اور نفرت کا۔ اب خدا کے لیے مجھ سے تفصیل مت پوچھیے

گا۔“ میں نے عاجز ہو کر کہا تو بھابھی نے گہرا سانس کھینچا تھا اور اسی متاسفانہ انداز میں بولی تھیں۔

”مجھے لگ رہا ہے میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا ہے داؤد! خدا تمہیں نیک ہدایت سے نوازے!“

ان کا فون بند ہوا تو میں نے شکر کا سانس بھرا تھا۔ مگر یہ سکون زیادہ عرصے تک میرے ساتھ نہیں رہ

سکا۔ چند دن گزرے تھے جب اماں نے فون پر چیخ چلا کر مجھے ایک اطلاع دی۔ اطلاع کیا تھی ایک بم تھا جو

بلاست کر دیا تھا انہوں نے، حجاب کو وہاں سے عون مرتضیٰ آ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مجھے اس پل لگا تھا میرا

دماغ پھٹ جائے گا۔ جو ہوا تھا ہرگز اچھا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ یقیناً میرے ساتھ قانونی لڑائی لڑتے۔ حجاب کے

ساتھ سلوک میرا جیسا تھا اس کے بعد میں ہرگز کسی خوش فہمی کو نہیں پال سکتا تھا۔ اور عون مرتضیٰ کو تو موقع چاہیے تھا

مجھ سے بدلہ لینے کا۔ میں غم و غصے کی زیادتی سے پاگل ہوتا اماں اور سائرہ آپا پر چلاتا رہا کہ ان کی موجودگی میں وہ

چلے کیسے گئی؟ آخر اس نے پہلے عون سے رابطہ تو کیا ہوگا۔ میرا طیش تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ دیکھا جاتا

تو یہ میری شکست تھی ناقابل بیان شکست۔ جواب مجھے ہرگز ہرگز گوارا نہیں تھی۔ اس شکست کو مجھے پھر فتح میں

بدلنا تھا چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑتا کچھ بھی۔

☆☆

پھر میرا خدشہ درست نکلا تھا۔ اگلے چند مہینوں میں مجھے حجاب کی طرف سے خلع کا نوٹس ملا۔ تھا۔

مجھ پر جو الزامات لگائے گئے تھے وہ غلط نہیں تھے بلکہ میں تو اس سے بھی بدتر سلوک کر چکا تھا اس سے جس کا ذکر

تک نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرا طیش تھا کہ سب کچھ درہم برہم کر دینے پر آمادہ تھا۔ جس وقت مجھے یہ نوٹس ملا

میں ٹیرس پر موسم کا لطف اٹھاتے ہوئے کافی پی رہا تھا۔ نوٹس پڑھتے ہی میں نے پھرے ہوئے انداز میں کافی

سمیت مگ دور بیٹھ دیا تھا۔ اس وقت مجھے جتنی بھی گالیاں یاد تھیں میں نے سب عون اور حجاب کو دے دیں مگر میرا

طیش پھر بھی ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت عون کا نمبر ملا لیا۔ مگر وہ میرا فون پک نہیں کر رہا تھا۔

میں نے تلملاتے ہوئے اسے اور گالیاں دیں پھر ایک ٹیکسٹ بھیجا تھا۔

”تمہاری ڈیئر بہن میرے بچے کی ماں بننے والی ہے سالا صاحب! اتنا تو تم بھی جانتے ہو گے کہ

پریگنسی پیریڈ میں طلاق نہیں ہوتی۔ اور اس بھول میں مت رہنا میں کبھی اسے آسانی سے چھوڑ دوں گا۔

نونیور! اس کے لیے میں تمہیں تو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر سکتا ہوں مگر.....“

میں نے سیل فون دوبارہ پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔ پھر بہت سارے دن اسی بے کیفی اور ٹینشن میں

گزرے تھے جب ولید ایک اہم اطلاع کے ساتھ چلا آیا۔

”آپ کے سالا صاحب کی شادی ہو رہی ہے واؤد!“

”ہاں اچھا عیسیٰ کی ہوگی۔“

میں نے بے دھیانی میں اس کی بات سنی تھی وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔

”نہیں یہی تو بات ہے۔ شادی عیسیٰ کی نہیں عون بھائی کی ہو رہی ہے۔ وہ بھی عیسیٰ کی منگیترے۔“

منا ہے لڑکی بہت کم عمر اور حسین ہے۔ عون بھیا کی تو لائٹری نکل آئی جی.....!“

وہ دانت نکوس کر کہہ رہا تھا میں ٹھٹھک گیا۔

”تم سچ کہہ رہے ہو ولید؟“ میرے انداز میں اضطراب تھا۔

آپ تصدیق کرا لیں۔ یہ سارا کام آٹاٹا ہوا ہے۔ اندر کی خبریں بھی ہیں۔ عیسیٰ نے لڑکی سے شادی

سے انکار کر دیا تھا۔ شاید بدنامی کے ڈر سے عون صاحب یہ کام کر رہے ہیں۔ ثواب کا ثواب اور مفت کی عیاشی

وہ اپنے مخصوص فضول انداز میں بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے شادی کا دن اور تاریخ بھی بتائی تھی۔ میں کسی

دوچ میں گم ہونے لگا۔ اس اہم دن پر مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیے تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔

☆☆

عون کی بارات رات کی تھی۔ اور مجھے اسی وقت کا انتظار تھا جب بارات روانہ ہو جاتی۔ ولید نے مجھے

رات کی روانگی کا وقت بھی بتایا تھا۔ میں تیار ہونے کے بعد گاڑی میں آن بیٹھا تھا۔ جب تک میں عون کے گھر

پہنچا بارات روانہ ہو چکی تھی۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے ولید سے تصدیق کرا لی۔ حجاب بارات کے ساتھ نہیں گئی تھی۔

بارات مجھے ولید نہ بھی بتاتا تو میں جانتا تھا۔ اس کی ڈیوری نزدیک تھی ایسی حالت میں وہ جا بھی نہیں سکتی تھی۔

ہری یہاں آنے کی وجہ بھی وہی تھی میں ان سات آٹھ مہینوں میں جتنی شدتوں سے اس کی کمی محسوس کر چکا تھا اس

کے بعد آج کا موقع مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مقصد صرف اس پر اپنے آئندہ کے عزائم واضح کرنے اور عون کو کورٹ

مانے سے روکنا ہی نہیں تھا۔ دل کے کسی کونے میں اسے دیکھنے اسے چھونے کی پاگل کر دینے والی خواہش مجھے

بہت راتوں سے گہری نیند سوتے میں جگا دیتی تھی پھر باقی کا وقت جاگتے اور کروٹیں بدلتے گزرتا تھا۔ بات اگر

دورت کے قرب کی تمنا کی ہوتی تو بھی ٹھیک تھا میں اس ضرورت کو پورا کر سکتا تھا آج بھی بہت سی لڑکیاں میری

ہوں میں پلکیں بچھاتی تھیں مگر خواہش تو عجیب تھی۔ وہ صرف وہ۔ میں حیران تھا میرے جیسا لا پرواہ اور بے نیاز

مدہ جو سبرینہ کے بعد کبھی کسی کا طلب گار نہیں ہوا تھا یہاں اس مقام پر آ کر کیسے بے بس ہو گیا تھا۔ میرا مقصد یہاں

کسی سے الجھنا اور ہنگامہ کرنا نہیں تھا جی میں اس کے گھر کی عقب کی سائیڈ پر گاڑی روک کر رات کی تاریکی میں

رووں کی طرح دیوار پھلانگ کر اندر گھسا تھا تو وجہ یہی احتیاط تھی۔ سیدھے راستے مجھے کوئی آسانی سے گھسنے نہ

دیتا۔ مجھے ہر صورت اندر جانا اور حجاب سے ملنا تھا۔ لڑائی بھرائی مشکل کام نہیں تھا مگر میرا معاملہ تو پہلے ہی کورٹ

پچھری تک جا پہنچا تھا میں اس معاملے کو گھمبیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جہاں سے میں نے دیوار پھلانگی تھی ایک مرتبہ

پہلے بھی میں اس طرح یہاں آچکا تھا۔ میں اس گھر کا داماد تھا مگر یہاں سے مجھے وہ عزت نہیں ملی تھی جو میرا حق تھا۔

مجھے اس خیال سے پھر پیش آنے لگا۔ لان کے عقبی حصے میں بھی آرائشی لیمپ روشن تھے جس کی وجہ سے ماحول منور ہو رہا تھا۔ شادی والا گھر تھا سجاوٹ اور آثارِ نظر آرہے تھے میں محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے ٹھٹھک گیا۔ سیل فون کان سے لگائے لان میں چہل قدمی کے انداز میں ٹہلتا ہوا عیسیٰ گفتگو میں مصروف تھا۔ مجھے اس مقام پر کسی کی مداخلت کا ہرگز بھی خدشہ نہیں تھا۔ میں جتنی تیزی سے بھی کوئی ایکشن لیتا اس کی نظر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اس پل وہ اپنے دھیان میں مڑا اور ایک دم ساکن ہو کر رہ گیا۔ ہم ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ لان میں موجود آرائشی روشنیاں ہمیں ایک دوسرے کو بے حد واضح دکھا رہی تھیں۔ وہ جتنا حیران تھا میں اس حد تک نخوت زدہ

”میرے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرنا عیسیٰ ورنہ.....“

”آپ یہاں کیسے داؤد بھائی!“ معاوہ سنبھلا تھا اور اس نے سیل فون کان سے ہٹا کر رابطہ منقطع کیا پھر رواداری سے آگے بڑھ کے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں خیر سگالی کے اس مظاہرے پر ششدر ہو گیا۔

”آئیے ہم اندر چلتے ہیں۔ بہت عرصہ ہوا آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ کیسے ہیں آپ؟“

اس نے زبردستی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کی گرم جوش گرفت دوستانہ لہجہ و انداز مجھے ناگواری کے احساس سے دوچار کر گئے۔ مجھے یہ سب کچھ منافقانہ محسوس ہوا تھا۔

”میرے ساتھ ڈرامہ بازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر! سائیڈ پر ہو جاؤ۔ مجھے ہر صورت حجاب سے ملنا چاہیے اگر تم نے فضول کی غیرت مندی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا سمجھے!“

میں نے ہونٹ سکڑ کر آنکھیں نکال کر کہا تھا۔ مجھے ایک دم بہت غصہ آنے لگا تھا۔

”حجاب اندر کمرے میں ہے۔ آپ مل سکتے ہیں۔ میں بھلا آپ کو منع کیوں کروں گا؟“

اس نے جواباً اسی رسائیت اور رواداری سے کہا تو میری پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

”اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں دیکھ لوں گا تمہیں۔“

انگلی تنبیہ کے انداز میں اٹھا کر اسے گھورتے ہوئے میں نے سرد آواز میں کہا اور اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ پورا گھر روشن تھا۔ گھر میں خاموشی تھی میں نے کچن میں جھانکا وہاں تقریباً سبھی ملازم جمع تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ میں آگے بڑھ کر حجاب کے کمرے تک آ گیا۔ حجاب بالکل سامنے ہی نظر آ گئی مگر اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ کچھ اور کچھ تھی میں کچھ کہے بغیر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ پہلے ٹھٹھکی تھی پھر حق دق رہ گئی۔ میں اسے ایک طویل عرصے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی قدر موٹی ہو گئی تھی۔ بھرا بھرا صحت مند شاداب چہرہ، اس روپ میں اس پر جیسے ٹوٹ کر نکھار آیا تھا۔ چہرہ جیسے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ وہ سامنے تھی جس کی وجہ سے میں کئی راتوں کا رجحان کاٹ چکا تھا۔ میرے اندر ایک انوکھی خوشی، ایک نئی ترنگ جاگ اٹھی۔ میں نے اس سے ایسے خوشگوار موڈ میں گفتگو کا آغاز کیا جیسے ہمارے بیچ ناراضی اور فاصلے آئے ہی نہ ہوں۔ میں اسے سرتاپا بخور دیکھ رہا تھا۔ میری نظروں کی تپش پر وہ جیسے موم کی طرح پگھل رہی تھی مگر یہ احساس ناگواری کا تھا۔ اس نے خود کو ڈھانپا تھا گویا میری نظروں سے بچنا چاہا۔ میں جو اس کا محرم تھا۔ میرے اندر اس کے اندازِ گفتگو نے بھی آگ بھڑکائی تھی۔ جیسی

میں نے ایسی ہی آگ اس کے اندر بھڑکادی۔ وہ بہت حساس تھی مگر صرف اپنوں کے لیے اور وہ اس کے بھائی اور والدین تھے۔ میرے لیے وہ کبھی اس طرح نہیں تڑپتی تھی۔ کبھی اس طرح نہیں روئی تھی۔ اسے کبھی مجھے سے محبت نہیں رہی تھی۔ اسے شاید کبھی مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک میں تھا۔ احمق گدھا کہ اسے پتا نہیں کیا سمجھنے لگا تھا۔ اُبلتا ہوا خون میرے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ مگر میں نے خود کو کمپوز کر لیا۔ میں یہاں اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑے تو ہم ہمیشہ ہی تھے۔ میں یہاں اسے منانے قائل کرنے اور اپنی راہیں ہموار کرنے آیا تھا۔ میں نے اس کی کوشش شروع کر دی مگر وہ میری کچھ مانتی، کچھ سنتی تب تھا نا۔ اس کا ہر انداز ناگواری لیے تھا جان چھڑانے والا تھا۔ میرے دل پر چوٹ پڑی تھی۔ کیا واقعی اس کے پاس میرے لیے کچھ نہیں تھا؟ کیا وہ صرف مجھ سے ہمیشہ مجبوری نبھاتی رہی تھی؟ یہ اس کا انداز اور رویہ ہی تھا جو مجھے پھر سے پتھر بننے اور تیر برسانے پر مجبور کر گیا۔ پھر اس کے بعد میں نے وہ کیا تھا جو مجھے مناسب لگا۔ میں اسے دھمکیاں دیتا رہا تھا۔ میں نے وہاں کتنا وقت گزارا مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے ساتھ وقت اتنی تیزی سے بیتا تھا کہ میں حیران رہ گیا تھا۔ بارات واپس آگئی تھی دلہن کو لے کر، فائرنگ اور آتش بازی کے علاوہ گاڑیوں کی آواز سے بھی بخوبی اندازہ ہو رہا تھا اور میں ابھی وہیں تھا۔ حجاب نے مجھے ہاتھ جوڑ جوڑ کر وہاں سے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں وہاں سے آتو گیا تھا مگر مجھے لگتا تھا میں اپنے وجود کا کوئی اہم حصہ وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ کیا وہ حصہ حجاب تھی؟ میں تب سمجھ اور جان ہی نہ پایا۔



میں رات بہت لیٹ سویا تھا۔ جی اگلی صبح خلاف معمول بہت دیر سے آنکھ کھلی وہ بھی سیل فون کی تسلسل سے بجتی ہوئی بیل کی آواز پر۔ میں نے بامشکل آنکھیں کھولی تھیں اور سیل فون اٹھا کر کال ریسو کی ”ہیلو! کون؟“ میرا دماغ ابھی تک غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

”سورہے ہو یا ر! اٹھ جاؤ باپ بن گئے ہو تم۔“

دوسری جانب ولید تھا اطلاع اتنی خاص اور اہم تھی کہ میری آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا!

”تمہیں کیسے پتا؟“ میرے لہجے میں بے حد ایکساٹمنٹ تھی۔

”جناب یاد رہے تو آپ نے ہمیں خود اپنے سرال کی ہر خبر پر نظر رکھنے کو کہا ہے۔ گوکہ میں شبیر نہیں ہوں۔“ جواباً اس نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا تو میں بھی ہنس دیا تھا۔

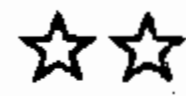
”رات ہی حجاب کو ہاسپٹل لے جایا گیا تھا۔ صبح ڈیوری ہوئی ہے۔ بیچاروں کی ساری رات بھاگ دوڑ میں گزر گئی۔ آپ نے تو عون مرتضیٰ کو اچھا وختا ڈالا۔ اپنی شادی کی رات بھی بیچارہ ہاسپٹل کے کاریڈور میں چکراتا ہوا نظر آیا۔“

وہ اب مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ جیسے مزے لے لے کر بولا۔ جواباً میں نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔

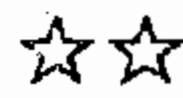
”ہائے اس کی وہ نو خیز نئی نویلی دلہن تو ساری رات اپنے سجنیا کی راہ نکلتی رہی ہوگی۔“

ہم دونوں کتنی دیر ایسی ہی بے تکی ہانکتے رہے تھے۔ پھر ولید نے ایک اہم سوال کیا تھا۔
 ”حجاب ابھی ہاسپٹل میں ہی ہے۔ آپ دیکھنے جائیں گے اپنے بیٹے کو؟“
 ”اسے دیکھنے اور پیار کرنے کا سب سے زیادہ حق مجھے ہی تو حاصل ہے۔ جاؤں گا کیوں نہیں۔“
 ”مگر داؤد صاحب آپ نے اپنے آپ کو کنٹرول رکھنا ہے۔ احتیاط ضروری ہے۔ آپ جانتے ہیں نا کورٹ تک معاملہ پہنچ چکا ہے۔“

ولید نے جیسے مجھے معاملے کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا تو میں نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔
 ”ڈونٹ وری! میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے رسائیت سے کہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا ایک بار پھر یقین دلایا اور سلسلہ کاٹ دیا۔ یہ اس کا تعاون ہی تھا کہ میں ہاسپٹل میں حجاب سے مل سکا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔



حجاب سے ہونے والی اس ملاقات نے بھی مجھے کوئی اچھی امید دلائی تھی نہ کوئی خوشی بخشی۔ وہ مجھ سے بے حد متغیر ہو چکی تھی۔ میری خیر سگالی کی ہر کوشش ناکام گئی تھی۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ہمیشہ کی طرح بھڑک اٹھتا۔ مگر اس کے برعکس میرے اندر ایک ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جانے کیوں مجھے اپنی یہ ہار رو ہانسا کرتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا حجاب کو میں نے حاصل کر کے بھی گویا نہیں کیا۔ میں اسے پا کر بھی کھونے والوں میں شمار ہوا تھا۔ فتح جسم کی تسخیر میں تو نہیں ہوتی۔ محبت کی فتح تو دلوں کی جیت میں ہوتی ہے اور میں یہ جنگ بہت بڑے طریقے سے ہار رہا تھا۔ اب میرے پاس ایک ہی حل تھا کہ میں عون مرتضیٰ سے گزارش کرتا کہ وہ کورٹ سے کیس واپس لے لے اور حجاب کو واپس میرے حوالے کر دے۔ میں اب اس کے ساتھ محبت کا سلوک کر کے اسے جیتنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں نے انتقام کے بعد اس بات کو بھی اپنی زندگی کا اہم مقصد کیوں سمجھ لیا تھا! شاید میں بہت شدت پسند تھا۔ اور ہمیشہ اپنے دل کے تابع رہنا چاہتا تھا۔ اب دل کا یہ تقاضا تھا تو میں نے اپنی ساری توانائیاں اسی جانب مرکوز کر دی تھیں۔ میں نے عون سے اس سلسلے میں رابطہ کیا۔ مگر وہ تو میری بات تک سننے کا بھی روادار نہیں تھا۔ جیسے تیسے جب میں نے اس پر اپنا مقصد واضح کیا تو جواب میں اس کی آنکھوں میں اتنی نفرت اور برہمی اُٹھ آئی تھی جو بیان سے باہر تھی۔ اس نے مجھے بہت بے عزت کیا تھا۔ اتنا کہ میں کھول کر رہ گیا۔ خیر سگالی اور بہتری کے وہ جذبے جو بے حد خاص تھے۔ عون مرتضیٰ کی اسی نفرت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ میں ایک بار پھر زخم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا۔ اب ہم پھر سے دشمن تھے جنہیں بس اپنی اپنی فتح عزیز تھی۔



اس کے بعد ہمارا آمناسا منا کورٹ میں ہوا تھا۔ حجاب اس کی حای کے طور پر اس کے ساتھ تھی۔ میرے اندر بھانپڑ جل اٹھے۔ میں خود کو ہر گز بھی کمپوز نہیں رکھ سکا اور کورٹ میں ہی میری عون مرتضیٰ سے تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ کورٹ میں کیس کی سماعت شروع ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا میرا پلہ کس قدر ہلکا ہے۔ مجھے یہ خوش فہمی پالنے کی

ضرورت نہیں تھی کہ میں یہ کیس جیت جاؤں گا۔ حالانکہ میں نے اپنا ایک ہی موقف رکھا تھا ”کہ عون مرتضیٰ میری بیوی کو میرے خلاف بیان دینے پر مجبور کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔“ حجاب کے بیان نے گوکلاس کی تردید کی تھی مگر میں اپنے موقف سے ایک انچ نہیں سرکا تھا۔ وہیں کورٹ میں میں طے کر چکا تھا۔ مجھے آئندہ کیا کرنا ہے۔ جیتنے کے لیے روز بردستی اور بد معاشی ضروری ہوتی ہے۔ اور بے ایمانی بھی اور دھوکہ بھی، میں بھی پہلے انہیں اصولوں پر کاربند ہو کر جیتا تھا۔ میں اب پھر ایسے ہی جیتنا چاہتا تھا۔ کیس کی اگلی سماعت پندرہ دن بعد کی تھی اور مجھے پورا یقین تھا میں اس دوران کوئی حل نکال لوں گا۔ مگر یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی اگلے دس دن گزر گئے اور میں حجاب اور عون کو ہمسکیاں دینے کے سوا کوئی ڈھنگ کا کام نہ کر سکا۔ میرا جی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں یہ جو دعویٰ کیا تھا مجھے لگتا تھا وہ خاک کا ڈھیر ثابت ہونے والا تھا۔ متوقع سبکی ہزیمت اور ذلت کے احساس نے ان دنوں مجھے نیم دیوانہ کر رکھا تھا کہ قدرت کو مجھ پر رحم آگیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ عون مرتضیٰ کا ایکسڈنٹ ہو گیا مجھے یہ اطلاع بھی ولید نے پہنچائی تھی۔ اگلا سبق بھی مجھے اسی نے دیا تھا۔ اور میں اس کی چال بازی اور ذہانت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہا۔ وہ واقعی میرا غیر خواہ اور دوست ثابت ہو رہا تھا۔ حجاب جتنی جذباتی اور احمق تھی مجھے بھی یقین تھا وہ ہمارے چلائے اس چکر میں آسانی سے پھنس جائے گی اور آنے والے وقت نے ثابت کیا میری سوچ غلط نہیں تھی۔ میرا اندازہ بھی غلط نہیں تھا۔

☆☆

میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا جیسی جیت کے خمار نے مجھے اگلے کئی دن تک کسی اور جانب توجہ دینے کے قابل نہیں چھوڑا۔ عیسیٰ اس دوران مسلسل مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہا تھا اور میں اس کی کوشش کو مسلسل ناکامی کا منہ دکھا رہا تھا۔ یہ ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ جب میں آفس سے نکل کر گھر آنے کو برکنگ کی جانب آ رہا تھا کہ وہ جانے کہاں سے نکل کر ایک دم میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”واٹ ٹان سنس!“

میں نے کسی قدر نخوت سے اسے اجنبیت بھری نظروں سے گھور کر دیکھا تو وہ تلخی سے مسکرانے لگا۔

”بد تمیزی یہ ہے جو میں کر رہا ہوں یا وہ جس کا مظاہرہ آپ کر رہے ہیں؟“

”تمہیں کس نے کہا کہ میں اس شہر میں منصف مقرر ہوا ہوں۔“

میں نے دانستہ تاؤ دلانے کو اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

”صحیح کہتے ہیں۔ آپ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کو یہ عہدہ ملے۔“

بکواس بند کرو۔ میں دھاڑا تو اس نے جواباً غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔

”داؤد بھائی میں آپ کے ساتھ انسانیت سے پیش آ رہا تھا اور آ رہا ہوں مگر آپ مجھے بد تمیزی پر مجبور کر رہے ہیں۔ حجاب کو لے جانا چاہتے تھے آپ! یہی میں بھی کرنا چاہتا تھا مگر مناسب اور عزت دار طریقے سے تعاون کر رہا تھا میں، مگر آپ نے ہمارا کام بگاڑ کے رکھ دیا۔ مجھے بے حد افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ مدد دی اور اچھائی کے قابل ہی نہیں ہیں۔“

اس کے متاسفانہ لہجے میں بے حد کرب شامل ہو گیا تھا۔
 ”کر چکے تم اپنی تقریر؟“

میں نے حقارت بھرے انداز میں کہا تو اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے کچھ اور سرخ ہو گیا۔
 ”آپ بالکل بھی اچھا نہیں کر رہے ہیں داؤد بھائی! اتنی زیادتی کا حساب بھی انسان کو چکانا پڑتا ہے۔“
 وہ بے بسی کی انتہا پر چلا گیا تھا۔ میں نے جیسے حظ لیا تھا اس کی اس بے بسی سے۔
 ”سالا صاحب جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ اہم بات ابھی نوٹ کر لیں۔ میں آپ کے پاس آکر گزارش پیش نہیں کروں گا۔ اوکے؟“

موسیٰ کی رنگت واضح طور پر پھیکی پڑ گئی۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دھکے سے اسے اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا میں متکبرانہ انداز میں چلتا اپنی گاڑی تک آیا تھا اور ایک جھٹکے سے اشارت کرنے کے بعد سرعت سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا ساکن و جامد سراپا بہت دیر تک سائیڈ مرر میں میری نگاہ کی دلچسپی اور مسکراہٹ کا باعث بنا رہا تھا۔

☆☆

مت پوچھیے کہاں دل کو لگا لیا ہم نے
 خود پر حیراں ہوں یہ کیا کیا ہم نے
 میں اس کو چاہتا ہوں یہ اس کے تصور میں بھی نہیں
 اک طوفان اٹھے گا اگر اس کو بتا دیا ہم نے

پھر اس کے بعد وہ ایک کٹھ پتلی تھی میرے ہاتھوں میں۔ جسے میں اپنی مرضی کے مطابق حرکت دے سکتا تھا مگر نہیں یہ میری خام خیالی تھی۔ اس کی یہ سعادت مندی۔ یہ خاموشی وقتی تھی۔ جس روز ہمیں کورٹ جانا تھا اس کی یہ خاموشی ٹوٹ گئی تھی اور اتنی بڑی طرح سے ٹوٹی تھی کہ ایک بار پھر طوفان آ گیا۔ وہ کسی طور بھی اپنے بھائی کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ یہ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی ہی تھی جس نے مجھے پھر سے وحشی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں یکسر بھول گیا تھا کہ میں پچھلے دنوں اس کے لیے کیسی خاص فیلنگ محسوس کرتا رہا تھا۔ اس وقت میرے پیش نظر صرف اپنے مقصد کا حصول تھا۔ میں صرف فتح حاصل کرنا چاہتا تھا عون مرتضیٰ کو ہرانا میری زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔ اور میں نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ میں نے کیا کھودیا ہے۔ کیس کا فیصلہ حجاب کے بیان کی بدولت میرے حق میں ہو گیا تھا۔ اور میں فتح و کامرانی کے احساس میں مبتلا بہت دنوں تک اپنے اس نقصان کو جان ہی نہ پایا جو شاید آئندہ زندگی میں مجھے کسی بڑی کسک میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ اور وہ نقصان تھا ”حجاب“ کو کھودینے کا تھا۔ عجیب بات ہے نا وہ میرے پاس تھی میری پہنچ میں مگر مجھے لگتا تھا وہ کہیں نہیں ہے۔ وہ واقعی کھو گئی تھی۔ اسے میں نے سچ مچ گنوا دیا تھا۔

☆☆

شکوے تو ہوں گے ہم سے
شکایتیں بھی ہوں گی ہم سے
پر اپنوں سے کبھی گلہ نہیں کرتے
اچھے نہیں بڑے ہی سہی

پر ہم جیسے لوگ
ملا نہیں کرتے

میں نے کسمندی سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر موجود تھی اور اسامہ کے کپڑے بدلنے میں مصروف تھی۔ فیروزی کلر کے سوٹ میں ستے ہوئے چہرے اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ تھکی تھکی سی نظر آئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کتنی مرتبہ کہا ہے اس قسم کے فضول کام نہ کیا کرو۔ گورنس کس مرض کی دوا ہے؟“
میرے لہجے میں بہت واضح ناگواری تھی۔ اس نے کچھ چونک کر ایک نظر مجھے دیکھا اور بغیر کسی تاثر کے پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ بے نیازی اور لاتعلقی اب اس کا معمول بن گئی تھی۔ مگر میں اس کا عادی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کی خاموشی نے مجھے تپا ڈالا تھا۔

”تم بہری ہو؟ سنا نہیں ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔“
اس کی کلائی پکڑ کر مرڑوتے ہوئے میں نے غرا کر کہا تو اس نے مجھے پھر ایک نظر دیکھا۔
ٹھیک ہے میں آئندہ نیچی کروں گی۔

اس کا لہجہ اس کے چہرے کی طرح سے ہی بے تاثر تھا۔ میں ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ اب میری کسی بات سے اختلاف نہیں کرتی تھی۔ میں نے اس کی بے حسی اور لاتعلقی توڑنے کو اس کی خاموشی کا قتل توڑنے کو ہر حربہ آزما لیا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکی۔ میں نے اس سے تعلق میں نفرت اور محبت دونوں کی انتہا کو چھوا تھا میں پھر یہ حربہ آزما چکا تھا محض اس کی چپ توڑنے کو میں نے ایک بار نہیں متعہ بار اس پر ستم ظریفی کی انتہا کر دی مگر اس کے منہ سے احتجاج کا ایک لفظ نہیں نکل سکا تو میں خود اپنے آپ میں شرمسار ہو کر رہ گیا پھر اس کا ازالہ کرتے ہوئے اسے منانے کی سعی میں میں نے اس پر محبتوں اور عنایتوں کی بھی بارش برسا کر دیکھ لی مگر اس کی بے حسی نہیں ٹوٹی تو میں جھنجھلا کر رہ گیا تھا۔ میں جیسے کبھی اس کے حصول کے لیے تڑپا تھا آج کل اس سے ہزار گنا بڑھ کر شدت سے میں اس کی توجہ اور محبت کی خاطر مچل رہا تھا جو مجھے مل کے نہیں دے رہی تھی۔
ناکامی میرے نصیب کا حصہ بن کے رہ گئی تھی بے بسی میرا مقدر بن گئی تھی۔ جھنجھلاہٹ اور طیش میں محض اس کی توجہ حاصل کرنے کو میں نے اُلٹے سیدھے قدم بھی اٹھائے راتوں کو دیر سے گھر آنا شروع کیا۔ شراب نوشی کی کثرت کر دی مگر اس نے جیسے میری طرف سے اپنی آنکھیں ہی بند نہیں کی تھیں شاید میرا ہونا نہ ہونا اس کے لیے ایک برابر ہو کے رہ گیا تھا۔ اور میرا طیش تھا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی طیش میں میں نے

ایک اور انتہائی قدم اٹھایا تھا میں ڈسٹرب تو اکثر رہنے لگا تھا۔ اس رات میں کلب میں موجود تھا اور ایک ٹیبل پر سر جھکائے بیٹھا ڈرنک کرنے میں مصروف تھا جب علیہ میرے نزدیک آگئی تھی۔

”ہیلو ابوداؤد؟“ وہ چپکلی تھی میں چونک کر متوجہ ہوا۔

”اواس ہوتا؟“ میری پھکی مسکان نے شاید میرے اندر کا بھید عیاں کر دیا تھا۔ اور میں نے بلا تامل

مان لیا۔

”تمہاری پارسا بیوی تمہارا خیال نہیں رکھتی؟“ اس کا لہجہ رقابت کی آگ میں جل رہا تھا۔ جواب

میں میرے لبوں پر خاموشی تھی میں ٹیبل کی سطح کو گھورتے ہوئے شمپین کے گھونٹ بھرتا رہا۔

”دل پشوری کو بیوی کا وجود ملے ضروری تو نہیں ہے ابوداؤد! میں آج بھی تمہاری منتظر ہوں۔“

اس نے میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو میں نظریں چرا گیا تھا۔

”ابھی تک ویسے ہی پارسا ہو؟“ وہ زہر خند سے بولی تھی اور میں کسی خیال کے تحت چونک گیا تھا۔

”تم آج میرے ساتھ چل سکتی ہو؟“

میں نے ایک ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ میں ہر قیمت میں اس پتھر میں جھونک لگا دینا چاہتا تھا۔

”کہاں؟“ وہ اک ادا سے مسکرائی جیسے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی ہو۔

”میرے گھر۔ ہم رات اکٹھے گزار سکتے ہیں۔“

میری بات نے اس کی باچھیں چیر دی تھیں۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ابوداؤد! میں تو ازل سے تمہاری تھی۔ ابد تک تمہاری رہوں گی۔“

وہ ایک دم مستی میں آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ آج

ڈرنک میں نے کچھ زیادہ کر لی تھی۔ علیہ کو مجھے سہارا دے کر گاڑی تک لانا پڑا اور رائیونگ بھی اسے خود کرنا پڑی تھی۔

”میں کر لوں گا علیہ!“

میں نے نرمی سے تو کہا تھا۔ جواباً وہ بے حد شوخی سے ہنس دی۔

”نہیں میری جان! میں یہ رسک کم از کم آج کی رات نہیں لے سکتی یہ رات تو میری زندگی کا حاصل

بننے والی ہے نا۔ اسے کسی حادثے کے حوالے کیسے کر سکتی ہوں۔“

اس کا لہجہ بے حد معنی خیز تھا جواب میں میں نے دانتہ خاموش رہا۔ وہ نہیں جانتی تھی میں اپنے مقصد

کے لیے اسے استعمال کرنے والا ہوں۔

”تمہاری وائف گھر پر نہیں ہے کیا ابوداؤد؟“

”گھر پر ہی ہے کیوں؟“ میں ذرا سا چونکا۔

”تو پھر ہم کہیں اور چلتے ہیں نا خواہ مخواہ بد مزگی ہوگی۔“

اس نے کچھ بے چین ہو کر کہا تو میں نے دل سے خواہش کی تھی کاش بد مزگی ہو جائے۔ میں علیہ

کے ہمراہ گھر پہنچا تو میری طبیعت کچھ اور بھی بگڑ گئی تھی۔ میں علینہ کے نہارے سیدھا بیڈروم میں ہی آیا تھا۔ حجاب اس وقت بستر پر دراز تھی۔ اسامہ اس کے سینے پر اوندھے منہ لیٹا سو رہا تھا۔ خود اس کی اپنی آنکھیں بھی بند تھیں۔ مگر کھٹکے کی آواز پر اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ میں بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری تھی اگلا احساس غیر یقینی کا تھا۔ مگر یہ لمحاتی کیفیت تھی۔ اگلے لمحوں میں اس نے نگاہ کا زاویہ بدل کر ہونٹ بھیج لیے تھے۔ میں مسکرایا تھا۔

”حجاب میٹ مائی فرینڈ علینہ! یونو یہ مجھے بہت محبت کرتی ہے۔ آج یہ یہیں رہے گی میرے ساتھ اسی بیڈروم میں۔ تم ایسا کرو دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔“

اس کے چہرے پر نگاہ جمائے اس کے تاثرات کو جھانچتے ہوئے میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو تعجب ابھرا تھا پھر وہ ویسا ہی سپاٹ نظر آنے لگا۔ کچھ کہے بغیر اس نے جھک کر اسامہ کو اٹھایا تھا اور اسی خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میں شکوک کھڑا رہ گیا تھا۔ توہین آمیز سا احساس میری رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اس کا مطلب تھا اے بالکل بھی میری پرواہ نہیں تھی۔ اے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میں اس کے سامنے ہی اس کا حق کسی اور کو دے دوں۔ میرے دل و دماغ میں شعلے سے لپکنے لگے۔ میرا جی چاہا تھا میں کھڑے کھڑے اطراف میں آگ لگا دوں۔ ویسی آگ جیسی میرے اندر بھڑک اٹھی تھی۔

”کیا ہوا ابوداؤد تم اس طرح خاموش کیوں ہو گئے ہو؟“

علینہ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے حیرت بھرے انداز میں استفسار کیا تھا۔ میں نے جواب میں خالی نظروں سے اسے دیکھا پھر اسے جھٹکتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ ’حجاب‘ مجھے لاؤنج میں مل گئی تھی۔ اسامہ ہنوز اس کی گود میں تھا۔ مجھے رو برو پا کے اس کی پیشانی ٹسکن آلود ہوئی تھی البتہ اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

”میں اس عورت کو واپس چھوڑ آتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم میری پذیرائی کرو۔“

میں نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر جیسے سرگوشی کی تھی۔ اس نے جواباً تیز نظروں سے مجھے گھورا تھا۔ ”آپ بھاڑ میں بھی چلے جائیں تو میں ایسا نہیں کروں گی۔ پذیرائی وہاں ہوتی ہے جہاں محبت ہو میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے؟“

اس کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا بے حد سرد تھا۔ میں نے ہونٹ بھیج کر بے بس نظروں سے اسے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا تو میرے انداز میں واضح شکست اور لاچارگی تھی۔

”میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں حجاب! جواب میں محبت کی چاہ رکھنا میرا حق نہیں ہے؟ تم بھول کیوں نہیں جاتی ہو کچھلی باتیں۔ ہم نئے سرے سے بھی تو زندگی شروع کر سکتے ہیں۔“

”آپ کیوں نہ بھول گئے تھے؟ آپ نے کیوں نہ معاف کر دیا تھا مجھے! میں..... جس کا کوئی قصور نہیں تھا مگر پھر بھی میں نے آپ کو معاف کیا۔ آپ کو قبول کیا۔ آپ کے ساتھ زندگی گزارتی رہی مگر اس روز انتہا ہو گئی تھی۔ آپ نے حجاب کو مار دیا تھا۔ اب وہ زندہ نہیں ہے تو کیسے پذیرائی کرے کیسے محبت کا جواب محبت سے

دے۔ اسے اب تو معاف کر دیں۔ اس کی اب تو جان چھوڑ دیں۔ لوگ مردوں کو تو تنگ نہیں کیا کرتے۔ وہ اپنی بات کے اختتام تک پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ میری آنکھوں کی جلن بڑھنے لگی۔ میں کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا تھا پھر شکستگی سے واپس پلٹ گیا۔ میں کمرے میں لوٹا تو علینہ میری منتظر تھی مگر میں اس کی توقع اور امیدوں پر پورا نہیں اتر سکا۔ آپ نے کبھی کسی ٹوٹے ہوئے انسان کو کسی کی توقع یا امید پر پورا اترنا دیکھا ہے؟ میں کیسے اتر سکتا تھا صبح دم جب وہ گئی تو مجھ سے بے حد خفا تھی۔



ہم آج بھی ہیں سوچ میں ڈوبے ہوئے محسن!
خود سے کبھی دنیا سے روٹھے ہوئے محسن!
دینے کے لیے اس کو جو ہم نے تھے سنبھالے
وہ پھول کتابوں میں ہیں سوکھے ہوئے محسن!
وہ اپنی جفاؤں میں کچھ تو کمی کریں آج
اک عمر ہوئی شہر وہ چھوڑے ہوئے محسن
ہم نے یہ کہا تھا کہ انہیں پیار ہے ہم سے
ہم آج بھی بھری بزم میں جھوٹے ہوئے محسن
یادوں میں ان کی ہمیں راحت جو ملی ہے
ہم آج ہیں اندر سے کچھ ٹوٹے ہوئے محسن

محبت۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ایک تلخ حقیقت۔ میں نے اسے تب مانا جب میں اندر سے اس محبت کے ہاتھوں خالی ہو گیا تھا۔ اس کی توجہ اس کی محبت کی ایسی طلب میرے اندر اٹھی تھی جس نے روح کے اپوانوں میں ہر سمت پھول اُگا دیئے۔ میں خود پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا یہ میں ہوں؟ وہی ابو داؤد جس کی اکثر جس کا طعنہ کمال تھا۔ جس نے کبھی اپنے آگے کسی کو قابل در خواستنا نہیں جانا تھا۔ وہ محبت کے ہاتھوں اس بڑی طرح سے شکست کھا گیا تھا کہ خود اسے اپنے اوپر رحم آنے لگا تھا۔ سکون زندگی سے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ میں دل کا کاسہ لیے ہریل اس کی توجہ اور محبت کے سکوں کی آس میں کسی گداگر کی طرح بیٹھا رہتا اور وہ اتنی ہی بے حس ہو گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر پیوینگنٹ ہوئی تو میں نے اس کی ناز برداری اور چاؤ چونچلے اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ میں اس کی توجہ حاصل کرنے کو بھی نہیں کر رہا تھا۔ میں تو بس اپنے دل کے ارمان پورے کرنا چاہتا تھا جو ایک محبوب بیوی کے لیے شوہر کے دل میں اٹتے ہیں۔

”تم خوش رہا کرو حجاب! میں تمہیں مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔“

رات کو جب میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا اور بہت اپنائیت آمیز انداز میں اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ اس نے جواب

میں ایک گہرا سانس بھرا اور سر جھکا لیا تھا۔ مجھے اس کا جواب نہ پا کر مایوسی تو ہوئی مگر ہمت نہیں باری۔

”کچھ بات کیا کرونا۔ میں تمہیں سننا چاہتا ہوں۔“

”کیا بات کروں؟“ وہ بے حد بے زار نظر آنے لگی۔

”چلو یہی بتاؤ ہم اپنے بچے کا کیا نام رکھیں گے؟ تمہیں یاد ہے اس مرتبہ نام رکھنے کا اختیار تمہارے

پاس ہے۔“

میں نے مسکرا کر بشارت سے کہا تو اس کے چہرے کی بے زاری میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

”نہیں آپ خود رکھ لینا۔“

”حجاب مجھے بیٹیاں اچھی لگتی ہیں۔ اس مرتبہ ہمارے ہاں بیٹی ہونی چاہیے۔“

”خدا نہ کرے۔“

اس نے جس طرح ہول کر کہا تھا۔ میں نے متحیر نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟ تمہیں لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں؟“

”بیٹیاں کیسے بڑی لگ سکتی ہیں یہ تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ میں تو اس کے نصیب سے خائف

ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں ایک دم آنسو بھر آئے اور میں جیسے مجرم سا بن گیا۔ مجھ سے کتنی دیر تک کچھ بولا نہیں گیا

تھا۔ وہ بھی جیسے نڈھال ہو گئی تھی سنگی بچ پر بیٹھ کر گہرے سانس بھرنے لگی۔

”تھک گئی ہو؟ آؤ اندر چلتے ہیں۔“

میں اسے سہارا دیئے اندر لایا تو تب بھی اس کی سانس پھول رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ہر ممکن طریقے

سے اسے خوش رکھنے کی تاکید کی تھی۔

”حجاب مجھے اس چیز کا نام بتا دو پلیز! جو تمہارے چہرے پر مسکراہٹ لادے۔ میرا یقین کرو میں

پنی جان وار کر بھی حاصل کر سکتا تو کروں گا۔“

میں بے حد متلجی ہو گیا تھا اس کے ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے میں نے جس دلگیری سے کہا اس کا

حجاب پر بالکل اثر نہیں ہوا تھا۔

”عزت اگر ایک بار چھن جائے تو کبھی واپس نہیں ملتی۔ مان اور بھروسے اگر ٹوٹ جائیں تو جوڑے نہیں

جاسکتے۔ ابوداؤد آپ نے مجھ سے میری یہی متاع چھین لی ہے اب کہاں سے لائیں گے جان وار کر بھی نہیں۔“

اس نے بھراہٹ زدہ آواز میں کہا تھا اور رخ پھیر کر لیٹ گئی۔ میں ساکن بیٹھا رہ گیا تھا۔ مجھے لگا

میں اسے کبھی خوشی نہیں دے سکوں گا۔ مجھے لگا میں ہمیشہ کے لیے بار گیا ہوں۔ ہاں دلوں کی ہار سے بڑھ کر بھی

کوئی ہار ہوتی ہے۔ مار ڈالنے والی ختم کر دینے والی۔ میری بدنصیبی تھی کہ یہی ہار میرا نصیب بن گئی تھی۔ نارسائی

کی آگ میں اب مجھے عمر بھر جلنا تھا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی اذیت ہو سکتی ہے کہ جس سے آپ محبت کرتے

ہوں اسے حاصل بھی کر چکے ہوں اس پر دسترس بھی پا چکے ہوں پھر بھی وہ آپ کی پہنچ سے دور ہو۔ پھر بھی آپ

اسے حاصل نہ کر پائیں۔ نہیں اس سے بڑی کوئی اذیت نہیں تھی۔

☆☆

کہا تھا نا اس طرح سوتے ہوئے مت چھوڑ کے جانا مجھے

مجھے بے شک جگا دینا دینا

محبت کے سفر میں میرے ساتھ چل نہیں سکتیں

جدائی کے سفر میں میرے ساتھ چل نہیں سکتیں

تمہیں راستہ بدلنا ہے

میری حد سے نکلنا ہے

تمہیں کس بات کا ڈر تھا

تمہیں جانے نہیں دیتا

کہیں پر قید کر لیتا

ارے بھلی!

محبت کی طبیعت میں زبردستی نہیں ہوتی

جسے رستہ بدلنا ہو

اسے رستہ بدلنے سے

جسے حد سے نکلنا ہو

اسے حد سے نکلنے سے

نہ کوئی روک پایا ہے

نہ کوئی روک پائے گا

تمہیں کس بات کا ڈر تھا

مجھے بے شک جگا دیتیں

میں تم کو دیکھ ہی لیتا

تمہیں کوئی دعا دیتا

کم از کم یوں تو نہ ہوتا

میری ساتھی!

حقیقت سے

تمہارے بعد کھونے کے لیے

کچھ بھی نہیں باقی

مگر پھر بھی مجھے دیکھو

ابھی بھی کھونے سے ڈرتا ہوں

میں اب سونے سے ڈرتا ہوں

میں عون ہوں۔ عون مرتضیٰ! خدا نے جسے ہمیشہ نوازا تھا۔ میری سوچ اور صلاحیت و اوقات سے
 کھ کر شاید پھر کسی کی نظر لگ گئی۔ درہم برہم ہو گیا سب کچھ اور میں بکھر سا گیا۔ کہتے ہیں وقت ہمیشہ ایک جیسا
 س رہتا۔ ہاں یہ سچ ہے۔ اگر اچھے دن ہم نے دیکھے ہوتے ہیں تو پھر تنگی اور آزمائش بھی ہمارا نصیب بنی
 تی ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ ہر انسان کو آزمانے اور پرکھنے کا اس ”مالک دو جہاں“ ”بے نیاز شہنشاہ“
 اپنا انداز ہے۔ یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی جب ہمارا یونیورسٹی پیریڈ اپنے اختتام کی جانب رواں دواں
 ۔ بہرینہ اور ابوداؤد سے میں وہیں متعارف ہوا تھا۔ جو آگے چل کر میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت
 یار کر گئے تھے۔



نواں حصہ

ہوتا ہے نا اس طرح بھی کہ کچھ لوگ آپ کی زندگی میں بہت یادگار رہ جاتے ہیں۔ چاہے ان کا کردار کتنا ہی ثانوی کیوں نہ ہو مگر آپ کو شش کے باوجود انہیں بھول نہیں پاتے۔ ابوداؤد اور سبرینہ کے نام میری زندگی کے لیے بھی ایسے ہی اکنو پس ثابت ہوئے۔ جو چمٹ جاتے ہیں تو خون چوسے بغیر جسم سے الگ نہیں ہوتے۔ یہی وہ دو شخصیتیں تھیں جن پر میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ بھروسہ کیا۔ سب سے زیادہ محبت اور مان بخشا مگر یہی وہ دو لوگ تھے۔ جنہوں نے میرے بھروسے کو ریزہ ریزہ کر دیا اور میری محبت کو شدید نفرت میں بدل دیا۔ زندگی میرے لیے کبھی اتنی کنھن نہیں تھی جتنی ان دونوں سے ملنے کے بعد ہو گئی۔ سبرینہ ابوداؤد سے پہلے میری زندگی میں آئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی ہاں البتہ وہ خود کو بہت خاص اور حسین بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرتی تھی۔ پہننے اوڑھنے اور گفتگو کا بہت سلیقہ تھا اسے۔ دلوں کو جیتنے کا فن بھی اسے بخوبی آتا تھا۔ وہ طرح دار تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی کے اکثر لڑکے اسے دل و جان سے پسند کرتے تھے۔ دوسری طرف میں تھا۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے رہنے والا۔ میں ذہن اور قابل تھا اسکول و کالج سے لے کر پھر یونیورسٹی تک میں ہمیشہ اساتذہ کا چہتا رہا تھا۔ کلاس میں میری پوزیشن ہمیشہ ٹاپ پر رہی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی میں ٹاپ رہنے کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل کر گیا تھا۔ ڈیٹ کا مقابلہ ہوا الیکشن مجھے کوئی ہرا نہیں سکا تھا یہ میرا ایک ریکارڈ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اگر مجھے پسند کرنے والے لوگ تھے تو نا پسند کرنے والے بھی۔ سبرینہ کا شروع میں شمار پہلی کیئگری میں ہوا تھا تو ابوداؤد کا ہمیشہ دوسری کیئگری میں شمار ہوا۔ وجہ بھی کچھ اور نہیں سبرینہ ہی ٹھہری یہ تو مجھے بہت بعد میں جا کے پتا چلا کہ سبرینہ اس کی رشتہ دار تھی اور اس کی منگیتر بھی۔ یوں اگر دیکھا جاتا تو ابوداؤد کی مجھ سے نفرت اور جڑ جائز تھی کہ میں اس کی منگیتر کے ساتھ آزادانہ گھومتا پھرتا تھا اور ایک طرح سے اس کا حق غضب کر رہا تھا۔ مگر تب تک میں یکسر لاعلم تھا۔ خیر سبرینہ سے میری دوستی یا محبت سبرینہ کی پیش رفت کے بعد ہی آگے بڑھی تھی۔ اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا جسے تھامنے میں بہر حال مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ یونیورسٹی کی بے حد اہم لڑکی تھی۔ یہ دوستی ہمارے بیچ کب اور کیسے محبت کا بیج بو گئی مجھے کبھی اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ وہ مجھے پسند کرتی تھی تب بھی اس کا اعلان وہ بیانگ دہل کرتی تھی پھر اس نے اپنی محبت کو مجھ سے کہاں چھپانا تھا۔ سبرینہ ایسی لڑکی تھی جس کی محبت کے ملنے پر لڑکے مجھ سے رشک اور حسد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میں ہر کسی سے بے نیاز محبت کے راستوں

اس کے سنگ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ یہاں فائل ایئر تھا جب وہ ناخوشگوار واقعہ ہوا جس نے بعد میں میری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں اس روز کچھ کتابیں ایشو کروانے یونیورسٹی کی لائبریری میں آیا تھا جب سبرینہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی وہیں آگئی تھی۔

عون مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔

میں الماری کے کیمبٹ میں سے اپنی مطلوبہ کتابیں ڈھونڈ رہا تھا اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا تھا۔

”ہاں بولو؟ میں پوری طرح اپنے کام میں محو تھا“

”تم سنو گے دھیان سے تو بولوں گی نا۔“ وہ پتا نہیں کیوں جھلا گئی تھی۔ میں مسکرایا تھا پھر اسے دیکھنے لگا۔

اب بولو!

”عون وہ ایک لڑکا ہے فضول سا وہ مجھ پر لائنیں مار رہا ہے۔“

اس نے کسی قدر رازداری سے بتایا تھا۔

”کیا مار رہا ہے؟“ میں نے اچھپے میں مبتلا ہو کر اسے دیکھا تھا۔

”لائنیں مطلب مجھ پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ فضول میں راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مجھے دیکھ کر

میری فضول شاعری سناتا ہے کہ بس خون کھول جاتا ہے۔“

میری پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔ مجھے اعتراف ہے میں ان دنوں بہت جذباتی

رکسی قدر راجح ہوا کرتا تھا۔ بہت جلدی غصے میں آ جانے والا۔

”کون ہے وہ کیا نام ہے؟“

میرا لہجہ میرے شدید طیش کے باعث زہر آلود ہو گیا تھا۔ جواب میں اس نے مجھے ابوداؤد کا نام اور

نیوڈیٹا بتا دیا۔

”اتنا عجیب و غریب ہے نا کہ مجھے تو دیکھ کر ہی غصہ آ جاتا ہے اسے۔ اور جرأت دیکھو اس کی

یونیورسٹی کی سب سے حسین لڑکی کو پٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

اس کے لہجے میں نفرت اور نخوت بھرا ہوا تھا۔

”میں پوچھ لوں گا اس سے۔“

میں نے جواباً اسے تسلی دی تھی۔ مگر اس کے بعد اپنی پڑھائی کی مصروفیت میں گم ہو کر اس بات کو

میں سے محو کر بیٹھا تھا۔ جب کچھ دن گزرنے پر سبرینہ غصے میں بھری ہوئی میرے پاس آئی تھی اور کاغذوں کا

بیل پلندہ میرے سامنے پٹخ کر اس نے مجھ پر برستے ہوئے کہا تھا۔

”تم بزدل ہو یا بے عزت میں نہیں جانتی۔ میں نے تمہیں خبردار کیا تھا اس کے بارے میں مگر تم

نے اس سے بات کرنی بھی گوارا نہیں کی۔ اس کی دیدہ دلیری دیکھو اور دھڑلہ ملاحظہ کرو یہ سارے لیٹرز اس نے

بہ ہفتہ کے اندر میرے گھر کے پتہ پر بھیجے ہیں۔ میں تمہاری ہونے والی بیوی ہوں عون کیا میری عزت کا

تمہیں اتنا ہی خیال ہے کہ کوئی بھی منہ اٹھا کر مجھے چھیڑ دے یا اتنے تھرڈ کلاس سطحی لیٹر لکھ دے؟“ وہ غصے میں لال پیلی ہو رہی تھی۔ لال پیلا تو میں بھی ہو گیا تھا۔ نو جوانی کا دور تھا گرم خون جوان خون طعنوں سے مزید ابال کھا گیا۔ پھر میں نے جو کیا تھا وہ اپنے آپ کو غیرت مند ثابت کرنے اور بزدلی کا دھبہ اُتارنے کو کیا تھا۔ اس نے پہلے میں ابو داؤد کو ایک تنبیہ کر چکا تھا جس کا اثر نہ لے کر اس نے مجھے کچھ اور غصہ دلا دیا تھا۔ اس روز ایک تماشائی ہوا تھا۔ پوری جامعہ کے سامنے میں نے ابو داؤد کی درگت بنائی تھی۔ پوری جامعہ نے اس روز اسے ذلیل ہوتے دیکھا تھا اور میری واہ واہ کی تھی تب مجھے احساس تک نہ ہوا تھا میں نے کچھ غلط کیا ہے۔ یا مجھے کسی نے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ میں بس فتح کے نشے میں چور رہا تھا۔ اس معاملے کے بعد جو اساتذہ اور پرنسپل صاحب کی تنبیہ اور ڈانٹ میں نے سنی یا ناراضی سہی وہ بھی مجھے برینہ کے التفات کے باعث زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کارنامے پر بہت نازاں بہت خوش ہوئی تھی۔ پھر شعوری یا لاشعوری طور پر میں ابو داؤد کا منتظر رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں ہر انسان کے اندر کمینگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں اس شکست کے بعد اس کی شرمندگی اور سبکی کو محسوس کر کے لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ وہ پھر کبھی یونیورسٹی میں مجھے نظر نہیں آ سکا۔

ہمارا فاضل ایئر مکمل ہوا اور ہم نے یونیورسٹی کو خیر آباد کہہ دیا۔ اس کے بعد عملی زندگی کا آغاز ہوا تھا میں پیپا کے ساتھ بزنس جوائن کر چکا تھا۔ برینہ کے ساتھ میری محبت کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس سے شادی کو اتنا ڈلا ہوا جا رہا تھا۔ ہماری شادی والدین کی باہم رضامندی سے ہوئی تھی مگر جانے کیوں کبھی مجھے لگتا تھا ماما برینہ کو کچھ خاص پسند نہیں کرتیں۔ ان کے خیال میں برینہ بہت براڈ مائنڈڈ تھی۔ وہ اپنی بہو خاص طور پر بڑی بہو ہرگز بھی ایسی نہیں چاہتی تھیں مگر میری پسندیدگی اور خواہش کے آگے انہوں نے چپ سادھ لی تھی۔ ہماری شادی طے ہو چکی تھی اس کے باوجود برینہ مجھ سے روز ملتی تھی جس دن میں اپنی مصروفیت کی بنا پر اس سے نہ مل پاتا وہ خود میرے پاس آدھمکتی۔ اس نے کبھی آفس یا گھر آنے پر تعرض نہیں کرتا تھا مگر میں جانے کیوں شرمندہ ہو جاتا اگر وہ آفس آتی تو مجھے پیپا سے نظریں چرانا پڑتیں اور گھر پر ماما اور بھائیوں سے۔ تو اس کی وجہ برینہ کی مجھ سے بے تکلفانہ گفتگو اور اتفاف کے کھلم کھلا مظاہرے تھے۔ میں اکثر جربز ہو جایا کرتا اور بے لفظوں میں متعدد بار اسے بتایا بھی کہ ہمارا گھر انہ روایات پسند ہے ہمارے ہاں لڑکے لڑکی کا یوں آزادانہ میل جول پسند نہیں کیا جاتا۔ مگر وہ جواب میں بڑے دھڑلے سے اپنے گھر اور روایات کو گنوا نا شروع کر دیتی کہ ”وہ لوگ بہت روشن خیال اور صاف ذہن کے مالک ہیں۔ وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے والے وغیرہ۔“ ایسے میں مجھے خاموش ہو جانا پڑتا۔ ایسا ہوتا ہے آپ جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو پھر اس کی خامیوں سے بھی آپ کو سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ سمجھوتہ میں نے بھی کیا تھا مگر میں یہ سمجھوتہ ساری زندگی نہیں کر سکا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ برینہ کی ذات کی ہر خامی نظر انداز کر دینے والی نہیں تھی۔

وہ اکثر مجھ سے کہتی تھی
 وفا ہے ذات عورت کی
 مگر جو مرد ہوتے ہیں بہت بے درد ہوتے ہیں
 کسی بھورے کی صورت گل کی خوشبو لوٹ لیتے ہیں
 سنو تم کو قسم میری
 روایت توڑ دینا تم
 نہ تنہا چھوڑ کے جانا نہ دل کو توڑ کے جانا
 مگر پھر یوں ہوا محسن!
 مجھے انجانے رستے پر اکیلا چھوڑ کر اس نے
 محبت چھوڑ دی اس نے
 وفا ہے ذات عورت کی
 روایت توڑ دی اس نے

وہ درحقیقت کیا تھی۔ میں اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ میں وہی تھا جسے بھرپور کوشش اور خواہش سے اس نے اصل کیا تھا۔ میں اس کی آرزو تھا، محبت تھا۔ وہ یہی کہتی تھی مگر جب میں اسے مل گیا پتا نہیں یہ اٹریکشن کیوں ختم ہو گئی۔ اس کا دل مجھ سے اتنی جلدی کیوں بھر گیا وہ مجھ سے اتنی جلدی کیسے اکتا گئی۔ شاید جو اس نے محبت کی تھی محبت نہیں تھی کیونکہ محبت کے جذبے اور احساس میں کہیں بھی کوئی چور در پچہ اور روزن نہیں کھلتا۔ ہاں پیار میں بسا ہوتا ہے۔ فیزی نیشن اور اٹریکشن میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ یہ وقتی احساس ہوتے ہیں۔ اس کے احساس کو میں میں میں سے کوئی نام دے سکتا ہوں۔ ہماری شادی کے شروع کے چند مہینے وہ بہت خوش مگن اور کھلی کھلی رہی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ میرے گھر والوں کو تب بھی پسند کرتی تھی نہ ان سے گلنا ملنا اسے گوارا تھا۔ شادی کے بعد بھی میری ساری ذمہ داریاں ماما پر تھیں۔ میرے کپڑے دھلوانا، وارڈ روب میں رکھوانا، ناشتہ، کھانا وغیرہ سب کچھ ماما پر تھا۔ یہاں تک کہ اس نے خود اپنی ذمہ داریاں بھی ماما پر ڈال دی تھیں۔ میں اکثر شرمندہ ہو جایا کرتا۔ مگر ماما حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں۔ یا شاید انہیں مجھ سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس قسم کی باتیں بتلا کر مجھے ٹینشن دینا نہیں چاہتی تھیں۔ جو اکثر سہرینہ میرے کانوں پھونکتی رہتی تھی۔ وہ اکثر مجھے ماما، پیپا، بھائیوں ہاں تک کہ حجاب کے متعلق بھی بھڑکانے اور کان بھرنے کی کوشش کرتی۔ تب حجاب بہ مشکل گیارہ بارہ سال کی تھی۔ اسے کسی کی انسلٹ کرنے یا جھگڑے کا کیا پتا تھا مگر سہرینہ حجاب کے متعلق مجھے ہر روز بتایا کرتی کہ اس نے آج مجھ سے بدتمیزی کی میری فلاں چیز توڑ دی۔ میں نے روکا تو آگے سے بدتمیزی کی۔ وہ بہت زبان دراز ہے، آپ نے اسے بہت سرجڑھا رکھا ہے وغیرہ۔ میں لازماً اس کی باتوں میں آ جاتا اگر جو اس کے طور طریقے پر غور کریں گے تو وہ سوجھ بوجھ سے آفس جاتا تو وہ سوری ہوتی۔ واپسی پر وہ ہر روز نک سک سے تیار

ملتی۔ کبھی اپنی ماں کے گھر جانے کی فرمائش، کبھی لانگ ڈرائیو پر تو کبھی آؤنگ و غیرہ۔ اس نے کبھی میری تھکن کا احساس نہیں کیا تھا۔ میں تو جیسے صحیح معنوں میں شادی کر کے پھنس گیا تھا۔

اپنا کیا دھرا تھا بھگتنا تو پڑنا تھا۔ اس روز میں آفس میں تھا جب اس نے فون کر کے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ماما کی طرف ہے میں واپسی پر اسے لے لوں۔ میری اس روز بہت اہم میننگ تھی فارغ ہوتے مجھے رات ہو گئی تھی۔ بہر حال میں آفس سے واپسی پر سبرینہ کے میکے چلا آیا تھا۔ اس روز گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ ملازم نے مجھے بتایا تھا۔ بیگم صاحبہ لاؤنج میں ہیں۔ میں لاؤنج کی جانب بڑھتے ہوئے ٹھٹھک گیا تھا۔ اندر سے سبرینہ کے زور زور سے بولنے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ مجھے جس بات نے ساکت کیا تھا وہ اس کی گفتگو میں ابو داؤد کا تذکرہ تھا۔ ابو داؤد میرے لیے قصہ پارینہ بن چکا تھا بیشک مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھ جیسے حساس اور نرم طبیعت کے مالک شخص کی کسی سے اس حد تک روارکھی گئی زیادتی اکثر پشیمانی اور شرمندگی کا باعث بنتی رہی تھی۔ یہ یاد میرے لیے ہمیشہ پچھتاوا بنی تھی کہ میں کسی کے ساتھ ناروا سلوک کر چکا تھا۔ میں دانستہ دروازے کے باہر رک گیا تھا۔ وہ اپنی ماما سے بہت جوش بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”اے میری سمجھ داری کہیں مام کہ میں نے اس کھڑوس آدمی سے عون کے ذریعے نجات حاصل کر لی۔ ورنہ آپ نے تو بابا کے پریش میں آکر میری شادی اپنے اس دور پار کے پینڈو بھانجے سے کر ادینی تھی۔ وسیع جائیداد کے لالچ میں۔ ریلی مجھے تو اسے دیکھ کر بھی گھن آتی تھی۔ سوکھا سڑا، ڈریکولا۔ وہ ایک شوہر کے طور پر مجھے ہرگز پسند نہیں تھا۔ کہاں عون مرتضیٰ جیسا ویل ڈریسٹ، بے حد وجیہہ شخص اور کہاں وہ اجڈ ہکلا سا ابو داؤد! جسے نہ ڈھنگ سے بولنا آتا تھا نہ اعتماد تھا اس میں، آپ کو تو داد دینی چاہیے میری سمجھ داری کی کہ میں نے ایسا داؤد کھیلا کہ پتا ہی صاف کر دیا اس کا۔ وہ تو شکر ہے عون نے تب ان لیٹرز کو کھول کر نہیں پڑھ لیا تھا ورنہ وہ شاید ذرا سا غور کرنے پر میری ہنڈ رائیٹنگ کو بھی پہچان جاتا۔“

وہ ہنس رہی تھی۔ میں سن کھڑا تھا۔

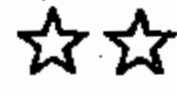
”تم نے بھی بے وقوفی کی سبرینہ! تمہیں وہ لیٹرز خود نہیں لکھنے چاہیے تھے اگر پکڑی جاتی تو پھر.....“ اس کی ماما بھی اس کے ساتھ ہنس رہی تھیں مگر انہوں نے ٹوکا بھی تھا۔ اس کا مطلب وہ اس سازش میں شامل تھیں۔

”پکڑی تو نہیں گئی نا۔ بس میں کسی اور کو اس راز میں شریک کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ معاملہ بہت نازک تھا۔“

”افوہ اب بھی چپ کرو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں بیٹا! تمہارے بابا کے آنے کا بھی ٹائم ہے۔ کسی نے سن لیا تو مصیبت آجائے گی۔“

اس کی ممانے اسے پھر ٹوکا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ سن تو لیا گیا تھا۔ مصیبت بھی آگئی تھی مگر ان پر نہیں بس مجھ پر۔ مجھے لگا تھا جیسے کسی نے میرے دل پر، میرے دماغ پر وزنی پتھر رکھ دیا ہو۔ میں اتنا ڈسٹرب ہوا تھا کہ

برینہ سے ملے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ اگلے دن وہ خوش ہو کر آگئی تھی اور مجھ سے خفا بھی تھی کہ میں اسے لینے کیوں نہیں آیا۔ مگر میں اتنا ڈسٹرب تھا کہ اس کی کسی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ شادی کے بعد اس کی بہت سی باتوں سے مجھے بے زاری اور جڑ محسوس ہوتی تھی مگر یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی اس اصلیت کے کھل جانے میں نے اس سے نفرت محسوس کی۔ اس کے نزدیک ”میں“ کیا تھا۔ ترپ کا ایک پتا جسے اس نے اپنی کامیابی اور نیت کے لیے استعمال کیا۔ اس نے صرف ابو داؤد کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی میرے ساتھ بھی دھوکہ کیا تھا۔



میرے ہمسفر
میرے بے خبر
تیرے نام پر
وہ جو پھول کھلتے تھے ہونٹ پر
وہ نہیں رہے
وہ نہیں رہے کہ جو ربط تھا درمیان
وہ بکھر گیا

میرے ہمسفر ہے وہی سفر
مگر ایک موڑ کے فرق سے
تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ کا
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے اسے کاٹتے
میرا سارا وقت نکل گیا۔

اس کے بعد ایک خلش، ایک کسک تھی جس نے میرا گھبراؤ کر لیا تھا۔ میں نے کہا تھا نا میں فطرتاً نرم ل اور حساس تھا۔ میری جو بیس سالہ زندگی کا ریکارڈ تھا کہ میں نے دانستہ کبھی کسی کو رکھ نہیں پہنچایا تھا اس کی ایک واضح مثال برینہ تھی۔ اس کی بات مجھ پر کھل گئی تھی اس کے باوجود میں نے اسے جتلیا نہ باز پرس کی۔ کہیں اندر مجھے یقین کامل تھا کہ وہ مکر جائے گی۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ میں اس کی فطرت جان گیا تھا۔ مگر ہمارے تعلق میں جو سچائی اور خلوص تھا اس میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ چند ماہ مزید گزرے میں نے اپنے کسی رویے سے برینہ کو نکالتے کاموقع نہیں دیا۔ جو ہو چکا تھا اس کا ازالہ شاید ممکن نہیں تھا کہ ابو داؤد اس کے بعد کبھی مجھے نظر نہیں آسکا تھا۔ پھر اس معاملے کو لے کر مزید بگاڑ پیدا کرنا لا حاصل تھی۔ ہماری شادی کو سال ہونے جا رہا تھا جب ممانے مجھے ایک دن اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ اس روز برینہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی اور رات وہیں گزارنے کا ارادہ

تھا۔ یہ بیٹے میں اس کا پانچواں چکر تھا۔ مگر میں نے کبھی خواہ مخواہ پابندی لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔
 ”خیریت ماما! آپ مجھے پریشان لگ رہی ہیں۔“

میں نے ماما کے چہرے کو بغور دیکھا جہاں سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔

”بیٹے آپ کو نہیں لگتا ہماری زندگی میں کوئی کمی ہے؟“

ان کے سوال نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

”میں سمجھا نہیں ماما!“ میں نے الجھ کر ان کو دیکھا تھا جواب میں انہوں نے گہرا سانس بھرا تھا۔

”بیٹے سبرینہ سے باقی جو مجھے شکایتیں تھیں ان کا میں نے کبھی تذکرہ آپ سے کرنا مناسب نہیں

سمجھا مگر یہ بات ہی ایسی تھی کہ میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ مجھے نہیں پتا وہ یہ سب تمہاری ایما پر کر رہی ہے مگر

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس حرکت پر بے حد صدمہ ہوا ہے۔“ بولتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی تو میرے دل کو دھکا

لگا تھا۔ میں نے اٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر چوم لیے ”پلیز ماما کھل کر بات کریں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ بخدا

آپ کو دکھ دینے کا تو میں تصور بھی گناہ سمجھتا ہوں۔“

میری بات کے جواب میں وہ کچھ دیر آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں سمیت مجھے دیکھتی رہیں تھیں پھر

کچھ کہے بغیر انہوں نے بیڈ کی سائیڈ دراز کھول کر کچھ نکالا اور میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”یہ مجھے تمہارے روم کی صفائی کرتے ہوئے ملی ہے۔ ظاہر ہے سبرینہ کے علاوہ کون استعمال کر سکتا

ہے۔ وہ شاید کچھ جلدی میں گھر سے نکلی تھی اپنا پرسل دراز جس میں جیولری وغیرہ رکھتی ہے لاک کرنا بھول گئی۔

میری نظر پڑی تو جیولری سمیٹ کر رکھتے نگاہ اس پر پڑ گئی۔ بیٹے آپ کو کیا اسے ہو سکتا ہے ابھی بچوں کی ضرورت

نہ ہو مگر ہمیں تو بہت ارمان ہے ہم اس گھر میں تمہارے بچوں کی چہکاریں سننا چاہتے ہیں۔“

وہ آنسو پونچھ کر کہہ رہی تھیں جبکہ میں شرمندگی، سبکی اور خفت سے جیسے زمین میں گڑھ گیا تھا۔ ماما نے

جو چیز میرے ہاتھ پر رکھی تھی وہ ترک حمل کی گولیوں کی شیشی تھی جس کی سیل ٹوٹی ہوئی تھی اور کچھ گولیاں استعمال

بھی ہوئی تھیں۔ سبرینہ یہ استعمال کرتی تھی اور مجھے خبر تک نہیں تھی۔ بچوں کی خواہش صرف ماما کی نہیں تھی خود

میری بھی تھی اور میں اس موضوع پر سبرینہ سے بہت بار بات بھی کر چکا تھا۔ مگر اس نے ہر بار مجھے مالا تھا اور کہا

تھا وہ ابھی اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ مگر مجھے گمان تک نہیں تھا وہ یہ گھناؤنا کام بھی کرتی ہوگی۔ یہ دوسرا

موقع تھا جب سبرینہ کی وجہ سے میں شرمندگی اور صدمے کا شکار ہوا تھا۔ ماما سے کچھ بھی کہے بغیر میں وہاں سے

اٹھ کر آ گیا تھا۔ میری خاموشی کو انہوں نے اللہ جانے کیا مفہوم پہنایا تھا مگر میری شرمندگی مجھے ایک لفظ کہنے کی

اجازت نہیں دیتی تھی۔ میرے اندر کوئی آگ بھڑک رہی تھی جو یونہی بجھنے والی نہیں تھی۔ میں نے سبرینہ سے

بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا جہی میں نے اس وقت اس کے گھر پر رابطہ کیا تھا۔ خون اس کی مدر نے اٹھایا تھا۔

”آنٹی سبرینہ سے میری بات کرادیں۔“

رہی علیک سلیک کے بعد میں نے مقصد کی بات کی تھی۔ جواب میں انہوں مجھے بتایا سبرینہ گھر پر

نہیں ہے اپنی کسی دوست کی طرف گئی ہوئی ہے۔ مجھے شدید کوفت نے آن لیا۔

”او کے! جب وہ آئے تو اسے میرا سچ دے دیجیے گا۔ اسے کہیے مجھے فون کرے۔“

اس کی مدر نے اثبات میں جواب دے کر فون بند کر دیا۔ ایک گھنٹہ دو گھنٹے گزر گئے۔ میں جو اس کی کال کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ مضطرب ہو کر پھر خود ہی رابطہ کیا تھا۔

”آئی آپ نے سبرینہ کو میرا سچ نہیں دیا؟“

ضبط کے باوجود میرے لہجے سے خفگی اور پیش چھلک گئی تھی۔

”وہ ابھی لوٹی ہی نہیں ہے تو مسیح کیسے دے سکتی تھی۔“

اس کی ماما کے جواب نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ میری بے ساختہ نظریں وال کلاک کی سمت اٹھ گئی تھیں۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔

”ابھی تک نہیں لوٹی؟ ٹائم کا پتا ہے اسے؟“

میں کسی قدر روڈ ہونے لگا۔ آدمی رات کے وقت بھی وہ گھر سے باہر تھی۔ یہ بات مجھے غصہ دلا گئی تھی۔
”بارہ بجے ہیں۔ تین تو نہیں بج گئے۔ پارٹیز میں اس طرح دیر تو ہو جاتی ہے۔ یہ کراچی ہے کوئی پسماندہ گاؤں نہیں جہاں عشا کی اذان سے پہلے لوگ سو جاتے ہیں۔ اور وہ ایک لبرل فیملی سے تعلق رکھتی ہے واضح رہے۔“

اس کی ماما کو پتا نہیں کیوں تپ چڑھ گئی تھی۔ مجھے کھری کھری سنا کر انہوں نے فون پٹخ دیا۔ میں کھول کر رہ گیا تھا۔ وہ رات جیسے تیسے میں نے بسر کی تھی اگلے دن صبح آفس جانے سے قبل میں اس کی طرف پہنچ گیا تھا۔
”تم؟ اتنی صبح کیوں آ گئے ہو؟ ابھی تو وہ سو رہی ہے۔“

سبرینہ کی مدر نے مجھے سبرینہ کے روم کے باہر ہی گھیر لیا۔ وہ شاید جاکنگ کر کے لوٹی تھیں۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس بے ترتیب سانس بکھرے بالوں سمیت وہ بے حد عجیب نقشہ پیش کر رہی تھیں۔
”سو رہی ہے تو جگایا بھی جاسکتا ہے۔ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

ان کا لہجہ جتنا خراب تھا۔ رات جس طرح انہوں نے میرے ساتھ مس بی ہو کیا تھا۔ اب میں بھی ان کا لحاظ کرنے والا نہیں تھا۔

”تم شوہر ہو اس کے شوہر ہی رہو سمجھے! مالک یا بادشاہ بننے کی کوشش مت کرو۔ بہر حال وہ تمہاری زر خرید نہیں ہے“ وہ پھٹ پڑی تھیں۔ میں حیران رہ گیا اللہ جانے وہ بات کو جھگڑے کا روپ کیوں دے رہی تھیں۔
”دیکھیے آئی! میری بات کا یہ مطلب کہیں سے بھی نہیں نکلتا۔ آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہی ہیں۔“ میں نے خود کو کمپوز کر کے کسی قدر تحمل سے جواب دیا مگر وہ کچھ اور بھی بلند آواز سے چیخنے لگی تھیں۔

”شٹ آپ! میں بات بڑھاری ہوں؟ تم جو بدتمیزی کر رہے ہو اس کا پتا ہے۔ میں کہہ رہی ہوں نا اس وقت تم جاؤ تم اس سے ابھی نہیں مل سکتے ہو۔“

آئی کی چیخ و پکار پر میں تو خائف ہوا ہی تھا جہاں ہم کھڑے تھے وہاں برینہ کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور سپلینگ گاؤن کی کھلی ڈوریوں اور بکھرے بالوں خمار آلود آنکھوں والا ایک لمبا ترنگا شخص نکل کر خفا خفا سا ہمارے سامنے آن رکا۔

”واٹ ہینڈ؟ یہ صبح صبح کیسا شور مچا دیا گیا ہے۔“

”اسد بیٹے! آپ اندر جاؤ اس سے تو میں خود نپٹ لوں گی۔“

آئی نے اسے جتنی نرمی سے مخاطب کیا تھا میری طرف دیکھ کر اس قدر دانت کچکچا کے بولی تھیں۔

”مگر یہ ہے کون؟“

اس نے اپنی بہکی بہکی سرخ آنکھیں مجھ پر ٹکائی تھیں۔ ہر بار بولنے کو منہ کھولنے پر اس کے ہونٹوں سے ناگوار بو کا ایک بھہک اڑتا تھا، جو میری طبیعت مکر کر چکا تھا۔

”عون ہے برینہ کا ہر ہینڈ۔“ آئی نے ایک بار پھر دانت کچکچا کر کہا تو اس نے چونک کر مجھے بغور دیکھا تھا۔ پھر ششدر سا بولا۔

”عون؟ مگر یہ تو کہیں سے بھی بد شکل اور کنگا نہیں لگتا یا دیا جیسا آپ نے کہا تھا۔“

اس کے الفاظ نے مجھے دھچکا پہنچایا تھا۔ میں نے ٹھٹھک کر باری باری دونوں کی شکل دیکھی اور ناگواری سے گویا ہوا تھا۔

”کیا کہا گیا ہے میرے بارے میں آپ سے؟“

میں محسوس کر چکا تھا۔ آئی خائف ہو رہی ہیں۔ اور جلد از جلد مجھے وہاں سے رخصت کر دینا چاہتی ہیں۔ چاہے دھکے مار کر ہی سہی۔ ان کے تنے ہوئے نقوش اور زہر خندناثرات یہی واضح کر رہے تھے۔

”اسد میں نے کہا نا بیٹے آپ اپنے کمرے میں جاؤ۔ اس سے میں خود نپٹ لوں گی۔“

”اوئے نکلو تم یہاں سے۔ برینہ تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی اب تم دفع ہو جاؤ۔“

انہوں نے پہلے اس اسد نامی آدمی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا مگر لہجوں میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ میں اس درجہ تو ہین برداشت نہیں کر سکتا تھا نہ ان کے منہ مزید لگنا چاہتا تھا۔ جیسی ایک جھٹکے سے پلٹ کر وہاں سے چلا آیا۔ وہ دن میرے لیے بہت اذیت انگیز تھا۔ مجھے کسی پل قرار نہیں تھا۔ برینہ میرا غلط انتخاب تھی میں جان چکا تھا۔ وہ موقع پرست تھی مجھے علم ہو گیا تھا۔ مگر وہ لالچی یا بد کردار بھی ہوگی اس کا مجھے قطعی یقین نہیں آتا تھا۔ اس نے ابو داؤد جیسے بے حد مالدار جاگیردار لڑکے کو بڑی طرح ٹھکرا کر مجھ سے شادی کر تھی۔ اگر دولت اس کی ترجیح ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتی۔ وہ لوز کر یکٹر ہوگی یہ میرے دل کو لگتی نہیں تھی بات۔ مگر مجھے یقین کرنا پڑا تھا جب میں نے اسے متعدد بار اسی اسد نامی شخص کے ساتھ مختلف ریستورنٹس اور شاپنگ آرکیڈ میں تکلف کی ہر دیوار گرائے بانہوں میں بانہیں ڈالے گھومتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا وہ واپس آ جائے گی۔ یا کم از کم مجھ سے کانٹیکٹ کرے گی۔ اس نے مجھ سے کانٹیکٹ تو کیا تھا مگر خلع کے مطالبے کے واسطے۔ مجھے اس کی بات

مان لینی تھی مگر اس سے قبل میں اپنے ذہن کی ساری گرہیں کھول لینا چاہتا تھا۔ میں نے طلاق کی ایک شرط رکھی تھی۔ آخری بار اس سے ملنے کی شرط۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اگلے دن ہی مجھ سے مقرر کی گئی جگہ پر ملنے چلی آئی تھی۔ میں نے اس روز شاید آخری مرتبہ بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر تر و تازہ فیشن ایبل اور بے باک نظر آ رہی تھی۔

”اگر تمہیں یہ سب ہی کرنا تھا تو تم نے میرے ساتھ شادی کیوں کی؟“

جانے کیسے میری زبان سے شکوہ پھیل گیا تھا۔ جواباً وہ کھنک دار ہنسی ہنس دی۔ ایسی ہنسی جس میں طنز کی آمیزش تھی۔

”تم نے اسد شیرازی کو غور سے دیکھا ہے عون؟“

اس کے اس بے تکے سوال نے میری پیشانی پر ناگواری کا تاثر ابھار دیا تھا۔ جسے نظر انداز کیے اس نے مزید گوہر افشانی جاری رکھی تھی۔

”وہ تم سے زیادہ ہنڈ سم ہے۔ تم سے کہیں زیادہ دولت مند ہے۔ وہ سب کچھ جو تم اگلے کئی سالوں میں بھی مجھے نہیں دے سکتے اس نے ابھی مجھے دے دیا ہے۔ یہ دیکھو۔“

اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پلاٹینم کی رنگ تھی جس میں ڈائمنڈ جڑا ہوا تھا۔

ابھی یہ شروعات ہے صرف دوستی کا ایک نذرانہ۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہاں ہے۔ ایسی انگلیاں تو کیا مجھ پر جیولری کے سیٹ دار کر صدقہ کر سکتا ہے۔ اور ایک تم ہو، ایک معمولی سا بزنس ہے تمہارا۔ جس میں چار چار بھائی شراکت دار ہو۔ پھر بہن کا حصہ بھی برابر کا۔ صرف ایک گھر ہے ایک گاڑی۔ سوری عون مرتضیٰ! مجھے اپنے خوابوں کی فوری تعبیر چاہیے تھی۔“

اس کا انداز کتنا سرسری تھا۔ اس کا لہجہ کتنا بے نیاز تھا۔ اس نے مجھے کند چھری سے ذبح کر دیا تھا اور اسے میری تکلیف اور اذیت کا اندازہ تک نہیں تھا۔ وفا، ایثار، محبت کی وہ ساری داستانیں جو وہ مجھے سنایا کرتی تھی خود بھول بیٹھی تھی۔ اب اسے کچھ یاد کرانے شکوہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مگر میں بے وقوف تھا اسے یہ سب یاد کرانے لگا۔ میں نے اس سے شکوہ کیا وہ ترک حمل کی دوا کیوں استعمال کرتی تھی۔ وہ میری مجرم تھی بہت ساری باتوں میں۔

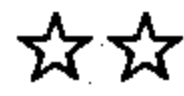
جواباً وہ ہنس پڑی تھی۔ وہی جلا کر خاک کر دینے والی، توڑ کر بکھیر دینے والی، بے حس ہنسی۔ میں بہت شروع میں جان گئی تھی عون کہ تم میرا غلط انتخاب ہو۔ تمہارے خوب رو چہرے کو میں کب تک دیکھ کر اپنا دل بہلا سکتی تھی۔ زندگی صرف محبت اور حسن سے تو دل بہلا کر نہیں گزاری جاتی نا۔ جیہی میں نے یہ احتیاط برتی تھی۔ دیکھو آج کام آگئی نا ورنہ اگر ہمارا کوئی بچہ ہوتا تو تم مجھے اس کی وجہ سے زبردستی زنجیر پا کرنے کی کوشش کرتے میں بھی شاید بچے کی وجہ سے مجبور ہو جاتی۔

اس کے لہجہ و انداز میں کسی قسم کی شرمندگی یا ندامت کا مشائبہ تک نہ تھا۔ میں لٹے پٹے سے انداز

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس روز میں کتنا بے بس تھا، کتنا دکھی تھا۔ وہ کبھی نہیں جان سکتی تھی۔ اور جب وہ اٹھ کر جا رہی تھی تو اس نے اچانک رک کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک اور بات کہی تھی۔ جس نے میرے پارہ پارہ دل کو عورت ذات سے ہمیشہ ہمیشہ کے محتاط کرنے کے ساتھ نفرت سے بھی بھر دیا۔

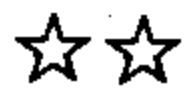
”مجھ پر الزام عائد کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا عون مرتضیٰ کہ بے وفائی کرنے والی میں پہلی یا آخری عورت نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی عورتیں یہ کام کر چکی ہیں بعد میں بھی کرتی رہیں گئی۔“

پھر وہ چلی گئی تھی۔ پھر میں نے اسے چھوڑ بھی دیا تھا مگر اس کی یادیں اس کی باتیں مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جاسکیں تو وجہ یہی تھی میں اسے بھلا نہیں سکا تھا۔ بھلانا چاہتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں ایسا دھوکہ پھر کھانے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں یہ سب یاد رکھوں۔ جہی میں نے ان سب کو تمام تر تلخی کے باوجود کبھی فراموش نہیں کیا۔



اس کے بعد بہت سا راقوت خاموشی سے بیت گیا۔ ماما پاپا سے ظاہر ہے یہ بات اور اس کی وجہ چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ پاپا نے میرے فیصلے کو جلد بازی قرار دیا جبکہ ماما مطمئن تھیں۔

وہ گھر بسانے والی عورت ہی نہیں تھی بیٹے! اچھا ہوا آپ نے اس سے نجات حاصل کر لی۔ مگر ماما کا یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا جب ان کی خواہش پر میں نے دوسری شادی سے انکار کر دیا۔ شروع شروع میں انہیں میرے ارادے کی پختگی اور عزائم کا پتا نہیں چلا جبھی سال چھٹے ماہ کے وقفے سے کسی لڑکی کو پسند کر کے بیٹھ جاتیں۔ کبھی پاپا کے ذریعے فورس کرنے کی کوشش کرتیں مگر میں اپنی بات سے جب ایک انچ بھی نہ سرکا اور گزرتے وقت کے ساتھ یہ میرا ارادہ ویسا ہی مضبوط رہا تو ان کی تشویش اور پریشانی بڑھنے لگی۔ یہ واحد معاملہ تھا جہاں میں نے ان کی پریشانی کی پرواہ کی تھی نہ تشویش کی۔ میرا سارا دھیان اور توجہ بزنس اور چھوٹے بھائی بہن پر مرکوز ہو گئی تھی اپنے بارے میں سوچنا اور کڑھنا میں چھوڑ چکا تھا۔ میرا مزاج یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ بہت شوخ و شریر تو میں پہلے بھی نہیں تھا۔ مگر ایسا تدبر اور سنجیدگی بھی میری طبیعت میں نہیں تھی جو سبرینہ والے واقعہ کے بعد میرے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ میں جانتا تھا ماما میری وجہ سے خاصی پریشان ہیں مگر میرے پاس ان کی پریشانی کا کوئی حل نہیں تھا۔ بس سبرینہ والے واقعہ کے بعد شعوری یا لاشعوری طور پر میں خائف ہو گیا تھا۔ دوسری شادی کا مطلب تھا ایک اور تجربہ اور میں خود کو تجربوں کی نذر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ضروری تو نہیں تھا میری زندگی میں آنے والی دوسری عورت سبرینہ جیسی نہ ہوتی۔ بس یہی خوف تھا جس نے آئندہ زندگی مجھے تنہا گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔



وقت کچھ اور آگے سرک گیا۔ بظاہر زخم مندمل ہو گئے تھے۔ ان دنوں میں آفیشل ٹور پر سری لنکا میں تھا جب ابو داؤد سے میری غیر متوقع دوسری اور بے حد اہم ملاقات ہوئی تھی۔ سچی بات ہے میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ وجہ میری یادداشت کا کمزور ہونا نہیں اس کی شخصیت کا زبردست تغیر تھا۔ پہلی ملاقات بغیر تعارف کے

رہی۔ میری طرح وہ مجھے پہچاننے سے قاصر نہیں رہا تھا۔ اور یقیناً مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ کچھ دیر مجھے گھورتے رہنے کے بعد میری بات کا جواب دیئے بنا ایک جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا تھا۔ گو کہ میں اسے پہچان نہیں سکا تھا مگر یہ تو جان گیا تھا کہ وہ پاکستانی ہے دیارِ غیر میں اپنے کسی ہم وطن کا مل جانا بھی انوکھی خوشی سے ہمکنار کرتا ہے۔ مگر اس کے رویے نے مجھے الجھا دیا تھا۔ جیسی میں نے بیچ میں گزر جانے والے دو تین دنوں کے باوجود اس واقعہ کو بھلانے سے قاصر رہا تھا پھر جانے کیوں مجھے لگا تھا جیسے میں اسے جانتا ہوں۔ اس کے چہرے پر اس کی آنکھیں تھیں جو وہی تھیں اس کی آنکھیں مجھے دیکھی بھالی لگتی رہی تھیں۔ دوبارہ میرا اس سے ٹکراؤ ایک ریسٹورنٹ میں ہوا تھا۔ میں وہاں لنچ کرنے گیا تھا کہ میری نگاہ کو نے کی اس ٹیبل پر جا پڑی جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا اور کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ جو اس کا رویہ تھا اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اسی سے گریز کرتا مگر میں اسی رویے کی وجہ سے الجھا ہوا تھا اور اس الجھن کو سلجھانا چاہتا تھا جیسی میرے قدم بے اختیار اس کی جانب بڑھ گئے تھے۔ جب میں نے اسے مخاطب کیا تھا تو متوجہ ہونے کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر وہی ناپسندیدہ تاثرات ابھر آئے۔ میں نے اس کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت مانگی تھی جو اس نے نہیں دی۔ یہ بداخلاقی کا بہت بڑا مظاہرہ تھا مگر میں بھی جیسے ڈھیٹ بن گیا۔ میں نے اس سے شاپنگ آرکیڈ میں ہونے والے تصادم پر معذرت کی تھی۔ مجھے کسی دانشور کی بات از بر تھی کہ ہر برائی کا توڑ اچھائی میں پوشیدہ ہے۔ اس کی بد مزاجی اور بداخلاقی کو میں اپنے مہذبانہ انداز اور شائستگی سے دور کرنے پر تل گیا تھا۔ یہاں دیارِ غیر میں ہم سب اپنے ملک کی پہچان اور شناخت لے کر آتے ہیں۔ ہمارے رویے ہمارے عمل ہی ہماری خوبی اور خاوی کے مظہر ہوتے ہیں۔ مجھے ابوداؤد کا غیر شائستہ رویہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ اور اپنے طور پر میں نے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھالیا تھا۔ بس اس وقت تک میری محض اتنی ہی سوچ تھی مگر اس نے میری اس کوشش کو نا کامی کی ایک زوردار ٹھوک ماری تھی اور وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ انداز میں ناگواری اور خفگی تھی۔ میں کبھی ایسا مستقل مزاج نہیں رہا تھا نہ میری اتنی ایسی تھی کہ اتنی عزت افزائی کے بعد میں پھر اٹھ کر اس کے پیچھے جاتا مگر اس وقت میرا یہ عمل خود میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے یا شاید قسمت میں اس کے ہاتھوں جو شکست اور کرب میرا نصیب بنا تھا اس کی شروعات ہو چکی تھی۔ میں اس کے پیچھے آیا تھا اور اس رویے کی وضاحت پوچھی تھی۔ اس نے اسے میری غلط فہمی قرار دیا اور مجھ سے جان چھڑانا چاہی۔ میں اس طرف سے مطمئن ہوا تو اگلی الجھن اس کے سامنے رکھ دی۔ مجھے واقعی اس کا چہرہ خاص طور پر آنکھیں کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ میں نے اس کا نام پوچھا تھا۔ اور جب اس نے اپنا نام بتایا تو میرے ذہن میں جیسے کاٹنا چبھا تھا۔ یہ وہ نام تھا جسے میں کبھی شعوری طور پر بھی فراموش نہیں کر سکا تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر بدل چکا تھا۔ بے حد وجہ اور خوبرو اس کی پرسنالٹی بے حد گروڈ اور شائمنگ تھی۔ ایک نظر دیکھنے میں ہی وہ امیر کبیر بزنس مین نظر آتا تھا ایسے ہی انداز و اطوار تھے۔ اس کا بہترین لباس بلکہ ہر انداز سے امارت چھلکتی تھی۔ امیر تو خیر وہ پہلے بھی تھا مگر شخصیت کا یہ نکھار اور دلکشی حیران کن تھی۔ میں صحیح معنوں میں ششدر رہ گیا۔

میرے اندرونی جذبات جو بھی تھے میں نے بظاہر اس سے ملنے پر خوشی کا اظہار کیا اور اس میں کوئی

شک بھی نہیں تھی کہ میں اسے اپنے روبرو پا کے خوش ہوا تھا۔ دُعا میں اکثر میں اسے ملنے اور اس کے ساتھ نادانستگی میں کی گئی زیادتی پر خدا سے معافی مانگنے کے ساتھ ازالے کا ایک موقع بھی مانگا کرتا تھا۔ مجھے لگا تھا مجھے وہ موقع فراہم کر دیا گیا تھا۔ میں اس موقع کو گنونا نہیں چاہتا تھا جیسی میں نے دانستہ اس ملاقات کو طول دیا تھا۔ میں زبردستی اسے اپنے اپارٹمنٹ لے آیا۔ مقصد اس سے کچھ بات کرنا کچھ اس کے متعلق جاننا تھا۔ میں اس سے دوبارہ ملنے کا خواہاں تھا۔ وہ مجھ سے کترار ہا تھا مگر میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس کے بعد شاید وہ سری لنکا سے واپس چلا گیا کہ پھر میری تلاش کے باوجود وہ مجھے وہاں نظر نہیں آیا تھا۔ پاکستان آ جانے کے بعد بھی میں لاشعوری طور پر اسے ہر جگہ کھوجا کرتا۔ مگر وہ تو جیسے دنیا کی بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔ ہمارے دودھیال میں شادی کی تقریب تھی خاصی دور کے رشتہ دار تھے۔ ماما کی ان دنوں طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جی انہوں نے مجھے اس شادی میں شریک ہونے کا کہہ دیا۔ میں چونکہ اس قسم کی تقریبات میں خود کو مس فٹ محسوس کیا کرتا تھا جیسی جان چھڑانے کی کوشش کی مگر ممانے بھیج کر دم لیا۔ عین وقت پر حجاب بھی میرے ساتھ جانے کو چل گئی تھی۔ دودن کی شادی سے فراغت کے بعد ہم واپس آنے کی تیاری میں مصروف تھے کہ موسم زبردست تغیر کے بعد کچھ کا کچھ ہو گیا اور ہم جو فلائیٹ کے لیے ایئر پورٹ روانہ ہو چکے تھے کچھ متفکر ہو گئے۔ ایسے موسم میں پلین کنسل ہو جانا تھا۔ میں کچھ متفکر ہو گیا تھا واپس میں جانا نہیں چاہتا تھا کہ حجاب کے ایگزیم شروع ہونے والے تھے۔ اس کی پڑھائی کا حرج ہوتا تھا۔ جیسی میں نے بائی ایئر کی بجائے ٹرین سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا اور ایئر پورٹ کی بجائے ہم لوگ اسٹیشن آ گئے۔ بھاگ دوڑ کر کے ارجنٹ ٹکٹس لینے کے بعد ہم ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ بارش طوفانی تھی اور ٹرین حسب معمول لیٹ۔ میرے برعکس حجاب اس موسم اور اس سفر کو انجوائے کرنے کے موڈ میں تھی۔ اس کا موڈ خوشگوار تھا اس نے ٹی پاٹ سے چائے نکال کر خود بھی پی تھی اور مجھے دیتے ہوئے بولی تھی۔

”بھیا میرے کو کینر ختم ہو گئے ہیں پلیز ذرا جا کے لے آئیں۔“

کو کینر کے بارے میں میں اس کی پسندیدگی سے آگاہ تھا جیسی اسے اپنا خیال رکھنے کا اشارہ کرتا اسٹیشن کی ٹک شاپ کی جانب آ گیا۔ کو کینر کے ساتھ جوس کے کچھ پیکٹ خرید کر میں واپس پلٹ رہا تھا جب ایک مرتبہ پھر ابو داؤد سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ اس نے شاید مجھے نہیں دیکھا تھا۔ برستی بارش کی شدید بو چھاڑتے بے خبر وہ نہلتے ہوئے سگریٹ کے کش لیتا جانے کس گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب میں نے جا کر اسے چوکا دیا۔ اس کے دوبارہ مل جانے کا احساس میرے لیے بے حد خوشگوار تھا جیسی جب میں نے اس سے بات کی تو یہ خوشگواہی میرے ہر انداز سے چھلک پڑی تھی۔ مگر مجھے لگا اسے مجھے دیکھ کر ہرگز کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا تھا اس کا مزاج یہی ہو میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی تھی۔ میرے پیش نظر میرا اور مقصد تھا یعنی میں اس کے ساتھ انجانے میں غلط فہمی کی بنا پر جو زیادتی کر چکا تھا میں اپنے رویے سے اس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ میں اسے زبردستی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اور چائے پیش کی تھی۔ میری اس دوستانہ روش کے باوجود بھی اس کا رویہ لیاد یا سا ہی رہا تھا۔ تب مجھے ایک دم سے لگا تھا وہ اس تلخ یاد کو ذہن سے محو نہیں کر پایا۔ میں نے مناسب سمجھا اس سے براہ

راست اس موضوع پر بات کر کے معذرت کر لوں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر میری بات کے آغاز میں ہی وہ منکر ہو گیا تھا۔ میں نے پھر بھی اس سے باقاعدہ ایک سکیوز کیا تھا۔ میں اس احساس جرم کے ساتھ مزید نہیں جی سکتا تھا۔ اس نے میری بات جیسے غائب دماغی سے سنی تھی اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ تب میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھ لی۔ میں کبھی کسی بات کے پیچھے نہیں پڑا تھا مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ میں پیچھے ہٹنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے بہت اچھا لگا تھا جب اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں غلط سوچ رہا ہوں۔ وہ اس بات کو فراموش کر چکا ہے۔ کاش میں نے تب اس کی بات کا یقین نہ کیا ہوتا تو بعد کے مسائل اور رسوائی و اذیت کا شکار ہونے سے بچ جاتا مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ جو کچھ تقدیر نے ہمارے مقدر میں لکھ دیا ہے اسے ہم کیسے ٹال سکتے ہیں۔ میں تو تب یہ بھی نہ جان سکا تھا کہ تب حجاب پر اس نے کیسی گندی نظر ڈالی ہے۔ اس نے میری بجائے حجاب کو انتقام کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کر کے میری ہستی کی دنیا تہہ و بالا کر دی تھی۔

☆☆

آنے والے کڑے وقت سے بے نیاز میں ابو داؤد سے اتنا عرصہ ملاقات نہ ہونے پر پریشان ہوتا رہتا تھا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب ایک روز اچانک ولید خالہ بی کے ساتھ ہمارے گھر چلا آیا۔ اس کی آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ اکثر ہمیں ملنے کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ مگر جو آمد کا مقصد اس نے بیان کیا اسے جاننے کے بعد میرا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ حجاب کے لیے اپنا پروپوزل لایا تھا۔ اس کا اور حجاب کا ہرگز بھی کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا اور حجاب مجھ سے پورے بارہ سال چھوٹی تھی۔ بات اگر صرف ایج ڈیفرنس کی ہوتی تو بھی قابل برداشت تھی۔ ولید نکما اور فضول شوق پالنے والا نکھو آدمی تھا۔ کوئی کام تک کر کبھی نہیں کیا تھا۔ حجاب کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ ابھی بچی تھی وہ ابھی تو میں ویسے ہی اس کی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ ولید جیسے انسان کو تو میں ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔ غصہ مجھے اس بات کا آیا تھا کہ وہ یہ فضول آس لے کر ہمارے گھر آتا رہا تھا۔ میں نے اس روز ولید کی اچھی خاصی انسٹ کی تھی اور آئندہ کے لیے اسے اپنے گھر آنے سے صاف منع کر دیا۔ گو کہ بعد میں ہمارے بڑوں نے سچ میں پڑ کر اس تلخی کو کم کر دیا تھا۔ ولید کا آنا جانا کسی خاص موقع تک محدود ہو کر رہ گیا۔ وہ بھی اب ہماری کوشش ہوتی حجاب سے اس کا سامنا نہ ہو۔ وقت مزید کچھ آگے سرک گیا۔ اس دوران ابو داؤد سے میری متعدد بار ملاقات ہوئی اور وہ انہی ملاقاتوں کی بدولت میرے بے حد نزدیک آ گیا تھا۔ یہ قربت اس وقت کچھ اور بڑھ گئی تھی جب اس کی خرابی طبیعت اور بہتر دیکھ بھال نہ ہونے کی بنا پر میں اسے اپنے ہاں لے آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں اس کے ساتھ بھلائی کر کے اپنی اس زیادتی کا ازالہ کرنے کا خواہاں تھا۔ اور میرا یہ عمل مجھے پوری طرح تو نہیں مگر کسی حد تک ازالہ محسوس ہوا تھا۔ مگر یہ سچ ہے۔ بچھو اپنی فطرت سے ہٹ نہیں سکتا۔ اس کا کام ڈسنا ہے تو چاہے اسے ڈبونے سے بچانے والا ہاتھ ہی کیوں نہ ہو وہ اس تفریق میں پڑے بغیر بس اپنی فطرت سے مجبور ہوگا۔ ابو داؤد نے اپنے عمل سے یہی ثابت کیا تھا میری ہر نیکی کے جواب میں اس نے مجھے معاف کیے بنا اپنا بدلہ چکایا تھا۔

☆☆

اس کے بعد اس کا داخلہ آزادانہ میرے گھر میں ہونے لگا۔ وہ اکثر مجھ سے ملنے کے بہانے میرے گھر آدھمکتا اور میں اس کے مذموم ارادوں سے بے خبر ہر بار خوشدلی اور محبت سے اسے خوش آمدید کہتا رہا۔ دل و جان اس پر لٹاتا رہا۔ اس بات سے انجان رہ کر اسے اپنے گھر میں نقب لگانے کا موقع تو میں خود فراہم کر رہا ہوں۔ حجاب کے ساتھ جو کچھ ہوا اپنی ذلت و رسوائی سے ماورا ہو کر میں جب سوچتا مجھے اپنا وجود برزخ میں جلتا اور تڑختا ہوا محسوس ہوتا۔

اس روز مجھے اس سے کچھ اہم کام تھا۔ میں اس سے ملنے اس کے آفس آیا تو اس کی بجائے اس کی سیٹ پر ولید کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔

”تم؟؟“ میں کسی طرح بھی اپنی حیرت پر قابو نہیں رکھ سکا تھا جو اب وہ طنزیہ مسکرایا تھا۔ ”آپ تو مجھے بالکل نا اہل اور بے کار سمجھتے تھے ماعون بھائی! مگر ایسا نہیں ہوتا۔ میری بھی ایک حیثیت ہے میں ابوداؤد کا بزنس پارٹنر ہوں۔“

اس نے جیسے اہم اطلاع بہت فخر سے مجھے دی تھی۔ میں مسکرا دیا تھا اور اسے اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ابوداؤد کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔ جواب میں اس نے ابوداؤد کی بیماری کا بتایا تھا۔ میں کچھ متفکر سا ہوتا اس سے ملنے اس کے گھر چلا آیا۔ واج مین مجھے جانتا تھا۔ گاڑی پورٹیکو میں روک کر میں اس کے بیڈروم میں ہی آ گیا اس سے پہلے بھی جتنی بار میں اس کے ہاں آیا تھا اس نے کبھی مہمانوں کی طرح مجھے ڈرائینگ روم تک محدود نہیں رکھا تھا۔ دروازہ ناک کرنے کے بعد میں اندر داخل ہوا تو ابوداؤد مجھے کمرے میں نظر نہیں آیا تھا۔ واش روم کے بند دروازے کے پیچھے سے پانی گرنے کی آواز اس کی وہاں موجودگی کی گواہ تھی۔ میں اس کے انتظار میں بیٹھتے ہوئے قدرے چونک گیا۔ اس کے بستر کے تکیے پر ایک ادھ کھلی ڈائری سے ایک تصویر کا کونہ جھانک رہا تھا۔ یونہی بے خیالی میں میں نے ڈائری بند کر کے رکھنا چاہی تو چکنے صنفی کے درمیان سے تصویر پھیل کر نیچے جا گری۔ میں جو نارمل سے انداز میں تصویر اٹھانے کو جھکا تھا جیسے اسی زاویے پر سکتے میں آ گیا۔ سفید لباس میں کھلے بالوں کے ساتھ بے تحاشا ہنستے ہوئے وہ کسی اور کی نہیں حجاب کی تصویر تھی۔ حجاب کی تصویر ابوداؤد کے بیڈروم میں پڑی اس کی پرسنل ڈائری سے برآمد ہوئی تھی۔ مجھے لگا تھا میرے جسم کا سارا خون میرے دماغ کی طرف پوری قوت سے دوڑنے لگا ہے۔ تصویر کے پیچھے جو اشعار لکھے گئے تھے وہ اس درجہ سطحی اور اخلاق سوز تھے کہ میں اپنے طیش پر بہ مشکل قابو رکھ سکا۔ میرا جی چاہا تھا واش روم کا بند دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور ابوداؤد کو مار مار کر عالم بالا پہنچا کر دم لوں۔ ایک وحشت اور اضطراب کی کیفیت میں میں نے ڈائری جھپٹ کر اٹھائی تھی اور اس کے صنفی اکھاڑ کر پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیئے تھے۔ میرا پورا وجود جیسے جل اٹھا تھا ایک لمبے کھنکھارے میں جی چاہا تھا میں ابوداؤد سے ابھی نپٹ لوں۔ میں اس سے ملے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ میرا خیال تھا یہی بہتر تھا اگر اس روز وہ میرے سامنے اسی ہیجانی کیفیت میں آ جاتا تو شاید نہیں یقیناً میں اسے شوٹ کر دیتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ میرے دماغ کی کھولن کم نہیں ہوئی تھی۔ ابوداؤد کا گھٹیا طرز عمل مجھے اکثر بے قابو کرنے لگتا۔ مگر

میں چونکہ ایک مرتبہ اس سے زیادتی کر چکا تھا جہی دوبارہ اس سے مس بی ہو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی سوچ تھی جو ہر بار اس کے ساتھ کوئی انتہائی حرکت سے باز کرا جاتی تھی۔ میں نے اس سے درگزر بس اس حد تک کیا تھا البتہ اس سے مزید کوئی تعلق واسطہ رکھنے کا میرا بالکل کوئی خیال نہیں تھا۔ مگر شاید اب وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ جہی اس نے اس روز ریسٹورنٹ میں جب فیضان میرے ساتھ تھا زبردستی ہمیں جوائن کیا تھا اور بات چیت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ فیضان کی وجہ سے میں اس کا لحاظ کرنے پر مجبور تھا کہ یہ بات ایسی تھی جسے میں اپنے سگے بھائی پر بھی عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری خاموشی ابوداؤد کے حوصلے بڑھا رہی تھی۔ فیضان کے وہاں سے ہٹتے ہی جیسے اے مجھ سے کھل کر بات کرنے کا موقع میسر آ گیا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا اور میں اسے ایسا کوئی موقع دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے میں نے اس کی وضاحت اور شرمندگی پر پہلی بار اسے دیکھا۔ وہ بے حد اضطراب کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے بہت مہذبانہ انداز میں معذرت کی اور پھر حجاب کے حوالے سے اپنے جذبوں کو اتنے احترام سے آشکارا کیا کہ میں ایک بار پھر اس کی باتوں میں آ گیا۔

میں پاگل تھا اس سے ایک بار پھر دھوکہ کھا گیا۔

میں نے سوچا تھا۔ اگر یہ واقعی اتنا سچا ہے حجاب سے اتنی گہری محبت کرتا ہے تو کیا حرج ہے۔ اس کے جذبوں کو پذیرائی بخش دی جائے۔ وہ ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا تھا ایک بھرپور اور خوبصورت زندگی اپنی شریک حیات کو دے سکتا تھا۔ خود بھی ہینڈ سم تھا۔ حجاب ہماری اکلوتی تھی بے حد نازوں پٹی، اس کے لیے ہماری خواہش کسی ایسے ہی لڑکے کی تھی جو اسے ہر لحاظ سے سکھی اور خوش رکھ سکے۔ پھر کیا حرج تھا وہ آدمی ابوداؤد ہی ہو۔ اس میں اور کوئی خرابی نہیں تھی۔ بس وہ عمر میں کچھ زیادہ بڑا تھا حجاب سے مگر یہ کوئی ایسا قابل اعتراض معاملہ نہیں تھا۔ یہی سوچیں تھیں جنہوں نے مجھے ڈھیلا پڑنے اور ابوداؤد کی خطا معاف کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ آہ کاش میں نے یہ غلطی نہ کی ہوتی۔ آہ کاش میں نے اپنے ہاتھوں اپنی ہنی کو مصیبتوں اور اذیتوں کے حوالے نہ کیا ہوتا۔ مگر یہ تقدیر کا لکھا تھا۔ اسے ہم کیسے ٹال سکتے تھے۔

☆☆

ابوداؤد کو معاف کر دینے اور اس کا عندیہ پورا کر دینے کے بعد میں ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ لاشعوری طور پر میں نے خود کو اپنے اس جرم سے اور زیادتی سے معاف پالیا تھا۔ میں نے گھر میں پیپا اور ماما کے سامنے یہ پروپوزل رکھا تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ابوداؤد ان کا دیکھا بھالا تھا اور انہیں پسند بھی۔ بس وہ حجاب کی اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ ابھی صرف رشتہ طے ہوگا۔ شادی حجاب کی تعلیم مکمل ہونے پر کی جائے گی۔ اس موقع پر جب گھر میں یہ خوشی کی خبر گردش کر رہی تھی۔ ماما نے ایک بار پھر میری شادی کا موضوع چھیڑ دیا۔ مگر میری ناں ہاں میں نہیں بدلی۔ ابوداؤد کے گھر والے پہلی بار ہمارے گھر آئے تو حجاب پہ اصل بات کھلی تھی۔ جس کے بعد اس نے احتجاجاً رو کر حشر کر لیا۔ ماما تو اس کی اس درجہ خفگی پر باقاعدہ پریشان ہو گئی تھیں۔

”عون بیٹے حجاب نے تو آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھا رہی۔“

”آپ فکر نہ کریں میں اس سے بات کروں گا۔“
 ”اگر پھر بھی نہ مانی تو؟“ وہ خدشات کا شکار تھیں۔ میں مسکرا دیا۔

”ایسا نہیں ہوگا۔ آپ نے اسے ابوداؤد کی تصویر دکھائی؟“
 ”میں نے کوشش کی تھی مگر اس نے نہیں دیکھی۔ صاف کہہ دیا جب شادی نہیں کرنی تو کیوں دیکھوں۔“
 ”اوکے میں بات کرتا ہوں۔“

میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ماما مجھے بتا چکی تھیں کہ وہ اپنے کمرے میں بند ہے۔ میں اس کے روم کے باہر آ رہا تھا اور اچھی خاصی درد سہی کے بعد دروازہ کھلوا دیا تھا۔ وہ کسی ننھی بچی کی طرح بے حد ناراض تھی۔ اسے منانا میرے لیے کبھی بھی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ وہ بچپن سے مجھ سے بے حد نزدیک تھی۔ ماما اور پاپا سے بھی بڑھ کر میں نے اس کے لاڈ اٹھائے تھے۔ بلکہ ماما اس کے بگاڑ کا الزام بڑے دھڑلے سے میرے سر رکھا کرتی تھیں۔ حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ وہ بگڑی ہوئی نہیں تھی۔

”میں نے اسے ابوداؤد کے متعلق بتایا تھا اور اسے قائل کرنے کی کوشش بھی کی۔ پتا نہیں وہ کس حد تک متفق ہوئی تھی البتہ یہ ضرور تھا کہ اس نے وہ احتجاج ختم کر دیا۔ یوں میری وجہ سے خالصتاً میری وجہ سے اس کے مقدر میں سیاعی لکھ دی گئی جس نے اس کی زندگی کی ساری روشنی ساری خوشیوں کو نگل لیا۔“

☆☆

جس روز ہم کھانے پر ابوداؤد کے ہاں انوائٹ تھے مجھے حجاب کی خفگی اور اداسی رہ رہ کے مضطرب کرتی رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ہم سب کے زور ڈالنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مان گئی ہے۔ میرے دل پر بوجھ سا آگرا تھا۔ وہ اداس تھی۔ جبکہ میں اسے خوش دیکھنے کا متمنی تھا۔ میری پرسوج نظریں ٹھہر ٹھہر کر ابوداؤد پر اٹھ رہی تھیں۔ یوں تو وہ تھا ہی ہینڈ سم مگر اس دن کچھ زیادہ سی گریس فل اور وجہ لگ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا اگر حجاب ایک مرتبہ ابوداؤد سے مل لے اسے دیکھ لے تو شاید نہیں یقیناً وہ اداسی ختم ہو جائے گی۔ وہ بھی نارمل لڑکیوں کی طرح اپنی زندگی کے اس بے حد اہم موقع پر خوش اور مطمئن نظر آئے گی۔ ابوداؤد کی ظاہری شخصیت سے کسی نوجوان لڑکی کا متاثر ہونا اور شریک حیات کے طور پر اسے قبول کرنا ہرگز مشکل نہیں تھا۔ بس کچھ ایسی ہی سوچ اور خیالات کی وجہ سے میں اس رات ابوداؤد کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا مگر حجاب کی کم عقلی نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا۔ اس کا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں اسے ابوداؤد سے متعارف کرا سکتا۔ بلکہ الٹا میں ابوداؤد سے شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ کہ وہ حجاب کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ خیر اس رات میں نے ابوداؤد پر اپنی اس سوچ کو آشکارا نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر پھر چلا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد میں نے محسوس کیا حجاب کے رویے میں واضح تبدیلی آگئی ہے۔ وہ ویسے ہی خوش اور مطمئن نظر آنے لگی تھی جیسی میں چاہتا تھا۔ تب میرے لیے یہ اطمینان کا ہی باعث تھا۔

☆☆

معنی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ حجاب ہماری اکلوتی بہن تھی۔ ہم ہرگز اس کی خوشی کے موقع پر کوئی کمی

میں رہنے دینا چاہتے تھے۔ جیسی ہر شوق پورا کیا گیا ہر ارمان نکالا گیا تھا۔ منگنی میں ابھی کچھ دن تھے جب ابوداؤد سے ملنے چلا آیا۔ اس نے خاصے بھجکے ہوئے انداز میں تقریب میں اپنی شمولیت کی بات کی تھی۔ مجھے کیا تراض ہو سکتا تھا۔ ہم بہت آزاد خیال لوگ نہیں تھے مگر وقت کے ساتھ چلنے میں قباحت نہیں تھی۔ میں نے خوشدلی سے اسے اجازت دی تھی۔ وہ ایک دم میرا مشکور نظر آنے لگا تو مجھے ہنسی آنے لگی تھی۔ منگنی کی تقریب میں وہ اتنا مارٹ اس قدر ڈشنگ نظر آ رہا تھا کہ مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہونے لگا تھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا اسی انتخاب پر میں بھی بے تحاشا شرمندگی بھی محسوس کروں گا اور وہ وقت دور نہیں ہے۔ سب سے پہلا شاک مجھے اس وقت لگا جب اس کی مہمان خواتین میں سے ایک خاتون کو میں نے اس کے ساتھ بے حد بے تکلف دیکھا۔ اپنے انداز و اطوار سے وہ ہرگز کسی شریف گھرانے کی نہیں لگتی تھی۔ گو کہ ابوداؤد اس کے التفات کے آگے کچھ خائف اور بنپا ہوا نظر آ رہا تھا مگر یہ بات طے تھی کہ اس کا اس عورت کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق یا شناسائی ضرور تھی۔ پھر اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش میں میرے شک کو گہرا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اپنے اندر کے شک و تشویش کو عیاں نہیں کیا تھا۔ تقریب میں رسم کا آغاز ہو گیا۔ وہ عورت سائے کی طرح ابوداؤد کے ساتھ لگی ہوئی۔ جہاں کہیں وہ اس کے ساتھ نہ ہوتی اس کی نظریں اس کا حصار کیے رکھتیں۔ میں پہلی بار اضطراب اور تشویش شکار ہوا تھا۔ حجاب کے معاملے میں ذرا سی بھی کوتاہی یا کمی کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں ابھی اسی فکر اور تشویش سے نہیں نکل سکا تھا کہ ایک اور دھچکا مجھے سہنا پڑا۔ ابوداؤد کے بڑے بھائی اور والدہ نے رسم کے رخصت سے ایک انوکھی فرمائش کر دی۔ ”ابوداؤد اور حجاب کے نکاح کی فرمائش“ ماما تو ایک دم ٹپٹا کے رہ گئی تھیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم نے تو منگنی تک ہی اس تقریب کو محدود رکھنا تھا اتنا اچانک.....“

میں چونکہ اس جگہ سے نزدیک تھا جہاں پر گفتگو ہو رہی تھی جیسی فوراً متوجہ ہوا اور اٹھ کر سرعت سے ماما کے پاس آیا۔ جہاں وہ دونوں ماما سے اپنی بات منوانے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

”منگنی کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے آنٹی! نکاح اہم فریضہ ہے۔ پھر کیا حرج ہے اگر اس طرح یہ رخصت کچھ اور مضبوط ہو جائے۔“

ابوداؤد کے بھائی کی بات نے میری پیشانی پر تیوری چڑھادی تھی۔

”محترم ہم خود بہتر سمجھتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ویسے بھی اگر آپ کا اس قسم کا کوئی ارادہ تھا تو آپ کو پہلے ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ عین وقت پر بات کر کے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“

میرا لہجہ بے حد کڑا اور سرد تھا۔ مجھے صحیح معنوں میں بے حد غصہ آیا تھا۔ میرے انداز نے اسے گڑبڑا دیا۔

”عون صاحب آپ شاید ہماری بات کا برا مان گئے ہیں؟“

”آپ یہ بتائیے یہ آپ کی رائے ہے یا آپ کو کسی نے کہا ہے؟“

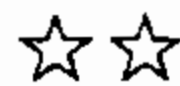
میں نے اسی تیز اور ترش لہجے میں استفسار کرتے ہوئے اسٹیج پر حجاب کے ہمراہ براجمان ابوداؤد پر کڑی نگاہ ڈالی تھی۔

”یہ خالصتاً ابو داؤد کی خواہش ہے۔ اس نے ہمیں آپ سے بات کرنے کا کہا ہے۔“

اب کی مرتبہ جواب ابو داؤد کی والدہ نے دیا تھا وہ میرے تاثرات سے خائف نظر آنے لگی تھیں۔

”تو پھر آپ انہیں کہہ دیجیے کہ ہمارا ایسا ہرگز کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے کر لے۔“

میرا صحیح معنوں میں اس وقت دماغ الٹ سا گیا تھا۔ ممانے میرے شدید لہجے اور الفاظ کی سنگینی پر مجھے گھور کر کسی قدر خفگی سے دیکھا۔ جبکہ ابو داؤد کی والدہ اور بھائی میرے تیوروں سے بالکل ہی شپٹا کر رہ گئے تھے۔ اسی دوران ابو داؤد بھی ہمارے پاس چلا آیا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا اسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا ہے۔ پھر اس نے جس طرح اپنے بھائی اور ماں کو سارا الزام دے کر خود بری الزمہ ہوا میرے لیے یہ بات جتنے شاک اور تاسف کا باعث تھی اس کے بھائی اور ماں کے حق دق چہرے دیکھ کر مجھے ابو داؤد کے جھوٹ کا صاف اور واضح اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ بعد میں بھی وضاحتیں دیتا رہا تھا۔ مگر میرا دماغ سائیں سائیں کرتا رہا تھا۔ ابو داؤد کی اس حرکت نے مجھے چونکا کر اس کی جانب سے محتاط ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ ابو داؤد کی طرف سے اگر میں متنفر نہیں بھی ہوا تھا تو مشکوک ضرور ہو گیا تھا۔ جانے کیوں مجھے تب ہی لگنے لگا تھا جیسے میں نے جذباتیت اور جلد بازی میں ایک غلط فیصلہ کر لیا ہے۔ ایک غلط قدم اٹھالیا ہے۔ میں ان دنوں بہت زیادہ پریشان رہنے لگا تھا۔ جیسے کوئی بھی صحیح فیصلہ نہ کر پا رہا ہوں کہ مجھے آئندہ کیا کرنا چاہیے۔ میں خدا سے صحیح فیصلے کی توفیق اور رہنمائی کا طلبگار رہنے لگا۔ انہی دنوں مجھے ابو داؤد کی بیماری کی اطلاع ملی تھی۔ رشتے کا تقاضا تھا کہ مجھے پاپا کے ساتھ اس کی عیادت کو جانا پڑا اس کی والدہ نے ہمارا استقبال کیا تھا اور ہمیں داؤد کے کمرے میں ہی لے گئیں۔ ابو داؤد سو رہا تھا۔ میں نے اس کی والدہ کو اسے جگانے سے منع کیا مگر وہ اٹھ چکا تھا۔ میں اس کی طرف سے بدظن ہو چکا تھا۔ جی بھی میرا اس سے بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ پاپا کے ساتھ ہی بات چیت میں مصروف رہا تھا اور میں بے زاری سے ادھر ادھر نظریں گھماتا رہا تھا جب اچانک میں ساکن رہ گیا تھا۔ بیڈ کے سرہانے کی جانب کارپٹ پر لمبی گردن والی خالی بوتل جھانک رہی تھی۔ بلاشبہ وہ شراب کی بوتل تھی۔ ابو داؤد کے کمرے میں اس بوتل کی موجودگی خود گواہ تھی کہ اسے استعمال کرنے والا کون تھا۔ میرے اندر بلا کے سنائے اتر آئے تھے۔ ایک بار پھر مجھے لگا تھا جیسے میں اپنی زندگی کی سنگین غلطی کر بیٹھا ہوں۔ مجھے قطعی سمجھ نہیں آئی تھی اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ابو داؤد کو سمجھانا یا اس قسم کی فضولیات سے باز رکھنا ایک دیوانے کا خواب تھا۔ میرا دماغ یہ سوچ کر ماؤف ہوا جارہا تھا کہ میں حجاب کو خود اپنے ہاتھوں اس کے حوالے کر دوں۔ یہ ناممکن، تھا ہر صورت ناممکن مجھے آئندہ کیا کرنا تھا کس طرح حجاب کو اس سے نجات دلانا ہے میں نہیں جانتا تھا مگر یہ طے تھا کہ مجھے اپنی جان پر بھی کھیل کر اگر حجاب کو اس آگ سے گرنے سے بچانا پڑا تو میں بچاؤں گا۔



میں نے اُلفت کے تقاضوں کو نبھایا اکثر

اور لوگوں نے میرا درد بڑھایا اکثر

میں نے گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانا چاہا
 اور لوگوں نے سر راہ گرایا اکثر
 میں نے چاہت کو دنیا میں تماشا نہ کیا
 اپنے ڈھلتے ہوئے اشکوں کو چھپایا اکثر
 یوں تیرے ترک تعلق سے شکایت کیسی
 چھوڑ دیتا ہے میرا ساتھ بھی سایہ اکثر

اس کے بعد میری صحیح معنوں میں راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ اضطراب مجھے ہر پل بے کل رکھنے لگا۔ شاید
 یثانیوں نے میرے دل کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ میرے دوست کے فادر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں انہی کی عیادت کو
 ہسپتال گیا تھا کہ کارڈیڈور سے گزرتے ہوئے ایک ادھ کھلے دروازے کے آگے سے گزرتے میری بے دھیانی میں
 کی نگاہ پلٹنا بھول گئی تھی۔ وہ ابوداؤد ہی تھا۔ بستر پر لیٹی ہوئی اس لڑکی کے پہلو میں بیڈ کی پٹی سے ٹکا ہوا۔ دونوں
 بے درمیان جیسے تکلف کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ ذرا سا غور کرنے پر مجھ پر مزید انکشاف ہوا تھا یہ وہی عورت تھی
 بے مکنی کی تقریب میں میں نے داؤد کے گرد پروانہ وار ٹارہوتے دیکھا تھا۔ تب اس لمحے ابوداؤد نے اس سے بے
 ری اور لا تعلقی کا اظہار کیا تھا۔ جان تو میں تب ہی گیا تھا اس کے جھوٹ کو مگر اب تو جیسے اس کا جھوٹ کسی طمانچے
 صورت منہ پر مارا جاسکتا تھا۔ میں سنبھلا تھا اور بھیچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کارڈیڈور سے ہٹ کر ہسپتال کے
 ن میں آ گیا۔ مگر میں اس زاویے سے کھڑا ہوا تھا کہ وہ دونوں اسی ادھ کھلے دروازے سے ہمیولوں کی صورت
 مائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں ہنوز ایک دوسرے کے نزدیک تھے اور میرے اندر کا بھونچال شدت اختیار کرتا
 رہا تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں اس
 کھٹکتی فریش آواز میری سماعتوں میں اتر کر حشر برپا کرنے لگی۔ میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ مگر جس
 رچ، جس دھڑلے سے اس نے جھوٹ بولا وہ میرے دل میں اس کی نفرت اور بغض کو کچھ اور بھی بڑھاوا دے گیا
 ۔ میں اس بات کے طیش کو دبا نہیں پارہا تھا جب ایک اور ایسا شدید واقعہ ہوا جس نے میری ذات کو جیسے کسی
 فتور بارود سے اڑا دیا تھا۔ پچھلے دنوں کی ذہنی ٹینشن نے مجھے مستقل سر درد میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ عجب بے بسی تھی
 میں فوری اور حتمی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ مہاپا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا یہ اتنا آسان
 تھا کہ میں اپنے منتخب کردہ بندے کو خود سے بڑا بنا کر پیش کرتا۔ پھر مجھے حجاب کے جذبات کی بھی پرواہ تھی۔
 اسے اس راہ پر زبردستی لانے والا بھی میں ہی تھا۔ میرے حوصلے "میری ہمتیں جیسے جواب دیتی جا رہی تھیں۔
 آفس میں بھی اسی قدر اضطلال کا شکار رہا تھا۔ جیسی پپانے مجھے ڈاکٹر سے چیک اپ کرانے اور گھر جا کے
 ام کا مشورہ دیا تھا۔ میں اتنا آپ سیٹ تھا کہ انکار کرنے کی بجائے ان کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ مگر واپسی کے
 میں جب گاڑی سگنل پر رکی تھی تب مجھے جو منظر نظر آیا تھا اس نے میری آنکھوں میں خراشیں ڈال دی تھیں۔
 حجاب یونیفارم میں تھی۔ ابوداؤد کی گاڑی میں، اس کی موجودگی میرے کرب اور اذیت کو دو چند کر

گئی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا ابو داؤد نے یہ کام کب سے شروع کیا تھا۔ ایسی ناقابل برداشت شکست! ہونٹ کاٹنے ہوئے میں نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ ابو داؤد کے ہمراہ حجاب کو دیکھنا اور برداشت کرنے کا مادہ کم از کم میرے اندر نہیں تھا۔ وہ میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چلا تھا کہ میں اس تک جا کے اس کے وجود کے ٹکڑے کر دیتا۔ مجھے اپنی برداشت اپنے ضبط پر حیرت ہوئی تھی۔ پھر میں نے حجاب کو ڈھکے پھپھ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ تب وہ کچھ حراساں اور پریشان نظر آنے لگی۔ میں کچھ اور ابھی اُلجھ گیا تھا۔ میں ابو داؤد سے جس قدر کتراتا، بچنے، جان چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر مسلط ہو رہا تھا مجھ پر۔ انہی دنوں فیضان کی منگنی کا فنکشن اُٹھ کھڑا ہوا تو وہ اس بہانے آن دھمکا۔ میں بے حد جھنجھلا کر رہ گیا۔ جو بھی تھا اب جلد اس کے انداز و اطوار مجھ پر عیاں ہو چکے تھے میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے جی بھی ایک فیصلہ کیا تھا اور فیضان کی منگنی سے اگلے روز ہی پاپا اور ماما کے سامنے اپنی بات رکھ دی مگر بہت محتاط انداز میں۔

”ماما اگر حجاب کی نسبت ختم کر دی جائے تو آپ کا کیا خیال ہوگا اس بارے میں؟“

میری بات سن کر ماما حقیقی معنوں میں سانس لینا بھول گئیں۔

”آپ ہوش میں ہیں عون مرتضیٰ!“

انہوں نے بے دریغ مجھے ڈانٹ کر رکھ دیا۔ پاپا بھی ٹھٹھک گئے تھے اور بغور مجھے دیکھ رہے تھے۔

میرے چہرے پر اضطراب تھا میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”آپ نے ایسی بات بلاوجہ تو نہیں کی ہوگی بیٹے میں جانتا ہوں۔ بہتر ہوگا آپ کھل کر وضاحت

کریں۔“ ماما کی نسبت پاپا نے فہم و فراست کا مظاہرہ کیا تھا مجھے اس پل لگا جیسے میرے گلے میں آنسوؤں کا گول پھنس گیا ہو۔ میں نے سرخ ہو کر جلتی آنکھوں کو اٹھا کر لمحہ بھر کو انہیں دیکھا تھا۔

”سوری پاپا! میں بے حد شرمندہ ہوں کہ میرا یہ فیصلہ بے حد غلط تھا۔ ابو داؤد ہرگز اس قابل نہیں

کہ ہم اس کے حوالے عمر بھر کے لیے حجاب کو کر دیں۔ آپ جانتے ہیں نا حجاب مجھے کتنی عزیز ہے۔“ شدت ضبط سے میری آواز بھینچی ہوئی تھی۔ ماما نے باقاعدہ گھور کر مجھے دیکھا تھا۔

”اب کیا آپ کو الہام ہو گیا ہے عون کہ وہ اس قابل نہیں۔ رشتہ طے کرتے وقت تو اس میں دنیا

جہاں کی خوبیاں تھیں۔“

ماما کو جلدی غصہ آ جایا کرتا تھا۔ وہ بی پی کی پشٹ تھیں۔ مجھے ان کی کسی بات پر غصہ نہیں آیا۔

”آپ اس کی پوری بات تو سن لیں حاجرہ!“ پاپا نے نرمی سے ٹوکا تھا پھر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”یہی تو میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ اس پرکھ میں مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اپنے تئیں تو میں نے بہترین ساتھی

منتخب کیا تھا مگر.....“

”ہوا کیا ہے یہ بھی بتاؤ نا بیٹے!“

پاپا نے پھر ٹوکا تو میں نے سینے کی گہرائیوں سے کرب آمیز سانس کھینچی تھی اور نگاہیں چرا کر بولا تھا۔

”وہ اچھا آدمی نہیں ہے پپا! ڈرنک کرتا ہے اور بھی برائیاں ہیں۔“

مما کے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ دہل کر مجھے دیکھنے لگیں۔

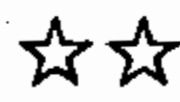
”تو تمہیں پہلے نہیں پتا تھا عون! اب ہم لوگوں کو کیا جواب دیں گے؟“

وہ ہچکھ کر بولی تھیں۔

”غلطی انسانوں سے ہی ہوا کرتی ہے بیگم صاحبہ! خیر عون بیٹے آپ کو ہو سکتا ہے غلط فہمی ہوئی ہو۔

اس طرح کے معاملات میں عجلت نقصان کا باعث ہوا کرتی ہے۔ ہم کون سا ابھی شادی کر رہے ہیں۔ آپ اچھی طرح سے اپنی تسلی کرا لیں پھر فیصلہ کریں گے۔“

پپا نے اسی رسائیت سے کہتے ہوئے اٹھ کر میرا کاندھا تھپک کر تسلی دینا چاہی تھی۔ مگر میرا سکون تو شاید ہمیشہ کے لیے کھو گیا تھا۔



اور تب جب میں ہر صورت کوئی حتمی قدم اٹھالینا چاہتا تھا ایک اور ایسی بات ہوئی جس نے جیسے میرے ہاتھ پیر باندھ کر رکھ دیئے۔ ابو داؤد کا ایکسڈنٹ ہوا تھا بہت شدید قسم کا۔ اس حادثے کی وجہ کیا تھی مجھے نہیں علم تھا مگر یہ ضرور ہوا تھا کہ میں فوری کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ تب ان لمحوں میں جبکہ میں حجاب پر اس کی اٹھنے والی نظر بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا مجھے حجاب کو اسے ملنے کی اجازت دینا پڑی تھی تو وجہ دوران بے ہوشی اس کا حجاب کو پکارتا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر ممانے حجاب کو اس سے ملوایا تھا۔ میں ایک بار پھر کنفیوژڈ ہو کر رہ گیا۔ دوران بے ہوشی بھلا کیسے وہ دھوکہ یا مکر کر سکتا تھا۔ کیا وہ واقعی حجاب سے محبت کرتا تھا؟ اس قدر گہری کہ حواسوں میں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا ہی متلاشی تھا۔ ان دنوں میرا اضطراب اور وحشت کچھ اور بھی بڑھنے لگی تھی تو وجہ حجاب کی اس کی ذات میں انوالومنٹ تھی۔ وہ جب تک ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہا تھا میں نے حجاب کا چہرہ متوحش ہی دیکھا تھا۔ ابو داؤد ڈسچارج ہو چکا تھا۔ میں ہرگز اتنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ نہیں کر سکا کہ اس کی عیادت کو اس کے گھر جاتا۔ مگر میں سمجھتا ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس نے جو شکست مجھے دینی تھی وہ دے دی تھی۔ اسی وقت مجھے لگا تھا کسی نے میرے پورے وجود کا سارا خون نچوڑ لیا ہو جب بذریعہ کوریئر مجھے وہ خاکی لفافہ موصول ہوا تھا۔ بھیجنے والے نے اپنا نام پتہ پوشیدہ رکھا تھا۔ اس کا مقصد جو بھی تھا میں بس اتنا جانتا تھا میری عزت نیلام ہو گئی ہے۔ وہ ابو داؤد کے گھر کی تصویر تھی جہاں وہ حجاب کے ساتھ تھا میں ان تصویروں کے زاویوں کو جزئیات سے کبھی بیان نہیں کر سکتا۔ میری غیرت نے مجھے ان پر ایک کے بعد دوسری نگاہ ڈالنے کی ہمت نہیں دی تھی۔ تصویروں کا لفافہ میرے کانپتے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ میرے پہلو میں ایسا ناقابل برداشت درد اٹھا تھا کہ میرا پورا وجود پسینوں میں نہا گیا۔ یہ اس سے محض چند دن بعد کی بات تھی۔ میں آفس میں تھا جب کسی انجان نمبر سے مجھے ایک مسج موصول ہوا تھا۔

”تصویریں دیکھ کر بھی اگر تمہاری غیرت کو جوش نہیں آیا تو آج لائیو تماشا جا کے وہاں دیکھ لو۔ ابو

داؤد آج تمہاری عزت کو ایک بار پھر نیلام کرنے والا ہے۔“

میرے ہاتھ کی جنبش نے اگلے لمحے اس مسیح کو ضائع کر دیا۔ میں میکا کی انداز میں اٹھا تھا۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا میں کیسے ابوداؤد کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ میرے سارے وجود میں جیسے زہریلی سوئیاں گڑی ہوئی تھیں۔ جب میں واج مین سے الجھتا راستے میں آئی ہر شے کو ٹھوکروں کی زد پر اڑاتا، اس کے بیدروم میں گھساتو میں بالکل حواسوں میں نہیں تھا۔ ابوداؤد غلط انسان ہے میں جان گیا تھا مگر وہ اس قدر سطحی ہوگا اس قدر گر جائے گا یہ تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ورنہ میں ایک پل بھی اس بندھن کو قائم رہنے دیتا نہ حجاب کو اس سے ملنے کی کوئی راہ چھوڑتا کس قدر منقسم مزاج تھا وہ، اور اسی قدر بودا اور بزدل اس نے برسوں پرانے ایک بھولے بھٹکے واقعہ کو لے کر اگر مجھ سے بدلہ چکانا چاہا تھا تو نشانہ میری بجائے حجاب کو بنایا تھا۔ اس روز میں جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں یاد میں نے وہاں کیا کیا اور کیسے حجاب کو اس سے چھڑا کر واپس لوٹا۔ دل و دماغ میرے قابو میں نہیں تھے مجھے لگ رہا تھا میرا دل کسی بھی پل دھڑکنا چھوڑ دے گا۔ جو کچھ وہاں میری آنکھیں دیکھ چکی تھیں وہ میرے صبر، میرے ضبط کی انتہا تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے میرے ہاتھ کانپتے رہے تھے اور آنکھوں کے آگے بار بار دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ میری ذہنی حالت اس قدر مخدوش تھی کہ اس روز میں نے حجاب کے ساتھ بھی کسی قدر زیادتی کر دی۔ حالانکہ میری نگاہ میں وہ کہیں بھی قصور وار نہیں تھی۔ وہ معصوم تھی۔ بس اسے ٹپ کر لیا گیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی۔ ابھی اتنی سوجھ بوجھ ہی نہ تھی اسے اچھے برے کی۔ اتنی سی عمر میں کہاں پہچان ہوتی ہے۔ یہ تو اس کی خواب سجانے کی عمر تھی مگر اس کے خوابوں کو تو چکنا چور کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت حساس تھی مجھے اس کا دکھ اس ساری رات رلاتا رہا تھا۔ پھر اگلے بہت سارے دن میں اس اضطراب سے نہیں نکل سکا۔ حجاب پر جو پابندیاں میں نے عائد کی تھیں وہ تحفظات تھے جو میں سمجھتا تھا بے حد ضروری تھے۔ ابوداؤد کی اصلیت کھل کر سامنے آ جانے کے بعد میں کوئی رسک لینے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ عزت جیسا نازک آگینہ ہلکی سی ٹھیس کا بھی متحمل نہیں ہوتا۔ اور میں ہر صورت اس عزت کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ جیسی میرا دوسرا فیصلہ جتنی بھی عجلت کا مظہر تھا مگر وقت اور حالات کی اہم ضرورت تھا۔ فراز میرا دوست تھا۔ وہ ابوداؤد کی طرح خوب رو تھا نہ دولت مند مگر اس کی شرافت و نجابت کی گارنٹی دی جاسکتی تھی۔ میں نے خود اس سے حجاب کی شادی کی۔ بات کی وہ ششدر ہونے لگا تھا۔ وہ حجاب کی عمر کے متعلق جانتا تھا۔ وہ ہماری حیثیت سے بھی آگاہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے مجھ سے صرف ایک بات کہی تھی۔

”مجھے نہیں پتا عون تم نے کیا سوچ کر میرا انتخاب کیا۔ بہر حال میں صرف اتنا کہوں گا میں خود کو اس قابل نہیں پاتا۔ تم اپنے فیصلے پر ایک بار پھر غور کر لینا۔ پھر بھی اگر تمہارا فیصلہ یہی ہو تو میں اسے اپنی سب سے بڑی خوش بختی سمجھوں گا بلاشبہ!“

اور مجھے بھلا نظر ثانی کی کیا ضرورت تھی فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ جو وقت کی نزاکت کا متقاضی تھا۔ پپانے میرا فیصلہ قبول کیا مگر ماما خوش نظر نہیں آتی تھیں۔ فیضان متفکر اور عیسیٰ اور موسیٰ گم صم تھے۔ ہر قسم کا اختیار گویا میرے ہاتھ میں تھا۔ جسے میں بہ احسن خوبی نبھانا چاہتا تھا۔ مگر انسان تو بس سوچنے پر قادر ہے میں نے اصلاح اور بچاؤ کی جتنی بھی تدبیریں اختیار کی تھیں وہ ابوداؤد جیسے سرکش انسان کی گناہ آلود سوچوں اور عمل کے سامنے

ریتلی دیوار ثابت ہوئیں۔ عین نکاح کے موقع پر وہ کسی عذاب کی طرح نازل ہوا تھا اور سب کچھ ملیا میٹ کر کے رکھ گیا۔ میں اپنی سوچ ارادے اور عہد کے مطابق مرجانا یا ماردینا چاہتا تھا مگر میرے حواس عین اس وقت میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے جب نہیں چھوڑنے چاہیے تھے۔

☆☆

دوا عصاب شکن حادثے یلکھت ہوئے تھے۔ حجاب کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ اور مجھے شدید زخمی۔ میرے گھر والوں کو وقتی طور پر حجاب بھول گئی میں یاد رہ گیا۔ میں جو شاید زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جسمانی سے کہیں بڑھ کر میں ذہنی اذیت اور کرب کا شکار تھا۔ ہوش میں آجانے کے بعد میں پاگلوں کی طرح زخمی ٹانگ اور جسم کی پرواہ کیے بغیر اٹھ اٹھ کر دوڑنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ میں ہر صورت سنی کو اس شیطان سے چھڑالانا چاہتا تھا مگر میرا زخمی وجود اور میرے اپنے، میرے راستے کی بڑی بڑی دیواریں بن گئے۔ بے بسی، لا چاری اور اذیت کا یہی لامتناہی سمندر تھا جس میں میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔ ہجانی انداز میں بار بار چیختا اور روتا رہا۔ ہاں اس روز اپنی شکست اور بے بسی کے سامنے لا چاری سے پڑا میں بار بار رویا تھا۔ وہ رات بہت کربناک، طویل اور مہیب تھی بے حد مہیب جو کتنی ہی نہ تھی۔ سانس اس دن زندگی کی ڈر کو جوڑنے کا باعث نہیں تھے ”آریاں“ تھیں جو ہر لمحہ لک جاں کو کاٹ رہے تھے۔ بہت اذیت تھی۔ بہت زیادہ۔ تمام میڈیسن مجھ پر بے اثر جا رہی تھیں مسکن دواؤں سے مجھے بے خبر رکھنے کی کوشش کی گئی تھی مگر میری تو آنکھیں جیسے بند نہ ہونے کی قسم کھا بیٹھیں تھیں۔ پھر اس نے ان کیا تھا۔ جو بکو اس نے کی وہ جیسے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”فیضان!“ میں وحشت بھرے انداز میں چیخا تھا۔

جی بھیا! وہ میرے نزدیک ہی تھا بے ساختہ مجھے تھام لیا۔ مگر وہ مجھ سے نگاہیں چار نہیں کر رہا تھا۔ میں اب شاید کبھی ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے۔ لمبے دھڑنگے مضبوط بھائیوں کی موجودگی میں بن کی عزت خطرے میں جا پڑی تھی اور ہم کچھ نہیں کر سکے تھے۔ خوف اور رسوائی کی بات صرف یہی نہیں تھی۔ از کی فیملی کے سامنے ہم کس درجہ ذلیل ہوئے تھے۔ اب ایک دنیا کے سامنے ہم رسوا ہونے والے تھے۔

”پولیس سے رابطہ کیا؟“

میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”نہیں بھیا پاپا نے منع کیا ہے۔“ اس کے جواب نے مجھے دوا آتھ کر دیا۔

”کیوں؟ کیوں منع کیا ہے پاپا نے؟ وہ ذلیل آدمی ہماری.....“ فیضان پولیس کو کال کرو۔ تمہارے

ست کا بھائی ہے نا پولیس ڈیپارٹمنٹ میں؟ اسے کال کرو اسے ساری بات بتاؤ مجھے ہر صورت حجاب واپس چاہیے۔“

”بھائی ایک رات گزر چکی ہے اور.....“

”اور کیا؟ ہاں اور کیا؟ ایک رات گزر گئی تو کیا ہم اسے مرنے زندہ درگور ہونے کو چھوڑ دیں؟“

”عون بیٹے بھول جاؤ اب اس بات کو صبر کر لو۔“

پپا نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے وحشت بھرے انداز میں ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”بھول جاؤں؟ صبر کر لوں؟ کیسے؟ نہیں پپا! وہ اسے جینے نہیں دے گا۔ وہ اسے لمحہ لمحہ مارے گا۔ میں جانتا ہوں اسے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جان گیا ہوں۔“

میرا ضبط ایک بار پھر چھلک گیا میں ایک بار پھر سسک اٹھا تھا۔ ماما پپا کو دنیا کا خوف تھا مگر مجھے صرف حجاب کی پرواہ تھی۔ میں اسے اس عفریت سے ہر طور پر بچانا چاہتا تھا۔ پھر میں سب کچھ بھلائے اسی کوشش میں لگ گیا۔ انسپکٹر شیراز سے میں نے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ اور اسے حجاب کی بازیابی کا کہا تھا۔ وہ ایک دیانت دار محنتی پولیس مین تھا۔ جی جان سے اس مشن پر لگ گیا۔ اس نے مجھے ایک جدید فون دیا تھا میری سم اس نے اس میں لگادی تھی۔

”جب بھی اس کا فون آئے آپ نے لازمی کال اٹینڈ کرنی ہے۔ اس سے ہمیں اس کی رہائش کی لوکیشن وغیرہ سمجھنے میں بہت سہولت اور مدد ملے گی۔“

اور میں نے اس تلاش کو کامیاب بنانے کی خاطر اپنے ضبط، اپنے حوصلے کو آخری حد تک آزمایا تھا۔ اس کی واہیات اور گندی باتیں سننا آسان نہیں تھا مگر مجھے خود پر جبر کرنا پڑا تھا۔ اور پھر تیسرے دن مسلسل کوشش اور تنگ و دو کے بعد ہم اس کے ٹھکانے کا کھوج لگا کر وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پورا گھر خالی تھا۔ بس چند ملازم تھے۔ ملازمہ کم عمر لڑکی تھی پولیس کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ شیراز نے واچ مین سے جو کچھ بھی پوچھا وہ صاف منکر ہو گیا تھا۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ دو دن پہلے یہاں کوئی آدمی کسی اغوا شدہ لڑکی کو لایا ہے۔ شیراز نے ایک دو تھپڑ بھی اسے مارے مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں سرکا۔

”ہماری صاحب تو شادی شدہ ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے کسی کام سے گئی ہے۔“

”اور تمہاری مالکن؟ وہ کہاں ہے؟“ وہ غرایا تھا۔ جواب ندارد

”شیراز کہیں تمہیں غلطی تو نہیں لگ رہی۔ میرا مطلب ہے کہ.....“

”ہر گز نہیں۔ وہ سیل فون ابھی بھی اسی گھر کے کسی کمرے میں موجود ہے۔ اپنی وے ابھی سچ سامنے

آجائے گا میرے کانشیبل اندر گئے ہیں تلاشی لینے۔“

اس نے یقین سے کہہ کر ایک طرح سے میری تسلی کرائی تھی۔ اس سے پہلے کہ اندر سے تلاشی لے کر کانشیبل باہر آتے حجاب کہیں سے نکل کر اچانک ہمارے سامنے آگئی۔ وہ اسی لباس میں تھی جو وہ گھر پر پہنے ہوئے تھی۔

”بھیا!.....“ اس کے ہونٹ کانپے تھے پھر وہ بھاگ کر مجھ سے آگے لپٹ گئی تھی۔ میں نے بے

ساختگی میں اپنی بانہوں کا مضبوط حصار اس کے گرد تان کر اس کی پیشانی کو محبت اور نرمی سے چوما۔ شیراز اسی وقت حجاب کا بیان لینا چاہ رہا تھا مگر میں نے مداخلت کی تھی۔ وہ کچھ متذبذب نظر آیا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے

یہ بات مان لی تھی۔ شیراز واپس گاڑی میں آیا تو اس نے مجھے جو خبر سنائی اس نے مجھے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاید وہ ملازمہ سے حجاب اور ابو داؤد کے نکاح کی تصدیق کر کے آیا تھا۔ مگر میں اس نکاح کی حقیقت جانتا تھا۔ یہ محض ایک فراڈ تھا یہ بات شیراز کو بتانے والی نہیں تھی۔ مگر غم و غصے اور طیش میں میرے منہ سے نکل گئی۔ انسپکٹر شیراز سے میری اکثر میٹنگ ہونے لگی۔ اسی بھر پور تعاون پر میں اس کا مشکور تھا۔ مگر وہ بار بار ایک ہی بات کہتا تھا کہ اگر واقعی نکاح ہو چکا ہے اور وہ اصلی ہے تو پھر آپ اپنی سسٹر کو اس سے زیادہ دیر تک نہیں بچا سکتے۔ میں قانونی چارہ جوئی کا سوچ چکا تھا۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ ابو داؤد نے حجاب سے نکاح کیا ہے۔ وہ جتنا کمینہ تھا ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بہر حال اگر ایسا ہوتا بھی میں تب بھی حجاب کو اس جیسے کم ظرف اور کمینہ انسان کو کبھی نہ سونپتا۔ وہ اس قابل تھا ہی نہیں۔ حجاب کو اس کی پہنچ سے نکال کر میں کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا مگر شاید ماما خوش نہیں تھیں۔ میں نے ان دنوں انہیں اتنا مضطرب اور بے کل دیکھا کہ حد نہیں۔

”آپ فکر کیوں کرتی ہیں ماما! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا نے ہمیں بڑے کرائس سے نکال لیا ہے۔ یہ تو بہت معمولی مسئلہ ہے۔“

اپنے تئیں میں نے انہیں تسلی دلا سہ دینے کی کوشش کی تھی مگر وہ پھر بھی تشویش کا شکار رہیں

”ایک دنیا کو خبر ہو چکی ہے بیٹے! کہ وہ خبیث ہماری بیٹی کو پورے تین دن اپنی تحویل میں رکھ چکا ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ وہ تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ پہلے بھی اس نے دریغ رکھ کر تو گولیاں نہیں چلائی تھیں اب پھر اگر خدا نخواستہ.....!“

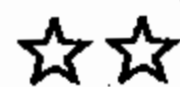
انہوں نے دہل کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے پریشانی نظروں سے کسی قدر خفگی سمیت انہیں دیکھا

”تو اس کا کیا مطلب ماما! مجھے زندہ سلامت رکھ کر آپ یا ہم حجاب کی قربانی دے دیں عزت کی بھی، جان کی بھی؟ یہ فیئر ہو گا یا پھر یہ ہمیں زیب دیتا ہے؟“

میں اتنا خفا، اتنا غصیلا ہو رہا تھا کہ چیخ پڑا۔ ماما نے خائف نظروں سے مجھے دیکھا پھر کچھ کہے بغیر آنسو بہانے لگیں تو مجھے خود کو کمپوز کرنا پڑا تھا۔

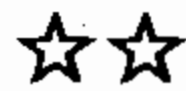
ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ موت کا ایک دن متعین ہے۔ کسی کی بھی جرات نہیں کہ اسے ایک لمحہ بھی آگے پیچھے سرکا سکے۔ ماما پھر ہم کیوں اس کے خوف سے اپنی عزت اور ایمان کا سودہ کرتے پھریں۔ نو ماما! نو کمپر و مائز! آپ مجھے بزدلی کے سبق مت پڑھائیں۔ میں حجاب کے ساتھ ہرگز بھی کوئی زیادتی نہیں ہونے دے سکتا۔“

میرا لہجہ دو ٹوک اور قطعی تھا۔ ماما نے بے بس نظروں سے مجھے دیکھا تھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں بے حد مطمئن ہو کر وہاں سے اٹھا تھا۔



میں حجاب کے حوالے سے پریشان تھا۔ ابو داؤد سے کسی بھی برائی کی توقع اب عبث نہیں رہی تھی۔

بھی میں۔ خصوصی طور پر حجاب سے بات کی تھی۔ اس نے اس موقع پر جو بات مجھ سے کہی وہ میرا ضبط چھلکانے کا باعث بنی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق وہ اس جھوٹے نکاح کو صحیح سمجھے بیٹھی تھی۔ میرے منہ سے حقیقت سن کر اسے شاک تو لگا تھا مگر یہ از حد ضروری تھا۔ کبھی کبھار سچائی جتنی بھی تلخ ہو آگاہی جتنی بھی کڑی ہو مگر ضروری ہوتی ہے۔ پھر اسی دن میرا وہ خوف اور خدشہ میرے سامنے آ گیا۔ ابو داد نے اپنی چال چلی تھی۔ شاک مجھے اس وقت لگا جب اس کے بھیجے پولیس آفیسر نے ثبوت کے طور پر اصل نکاح نامے کی کاپی مجھے دکھائی۔ مجھے لگا تھا میں ایک دم شکستہ ہو گیا ہوں۔ مجھے شکست فاش دینے اور حجاب کو تختہ مشق بنانے کی غرض سے اس نے بڑا مضبوط اور ہکا کام کیا تھا۔ میری پوزیشن ایسی نہیں رہی تھی کہ میں حجاب کے دفاع کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا اور وہ پھر اس مکر وہ شخص کی تحویل میں چلی گئی۔ میرے شب و روز ایک مرتبہ پھر کانٹوں پر بسر ہونے لگے۔ بنا دیکھے بنا جانے بھی مجھے اندازہ تھا حجاب کی زندگی کیسی ہو سکتی تھی۔ وہ ایسی اضطراب کی گھڑیاں تھیں کہ میں جس نے کبھی زندگی میں اسموکنگ نہیں کی تھی ان دنوں ہر پل آگ سے کھیلنے لگا۔ میری توجہ جیسے ہر سمت سے ہٹ کر حجاب پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ میں ہارٹ پیسٹ بن کر رہ گیا۔ ماما، پاپا ہی نہیں تینوں بھائی بھی میری وجہ سے بہت پریشان تھے مگر میں ان کی پریشانی رفع کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں رہا تھا۔ یہ محبت جو ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ آزمائش بن کر آتی ہے کڑی آزمائش! میں بھی اسی آزمائش سے گزر رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی گزرا تھا۔ جب برینہ نے مجھے دھوکہ دیا تھا اور بے وفائی کا کاری زخم لگا گئی تھی۔ مگر تب میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ میرا اپنا دکھ تھا میں برداشت کر گیا۔ یہ میری ہنی کا دکھ تھا جو مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جو میری زندگی کا روگ بن گیا تھا۔ جو میری جان لے رہا تھا۔



اداس موسم میں زرد پتے

منتظر ہیں بہار تیرے

نہ جانے کتنی رتوں سے پیارے

یہ دشت تم کو بلارہے ہیں

کبھی تو لوٹو

کبھی تو پلٹو

کہ زندگی میں ویرانیاں ہیں

بنا تمہارے یہ موسم کی ادائیں دیکھو

کبھی ہنسائیں کبھی رولائیں

تمہی کہو

اب کیا کریں ہم

یاد رکھیں یا بس جائیں

بے کیف دن، طویل راتیں اور اداس زندگی، بس اب یہی انداز تھے جینے کے۔ پتا نہیں کتنی صدیاں بیت گئیں تھیں پھر ایک روز مجھے ایک انجان نمبر سے ایک کال آتی تھی۔ وہ کوئی خاتون تھیں۔ جنہوں نے اپنا تعارف مجھے ابو داؤد کی بھانج کے طور پر کرایا تو میرے ہونٹ باہم پیوست ہو گئے تھے۔ پھر جو کچھ ان کی زبانی مجھے پتا چلا وہ سب جیسے میں جانتا تھا۔ اضطراب کی اصل وجہ یہی تو تھی۔ انہوں نے مجھ سے ابو داؤد کے رویے کی معذرت کی تھی اور ہر ممکن طریقے سے حجاب کو وہاں سے نکالنے کی استدعا کے ساتھ اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا تھا۔ میں اسی پل آفس سے گھر جانے کو اٹھ گیا۔ میرے چہرے پر یقیناً کوئی غیر معمولی تاثر تھا کہ مجھے دیکھ کر چونک گئی تھیں۔ ”خیریت ہے بیٹے؟“ انہوں نے مجھے بے اختیار تھام لیا تھا۔ اور میں بے آسرا ٹہنی کی طرح ان کے وجود سے لگ گیا تھا۔

”مما حجاب بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اگر ہم اسے اس عقوبت خانے سے نکال کر نہیں لائے تو وہ مر جائے گی۔ اس کی موت کا ذمہ دار صرف میں ہوں گا۔ مما اگر اسے کچھ ہوا تو میں پہلے مر جاؤں گا۔ میں شوٹ کر لوں گا خود کو۔“

میں خواہ اس بحال نہیں رکھ سکا تھا۔ غم و غصے، تشویش، تفکر اور گھبراہٹ نے مل جل کر مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ مما میری حالت پر گھبرا گئی تھیں اور مجھے سنبھالنے کی سعی کرنے لگیں۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے بیٹے! اور تم کہاں جانا چاہ رہے ہو؟“

مجھے عجلت میں تیار ہوتے دیکھ کر وہ سراسیمہ ہونے لگی تھیں۔

”میں آپ کو سب کچھ واپس آ کے بتاؤں گا مما! ابھی سمجھ لیں میرے پاس اتنا ٹائم نہیں۔ ایک ایک

لحہ قیمتی ہے۔ حجاب وہاں میری منتظر ہے۔“

میں ان کی پکاروں کو نظر انداز کرتا عجلت میں نکل گیا تھا۔ کراچی سے لاہور تک کا سفر اسی تشویش اور اضطراب میں مبتلا رہ کر کیا تھا۔ میں وہاں پہنچا جوائڈر لیس مجھے دیا گیا تھا تو ابو داؤد کی بھانج نے ہی میرا استقبال کیا تھا وہ کچھ عجلت اور گھبراہٹ کا شکار نظر آتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ یہ کام رازداری سے کمرہی ہیں۔ میں ان کی ہمدردی پر مشکور ہو کر رہ گیا۔ حجاب کو دیکھ کر مجھے دھکا لگا تھا۔ وہ اتنی دیک اور زرد ہو رہی تھی کہ پہلی نظر میں میں اسے پہچان نہیں سکا۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ ابو داؤد میری سوچ سے کہیں بڑھ کر کمینگی پر اتر آیا تھا۔ حجاب میرے ساتھ واپس نہیں آنا چاہتی تھی مگر یہ بات اس کی ماننے والی نہیں تھی۔ جی میں اسے سمجھا بچھا کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مما سمیت سب کو اسے دیکھ کر دھچکا لگا تھا۔ میرا خود دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ اب میں اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ابو داؤد یقیناً پوری تیاری اور عیاری کے ساتھ میدان میں اتر آتا تھا جی ہر معاملے میں مجھے شکست سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ مگر اس شکست سے خائف ہو کر میں حجاب کی سیفٹی کی تدبیر سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اپنی سی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مما اور تانیہ جیسی سمجھ دار خواتین کی زیر نگہداشت اور محبت کی وجہ سے حجاب کی نقاہت

اور کمزوری ختم ہوتی چلی گئی۔ یہ اللہ کا بہت خاص کرم تھا کہ اُس نے حجاب کو سنبھلنے کی ہمت عطا فرمائی تھی۔ حالات کس حد تک قابو میں آگئے۔ حجاب بھی بظاہر سنبھلی ہوئی لگنے لگی تھی۔ میں اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا تو مجھے زندگی کا پھیکا پن ختم ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔ حجاب کی طرف سے ماما کی فکر ختم ہوئی تو انہیں ایک بار پھر میری شادی کا شوق چرا گیا تھا۔ اس مرتبہ ان کے اصرار میں اتنی شدت تھی کہ میں بوکھلا کر رہ گیا۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنی بات کو منوانے کی غرض سے ثانیہ اور حجاب کو بھی میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ مگر یہ ایسا معاملہ تھا کہ میں کسی کی بھی ماننے اور سننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ماما کا دھیان اپنی جانب سے ہٹانے کی غرض سے میں نے انہیں عیسیٰ کی شادی کا مشورہ دیا تھا۔ مقصد انہیں بہانا تھا جس میں میں کامیاب رہا تھا۔ ماما نے جی جان سے لڑکی تلاش کی۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا سامی ہوئی تھی کہ وہ اس معاملے میں ہر جگہ مجھے ساتھ رکھ رہی تھیں۔ جس روز وہ لڑکی دیکھنے گئی تھیں اس روز بھی مجھے زبردستی ساتھ لے کر گئیں۔ حالانکہ اس روز میری میٹنگ تھی۔ اور میں نے جان چھڑانے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ مان کر نہیں دیں۔ عیسیٰ پڑھنے کی غرض سے باہر جا چکا تھا۔ موسیٰ اور فیضان کو وہ ان معاملوں میں اتنا نہیں ڈالا کرتی تھیں۔ میں نے یہی سمجھا تھا جی ان کی بات مان لی تھی۔ ماما لڑکی کے گھر پر چھوڑ کر میں آفس جانے کو اسی لمحے واپس پلٹ گیا تھا۔ ڈرائیونگ روم سے نکل کر کارڈور کا موڑ مڑ رہا تھا جب کوئی اپنے دھیان میں چلتا ہوا زور سے مجھ سے ٹکرایا تھا۔ میں کچھ بوکھلا کر متوجہ ہوا تو یہ بوکھلاہٹ شدید خجالت میں بدل گئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی۔ اپنے نرم و نازک سراپے کے ساتھ میری جیسی خجالت اور خفت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

”آئی ایم ساری!“

مجھے کچھ تو کہنا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے میں رکا نہیں تھا۔ اپنا ڈھلک جانے والا چشمہ ناک پر سیٹ کرتے ہوئے میں کترا کر نکل آیا تھا۔ یہ بات اتنی معمولی اور غیر اہم تھی کہ اسے یاد رکھ ہی نہیں سکتا تھا مگر جب وہاں سے ماما لڑکی کی پسندیدگی اور تعریفوں کے ساتھ لوٹی تو بے حد خوش تھیں۔ اس کی تصویریں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے مجھے زبردستی تصویر دکھانا چاہی تھی اور ایک طرح کا شکوہ بھی کیا تھا۔ میں تصویر پر ایک نگاہ ڈالتے ہی حیران ہو گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو کارڈور میں ہوا کے گھوڑے پر سوار مجھ سے ٹکرا گئی تھی۔ وہ لڑکی واقعی بہت انوسینٹ اور پیاری تھی عیسیٰ کے ساتھ بہت سوٹ کرتی۔ ماما کی خوشی نے مجھے بھی مطمئن کر دیا تھا۔ مگر شاید یہ اطمینان مجھے اس نہیں آسکا تھا۔ جیسا سارا معاملہ ایک دم چوپٹ ہو گیا تھا۔ اور جس انداز میں سب کچھ درہم برہم ہوا اس نے مجھے چکرا کے رکھ دیا۔ عیسیٰ کے انکار اور اس کے بعد گھمبیر ہو جانے والی صورتحال نے مجھے اس حد تک فورس کیا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہ گیا کہ میں ڈوبتی عزت کی اس ناؤ کو بچانے کی اپنی ہی کوشش کروں۔ میں! جن کی وجہ سے ایک بار نہیں دو مرتبہ اس گھر اور اس کے مکین شدید اضطراب کرب اور ذلت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ اب اس صورتحال میں یہ میرا حق تھا یہ میرا فرض تھا کہ اس موقع پر میں قربانی دیتا اور میں نے قربانی دے دی تھی۔ اس کے باوجود کہ میں ذہنی و قلبی طور پر اس کام کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ پتا نہیں یہ کیسی قربانی تھی جس پر دل آمادہ نہیں تھا۔ شاید نہیں یقیناً یہ مجبوری کا بندھن تھا جو

مجھے باندھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

☆☆

یہ کوئی نہ جانتا تھا
میری تار تار محبتیں
میری دل نگار محبتیں
میری بے وقار محبتیں
جو اجڑ سکیں نہ پنپ سکیں
سر شاخ دل نہ سجا کبھی کوئی لمحہ کھلنے گلاب سا
سر باب جاں نہ رقم ہوا کوئی سانحہ۔ کوئی المیہ
میری بے یقین محبتیں
نہ عطا ہوئیں انہیں دیر میں نہ شرف ہی شہرت عام کا
نہ سند ہی کوئی دوام کی نہ وصال کی کوئی سرخوشی
نہ تو شدتیں غم ہجر میں، جو گریزاں ان سے صعوبتیں
سب ہی راحتیں بھی تھیں اجنبی، نہ رقابتوں میں خلوص تھا
نہ تھیں استوار رفاقتیں کسی قید میں، کسی جبر میں، رہیں کور چشم بصارتیں
سو کتاب جاں کی عبارتیں، نہ سفید ہوئیں نہ سیاہ ہی
وہی ایک رنگ تھا سرمئی، وہ جو پیرہن ہے شام کا
یونہی عمر ساری گزر گئی۔ کسی سرکشیدہ سوال میں
کسی خواب کے سے خیال، میں کسی خوف جیسے ملال میں
اک عجب سی صورتحال میں

میری بد نصیب محبتو! میری ایک بات یہ جان لو
کبھی معتبر بھی جو ہو گئیں، اس زندگی میں ہی تم اگر
تو یہ دیر پا خوشی مجھے نئے دکھ سے کر دے گی آشنا
میں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں گا وہ خوشی برتنے کا ذوق و شوق
جسے وقت لے کے بھی جا چکا



دسواں حصہ

سب سے زیادہ خفا میں عیسیٰ سے تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے سب کرنا پڑا تھا۔ بات صرف میری ناپسندیدگی کی ہی تو نہیں تھی۔ فریق ثانی کے لیے بھی کوئی راہ فرار نہیں چھوڑی گئی تھی۔ یہ سراسر مجبوری اور جبر کا بندھن تھا ایسے بندھن پائیدار کہاں ہوتے ہیں۔ پھر روشانے کو میں دیکھ اور مل چکا تھا وہ بہت کم عمر تھی۔ مجھ سے کم از کم بھی بارہ تیرا سال چھوٹی ہوگی۔ انڈرا سٹینڈنگ ہونا تو دور کی بات، وہ تو شاید مجھے ایکسپکٹ بھی نہ کرتی۔ مگر نہیں ایکسپکٹ تو وہ کر چکی تھی۔ پھر وہی مجبوری۔ انسان اپنے رشتے ناطوں میں کس بے بسی سے جکڑا ہوا ہے۔ شادی کی ہر تقریب میں میں بے حد سنجیدہ اور کچھ گم صم نظر آیا تھا۔ عیسیٰ بارات کے ساتھ نہیں آیا۔ وجہ ظاہر تو حجاب کے پاس رکنے کی تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں میرا ذہن کچھ مس کر رہا تھا۔ کچھ ایسا جو مجھ سے چھپایا گیا تھا۔ اور یہی چیز مجھے اضطراب بخش رہی تھی۔ تقریب میں، رسموں کے دوران بھی، میرے ذہن میں یہی جوالہ مکھی پکتا رہا۔ کبھی میں حجاب کی وجہ سے آپ سیٹ ہونے لگتا۔ ابوداؤد جیسے شخص سے کسی بھی کمینگی اور گھٹیا پن کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔ وہ بہت سطحی انداز میں سوچتا تھا۔ جب تک ہم لوگ واپس نہیں آگئے۔ میں مضطرب اور بے چین رہا تھا۔ اسی دوران میں نے دو سے تین مرتبہ فون پر حجاب کی خیریت معلوم کی تھی۔

”بھائی آج آپ کی شادی ہے یا رانجوائے کریں نا پلیز!“

تیسری مرتبہ کال کرنے پر میں نے عیسیٰ کی شوخ چلبلائی آواز سنی تھی میں نے سرخ چہرے کے ساتھ ہونٹ بھینچتے ہوئے فون بند کر دیا۔ گھر پہنچتے ہی میں عیسیٰ کی جانب لپکا تھا۔

”حجاب کہاں ہے؟ وہ ٹھیک ہے نا؟“

جواب میں اس نے دانت نکال لیے تھے۔ پھر آنکھیں نچا کر کسی قدر شوخی سے بولا۔

”روشی کی تو ایک ہی نند ہے وہ بھی سو پر بھاری پڑے گی اسے۔ کمال ہے دولہا صاحب نئی نویلی دلہن کو بھولے بہن کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے بھیا! وہ ہماری بھی اتنی ہی سگی ہے جتنی آپ کی۔ گستاخی معاف!“

میرے تاثرات میں تلخی اٹتے دیکھ کر وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر دفاعی انداز میں بولا تو میں اس کی مسخری پر دھیان دیئے بنا اندرونی حصے کی جانب لپکا تھا۔ اس بات کو بھول کر کہ مما پیچھے سے مجھے آوازیں دے رہی تھیں۔ انہیں شاید وہاں بھی کچھ رسمیں وغیرہ کرنی تھیں۔ میں نے ایک نظر پلٹ کر انہیں دیکھا اور ان سنی کیے

اندر بڑھتا چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں اس پل میرے دل کو پنکھ لگ رہے تھے۔ حجاب کی تلاش میں میں اس کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ مگر اُلٹے قدموں مڑا تو بدحواس سی زبیدہ سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

”صاحب وہ وہ چھوٹی بی بی کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے جی!“

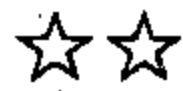
اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں زور سے چونکا۔

”کہاں ہے حجاب!“ میں چیخ پڑا تھا۔

زبیدہ نے ہاتھ سے کچن کی سمت اشارہ کیا۔ میں اندھا دھند اس سمت بھاگا تھا۔ حجاب وہیں تھی۔ کچن کے فرش پر وہ مجھے بے ترتیب پڑی نظر آئی تو میرا دل ہم سا گیا تھا۔

”حجاب! حجاب! آنکھیں کھولو۔“

میں وحشت زدہ ہو کر اس پر جھکا اور اسے جھنجھوڑا۔ وہ تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں اسے بانہوں میں اٹھا کر باہر بھاگا تھا۔ ماما اور عیسیٰ بھی عجلت میں میرے ساتھ گاڑی تک آئے تھے۔ اگلے لمحے گاڑی ہاسپٹل کی جانب دوڑ رہی تھی۔



وہ ساری رات بہت اضطراب میں گزری تھی۔ میں جتنا بے کل تھا اسی قدر افسردہ۔ ماما نے دو تین مرتبہ میرے پاس آ کر مجھے گھر واپس جانے کا کیا تھا۔ مگر میں ہر گز بھی اس بات پر آمادہ نہیں تھا۔ بلکہ مجھے ماما کی بات سن کر ہر بار غصہ آیا تھا۔

”بہت غلط بات ہے بیٹے! دہن کیا سوچے گی؟ ہم ہیں نا یہاں۔“

انہوں نے جب چوتھی بار بھی مجھ سے یہ بات دے دے انداز میں آ کر کہی تو میں بے حد چڑ کر رہ گیا تھا۔

”آپ کی بہو میرے انتظار میں پلکیں فرش راہ نہیں کیے بیٹھی ہوگی ماما! بلکہ شکر کر رہی ہوگی کہ جان چھوٹی۔ میری بہن آئی سی یو میں ہے اور میں گھر جا کے آرام کروں کتنی عجیب بات ہوگی یہ۔“

میرے تلخ و ترش انداز اور متاسفانہ لہجے پر ماما نے مجھے بے حد ناراضی سے دیکھا تھا۔

”خدا نخواستہ وہ کیوں شکر کر رہی ہوگی کہ جان چھوٹی؟ اپنے پاس سے مفروضے گھڑ کے اس پر الزام لگانے کی ضرورت نہیں ہے اچھا!“

انہوں نے مجھے بڑی طرح سے ڈانٹا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ کچھ دیر مجھے آس بھری نظروں سے دیکھتیں رہی تھیں مگر میں بے نیازی کا تاثر دینے کو دوسری جانب دیکھتا رہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر رہ گئی تھیں۔ اسی وقت آپریشن روم کا دروازہ کھلا تو میں باہر آئی ڈاکٹر کی جانب لپکا تھا۔

”پیشٹ کے شوہر کدھر ہیں؟“

ڈاکٹر کا انداز پیشہ وارانہ تھا میں نے آہستگی سے بتایا وہ نہیں ہے اور اپنے تعارف کے بعد حجاب کی

خیریت دریافت کی تھی۔

”دیکھئے عون صاحب! ہمیں کچھ پیپرز پرسیاں چاہیے جو پمپٹ کے سرپرست کے ہونے چاہیے۔ سیزیرین ہوگا۔ اسی میں آپ کو پتا ہے ڈیفنی کٹی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کاؤنٹر پر چلے جائیں فائل وہیں ہوگی سیگنچر کر دیجیے گا۔ ٹھیکس۔“

ان پیپرز پرسیاں کرتے ہوئے میرے ہاتھوں میں لرزش اور آنکھوں میں دھند اتر آئی تھی۔ دل تمام تر شدتوں سے حجاب کی زندگی اور تندرستی کے لیے خدا کے حضور سجدہ ریز تھا۔ یہ خدا کا ہی کرم تھا کہ تہجد کی اذان کی ساتھ حجاب کی مشکل کو خدا نے آسان کیا تھا اور اس کے قدموں کے نیچے جنت بچھا دی تھی۔ اس کے ہوش میں آ جانے تک میں مضطرب ہی رہا تھا۔ رات کو میں ماما اور عیسیٰ حجاب کو لے کر ہاسپٹل آئے تھے۔ صبح حجاب کے بچے کی خوشخبری سن کر پاپا عیسیٰ، فیضان، ثانیہ اور موسیٰ بھی باری باری حجاب اور بچے کو دیکھنے آ گئے مگر مجھے اس وقت ناگواری کا احساس ہوا تھا جب میں نے روشا نے کو بھی وہاں دیکھا تھا۔ مہندی لگے ہاتھوں پیروں کی وجہ سے وہ بہت سارے لوگوں کی نظروں میں آرہی تھی۔ ماما کے ساتھ پاپا بھی مجھے واپس گھر بھیجنے اور آرام کرنے کا مشورہ بار بار دینے لگے۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر ان لوگوں کے سامنے میری کوئی پیش نہیں چلی تھی۔ جس وقت میں گھر جانے کو اٹھا تھا۔ پاپا نے روشا نے اور ثانیہ کو بھی ساتھ لے جانے کا کہہ دیا تھا۔ میں گہرا سانس بھرتا کوٹ کی جیب میں گاڑی کی چابی کی موجودگی کا اطمینان کرتا کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ دونوں مدھم آواز میں باتیں کرتی میرے پیچھے آرہی تھیں۔ جب ہم لوگ پورٹیکو میں پہنچے اس پل فیضان ہاٹ لائن کا ڈبہ اٹھائے بائیک اسٹینڈ کرتا ہوا ہماری جانب آیا تھا۔

”روشی تم چلی جاؤ گھر، میں فیضان کے ساتھ آ جاؤں گی۔“

ثانیہ کو پتا نہیں کیا سو جھی تھی کہ ایک دم سے فیصلہ بدل لیا۔ اس کے لہجے کی معنی خیزی پر میں نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ تھی اور وہ روشا نے کی سمت جھک کر سرگوشی میں کچھ کہہ رہی تھی۔ روشا نے بڑی طرح جھینپی تھی اور اس نے پلکیں اٹھا کر لمحہ بھر کو مجھے دیکھا تھا۔ مجھے اپنی سمت متوجہ پا کے وہ گڑبڑا گئی تھی۔ میں ہونٹ بھیج کر نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔

”بھیا سنبھالیں اپنی دلہن کو اور ہاں اسے ٹائم پر پارلر بھیج دیجیے گا۔ آج ولیمہ ہے آپ کا۔“

ثانیہ نے ہنستے ہوئے روشا نے کو میری طرف دھکیلا تھا اور خود فیضان کے پیچھے چلی گئی۔ روشا نے کے چہرے پر گلال بکھر گیا تھا۔ مگر میں ہنوز سنجیدہ تھا۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے گاڑی کی چابی نکالی تھی اور فرنٹ دروازہ ان لاکڈ کرنے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ راستے میں ہمارے درمیان خاموشی رہی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی جلت رنگ بار بار گاڑی کے ماحول کو ڈسٹرب کرتی تھی تو میں بھی چونک سا جاتا تھا۔ گاڑی پورٹیکو میں روک کر میں اس کے اترنے کا انتظار کیے بنا لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے روم میں چلا آیا۔ کوٹ اور رسٹ وائچ اتار کر رکھتے ہوئے میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ ساتھ ہی چوڑیوں کی کھٹک آنے والی کی خبر

از خود ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور اطمینان سے اپنا کام کیا تھا۔ مائی اُتار کر بستر پر پھیلتے ہوئے میں شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وارڈروب کی سمت بڑھا تو اسے پہلے سے وہاں مصروف پا کر وہیں تھم گیا۔ وہ پتا نہیں کس کام میں لگ گئی تھی۔

”آپ کے لیے کرتا شلوار رکھوں یا ٹرواؤز شرٹ؟“

ذرا سارخ پھیر کر اس نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے جیسے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ ہٹ جائیں میں خود کر لوں گا۔“

میں نے جواباً رسانیت سے کہا اور آگے بڑھ کر اس کی سنے بغیر سرمئی کرتا شلوار کا بیگر نکال کر کپڑے لیے اور واش روم میں گھس گیا۔ ہاتھ لے کر تو لیے سے سرخنگ کرتا باہر آیا تو وہ کمرے میں نہیں تھی میں نے دھیان دیئے بغیر ڈریسنگ ٹیبل تک آ کر برش سے بال بنائے تھے۔ میرے جوتے ریک میں اور کوٹ بینگ ہو چکا تھا۔ مائی بھی اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ یہ یقیناً روشانے کی کارگزاری تھی وہ بہت سلیقہ مند لگتی تھی۔ میں بستر تک آنے سے قبل انٹرکام تک گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ریسورٹھا کر زبیدہ کو چائے کی تاکید کرتا وہ ایک بار پھر دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔ میری نگاہ سرسری انداز میں اٹھی تھی۔ پیازی فرائک پر بے حد حسین کام تھا۔ کھلے ریشمی بالوں کے درمیان اجلا دو دھیا ملکوتی نقوش سے سجا چہرہ، دوپٹہ ایک سائڈ پر پڑا تھا چوڑی داری پا جاے میں وہ قدیم مغلیہ دور کی کوئی حسین کردار لگ رہی تھی۔ میری نظروں کو محسوس کر کے وہ اچھی خاصی کنفیوژ ہوئی تو میں فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل کر بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی پھر چھوٹا میز اٹھا کر بیڈ کے ساتھ رکھنے کے بعد ٹرے میرے نزدیک رکھ دی۔

”آپ نے خواجواہ زحمت کی۔ میں چائے کے علاوہ کسی چیز کی طلب محسوس نہیں کر رہا تھا۔“

میں نے رسانیت سے کہا تھا اور ہاتھ بڑھا کر چینی کس کر کے چائے کا لگ اٹھالیا۔ سب لیتے ہوئے میری نگاہیں غیر شعوری طور پر اس کے لرزیدہ بے حد سفید ہاتھوں پر جا ٹھہریں۔ سلاؤں اٹھا کر اس نے مکھن لگایا تھا پھر سلاؤں کو پلیٹ میں رکھنے کے بعد میری جانب بڑھا دیا۔

”خالی معدے کے لیے چائے نقصان دہ ہوتی ہے۔ آپ یہ ساتھ لے لیں۔“

انداز کی خاصیت نے مجھے ٹھٹھکا کے رکھ دیا۔ کیا وہ اتنی جلدی حالات سے سمجھوتہ کر چکی تھی؟ وہ بھی اس صورت کہ عیسیٰ بھی اسی گھر میں اس کے آس پاس تھا۔ کچھ کہے بغیر میں نے پلیٹ تھام لی تھی اور سلاؤں کو فولڈ کر کے ہاتھ میں لیتے ہوئے ایک بائٹ لیا۔

”آپ ناشتہ نہیں کریں گی؟“

اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے دیکھ کر میں نے اچھے سے استفسار کیا تھا۔ وہ جیسے چونکی۔ پھر سر کو نشی میں جنبش دی۔

”میں کر چکی ہوں۔“ اچھوٹلی میں ارلی مارنگ بریک فاسٹ میں جوس یا دودھ لینے کی عادی

ہوں۔ کالج جانا ہوتا تھا۔“

اس نے مسکرا کر بتایا تو میں نے محض سر ہلا دیا تھا۔ سلاؤں اور چائے ختم کر کے میں واش روم جا کے ہاتھ دھونے کئی کرنے کے بعد اندر آیا تو وہ برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھ رہی تھی۔

”آپ رہنے دیں میں زبیدہ سے کہہ دیتا ہوں وہ برتن لے جائے گی۔“

اسے ٹرے سمیت باہر جاتے دیکھ کر میں نے ٹوکا تھا۔ وہ ایک دن کی دلہن تھی مجھے اس کا یوں کام کرنا مناسب محسوس نہیں ہوا تھا۔

”ارے نہیں اتنا سا تو کام ہے میں ابھی آ جاتی ہوں۔“

وہ ایک بار پھر مسکرائی تھی تو میری نگاہ اس کے داہنے گال پر پڑتے بھنور میں جیسے الجھ کر رہی وہ پلٹ گئی تھی۔ میں گہرا سانس بھر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ اتنا تھکا ہوا تھا کب آنکھ لگی مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔

☆☆

میں سو کر اٹھا تو میری نگاہ کروٹ بدلتے ہوئے روشانی پر جا پڑی تھی۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بالوں میں انگلیاں پھیلاتے ہوئے وہ بہت مگن انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ کچھ اس قدر محو ہو کر کہ شاید میرے بیدار ہونے کی بھی اسے خبر نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک دم سا کن سا ہو گیا۔ جبکہ وہ پہلے چونکی تھی پھر اتنی نچل ہوئی کہ بے ساختہ چہرے کا رخ پھیر لیا۔ میں کچھ حیران، کچھ الجھا الجھا سا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ گئی نہیں؟“

الجھے بال ہاتھ سے سمیٹ کر پیشانی سے ہٹاتے ہوئے میں نے اسے مخاطب کیا تھا۔

”مجھے کہاں جانا تھا؟“ وہ مجھے استعجاب آمیز نظروں سے تکتے لگی۔

”عالبابا پارلر۔“ میں نے رسائیت سے کہا تو وہ خفیف سی ہو گئی۔

”جی جانا ہے۔ ثانیہ بھا بھی تیار ہو رہی ہیں۔“

”کون ڈراپ کر رہا ہے آپ کو؟“

”فیضی بھائی جائیں گے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور دوپٹہ اتار کر چادر اوڑھنے لگی۔ میں سیلر پہن

کر باہر آ گیا۔ موسیٰ گنگناتے ہوئے اسی سمت آ رہا تھا۔

”چپا آگئے ہاسپٹل سے؟“

”جی آگئے ہیں۔ اب تو ولیمہ کا انتظام دیکھتے پھر رہے ہیں۔“

”اوکے میں ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ پاپو چھیں تو بتا دینا۔“

میں نے سنجیدگی سے کہا تھا بھی ممانے مجھے پکار لیا۔ میں کچھ حیرانی سے پلٹا۔

”آپ بھی گھر آ گئی ہیں تو حجاب کے پاس کون ہے؟“

”حجاب اب ٹھیک ہے بیٹے! اسی نے خود مجھے گھر بھیجا ہے۔ یہاں فنکشن ہے ظاہر ہے ہمیں گھر پر

موجود ہونا چاہیے۔ میں آپ سے بھی یہی کہہ رہی ہوں آپ اب مت جانا آپ کے پیلا بلار ہے تھے آپ کو۔“
 ”مگر مہاجب کے پاس کون ہے؟ اسے وہاں تنہا کیوں چھوڑ دیا آپ نے۔“
 میں بے طرح جھنجھلایا تھا۔

”تنہا نہیں چھوڑا۔ زبیدہ ہے وہاں ڈونٹ وری!“
 ”زبیدہ کیا کرے گی؟ اسی لیے میں نے کہا تھا آپ لوگ ولیمہ منسوخ کر دیں۔ کوئی اتنا ضروری تو نہیں تھا مگر.....“

”ضروری کیوں نہیں تھا عون! آپ جانتے ہو ولیمہ سنت نبوی ﷺ ہے۔“
 ممانے جیسے مجھے ڈانٹا تھا۔
 ”ممانہ تقریب بعد میں بھی ہو سکتی تھی۔“ میں نے پھر اپنی بات پر زور دیا۔
 ”عین وقت پر گھر بلائے مہمانوں کو کیسے منع کر دیتے؟ چند گھنٹوں کی بات ہے پھر ہم دوبارہ ہاسپٹل چلے جائیں گے۔ آپ ٹینشن کیوں لے رہے ہو ریلیکس!“

میرے قریب آ کر انہوں نے مسکرا کر میرا کاندھا تھپکا تو میں ٹھنڈا سانس بھر کے جزبز ہو کر رہ گیا تھا۔
 ”اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تمہیں روشنی کیسی لگی؟ پیاری ہے نا؟“
 انہوں نے یہ سوال بڑی رازداری اور کسی قدر تقاضا سے کیا تھا۔

”جی!!“ میرا جواب مختصر مگر بے توجہی لیے ہوئے تھا جسے انہوں نے صاف محسوس کیا۔
 ”یہ کیا بات ہوئی عون! اتنی پیاری لڑکی مل گئی ہے آپ کو آپ پھر بھی ویسے ہی کول ہو۔“
 ”ممانہ پلیر! اس ٹاپک کو فی الحال کلوز کر دیں۔ آپ جانتی ہیں میں آل ریڈی پریشان ہوں۔“
 میں نے کسی قدر عاجزی سے کہا تو انہوں نے جواباً محبت سے مجھے دیکھا تھا۔
 ”کیوں پریشان ہو؟ مت ہونا پریشان۔ بس اب تم خوش رہا کرو۔“
 ان کی سادگی پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

”یہ اتنا آسان تھوڑی ہے ممانہ! حجاب کی زندگی میری وجہ سے آپ سیٹ ہو چکی ہے۔ میں بہت گلٹی فیل کرتا ہوں۔“ میں جیسے روہانسا ہوئے لگا تھا۔

”خدا سب بہتر کر دے گا بیٹے! بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔“
 میرا کاندھا تھپک کر انہوں نے جس اعتماد اور یقین سے کہا تھا وہ مجھے اچھا لگا تھا۔



ولیمہ کی تقریب کو سچی بات ہے میں نے بے حد بے دلی سے پنپایا تھا۔ روشانی کی سب نے ہی تعریف کی تھی مگر میں نے نگاہ بھر کے اسے دھیان سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں حجاب کی وجہ سے متفکر تھا۔ تقریب کے اختتام تک جیسے میرا ضبط جواب دے گیا تھا۔ میں پارکنگ میں موجود موسیٰ کے پاس آیا تھا جو بائیک اسٹارٹ

کرتے ہوئے کہیں اڑان بھرنے کو تیار کھڑا تھا۔

”بائیک کی چابی مجھے دو موسیٰ!“

”کیوں؟ ارے آپ اپنی دلہن کے ساتھ گاڑی میں جائیں نا۔ بائیک ہم غریبوں کے لیے چھوڑ

دیں یا پھر بائیک پر دلہن کو لے جانا چاہتے ہیں؟“

تبھی عیسیٰ آن دھمکا تھا اور اس نے آتے ہی ماحول کو خوشگوار تاثر دینا چاہا تھا اپنے تئیں شاید وہ میری خفگی دور کرنے کا خواہاں تھا۔

”تم گاڑی سے چلے جانا۔“ موسیٰ سے چابی لے کر میں نے اسے گویا ہدایت کی تھی۔ اور بائیک

لیے ہوٹل کی پارکنگ سے نکل آیا۔ ہوٹل سے ہاسپٹل کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ پھر سردی بھی بہت تھی۔ میں ہاسپٹل پہنچا تو مجھے چھینکیں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ حجاب مجھے کچھ ڈسٹرب لگی مگر وہ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہو گئی تھی۔

”بھیا آپ؟ آپ کیوں آگئے؟“

”ارے اپنی گڑیا کی طبیعت پوچھنے۔ کیسی ہو؟ اور ہمارا کامیڈ کیا ہے؟“

میں نے پہلے اس کی پیشانی چومی تھی پھر بچے کو گود میں لے لیا۔ وہ آہستگی سے مسکرا دی۔

”آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا بھیا! رات بھی آپ یہیں رہے ہیں۔ روشنی کیا سوچے گی؟“

”تم نے اس کا نام سوچا کیا رکھنا ہے؟“

میں نے دانستہ موضوع بدل دیا۔ وہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

”اسامہ اچھا نام ہے نا بھیا!“

”شیور بہت پیارا۔ تمہاری پسند ہے تو بس آج سے اس کا یہی نام ہوا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر جھک کر بچے کو پھر چوما۔

”روشنی کیسی لگ رہی تھی بھیا!“

اس کے سوال نے مجھے خفیف سا کزدیا تھا۔ میں بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

”بتائیں نا بھیا!“ وہ جیسے محل اٹھی میں نے اسے پیار بھرے انداز میں گھورا

”یہ تم اس سے خود پوچھ لینا۔ مجھے کیا پتا؟“

میں کچھ اور بھی خفت زدہ ہو گیا تھا۔ وہ ہنس دی۔

”اس سے تو آپ کا پوچھوں گی نا کہ آپ کیسے لگ رہے تھے؟“

اس نے شریرا انداز میں کہا تو میں گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

”پھر تو اپنے بھائی کی بدخونیاں سننے کو تیار ہو جاؤ۔“

میں نے دانستہ اسے چھیڑا مقصد اس کا ذہن ریلیکس کرنا تھا۔ وہ جواباً ہنسنے لگی۔

”بدخونیاں ہی کیوں؟ تعریفیں کیوں نہیں۔“

ہم باتیں کر رہے تھے جب موسیٰ اور فیضانِ پیا کے ساتھ وہاں آ گئے تھے۔
 ”عون آپ اب گھر جاؤ بیٹے“
 ”مگر پیا!.....“

اگر مگر کچھ نہیں۔ بس آپ چلے جاؤ، ورنہ آپ کی ممانے ہم سب پر ڈنڈا اٹھالینا ہے، محترمہ کل ہی اچھے خاصے غصے میں تھیں کہ ان کی لاڈلی بہو کی حق تلفی ہو گئی۔“
 پیا کی بات پر میرا چہرہ اخفت اور خجالت سے سرخ ہو کر دہکنے لگا۔ میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ سیسی کی شرارتی شوخ نظریں جیسے میرے چہرے کو متبسم نظروں سے تک رہی تھیں۔ کچھ کہے بغیر میں وہاں سے نکل آیا تھا۔

☆☆

میں گھر پہنچا تو گھر میں معمول سے کچھ زیادہ چہل پہل تھی۔ گھر کی ساری لائٹس روشن تھیں اور ماما کچن سے باہر کھڑی زبیدہ کو کھانا سمیٹ کر فریزر کی ہدایت کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔
 ”آگئے بیٹے! حجاب کیسی ہے؟“
 ”جی! حجاب ٹھیک ہے آپ زبیدہ سے کہہ کر کافی مجھے روم میں بھجوادیتے گیے گا۔“
 ”اچھا بیٹے! میں بھیجتی ہوں۔“

میں کمرے میں آیا تو روشانی سامنے ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ ویسے ہی سچی سنوری ہوئی۔
 ”آپ نے چیخ کیوں نہیں کیا؟“

میں حیرانی سے استفسار کرنے لگا۔ جواباً وہ کچھ نہیں بولی تو میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔
 ”آپ کو ریلیس ہو کر آرام کرنا چاہیے تھا۔ اچھی خاصی رات ہو گئی ہے۔“
 ”بھابی نے مجھے آپ کا ویٹ کرنے کا کہا تھا۔“

وہ بے حد مدہم ہو کر بولی تو میرے اعصاب ایک دم کشیدہ ہو گئے تھے۔ کوٹ کے بٹن کھولتے میرے ہاتھ اسی زاویے پر ساکن ہو گئے تھے۔

”آپ کو چیخ کرنے یا آرام کرنے کے لیے میری اجازت کی کیا ضرورت تھی؟“
 میں نے کسی قدر سرد آواز میں پوچھا تو وہ کچھ سہم کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے زور سے سر جھٹکا تھا۔
 ”روشانے میں خواہ مخواہ پابندیاں عائد کرنے والا ٹیکل شوہر نہیں ہوں سوریکس! جائیں لباس بدل کر سو جائیں۔“

”جی بہتر!“

وہ آنسو بھری آنکھیں لیے اٹھ گئی۔ میں ہونٹ بھیچے کھڑا رہا تھا۔ لباس تبدیل کر کے وہ کمرے میں آئی تو میں بھی ڈریسنگ روم میں جا گھسا تھا۔ سلپنگ گاؤن میں ملبوس میں واپس آیا تو زبیدہ کمرے میں کافی ک

ل رکھ کر واپس جا رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا پھر لائٹ بجھا کر ٹیبل لیمپ آن کر دیا تھا کافی کے سپ لیتے ہوئے میں نے اس کے کروٹ کے بل لیٹے وجود میں خفیف سے جھٹکے محسوس کیے تو ایک دم ساکن مابو گیا۔ وہ شاید میرے لہجے کی سختی کو پا کر ہرٹ ہوئی تھی۔ میں نے کافی کا مگ بے دلی سے واپس رکھ دیا۔
”روشانے!“

بیڈ پر اس کے مقابل بیٹھے ہوئے میں نے بے حد گھمبیر آواز میں اسے پکارا تھا۔ وہ جیسے ساکت سی ہو گئی۔
”پلیز لیسن ٹومی!“

میں نے رسائیت سے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مگر اسی طرح کہ چہرے کا رخ میری جانب سے پھیرے رکھا تھا۔ شاید نہیں یقیناً وہ مجھ سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی میں نے گہرا سانس بھرا۔
”میں جانتا ہوں ہماری شادی آپ کے لیے غیر متوقع ثابت ہوئی ہے۔ شاید نصیب میں یہی لکھا تھا۔ ہم قسمت کے آگے بے بس ہوتے ہیں۔ میں آپ کو ذہنی طور پر اس بات کو قبول کرنے کو پورا ٹائم دینا چاہتا ہوں۔ جتنا اچانک اور غیر متوقع یہ آپ کے لیے تھی میرے لیے بھی اسی قدر ہے۔ میں منٹیلی آپ سیٹ ہوں۔ سیز آپ مجھے بھی کچھ وقت دیں۔ اکیچوئلی میں نہیں چاہتا کہ آپ کے حقوق کی ادائیگی میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہو۔ میں پورے خلوص اور نیک نیتی سے آپ کو اپنا نا چاہوں گا۔ آپ جانتی ہیں نا میں پہلے بھی شادی کر چکا ہوں۔ آپ مجھ سے بہت چھوٹی ہیں میں ہرگز بھی ایسا کوئی تصور نہیں رکھتا تھا۔ یہ سب جتنا اچانک ہوا ہے اسی درمیان آپ سیٹ ہوں۔ آپ مجھے وقت دیں گی؟“

بچے تلے الفاظ میں میں نے اس پر اپنا نقطہ نظر واضح کیا تھا۔ اس نے رخ پھیر کر مجھے دیکھا۔ پھر بگی پلکوں سے مسکرا دی۔

”میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

”تھینکس اے لائٹ!“

میں نے ممنونیت سے کہا تھا۔ اور لیٹنے کے بعد کروٹ بدل لی۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔



وفا کی آرزو کرنا

سفر کی جستجو کرنا

جو تم مایوس ہو جاؤ

تو مجھ سے گفتگو کرنا

یہ اکثر ہو بھی جاتا ہے

کہ کوئی کھو بھی جاتا ہے

مقدر کو ستاؤ گے

تو پھر یہ سو بھی جاتا ہے

اگر تم حوصلہ رکھو

وفا کا سلسلہ رکھو

جسے تمہا پنا کہتے ہو

تو اس سے رابطہ رکھو

میں یہ دعوے سے کہتا ہوں

کبھی نا کام نہ ہو گے

محبت کو سمجھ جاؤ

کبھی بدنام نہ ہو گے

میں نے حجاب کو بلایا تھا اور اس سے کھل کر بات کی۔ میں نے اسے بتایا تھا۔ میں عون پر خلع کا کيس دائر کرنا چاہ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا وہ اختلاف کرے گی تو میں اسے سمجھاؤں گا۔ یہ طے تھا کہ مجھے حجاب کو اب اس کے پاس واپس نہیں جانے دینا تھا۔ مگر میری توقع کے برخلاف حجاب نے منع نہیں کیا تھا۔

”آپ کا ہر فیصلہ جو بھی آپ میرے لیے کریں گے بھیا مجھے قبول ہوگا۔ لیکن پلیز بھائی اس معاملے کے ختم ہو جانے کے بعد آپ مجھ سے کبھی دوسری شادی کے ٹاپک پر بات بھی نہیں کریں گے۔“

میں نے محسوس کیا تھا اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔ میرے دل پر چوٹ پڑی۔

”یہ بعد کی بات ہے فی الحال موضوع یہ نہیں ہے۔“

میں کترایا تو وہ روہانسی ہونے لگی تھی

”نہیں بھیا پلیز! آپ پر اس کریں مجھ سے، آپ مجھے کبھی فورس نہیں کریں گے۔“

”ہنی گڑیا! ہم پھر بات کریں گے نا!“

میں ہر گز بھی اس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا جیسی اسے ٹوک کر اٹھ گیا۔ پھر اسی روز میں نے فیضان سے اس معاملے کو ڈسکس کیا تھا اور اسے کہا تھا وہ کل لازمی ابوداؤد کو خلع کا نوٹس بھجوادے۔ جب ہم اس موضوع پر بات کر رہے تھے میں نے بہت عجلت میں عیسیٰ کو اس سمت آتے دیکھا تھا۔

”خیریت؟ کیا بات ہے؟“

میں نے اس کے متفکر چہرے کو بغور دیکھ کر سوال کیا تو وہ کچھ متذبذب نظر آنے لگا۔

”بھیا آپ حجاب کو طلاق دلوانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں!“ میرا جواب دو ٹوک اور قطعی تھا۔ وہ کچھ مضطرب نظر آنے لگا۔

”مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔“

”تم سے مشورہ کس نے مانگا ہے؟“ مجھے شدید غصہ آیا تھا اسی حساب سے میرا لہجہ بھی درشت ہو گیا۔

”مائنڈاٹ بھیا! یہ آپ کی زندگی کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ حجاب کی زندگی ہے۔“

”میں حجاب سے پوچھ چکا ہوں۔ وہ بھی یہی چاہتی ہے۔“

میں نے تلخ لہجے میں جیسے اسے بتایا تھا۔ عیسیٰ زہر خند سے ہنسا۔

”اچھا! حالانکہ جہاں تک میں جان پایا ہوں وہ ایسا نہیں چاہتی۔ بھیا میں نے اس کی آنکھوں میں غم

کو گھات لگائے بیٹھا دیکھا ہے۔ ایک افسردگی دیکھی ہے۔ آپ پلیز اس پر تو غور کریں۔“

غصے سے بات کرتے وہ ایک دم سے دھیمّا پڑ گیا اس کا گلا جیسے بھرا سا گیا تھا۔ میرے اندر کا

اشتعال جیسے دھیمّا پڑنے لگا۔

”تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو عیسیٰ! بہتر ہے کہ تم خاموش رہو۔“

مجھے ایسا لگتا ہے بھیا! آپ کچھ نہیں جانتے۔ آپ جلد بازی کا بھی مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کچھ وقت تو

دیں انہیں۔ حجاب اب تنہا نہیں ہے۔ بیٹا ہے اس کا۔ بچے کا بھی تو سوچیں۔ اسٹیپ فادر اسے ایکسپٹ کرے

گا؟ بھیا جو معاملہ صلح صفائی سے حل ہو سکتا ہے اسے اس طرح کیوں ختم کر رہے ہیں؟“

وہ بے حد عاجز ہو کر بولا تو میں نے گہرا سانس بھر کے سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں نے ایسا نہیں کیا ہوگا؟ میں نے ایسا ہی تو کیا تھا۔ مگر وہ کتے کی وہ دم ہے

جو سو سال بھی نلکی میں رہے تو سیدھی نہیں ہو سکتی۔ تم بس خاموش رہو اور مجھے جو کر رہا ہوں کرنے دو۔“ میں نے

زری سے کہا تھا اور فیضان کو نوٹس بھجوانے کی تاکید کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔

☆☆

میں آفس سے لوٹا تو لاؤنچ سے کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے چلتے ہوئے

دروازے سے جھانکا۔ اندر عیسیٰ صوفے پر بیٹھی روشانی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ روشانی

بھی ہنس رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی مجھے نہیں دیکھا۔ میں گہرا سانس بھرتا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے روم

میں آگیا۔ ہاتھ لے کر باہر نکلا تو روشنی اندر آچکی تھی۔

”آپ کے لیے چائے بناؤں؟“

وہ نیراکوٹ ہینگر میں لٹکا رہی تھی۔ سلام کرنے کے بعد بولی۔

”جی بنا دیں مگر ذرا جلدی، مجھے کام سے پھر باہر جانا ہے۔“

میں ڈرینگ ٹیبل کے آئینے کے آگے کھڑا ہو کر بال بنانے میں مصروف ہو کر بولا۔ تو وہ سر ہلاتی

باہر چلی گئی تھی۔ میں نے بال بنائے پھر رسٹ وائچ اٹھا کر کلائی پر باندھتا کمرے سے باہر آگیا۔ عیسیٰ اور موسیٰ

دونوں اسامہ کے ساتھ ہال کمرے میں کھینے میں مصروف تھے۔

”بیٹے آپ روشنی کو شام کو کہیں گھمانے ہی لے جایا کرو۔“

مما اسی وقت وہاں آئی تھیں آتے ہی اپنا من پسند موضوع چھیڑا۔

”جی تو اور کیا؟ اور کچھ نہیں آپ تو واپسی پر بیگم صاحبہ کے لیے گجرے بھی نہیں لاتے۔ نئی ٹویلی اور اتنی چار منگ سی دہن ہے آپ کی پھر بھی ایسی بے نیازی۔“

عیسیٰ نے اسی پل وہاں چائے سمیت آتی روشنائی کو دیکھ کر قدرے شوخی سے کہا تھا۔ وہ جھینپ کر ہنسی دی۔

”حجاب کہاں ہے؟ اسے کہیں وہ بھی سب کے ساتھ بیٹھا کرے نا۔ اکیلے رہ کر تو پریشان ہی ہوتی ہوگی۔“ روشنائی سے چائے لیتے ہوئے میں نے دانستہ موضوع بدلا۔ ماما ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئیں۔

”جاؤ روشنی حجاب کو یہیں بلا لاؤ۔“

عیسیٰ کے کہنے پر روشنائی اُلٹے قدموں پلٹ گئی تھی۔ میں نے چائے ختم کرنے کے خالی مگ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب پھر کہاں چل دیئے؟“

ماما بے چین ہوئی تھیں۔

”ضروری کام ہے ماما!“

”میں نے کہا تھا روشنی کو بھی لے جایا کرو ساتھ۔“

”کام کے لیے؟“ میں ششدر ہوا تو عیسیٰ اور موسیٰ کھی کھی کرنے لگے۔ میں بھی نجل ہو گیا تھا۔ ماما نے البتہ منہ بنا لیا۔

”او کے ماما لے جایا کروں گا۔ اب تو ریلی کام سے جا رہا ہوں۔“

میں نے محض ان کا دل رکھنے کو کہا تھا اور پلٹ کر باہر نکل آیا۔ پورٹیکو میں آکر میں گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ رہا تھا جب میرے کرتے کی جیب میں پڑا ہوا موبائیل وائبر پیٹ کرنے لگا تھا۔ سیل فون ہاتھ میں لے کر نمبر دیکھتے ہوئے میری پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھری تھیں۔ انگلی کی جنبش سے میں نے ابوداؤد کی کال کو ڈس کنکٹ کیا تھا اور سیل فون آف موڈ کے ساتھ ڈیش بورڈ پر اچھال دیا۔ کچھ توقف کے بعد سیل ایک بار پھر وائبر پیٹ کرنے لگا۔ اس مرتبہ انجان نمبر تھا۔ میں نے گہرا سانس کھینچا اور گاڑی گیٹ سے نکالتے ہوئے کال پک کی تھی۔

”السلام علیکم!“

”السلام! کہیے کیسے مزاج ہیں جناب!“ ابوداؤد کی چہکتی آواز سن کر میرے ہونٹ باہم بھینچ گئے تھے۔

”کیوں زحمت کی ہے؟“

”ہماری ایک نہیں دو دو امانتیں ہیں تمہارے پاس! اب بھی زحمت نہ کریں گے تو کب کریں گے؟“

”مقصد کی بات کرو۔“ میں پھنکارا۔ جوا باوہ بڑی ترنگ میں آکر بولا تھا۔

”خفا کیوں ہوتے ہو جان من! مقصد کی بات اس سے بڑھ کے کیا ہو سکتی ہے؟“

”بکواس بند کرو۔“ میں دھاڑا۔

”عون!!“ اس نے اتنی رسانیت اتنی آہستگی سے کہا تھا کہ میں بہ مشکل سن پایا۔

”میں بگاڑ نہیں چاہتا۔ میں حجاب کو طلاق نہیں دینا چاہتا۔ تم سمجھ رہے ہو کورٹ میں جا کر تم جیت

نہیں سکو گے۔ یاد رکھنا میں تمہیں جیتنے نہیں دوں گا۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”نہیں۔ آگاہ کر رہا ہوں۔“

”کر دیا؟ اب دفع ہو جاؤ۔“ میں نے سرد آواز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ مگر میں ایک دم آپ سیٹ

ہو گیا تھا۔ یہ بات ابھی ہمارے گھر کے اندر تھی۔ کچھ دیر قبل میں نے فیضان سے ڈسکس کی تھی ابوداؤد تک کیسے پہنچی؟ میں جس قدر سوچ رہا تھا اُلجھن بڑھ رہی تھی۔ تبھی ابوداؤد کی دوبارہ کال آنے لگی۔ میں نے سلگتی نظروں

سے اسکرین پر ہلنک کرتے اس کے نام کو دیکھا تھا۔

”پوچھو گے نہیں اب مجھے کیا تکلیف ہے؟“

میرے کال ریسو کر لینے پر وہ ہنس کر بولا تھا۔

”تم خود بتا دو۔“ میں نے جواباً طنز سے کہا تو وہ زور سے ہنس دیا۔

”مان جاؤ عون مرتضیٰ! میں تمہارے گھر آ جاتا ہوں۔ خوش اسلوبی سے معاملہ سلجھالیتے ہیں۔“

”میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا اگر تم نے ایسا سوچا بھی۔“

میرا ضبط چھلکنے لگا تو میں چیخا۔

”کام ڈاؤن یار! اتنا غصہ نہیں کرتے۔ پر اس میں حجاب پر کوی بڑی نظر نہیں ڈالوں گا۔ چار

بھائیوں کی موجودگی ایسا کر کے میں واقعی ٹانگیں تڑواؤں گا۔“ وہ بکواس شروع کر چکا تھا۔ میں نے تپ کر کال

ڈسکنکٹ کر دی۔ میرا ذہن منتشر ہو چکا تھا۔ رات گئے میں واپس لوٹا تو ہنوز پریشان تھا۔ ہال کمرے کی

لائٹس آن تھیں اور عیسیٰ وہیں کارپٹ پر لیٹا ہوا تھا مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آئیے بھیا!“

”نہیں میں تھکا ہوا ہوں۔ آرام کروں گا۔“

”چائے پی لیں۔ روشی بنانے گئی ہوئی ہے۔“

اس کی اگلی بات نے میرے اٹھتے ہوئے قدم روک دیے۔ میں نے کچھ پل اپنے اندر ایک سناٹا

اُترتا محسوس کیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے گھر کے تقریباً سبھی مکین اپنے کمروں میں تھے۔ پھر روشی کیوں عیسیٰ

کے ساتھ تھی؟ ایک تلخ اور ترش سوچ میرے ذہن میں آئی تھی جسے اگلے لمحے میں نے جھٹک دیا تھا۔

”نو تھینکس! اس وقت چائے پی کر میں سو نہیں پاؤں گا یار۔“

میں رسان سے کہتا آگے بڑھا تو اسی پل روشا نے ٹرے میں کافی کے مگ لیے اندر آئی تھی۔ مجھے

دیکھ کر خوشدلی سے سلام کیا۔ میں جواب دیتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ میرے خیال کے مطابق میرے

پیچھے فوری نہیں آئی۔ شاید کافی پینے لگی تھی۔ چیخ کرنے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا تھا جب وہ اندر آئی۔
 ”کھانا نہیں کھائیں گے؟“

”نہیں دوست کے ساتھ کھالیا تھا۔“

”اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

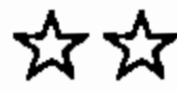
”تو تھینکس! بس یہ لائٹ بند کر دیں۔“

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کمرے سے باہر جا رہی تھی میں نے حیرانی سے اسے پکارا تھا۔

”روشانے کہاں جا رہی ہیں؟“

”ابھی کچھ دیر میں آتی ہوں۔“

اس نے مجھے پتا نہیں اطلاع دی تھی یا اجازت مانگی تھی۔ میں صحیح جج نہیں کر سکا۔ اس کے جانے کے بعد میں کتنی دیر تک بے حس و حرکت لیٹا اپنے اندر گونجتے سنائے کو سنتا رہا تھا۔ پھر کروٹ بدل لی تھی۔



”بھیا پلیز آپ اس طرح کر لیں۔ آئی تھینک ان کی بات سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“
 عیسیٰ پچھلے پچیس منٹ سے مجھے قائل کرنے کی کوشش میں مسلسل مصروف تھا۔ اس کا موقف تھا کہ ابوداؤد کو گھر آنے دیا جائے اور اس کی بات سنی جائے۔

”جب مجھے اس کی ان فضول باتوں کو ماننا نہیں ہے تو پھر فائدہ؟“

میں کسی قدر جھنجھلا رہا تھا۔

”ضروری تو نہیں ہے عون کہ آپ کو وہ قائل نہ کر سکیں۔“

ثانیہ بھابھی نے بھی دبے ہوئے انداز میں کہا تو میں نے ہونٹ بھیج لیے تھے۔

”ہم اصلاح کی ایک کوشش کرنا چاہ رہے ہیں کیا حرج ہے اگر اس کا نتیجہ دیکھ لیا جائے۔“

میرے سرخ چہرے کو دیکھتے ہوئے عیسیٰ نے لجاجت سے کہا تھا۔

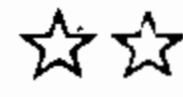
”اوکے۔ از یوش!“

میں نے نروٹھے پن سے کہا تھا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ تبھی ابوداؤد کو وہاں آنے کی پر مشن اور بہانہ مل گیا۔ مگر اس وقت میرے اطمینان کا ٹھکانا نہیں رہا۔ جب حجاب نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ جہاں ابوداؤد کا چہرا اترتا تھا۔ عیسیٰ باقاعدہ جھنجھلایا ہوا نظر آنے لگا۔

”بس ہو گئی تمہاری تسلی؟ اب تم یہاں سے تشریف لے جاؤ۔“

میں نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا۔ وہ جواب میں کینہ تو ز نظروں سے مجھے گھورتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں کاندھے جھٹک کر باہر آیا تو کارڈور میں روشنائی اور عیسیٰ کو ایک دوسرے کے نزدیک کھڑے راز

دارانہ انداز میں گفتگو کرتے دیکھ کر خوا مخواہ کھنکھار رہا تھا۔ دونوں چونکے اور کچھ خائف سے نظر آنے لگے۔ میں نظر انداز کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ میرے دل میں ایک کانٹا سا چھارہ گیا تھا۔



کس بات کا بدلہ لیا ہے تم نے

ہمیں اپنا بنا کر

اس طرح تنہا چھوڑ دیا کہ

ہم اپنے بھی نہ بن سکے

میرے اندر جو اضطراب در آیا تھا وہ دھیرے دھیرے گہرا اور اذیت انگیز ہوتا جا رہا تھا۔ یہ میرا محض وہم نہیں تھا۔ عیسیٰ اور روشانے کے درمیان کچھ تھا ایسا، جو مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس رات جب وہ بہت دیر تک نہیں لوٹی تھی اور مجھے نیند بھی نہیں آئی تھی تو میں کچھ پریشان ہو کر اس کی تلاش میں بیڈروم سے نکل آیا۔ پورا گھر مدہم اندھیرے اور گہرے سناٹے کی زد میں تھا۔ رات کے وقت کا مخصوص سکون ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ میں حیران تھا روشانے آخر اس وقت کہاں رہ گئی وہ بھی اس صورت جبکہ گھر کے سبھی مکین سونے کی غرض سے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ مجھے کچن کا خیال آیا تھا۔ اب اکثر کچن کی تمام ذمہ داریاں اسی نے اپنے سر لے رکھی تھیں۔ عین ممکن تھا وہ ابھی تک وہیں مصروف ہو۔ کچن میں جانے کے ارادے سے میں سیڑھیاں اتر کر سیکنڈ فلور پر آیا تھا۔ جب لاؤنج کی لائٹ جلتی دیکھ کر دروازے سے جھانکا۔ ہاتھ میں کافی کاگ لیے روشانے مجھے وہیں بیٹھی نظر آئی تھی مگر وہ اکیلی نہیں تھی۔ عیسیٰ اس کے ساتھ تھا۔ اور دونوں بہت مدہم آواز میں کچھ بات کر رہے تھے۔ مجھ پر پہلے نگاہ روشانے کی پڑی تھی۔ میں نے واضح طور پر اس کا چہرہ پھیکا پڑتا محسوس کیا۔

”آپ!“ اس کا لہجہ بھی ہلکا سا لرز گیا تھا۔ عیسیٰ نے چونک کر پلٹتے ہوئے مجھے دیکھا روشانے کی طرح وہ بھی جیسے ایک دم خائف نظر آنے لگا۔

”ہم ایک مووی دیکھ رہے تھے۔ ٹائم کا پتا ہی نہ چلا۔“

عیسیٰ نے ایک فضول وضاحت دی تھی۔ اس کا اٹکتا، رکتا لہجہ اس کے جھوٹ اور اندرونی خلفشار کی صاف چغلی کھارہا تھا۔ میں نے ہونٹ بھیچے رکھے۔ ٹی وی آف تھا۔ ان کے جھوٹ کا از خود پول کھل رہا تھا۔ ایک لفظ کہے بغیر میں نے قدم واپسی کو موڑ دیے۔ میرے دل و دماغ میں جوار بھائے اٹھ رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا آٹھ سال پہلے کا وقت مجھ پر پلٹ کر پھر آ گیا ہو۔ میرے سامنے سبرینہ کھڑی ہو۔ اپنی تمام تر ڈھٹائی، بے شرمی اور بد لحاظی کے ساتھ۔ ہاں وہ روشانے نہیں تھی وہ سبرینہ تھی۔ دکھ میرے اندر رونے لگا۔ میری قسمت میں شاید با وفا اور با کردار عورت نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ بھی تو المیہ تھا کہ روشانے عیسیٰ سے منسوب ہوئی تھی۔ مگر عیسیٰ نے شادی سے انکار کر دیا۔ جب وہ مجبوری کا بندھن مجھ سے باندھ چکی تو عیسیٰ کو اپنی غلطی کا احساس جاگ اٹھا۔ ہاں یہ بہت واضح اور سامنے کی بات تھی۔ روشانے عیسیٰ کے جوڑ کی ہی تھی۔ مجھے تب مہاپاپا کی وجہ سے بھی یہ قدم

نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ بیڈروم میں آکر میں کانپتے ہاتھوں اور بھیختے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ دروازے سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔ وہ مجھ سے کچھ دیر بعد کمرے میں آگئی تھی۔ اور میری خاموشی اور خطرناک سنجیدگی یقیناً اسے خائف کر رہی تھی کچھ دیر وہ تذبذب میں رہی تھی۔ پھر بیڈ پر میرے پہلو میں آن بیٹھی۔

”عون!!“

خاصی تاخیر سے اس نے مجھے مخاطب کیا تو اس کی آواز میں انجانے خدشات کی لرزش تھی۔

”مجھے صرف یہ بتاؤ روشا نے! میرا انتظار بہت زیادہ طویل ہو گیا تھا؟ تم اگر ویٹ نہیں کر سکتی تھیں تو مجھے بتائیں۔ میں نے ساری عمر تم سے دور تو نہیں رہنا تھا۔“

میرے اندر جو طوفان اٹھ رہے تھے انہیں دبا کر میں نے رسائیت سے بات شروع کی مگر میرا لہجہ متوازن نہیں تھا۔ غم و غصہ اور شدید دکھ مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا وقت اور حالات سے مجھے اپنے ہر دکھ کو سہنے اور برداشت کرنے کا حوصلہ مل گیا ہے مگر نہیں میں آج بھی اتنا ہی کمزور اور دکھی تھا جتنا آج سے آٹھ سال پہلے ہوا تھا۔

”آپ بہت غلط سمجھ رہے ہیں عون! فارگا ڈسک! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

وہ روہانسی ہو گئی تھی اور اپنی صفائی پیش کرنے لگی تھی۔ مجھے اس پل اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ میں نے دہک اٹھنے والی آنکھوں سے قہر بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

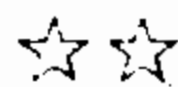
”یہ غلط سمجھنے پر مجھے کس نے مجبور کیا؟“ میں پھنکارا تھا۔ اس کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

”میری بات سنیں عون! میری بات سنیں۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا سمجھیں تم؟ غلطی میری تھی۔ میں نے تم سے شادی کر لی۔ مجھے بس یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میرا اور عیسیٰ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ میں کسی لحاظ سے بھی اس کی طرح کا نہیں تھا۔ پھر تم مجھے ایکسپٹ بھی کیسے کرتیں؟ آج ایک اور عورت کے ساتھ ساتھ مجھے میرے بھائی نے بھی لوٹا ہے اور ایسا صرف تمہاری وجہ سے ہوا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ ورنہ تم وہی تھیں نا جس سے وہ از خود شادی کرنے سے انکار کر چکا تھا۔“

میں ضبط کھو کر چیخ اٹھا۔ وہ خائف تھی تھر تھر کانپتی، آنسو بہاتی سرکونی میں زور زور سے ہلاتی رہی۔ میرے دل میں اس کے لیے موجود نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔

”تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میں مزید ایک لمحہ بھی تمہیں برداشت نہیں کر سکتا۔ صبح اس گھر سے بھی چلی جانا۔“ میرا ضبط واقعی جواب دے رہا تھا۔ وہ ایک دم سروسوں کے پھول کی طرح زرد پڑ گئی۔ وہ کمرے سے باہر نہیں گئی۔ اس کی اس ڈھٹائی نے مجھے آگ لگا دی۔ اور میں وہ ضبط کھو گیا جس کا میں اب تک بہ مشکل مظاہرہ کر پارہا تھا۔ میں اٹھا اور اسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے باہر دھکا دینے کے بعد ایک دھماکے سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ یہ طے تھا کہ اب میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔



اگلے دن میں آفس سے آیا تو وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ پھر ماما سے پتا چلا کہ وہ اپنی ماں کے گھر چلی گئی

ہے۔ گو کہ یہ بات انہوں نے جس انداز میں بتائی تھی اس سے کسی طرح بھی میں یہ اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ ان پر بات کھلی ہے۔ مگر میرا اپنا دل عجیب سی خاموشی کی زد پر آ گیا تھا۔ روشنانے کا چپ چاپ بنا کسی وضاحت یا صفائی کے چلے جانا بھی اس کے جرم کو ثابت کرتا تھا۔ میری آنکھوں کی جلن یکلخت بڑھ گئی۔ بعد میں پیش آنے والے حالات مجھے خائف کرنے لگے۔ ایک بار پھر طلاق اور پھر یہیں پر اکتفا نہیں ہونا تھا لازماً عیسیٰ اور وہ ایک بھی ہونے کی بات کرتے۔ مجھے لگا جیسے فضاؤں میں آکسیجن کی ایک دم کمی ہو گئی ہو۔ مجھے سانس لینے میں شدید دشواری محسوس ہونے لگی تو گھبراہٹ میں ویسے ہی اٹھ کر باہر آ گیا۔ حالانکہ آج کے دن مجموعی طور پر مجھے بہت بڑی کامیابی ملی تھی۔ حجاب کے کیس میں ہماری جیت کے امکان روشن تھے۔ ابو داؤد کی شکل دیکھ کر بھی مجھے تسکین نہیں ملی۔ جس پر ہار کے خوف نے سیاہی پھیر دی تھی۔ سب کچھ بس پشت چلا گیا تھا۔ یہ حادثہ اس بڑی طرح اثر انداز ہوا تھا مجھ پر کہ میں جیسے پوری ہستی سمیت ہل کر رہ گیا تھا۔ میں غائب دماغی کی حالت میں ڈرائیو کر رہا تھا یقیناً غلطی میری اپنی تھی کہ میں سامنے سے آنے والی گاڑی کو نہ دیکھ سکا۔ حادثہ یقینی تھا جو ہو کر رہا۔ اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں رہی تھی۔ حواسوں میں لوٹنے کے بعد میں نے اتنے پریشان چہرؤں میں ان دو چہروں کو بھی دیکھا تھا جو میرے لیے سب سے زیادہ اذیت کا باعث تھے۔ عیسیٰ اور روشنانے۔ میرے کرب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

”وہ اب کیوں آئی تھی؟ وہ پھر سے کیوں آئی تھی؟“

کتنا ہراس تھا اس کی آنکھوں میں، کتنا خوفزدہ اور متوحش تھا اس کا چہرہ، کیا وہ میرے زندہ بچ جانے پر متاسف تھی؟ ہاں یقیناً! آہ کاش میں مر گیا ہوتا۔ میں زندہ کیوں بچ گیا تھا۔ اس روز میں اپنے دکھ پر رونے کو بھی بے بس ہو گیا تھا۔ لا چاری اور کرب جب حد سے بڑھ جائے تو آنسو چھلک ہی جاتے ہیں۔ میں بھی اس روز بہت دیر تک آنسو بہاتا رہا تھا۔ سب اداس تھے۔ میرے دکھوں پر پریشان، مگر کوئی بھی میری روح کے اضطراب سے آگاہ نہیں تھا۔ جو میری رگ جاں پر خنجر بن کر وار کر رہا تھا۔ چند دن ہاسپٹل میں رہنے کے بعد جب میں ڈسچارج ہو کے گھر آیا تو عیسیٰ ہی مجھے سہارا دیئے ہوئے تھا۔ ہاسپٹل میں بھی میں نے اسے اپنے لیے بے حد پریشان پایا تھا۔ وہ راتوں کو بھی میرے لیے جاگتا تھا میری ایک کراہ پر تڑپ اٹھنے والا عیسیٰ مجھے اتنے بڑے دکھ سے کیوں بھلا دو چار کر گیا تھا؟ اور سمجھتا تھا کہ مجھے خبر نہیں ہے۔ پتا نہیں روشنانے نے بھی اسے نئی صورتحال سے آگاہ کیا تھا یا نہیں؟ مجھے نہیں پتا تھا ان کے بیچ کیا طے پایا تھا۔ مجھے جاننے کا انٹرسٹ بھی نہیں تھا۔ ہاں البتہ روشنانے کی موجودگی مجھے الجھن اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ جب بھی میرے آس پاس ہوتی میں آنکھیں موند لیتا۔ یہ سچ تھا میں اب اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

”ہاسپٹل میں ڈسچارج ہو جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ابھی آپ کو مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہے۔ بھیا پلزز بے احتیاطی ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔“

عیسیٰ نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ سادہ، بے ریا چہرہ ایک دم روشن اور منور۔ وہ میرا بھائی تھا ہمیشہ سے مجھ سے امپریس۔ لاشعوری طور پر ہر وہ عمل اپنانے کی کوشش میں کوشاں، جو مجھ

میں اس نے دیکھا تھا۔ کیا روشا نے.....؟ مگر نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، مگر ایسا ہے۔ ہاں سچ کہا ہے کسی نے زر، رن اور زمین ہی اصل فساد اور شر کا باعث ہے۔ مگر وہ اپنے عمل پر ذرا بھی شرمندہ نظر نہیں آتا۔ کیوں؟ کیا وہ اتنا بے حس ہو گیا؟ یا پھر وہ مجھے ابھی تک بے خبر انجان سمجھ رہا ہے۔ جو بھی تھا۔ جو کچھ بھی تھا۔ مجھے لگ رہا تھا۔ میرے دماغ کی شریانیں انہی سوچوں کے باعث پھٹ جائیں گی۔

”میں نے یحییٰ بنادی ہے روشی بیٹے! عون اٹھے تو اسے پلا دینا۔ دوا کے متعلق بھی عیسیٰ نے تمہیں بتا دیا ہے نا۔ ٹائم پر دیتی رہنا بیٹا! اور سنو خود کو سنبھالو ان چند دنوں میں تم آدھی بھی نہیں رہ گئی ہو۔ اپنا خیال رکھو بیٹے! خدا نے کرم کیا ہے بہت! عون اب ٹھیک ہے۔ ہاں؟“

میں آنکھیں بند کیے کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا جب میں نے ماما کی آواز سنی تھی وہ یقیناً روشا نے سے ہی مخاطب تھیں میرے اندر زہر دوڑنے لگا۔ ماما بھلا اصلیت کیا جانتی تھیں؟ وہ یونہی کچھ دیر اسے تسلی دیتی رہی تھیں۔ پھر جب وہ باہر جانے لگیں تو میں روشا نے کے ساتھ کمرے میں تنہا رہ جانے کے خیال سے وحشت زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ جی بے اختیار ماما کو پکار لیا تھا۔

”جی بیٹے! آپ جاگ رہے ہو جان!“

مما تیزی سے بڑھ کر مجھ پر جھکی تھیں۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں چوم کر اپنی نم آنکھوں سے لگایا تھا۔ پھر آہستگی سے بولا تھا

”مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں مت جائیں ماما! پلیز میرے پاس رہیں۔“

یقیناً میرے لہجے میں ایسا اضطراب اور وحشت تھی کہ ماما پریشان ہو گئی تھیں۔

”میں آپ کے پاس ہوں بیٹے! بس نماز پڑھنے جا رہی تھی۔“

انہوں نے جھک کر میری پیشانی چومی پھر کچھ پریشان ہو گئیں۔

”عون بیٹے آپ کا ٹمپریچر پھر بڑھ رہا ہے۔ روشی عیسیٰ کو بلاؤ۔“

”نہیں ماما! میں ٹھیک ہوں۔ آپ بس میرے پاس رہیں۔“

میں نے بڑی سرعت سے موسیٰ کو بلانے سے ٹوکا تھا پھر ماما کا ہاتھ بھی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مگر شاید ماما نے روشا نے کو پھر بھی بھیج دیا تھا جی اگلے چند لمحوں میں عیسیٰ کسی قدر پریشانی کے عالم میں میرے سر ہانے آکھڑا ہوا تھا۔ اس نے میرا صرف ٹمپریچر ہی نوٹ نہیں کیا تھا بی بی بھی چیک کرنے میں مشغول ہو گیا۔ میں ہونٹ بھینچے اس سے دانستہ نگاہیں ہٹائے گہرے سانس بھرتا رہا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے نا کبھی کبھار اپنے دکھ اپنے اندر رکھنا۔ اپنے مجرموں کو اپنے سامنے پانا اور انہیں کچھ نہ کہہ سکنا۔ مجبوریاں، رشتوں کی نزاکتیں یہ سب کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ میں یہ سوچ کر ہلکان ہوا جاتا تھا۔ ماما، پاپا اس بات کے کھل جانے پر کیا صدمہ ٹوٹے گا۔ وہ شاید اس ذلت اور رسوائی کے ساتھ پہاڑ جیسے غم کو سہہ نہ پائیں۔ پاپا جو حجاب کے ساتھ پیش آنے والی ٹریجڈی کے بعد ہی ہارٹ پیشنٹ بن کر رہ گئے تھے۔ اور ماما جن کے آنسو ابھی حجاب کے دکھ پر بہتے نہیں تھمتے تھے۔ پھر روشا نے تو ان کی بہت چہیتی تھی۔

من پسند اور بے حد لاڈلی۔ وہ یہ دکھ سہا نہیں سکتیں تھیں۔ میں شدید اضطراب کا شکار تھا۔ مجھے قطعی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں منجد ہار میں پھنس گیا تھا۔ کسی فیصلے کا کوئی اختیار جیسے میرے پاس نہیں رہا تھا۔

”جب آپ میں ہمت نہیں ہے دکھ سہنے کی تو کیوں اتنے بڑے بڑے فیصلے کرتے ہیں؟ کیوں نہیں معاملات کو خدا کے سپرد کر دیتے؟“

عیسیٰ کی ہلکی سی جھنجھلاہٹ لیے بات نے مجھے چونکا یا ہی نہیں سرد بھی کر دیا تھا۔ کیا وہ اتنا بے باک ہو گیا تھا کہ اب براہ راست مجھ سے اس موضوع پر کھل کر بات کرتا؟ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

”کیا مطلب ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اسے غصیلے انداز میں دیکھا۔ جواب میں اس نے سرد آہ بھری تھی۔

”بھیا آپ ہرگز انجان نہیں ہیں۔ جانتے ہیں میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔“

اس کے انداز میں کسی قدر خفگی تھی۔ مجھے اپنا دل تھمتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے خود حیرانی ہوئی۔ اتنا بہت کچھ ہو جانے کے باوجود شاید میں لاشعوری طور پر سد ہار کا خواہش مند تھا۔ مجھے صحیح طور اپنی کیفیت، اپنے خوف کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ میں ایک بار پھر طلاق دے کر دنیا میں ہو جانے والی بدنامی سے خائف تھا یا پھر ممما، پپا کو اس کر بناک دکھ سے بچانے کا متمنی۔ مجھے سمجھ نہیں آئی میں کیا چاہتا ہوں۔ یقیناً میں اس رشتے کو بچانا اور نبھانا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود کہ فریق ثانی کی یہ مرضی نہیں تھی۔ لیکن اس طرح تو نہیں ہوتا ناں۔ وہ بھی اس صورت جب کہ خود میرا اپنا بھائی بھی وہی چاہ رہا تھا جس سے میں خائف تھا۔ میں نے گہرا سانس کھینچا۔

”تم صحیح کہہ رہے ہو عیسیٰ! مجھے یہ کرنا چاہیے۔“

میں جب بولا تو ہزار ہا ضبط کے باوجود میری آواز بھیگ گئی تھی۔ جبکہ میرے برعکس اس میرے ایک جملے نے جیسے اسے شادی مرگ میں مبتلا کر دیا۔ وہ پہلے جتنا حیران ہوا تھا پھر اسی قدر خوش نظر آنے لگا۔

”ریلی بھیا! اوہ مائی گاڈ! میں کیسے خود کو یہ یقین دلاؤں کہ آپ کو اعتراض نہیں اور آپ مان گئے ہیں۔ اب دیکھیے گا بھیا! سب ایک دم سے ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھہریں میں ذرا شکرانے کے نفل تو پڑھ آؤں۔“

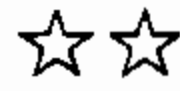
وہ چہک کر کہتے مجھے لپٹا کر پیار کرتا ہنستا، مسکراتا پلٹ کر بھاگ گیا۔ میں ساکن جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنی خوشی، اتنی ڈھٹائی کے مظاہرے نے مجھے، میرے دل کو لہو لہان کر دیا۔ ممما حیران نظر آرہی تھیں۔

”ایسی کون سی خوشی کی خبر سنا دی تم نے بیٹے؟“

ان کی بات پر میں چونکا تھا میری دھندلاتی آنکھوں میں ان کا عکس واضح نظر نہیں آیا۔ جواباً میں نے ایک سرد آہ کھینچی تھی۔

”ہے ایک بات۔ آپ کو جب پتا چلے گی شاید آپ کو دکھ ہو۔ مگر ممما! کچھ فیصلے نا گریز ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو دکھ ہو تو خود کو سنبھال لیجیے گا اور اس بات پر یقین رکھیے گا۔ خدا اپنے بندوں کو ان کی ہمت سے بڑھ کر دکھ نہیں دیتا۔“

میں نے مدھم لہجے میں کہا تھا اور ماما کو حیران ششدر چھوڑ کر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ اب مجھ میں کسی کے سامنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے ان ہمتوں کو مجتمع کرنا تھا اس بڑے فیصلے کے لیے جو ناگزیر ہو چکا تھا۔



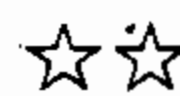
پھر وہ رات کا ہی کوئی پہر تھا جب میری آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے کا سبب کوئی احساس تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر رہا یہ احساس کیا ہے؟ میرا ذہن خوابیدہ تھا۔ دواؤں کا اثر میرے ذہن کو پوری طرح بیدار نہیں ہونے دے رہا تھا۔ کمرانیم تار یک نہیں تھا مکمل طور پر تاریک تھا۔ شاید بجلی فیل ہو گئی تھی یا پھر کسی نے نائٹ بلب بھی بجھا دیا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر رہا۔

”مجھے معاف کر دیں عون! فار گاڈ سیک مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ یہ سرگوشی سے مشابہہ بھیگی بھرائی آواز کس کی تھی۔ یہ کچھ شناسا لہجہ تھا مگر میرا خوابیدہ ذہن شناخت سے قاصر رہا۔ میں نے اپنے چہرے پر کسی ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ پھر ہونٹوں کا۔ کپکپاتے ہوئے نم ہونٹ جو بار بار اک دیوانگی کے عالم میں میرے چہرے کے مختلف نقوش کو چھو رہے تھے۔ پھر کوئی گرم نرم چیز بھی میرے چہرے کو تسلسل سے بھگونے لگی۔ میرا سینہ ایک گداز نرم و نازک بوجھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں ساکن پڑا رہا۔ بے حس و حرکت۔ وہ کون تھا؟ میں نے سوچا۔ میرا ذہن ہنوز جیسے گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

”آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ سب کچھ بہت غلط ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے عون! مجھ سے نفرت نہ کریں پلیز!“ ادھر دیوانگی اور سراسمگی کا وہی عالم تھا۔ معاً میں ایک دم ساکن ہو گیا۔ ذہن روشن ہو گیا۔ میرے بے حد نزدیک میرے سینے سے لگی ہوئی۔ وہ یقیناً رو بھی رہی تھی۔ مجھے لگا حیرت، غیر یقینی اور استعجاب سے میرا وجود برف کی سل میں ڈھل گیا ہو۔ مجھ میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ بولنے کی صلاحیت تو جیسے میں پہلے ہی کھو چکا تھا۔ وہ جانے کتنی دیر تک یونہی مجھ سے لپٹی رہی۔ روتی رہی۔

”میں آپ سے محبت کرتی ہوں عون صرف آپ سے۔ آپ کو یقین تو کرنا چاہیے نا۔ آپ کو مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع تو دینا چاہیے نا؟“

وہ پھر کہہ رہی تھی۔ وہ پھر رو رہی تھی۔ میں یونہی ساکن پڑا رہا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گئی۔ مجھ سے دور ہٹ کر بستر سے اتر گئی۔ میں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی وہ شاید واش روم چلی گئی تھی یا پھر کمرے سے باہر میں سمجھنے سے قاصر رہا۔ پتا نہیں کتنی دیر میں یونہی لیٹا رہا پھر جانے کب دوبارہ غافل ہو گیا تھا۔ شاید مجھے نیند آ گئی تھی۔



ہمیں چھوڑ چھاڑ کے بھیڑ میں

اب کس لیے ہو پکارتے

یہ جو ہجر ہے یہ تو روگ ہے

یہ جو روگ ہے یہی جگر ہے
 تو یہ طے ہوا کہ کبھی کبھی
 کوئی خواب دیکھ کے روئیں گے
 کبھی یاد آیا جو دشت دل
 تو سحاب دیکھ کے روئیں
 یہ کتاب لکھی جو عشق میں
 یہ کتاب دیکھ کے روئیں گے
 جو ڈسے ہوئے ہیں بہار کے
 وہ گلاب دیکھ کے روئیں گے

اگلے دن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی اور میں منحصرے میں مبتلا ہو رہا تھا آیات میں نے خواب دیکھا
 تھا یا واقعی وہ حقیقت میں میرے پاس آتی تھی۔ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ سچ تھا یا محض حالات کی وجہ سے بولا گیا
 ایک اور جھوٹ۔ ہاں یقیناً وہ ایک جھوٹ تھا۔ میرے اندر کا اضطراب گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں ابھی اس وحشت
 بھرے احساس سے نہیں نکلا تھا کہ ایک اور افتاد ٹوٹ پڑی۔ حجاب کسی کو بتائے بغیر ابوداؤد کے ساتھ چلی گئی تھی۔
 مجھ سے یقیناً یہ خبر چھپائی گئی تھی مگر کب تک؟ سب کے پریشان چہرے اور سوالیہ استعجابی آنکھیں از خود بھید کھول
 رہی تھیں جو بالآخر مجھ پر بھی عیاں ہو گیا۔

”وائے؟؟“

میرے اندر غضب کا احتجاج اور وحشت در آئی تھی۔

”کیوں کیا تھا حجاب نے ایسا؟“

میراجی چاہا تھا میں خودکشی کر لوں۔ اتنی ذلت اور رسوائی سہہ کر بھی کیا کوئی کسریا کی باقی تھی کہ یہ
 سب ہوتا۔ میں جیسے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ سب جیسے ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ بالخصوص مجھ سے،
 سب خائف تھے۔ میں نے اس خبر کو پا کر اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ماما کو میری فکر لگ گئی تھی۔ وہ بار
 بار آ کر دروازہ بجاتی تھیں اور مجھے پکارنے لگتی تھیں۔

”بے فکر رہیں ماما! میرا خودکشی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آپ چلی جائیں۔ فی الحال مجھے تنہا چھوڑ
 دیں۔“ میں سارے ضبط کھو کر چیخ پڑا تھا۔

”بیٹے میری بات سنو، دروازہ کھولو پلیز!“

میں نے پاپا کی آواز سنی تھی۔ یقیناً وہ بھی ماما کے ساتھ تھے۔ مجھے اٹھنا پڑا۔ نقاہت بیماری اور پے در
 پے لگنے والے شاکس نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ جی بھی میری چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ دروازہ کھلا تو ماما
 کے ساتھ پاپا بھی تیزی سے اندر آ گئے۔

”عون کام ڈاؤن بیٹے!“

انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا تھا پھر مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ میں سر تاپا کانپ رہا تھا۔

”اس نے ایسا کیوں کیا پاپا! اس نے مجھے جیتے جی مار دیا۔“

میں اس پل اپنے اوپر ضبط گنوا بیٹھا تھا۔ ان کے کاندھے سے لگتے ہیں میرے آنسو بہنے لگے۔ ابو

داؤد کی کال نے گویا جلتی پر کام کیا تھا۔ وہ میری سبکی اور شکست پر مجھے مار چر کرتا رہا تھا

”کچھ مت سوچو۔ بس ریلیکس رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

پاپا نے مجھے اپنے ساتھ بھیج کر تھپکا تھا مگر میرے اندر سرسراتی وحشت اور دکھ میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

”کیا ٹھیک ہوگا؟ کچھ بھی نہیں پاپا! سب غلط ہو گیا۔ میں نے جانا میں ہر جگہ پر غلط تھا۔ جی تو سب

کچھ درہم برہم ہو گیا، برباد ہو گیا۔“

میں وحشت زدہ ہو کر چیخا اور ان کے بازوؤں سے نکل گیا۔ اپنے بال مٹھی میں جکڑ کر جھٹکے دیتے

یقیناً میں حواسوں میں نہیں تھا۔

”خود کو سنبھالو بیٹے! اس طرح تو آپ بیمار پڑ جاؤ گے۔“

مما میری حالت دیکھ کر رونے لگیں وہ ابو داؤد اور ساتھ ساتھ حجاب کو بھی کوس رہی تھیں اور پہلی بار،

زندگی میں پہلی بار مجھے حجاب سے نفرت محسوس ہوئی۔ وہ میرے لیے صرف اذیت کا سامان کرنے کو دنیا میں آئی

تھی۔ اس نے ابو داؤد کے ساتھ مل کر ہمیشہ میرا سر جھکایا تھا۔ صرف اس نے نہیں روشا نے اور عیسیٰ نے بھی۔ میرا

رشتوں سے مکمل طور پر اعتماد اٹھ گیا۔ میں اس دن گویا پوری طرح سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ رشتے جو مقدس تھے

فرشتوں کی طرح میرے نزدیک ان کا مفہوم بدل گیا تھا۔ اس روز ممّا اور پاپا کے سمجھانے بجھانے کے باوجود میں

تڑپتا اور سسکتا رہا تھا۔ اس وحشت اور مایوسی کی حالت میں میں نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔ اس وقت جب

کمرے میں کوئی نہیں تھا میں نے فروٹ کی باسکٹ سے چھری اٹھا کر نہایت بے دردی سے اپنے ہاتھ کی دین

کاٹ دی تھی۔ مجھے ان حالات میں جی کر مزید آزمائش اور دکھ دیکھنے گوارا نہیں تھے۔ میں جو ہر قسم کے حالات

میں حوصلے سے مسکرا نے کا دعویٰ کیا کرتا تھا آج ہار گیا تھا۔ میں جو خودکشی کرنے والوں کو بزدل گردانا کرتا تھا۔ اپنی

سوچ سے شرمندہ ہو گیا تھا۔ بس ایک ہی سوچ تھی ایک ہی سوچ، اگر میں اس طرح خود کو ختم کر لوں تو پھر یقیناً

حالات بہتر ہو جائیں گے۔ حجاب ابو داؤد کے ساتھ خوش رہ لے گی۔ ابو داؤد کے سینے میں بھڑکی انتقام کی آگ

میری موت سے سرد پڑ جائے گی۔ روشا نے اور عیسیٰ کے راستے کی رکاوٹ بھی دور ہو جائے گی۔ ارے میں کتنا

احمق تھا مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ اس سوچ نے میرے اندر سے ہر ملال مٹا دیا، ہر تکلیف کو ختم کر دیا۔

میں جیسے بے حد پرسکون ہو کے لیٹ گیا تھا۔ کٹی ہوئی کلائی سے سرعت سے بہتا خون بستر کو رنگین کرتا جا رہا تھا۔

☆☆

خزاں کے موسم کی سردشا میں

سراب یادوں کے ہاتھ تھامے
 کبھی جو تم سے حساب مانگیں
 بے نور آنکھوں سے خواب مانگیں
 تو جان لینا کہ خواب سارے
 میری حدوں سے نکل چکے ہیں
 تمہاری چوکھٹ پر آر کے ہیں
 مسافتوں سے تھکے ہوئے ہیں
 غبار راہ سے اٹے ہوئے ہیں
 تمہاری نگری میں اجنبی ہیں
 اس لیے کچھ ڈرے ہوئے ہیں
 سوالی نظروں سے تک رہے ہیں
 تمہاری چوکھٹ نہ جانے کب سے

میرے لیے یہ سوچ اور خیال ہی ناقابل قبول تھا کہ میں پھر زندہ بچ گیا ہوں میں مرجانا چاہتا تھا پھر موت نے بھی مجھے قبول کیوں نہیں کیا۔ درد جسم کا نہیں تھا۔ کرب بھی روحانی تھا اور اذیتیں بھی۔ میں ان سے ہمیشہ کی نجات چاہتا تھا مگر مجھے نجات نہیں دی گئی۔ مجھے کیوں بچایا گیا؟ میں بھڑک اٹھا، چیختا رہا۔ میں شدید ترین فرسٹریشن کا شکار تھا۔ جی بھی بھرا تو پھر کسی سے سنبھالنے کا نہیں رہا تھا۔ ہاسپٹل میں ایک ہنگامہ بچ گیا تھا۔ میں نے ڈرپ کی نیڈل اُتار کر پھینک دی۔ بستر سے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش میں میرا پیر کسی شے میں الجھا تھا میں منہ کے بل جا گرا تھا۔ میری کلائی کے کچے زخم کے ٹانگے کھل جانے کے باعث خون جاری ہو گیا تھا۔ گرنے کی وجہ سے ناک پر شدید چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ میں ڈاکٹر ز اور پاپا کے ساتھ موسیٰ عیسیٰ کی گرفت سے چل چل کر نکلتا اور چیختا چنکاڑتا رہا تھا۔ میں ہر صورت مرجانے اس زندگی سے جان چھڑانے کا متنی تھا۔ میں شدید وحشت میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا اور چیختا رہا تھا۔ مجھے کسی نہ کسی طور قابو کر کے بستر پر ڈالا گیا۔ مجھے بیک وقت تین چار لوگوں نے سنبھالا ہوا تھا مگر میں ان سے چھوٹنے کی کوشش میں پوری جدوجہد کرتا رہا تھا معاً میرے بازو میں ہلکی چھن ہوئی تھی۔ شاید مجھے انجیکشن دیا گیا تھا۔ بے ہوشی کا، اس کے بعد میری مزاحمت ہی نہیں تھی میرا حواس سے ہر تعلق ختم ہو گیا۔ دوبارہ جانے کتنی دیر بعد میں میری آنکھ کھلی تھی۔ میں کمرے میں تنہا نہیں تھا۔ ماما میرے سر ہانے موجود تھیں۔ ان کی آنکھیں اس وقت بھی گیلی تھیں اور چہرے پر ہر اس تھا۔ نماز کے اسٹائل میں دوپٹہ اوڑھے تسبیح ہاتھ میں لیے ان کے ہونٹ کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ بے ساختہ مجھ پر جھکیں۔

”عون میرے بیٹے! میری زندگی! تم.....“

کچھ مزید کہنے کی کوشش ان کی بڑی طرح ناکامی سے دو چار ہوئی تھی۔ ان کی آنکھیں بے تحاشا برس

اُنھیں۔ انہوں نے جھک کر بڑی بے تابی سے میری پیشانی کو بار بار چوما تھا۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا جان! خدا کی قسم عون اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں آپ سے پہلے مر جاتی۔ ایسی حرکت کرتے آپ کو میرا خیال کیوں نہیں آیا؟“

وہ میرے سینے پر سر رکھ کے ہچکیوں سے رونے لگیں۔ میں بے حس سا کن پڑا رہا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے اندر سے میں ایک دم خالی ہو گیا ہوں۔

”عون کچھ بو بو بیٹے! اپنے اندر کا غبار نکال لو۔“

”انہوں نے میرے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر نرمی سے کہا تو میرے ہونٹوں پر زہر سے بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔“

”آپ نے مجھے مرنے کیوں نہیں دیا ماما!“

اور میری بات نے ان کے غمزہ چہرے کو ایک دم تاریک کر دیا تھا۔ بے ساختہ دہل کر انہوں نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

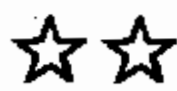
”فارگاڈ سیک، آئندہ ایسی بات مت کہنا۔“

اور میں نے ہونٹ بھیج لیے تھے۔

روشانے رو رو کر پاگل ہوتی رہی ہے۔ نئی نویلی دہن کن دکھوں میں پڑ گئی۔ ابھی تو اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔“

مما کا لہجہ غم کی شدت سے ٹوٹ رہا تھا۔ میرے چہرے پر زہریلی مسکان بکھر گئی۔

”آپ فکر نہ کریں ماما! اس کے سارے دکھ دور کر دوں گا میں۔ اب مجھے کسی کی بھی کوئی پروا نہیں کرنی۔“ میں نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور رخ پھیر لیا۔ میری آنکھوں کی جلن یکلخت بڑھ گئی تھی۔ اگر خدا کو میری موت ابھی منظور نہیں تھی تو پھر مجھے حالات کا سامنا تو کرنا چاہیے تھا نا اور اب میں تیار تھا۔



ہم دشت کے باسی ہیں اے شہر کے لوگو!
یہ روح پیاسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
دکھ درد سے صدیوں کا تعلق ہے ہمارا
آنکھوں کی اداسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جان دینا رویت ہے قبیلے کی ہماری!
یہ سرخ لباسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جو بات بھی کہتے ہیں اُتر جاتی ہے دل میں
تاثر جو ہمیں اس ورثے میں ملی ہے

”میں آپ کا سر بادوں؟“

میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں کنپٹیوں پر تھیں۔ اضطراب کی کیفیت میں میں اپنی کنپٹیاں مسل رہا تھا جب اس آواز کو سن کر ٹھٹھکا۔ روشا نے میرے سامنے تھی۔ ماند ہوتی رنگت اور آنکھوں تلے گہرے ہوتے حلقوں کے ساتھ وہ اپنی بے چین نظروں کو مجھ پر نکائے کھڑی تھی۔ میرا دماغ جیسے اسے سامنے پا کر خراب سا ہونے لگا۔

”تم میرا گلا دبا دو۔ تمہیں بھی مجھ سے ہمیشہ کی نجات مل جائے گی۔“

”میں برس پڑا تھا۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں عون!“

وہ پتا نہیں کیوں روہانسی ہو گئی تھی۔ ہاں یہ اس کی اداکاری تھی۔ ہاں وہ اب تک مجھ پر عیاں نہیں ہوئی تھی پھر اب اپنا بھرم کیسے کھونا چاہیے گی۔

”کیسی باتیں کر رہا ہوں؟“ میں غرایا۔

”کیسی باتیں کروں؟ ابھی اسی وقت تمہیں طلاق دے دوں۔ یہی چاہتی ہونا تم؟ ایسے ہی کروں گا فکر مت کرو۔“ میں حلق کے بل چیخا اس کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا۔ ہونٹ کاپنے لگے۔ وہ کھڑے سے یکنخت بیٹھ گئی تھی۔

”عون!!“

میں نے اس کی گھٹی گھٹی چیخ سنی تھی اور کچھ کہے بغیر قہر بھری نگاہ اس پر ڈالتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں گھر کے کسی فرد کو انوالو کیے بغیر اسے ڈائیورس کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا اگر گھر میں کسی کو بھنک بھی پڑ گئی۔ اس میرے ارادے کی، تو ہزار رکاوٹیں ڈالی جائیں گی اور میں اب ایسا نہیں چاہتا تھا۔ جیسی فیضان کی بجائے میں نے شہر کے نسبتاً غیر معروف لائر سے بات کی تھی اور اسے طلاق کے کاغذات تیار کرنے کا کہا تھا۔ یہ بات میں نے ٹیرس پر رک کر کی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد کمرے میں آیا تو وہاں کی صورتحال نے مجھے جیسے آگ لگادی تھی۔ روشا نے کارپٹ پر بیٹھی تھی اور عیسیٰ اسے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ دونوں میں جیسے کوئی دوری نہیں تھی۔ اور وہ دونوں پہ کھیل میرے بیڈروم میں کھیل رہے تھے۔ میرا ضبط اور برداشت جواب دے گئی۔ میں پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے ان پر جھپٹ پڑنا چاہتا تھا مگر جیسے زمین نے میرے قدم جکڑ لیے تھے۔

”مجھے چھوڑ دو عیسیٰ! فار گاڈ سیک! میرے حال پر رحم کرو۔ میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ مجھے مر

جانے، دو عون کی نظروں سے گر کر مجھے مر جانا ہی چاہیے۔“

میں نے وہیں کھڑے اس کی روتی بلکتی آواز سنی تھی۔ اور نفرت سے ہونٹ سکڑ لیے تھے۔

”ہوا کیا ہے کہ تم یہ فضول حرکت کرنے لگی تھیں؟ روشا نے پلیز مجھے بتاؤ ایسی کوئی افتاد ٹوٹ پڑی ہے کہ

جس کا اتنا شدید ری ایکشن لے رہی ہو تم؟ حجاب کا یوں چلے جانا کوئی اتنا غیر متوقع عمل تو نہیں ہے کم از کم تمہارے

لیے۔ یہ ہماری کوششوں کا ہی نتیجہ ہے مگر حجاب نے تھوڑی غلطی کی۔ معاملہ سدھارنے کی بجائے بگاڑ دیا۔ مجھے حیرانی

ہے اس نے ایسا قدم کیوں اٹھایا۔ بھیج تو ہم بھی اسے وہیں دیتے مگر اس کی جلد بازی نے سارا کام خراب کر دیا ہے۔“ عیسیٰ کی باتیں تھیں یا انکشاف! میں ششدر رہ گیا۔ بے اختیار میرے قدم پیچھے کی جانب اٹھے اور میں دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہ کون سا نیا کھیل تھا جو میری نگاہوں سے او جھل رہ گیا تھا۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں رہا ہے عیسیٰ! کچھ بھی۔ اس سارے معاملے میں شاید سب سے زیادہ نقصان میرے حصے میں آیا ہے۔ عون کی نظروں سے گر گئی ہوں میں۔ وہ بہت غلط سوچ رہے ہیں۔ میرے اور تمہارے بارے میں۔ وہ مجھے طلاق دینا چاہتے ہیں عیسیٰ! میں یہ ذلت نہیں سہوں گی۔ میں مر جاؤں گی اس سے پہلے ہی۔ مجھے مر جانے دو۔“ وہ بڑی طرح بلک رہی تھی۔ میں ساکن رہ گیا تھا۔

”یہ کوئی نیا ڈرامہ ترتیب دیا گیا تھا کیا؟“

میں نے بے حد مشکوک ہو کر سوچا۔

”کیا مطلب ہے کیا کہنا چاہتی ہو؟“

عیسیٰ کی آواز میں تحیر و استعجاب تھا۔ جواب میں روشنانے کی سسکیاں گونجتی رہیں۔ اس کی خاموشی میرے لیے جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔

”غلطی میری ہی تھی عیسیٰ! مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں ہمدردی اور اصلاح کی کوشش میں مذہب کی مقرر کردہ حدود سے نکل گئی تھی۔ تم غیر محرم تھے میرے لیے، دیور کو عدیث مبارکہ میں آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ میرا دامن کیسے نہ جلتا۔ جس دھن میں میں مبتلا ہوئی تھی اس میں احتیاط کا دامن تو تھا مناجا چاہیے تھا مجھے۔ مگر ایسا نہیں کیا تو نتیجہ یہی نکلتا تھا۔ عون کو کبھی پتا نہیں چھے۔ حقیقت کیا تھی۔ وہ کبھی سچ نہیں جان سکیں گے۔ اگر کبھی جان بھی گئے تو کبھی یقین نہیں کریں گے۔ بتاؤ اس سے بڑھ کر بھی میرا کوئی نقصان ہو سکتا ہے؟“ اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ عیسیٰ خاموش کھڑا تھا۔

”میں خود بھیا سے بات کروں گا۔ ان کی غلط فہمی کو دور کروں گا۔ تم فکر مت کرو۔ اور پلیز اب دوبارہ یہ حماقت نہ کرنا۔“ عیسیٰ نے شاید خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

عون صحیح کہتے تھے عیسیٰ! ابوداؤد کی فطرت میں احسان مندی ہے نہ شرافت! دیکھا وہ ہمیں بھی چہرہ لگا گئے نا۔ وہ ہیں ہی چیئر۔ کاش ہم عون کے خلاف نہ چلے ہوتے۔ ہم نے ابوداؤد سے ہمدردی کا نہ سوچا ہوتا۔ حجاب کو خوشیاں دینے کی کوشش میں میں نے اپنی ساری خوشیاں کھودیں صرف خوشیاں نہیں اعتماد اور بھرم بھی۔ صرف یہ ہوتا تب بھی قابل قبول تھا مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اب حجاب ابوداؤد کے ساتھ خوش ہوگی۔ وہ خوش نہیں ہوگی عیسیٰ! اگر ابوداؤد نے حجاب کو خوش رکھنا ہوتا تو وہ اس طرح اسے اپنے پاس آنے پر مجبور نہ کرتے۔“ وہ ہنوز ہچکیاں بھر رہی تھی۔ میرا ذہن بے طرح الجھ گیا تھا۔

”تم بالکل پریشان نہ ہو روشی! ہم سے تھوڑی سی غلطی ضرور ہوئی ہے مگر اس کام میں صرف ہم دونوں شامل نہیں تھے۔ فیضی بھائی، ثانی بھابی اور موسیٰ بھی ہماری گواہی دیں گے۔ میں نے کہا نا تم فکر مت کرو۔“

ہم تمہارا نقصان نہیں ہونے دیں گے۔“

وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ تو میں اندر آ گیا۔ میرے دماغ میں جیسے ان کی آوازوں کی بازگشت تھی۔ مجھے یاد آیا تھا۔ شادی کے شروع دنوں میں بھی مجھے لگا تھا کچھ مسنگ ہے وہ کیا تھا جو مجھ سے چھپایا گیا تھا۔ جواب بھی ظاہر ہوا تھا۔ وہ بھی واضح تو نہیں تھا۔ بلکہ میری الجھن کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ پھر میں اس بات کو لے کر بھی مشکوک تھا کہ روشانے یا عیسیٰ میری ٹیرس پر موجودگی سے بے خبر تھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں ان کی بات چیت سن نہیں رہا ہوں۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایک کے بعد مجھے دوسرا دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں کیسے اتنی آسانی سے یقین کر لیتا۔ میں نے کہا تا میرا ہر رشتے سے یقین ختم ہو چکا تھا۔

☆☆

وہ منزلیں بھی کھو گئیں، وہ راستے بھی کھو گئے
جو آشنا سے لوگ تھے، وہ اجنبی سے ہو گئے
نہ چاند تھا، نہ چاندنی، عجب سی وہ زندگی
چراغ تھے کہ بجھ گئے، نصیب تھے کہ سو گئے
یہ پوچھتے ہیں راستے، رکے ہو کس کے واسطے
چلو تم بھی اب چلے چلو وہ مہرباں تو کھو گئے

پتا نہیں زندگی اتنی تلخ اور اذیت انگیز کیوں ہو گئی تھی۔ کورٹ سے واپسی پر میں بے اختیار شاک کی ہونے لگا تھا۔ ابوداؤد نے حسب خواہش مجھے ویسی ہی شکست سے دو چار کر دیا تھا جیسی وہ چاہتا تھا۔ جیسے اس نے دعوے کیے تھے۔ حجاب نے میرے خلاف کورٹ میں کھڑے ہو کر گواہی دی۔ مجھ پر الزام لگائے تو جیسے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی گئی تھی۔ مجھے لگا تھا یہ آخری ظلم تھا۔ یہ آخری زیادتی تھی جو مجھ پر ہوئی۔ اس کے بعد جو بھی ہو جاتا اب مجھ پر اثر ہونے والا نہیں تھا۔ ہاں ایسی ہی بے حسی اور لا تعلقی کے احساس نے مجھے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا۔ مجھ سے برعکس سب دکھی تھے۔ اس روز گھر میں موت کا سناٹا طاری رہا تھا۔ میں نے اسی روز لائر سے طلاق کے کاغذات بھی منگوا لیے۔ اب مجھے کسی کی وضاحت کسی صفائی کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ آج جو آخری زیادتی میرے ساتھ ہوئی تھی اس میں بھی کسی کا بہت اہم حصہ تھا۔ اس سازش میں بھی بہت سے لوگ شریک تھے۔ میں آج کے دن دواہم کام کرنا چاہتا تھا۔ روشانے کو طلاق دے کر اس گھر اس شہر کو ہی نہیں اس ملک کو بھی چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ میں تمام تلخ یادوں سے چھٹکارا پالینے کا سوچ چکا تھا۔ اور مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔ فی الحال میں سری لنکا جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے پاسپورٹ نکالا تھا اور ٹکٹ کنفرم کرانے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس کام میں مجھے خاصی زیادہ جدوجہد کرنا پڑی تھی مگر یہ کام ہو گیا تھا۔ رات نو بجے کی میری فلائیٹ تھی۔ اور اسی دوران مجھے روشانے سے بندھے تعلق سے بھی نجات حاصل کرنی تھی۔ دو تین گھنٹے پہلے میں نے لائر سے کاغذات بھیجنے کا کہا تھا مگر ابھی تک نہیں آئے تھے میں نے ایک بار پھر اس کا نمبر ڈائل کیا۔

”جی عون صاحب!“

مجھے ان کی مصروف آواز سنائی دی۔

”جناب میں نے آپ سے گزارش کی تھی میرا کام ابھی کر دیں۔ مجھے ایمر جنسی ہے میں یہ کام

کر کے ہی جانا چاہتا تھا۔“

میں نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا تو جواباً ان کی ہراساں میری آواز سننے کو ملی تھی۔

”عون صاحب میں نے ٹی سی ایس کرادیئے تھے پیپرز، دو گھنٹے کے اندر آپ کو ملنے تھے۔ ملے نہیں؟“

میں حیران رہ گیا۔

”نہیں۔ آپ سروس کے نمائندے سے پتا کروائیں پلیز!“

”او کے میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔“

انہوں نے کہا تھا پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے سیل کان سے ہٹا کر ہونٹ بھیج لیے۔

”ان پیپرز کا انتظار تھا آپ کو بھیا!“

عیسیٰ کی آواز پر میں نے چونک کر سامنے دیکھا وہ ہاتھ میں لفافہ لیے کھڑا تھا۔ آنکھوں میں دبا دبا

غصہ تھا۔

”ہاں یہی۔ مگر تم نے اسے کھولا کیوں؟“

میں لفافے کو چاک دیکھ کر کس قدر تلخی و غصے سے بولا تھا۔

”آپ واقعی ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں بھیا؟“

”تمہیں میرے پرسنل معاملے سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ سمجھے؟“

میں پھنکارا اور اس کے ہاتھ سے لفافہ جھپٹ لیا۔

”مجھے کیوں غرض نہیں ہونی چاہیے؟ اس الزام کی زد پر صرف آپ کی بیوی نہیں آرہی ہے۔ میں

بھی آرہا ہوں۔ مائنڈاٹ بھیا! آپ سچ جانے بغیر کیسے اتنا بڑا قدم اٹھا سکتے ہیں؟“

وہ جواباً چیخ پڑا تھا۔ میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

”چینو مت۔ چیخنے سے سچائی پر پردہ نہیں پڑ جائے گا۔ میں اگر خاموش تھا تو اس کی وجہ وہ بھرم ہے

جسے میں قائم رکھنا چاہتا ہوں۔“

میں زور سے دھاڑ تو عیسیٰ تلخی و تنفر سے مسکرایا۔

”سچ؟ آپ سچ کو جانتے ہیں بھیا؟“ اس کا لہجہ بے حد طنزیہ تھا۔

”اپنی مرضی کی بات فرض کر لینا اور پھر اسے سچ سمجھ کر اپنی مرضی کا فیصلہ کسی پر مسلط کر دینا تو انصاف

نہیں کہلاتا۔ آج آپ کو سننا پڑے گا کہ سچ کیا ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا! سمجھے تم۔“

میں چیخ اٹھا تو اس نے جواباً پینختے ہوئے مجھے زور سے دھکا دیا تھا۔

”چپ ہو جائیں آپ! آپ کچھ نہیں جانتے کچھ بھی نہیں۔ نہ یہ کہ آپ کے اس انتہائی اقدام کی وجہ سے کوئی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے اور نہ یہ کہ کسی کو غلط سمجھ کر آپ نے عمر بھر کے لیے اسے مصلوب کرنے کا سوچ لیا ہے۔ سنیں بھیا آپ جیسے جذباتی انسان اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں مگر پھر بھی ساری زندگی خود کو مظلوم سمجھتے ہوئے گزار دیے ہیں۔ کیا یہ سب سے بڑی حماقت نہیں ہے؟“

”بکو اس بند کرو۔ مجھے تمہاری فلسفیانہ گفتگو سے کچھ لینا دینا نہیں ہے سمجھے؟“

میں حلق کے بل غرایا تھا۔ جواباً وہ زہر خند سے ہنس پڑا۔ اس کی آنکھیں بے حد لال ہو رہی تھیں۔

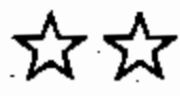
”یہ فلسفیانہ گفتگو ہے آپ کی نظر، میں تو یونہی سہی۔ مگر بھیا میری بات سنیں۔ جب روشانی سے شادی سے میں نے انکار کیا تو میرے انکار سے پہلے اس شادی سے انکار روشانی نے کر چکی تھی جانتے ہیں کیوں؟“

اس نے ذرا سا توقف کیا پھر اپنی لہو رنگ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔

”آپ کی وجہ سے۔ اس لیے کہ وہ آپ سے محبت کی دعویٰ کرتی تھی۔ تب اس نے مجھے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔ وہ دھوکے کی زندگی گزارنے پر آمادہ نہیں تھی۔ جیسا اس نے یہ بولڈ اسٹیپ لیا تھا۔ مجھے اس کا فیصلہ پسند آیا تھا۔ بھیا میری اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی جو میں ہرٹ ہوتا۔ بلکہ مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ عون بھیا کبھی اس سے شادی نہیں کریں گے۔ آپ کو پتا ہے وہ آپ کے نام پر جوگ لینے کو بھی تیار تھی۔ وہ پاگل تھی۔ اس کا پاگل پن دیکھتے ہوئے میں نے اس کے ساتھ مل کر ایک پلان ترتیب دیا تھا۔ اور اپنی منگنی اس سے ہونے دی تھی۔ عین شادی کے موقع پر سچے ہٹ گیا۔ ہماری سب خواہش وہ سب ہوا تھا جو ہم نے چاہا تھا۔ بھیا اس میں روشانی کی دعاؤں کا کمال تھا جو اس نے طویل سجدوں میں رب کو مناتے ہوئے مانگی تھیں۔ میں نے شادی کے بعد یہ بات کسی سے نہیں چھپائی ماسوائے آپ کے، بس ہم آپ سے ڈر گئے تھے۔ جیسا بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔ عیسیٰ اور بھی پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا جبکہ میں یوں تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ مجھے وہ ایک ایک پل یاد آیا تھا، جب جب روشانی نے مجھے حیران کیا تھا۔ شادی کے دن میری توقع کے خلاف وہ جتنی سرشار اور مطمئن تھی میں الجھا تھا اس بات کو لے کر، پھر جب اسی رات میں نے اسے انور کیا تو اس کا بے ساختہ رونا پھر میری تسلی پر مسکرا کر مجھے انتظار کا یقین دلایا، صرف یہی نہیں اس رات جو اس کا کھلم کھلا اظہار تھا۔ اس کی جو دیوانگی تھی جسے میں خواب سمجھ کر جھٹکتا رہا تھا۔ کیا یہ سب جھوٹ تھا؟ کیا عیسیٰ کی آنکھوں میں واضح طور پر نظر آنے والا سچ بھی جھوٹ تھا۔ میں سناتوں کی زد پر تھا۔ آپ کی بارات کی رات ابو داؤد یہاں آیا تھا حجاب سے ملنے مگر حجاب سے قبل اس کا مجھ سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ وہ شاید مجھ سے جھگڑتا یا مار کٹائی کرتا۔ مگر میں نے ایسا اسے کوئی موقع نہیں دیا۔ میں نے اسے حجاب سے ملنے کی اجازت دی۔ مائنڈ مت کیجیے گا بھیا مگر میری نظر میں آپ کا رویہ شدید اور بے جا تھا۔ مجھے حجاب کی بہتری منظور تھی۔ میں ہرگز بھی طلاق کے حق میں نہیں تھا۔ وہ

بھی اس صورت جبکہ حجاب اب تنہا نہیں تھی۔ میں ابو داؤد کو ایک موقع دینا چاہتا تھا۔ میں اس کے نظریات جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے بعد میں بھی متعدد ملاقاتیں کیں۔ وہ ہر صورت حجاب کو اپنے ساتھ رکھنے اور اسے خوش رکھنے کی ضمانتیں دیتا تھا میرے خیال سے اگر ایسا ہو جاتا تو کوئی برائی نہیں تھی مگر آپ کے رویے میں کوئی لچک نہیں تھی بھیا! میری روشا نے سے دوستی تھی۔ میں نے اس سے یہ معاملہ ڈسکس کیا اور اس کی رائے مانگی۔ وہ میری سوچ اور خیالات سے متفق تھی۔ اس نے مجھے انکریج کیا۔ ہم دونوں مل کر انہی کوششوں میں کچھ اس طور مصروف ہوئے کہ حالات کی نزاکت کو بھول گئے۔ روشا نے مجھ سے منسوب رہی تھی۔ میرا اس کا رشتہ بہر حال مشکوک تھا۔ ہمیں احتیاط کرنی چاہیے تھی مگر ہم حجاب کی محبت میں اصلاح میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ ہمیں ان باریکیوں پر غور کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ روشا نے آپ پر بات کھل جانے کے بعد سراسیمہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بھی بہت دیر سے معاملے کے بگاڑ کا بتایا۔ وہ آپ کو کھوکھو کر زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی بھیا! جیسا اس نے خود کشی کی بھی کوشش کی۔ وہ تو میں نے بروقت دیکھ لیا۔ مگر وہ زور درنج رہنے لگی تھی۔ سچ آپ سننا نہیں چاہتے تھے بھیا! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر ایک ایک حرف سچائی کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ آپ کو خدا کا ہی واسطہ ہے اب کوئی جذباتی فیصلہ مت کیجیے گا۔ یاد رکھیے گا اگر آپ نے اب بھی کوئی جذباتی فیصلہ کیا تو آپ صرف روشا نے کو ہی نہیں اور بھی بہت سارے لوگوں کو جیتے جی مار ڈالیں گے۔

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔ پلٹ کر چلا گیا۔ میں اسی طرح پتھرایا ہوا کھڑا رہا تھا۔



میں اداس رستہ ہوں شہر کا، مجھے آہٹوں کی تلاش ہے
یہ ستارے سب ہیں بجھے بجھے، مجھے جگنوؤں کی تلاش ہے
وہ جو ایک دریا تھا آگ کا، سبھی راستوں سے گزر گیا
ہمیں کب سے ریت کے شہر میں، نئی بارشوں کی تلاش ہے

میں بے حد مضطرب ہو چکا تھا۔ غم و غصے کی جگہ دل میں ایک عجیب سا سناٹا اتر آیا تھا اس میں بھی شک نہیں تھا کہ غیر یقینی اور شک ابھی تھا۔ میں حیران تھا۔ یہ ممکن ہے؟ روشا نے کو مجھ میں کیا نظر آیا تھا کہ وہ مجھ پر مر مٹی تھی۔ اس سوچ کے برعکس جب میں عیسیٰ کی باتوں کو سامنے رکھ کر حالات و واقعات کی کڑیاں ملاتا تو ایک زنجیر بنتی نظر آتی تھی۔ یہی زنجیر تھی جو مجھے جکڑ رہی تھی۔ مجھے بے بس کر کے کھینچ رہی تھی۔ پتا نہیں میں عین فیصلے کے مرحلے پر پہنچ کر کیوں بے بس ہو گیا تھا۔ میں کمرے میں بند بیچ اور جھوٹ کی پرکھ میں گھرا اُلجھتا رہا، سگریٹ پھونکتا رہا اور میری فلائیٹ کا ٹائم نکل گیا۔ گھڑی نے با آواز بلند رات گیارہ بجے کا اعلان کیا تب میں چونکا تھا اور ہونٹ بھیچ کر رہ گیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد میں نے اپنے معدے میں شدید اینٹھن محسوس کی تھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا پتا نہیں ماما کو میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ تو مجھے کبھی یوں فراموش نہیں کرتیں۔ میں حیران سا کمرے سے نکل آیا۔ شاید عیسیٰ کی زبانی ان تک میرے ارادے پہنچ چکے

تھے۔ اور اپنی لاڈلی بہو سے اس حد تک زیادتی کے مرتکب ہو جانے والے بیٹے سے وہ خفا ہو گئی تھیں۔
 میں نے ایک قیاس کیا اور گہرا سانس بھرتا بیڑھیاں اتر کر نیچے چلا آیا۔ رات کے اس پہر گھر میں جو
 سناٹا تھا وہ مجھے چونکانے کا باعث نہیں بنا کہ ظاہر ہے سب اپنے کمروں میں جا چکے ہوں گے۔ میں کچن کی سمت
 چلا آیا کہ اس وقت ممایا ثانیہ بھابھی کو کھانے کے لیے ڈسٹرب کرنا مجھے کسی طور پر بھی مناسب نہیں لگا تھا۔ میں
 نے خود کھانا گرم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کچن کی جانب آیا تو لائیٹ آن دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ کوئنگ ریج کے گرد
 برتنوں اور چیزوں کا انبار تھا اور دونوں چولہے آن تھے یوں لگتا تھا ابھی کوئی یہاں سے عارضی طور پر نکل کر گیا ہو۔
 میں کچھ حیران سا آگے بڑھ آیا۔ بکھرے ہوئے دھونے والے برتنوں کو سمیٹ کر سنک میں ڈالا اور دونوں
 چولہے بند کرنے کے بعد میں پلٹ کر فریج کا دروازہ کھول کر جائزہ لیتے میں مصروف تھا جب ثانیہ اپنے دھیان
 میں اندر آئی تھیں مجھے دیکھ کر ایک دم ٹھٹک گئیں۔

”ارے بھیا آپ؟ کچھ چاہیے؟“

”آپ جاگ رہی ہیں ابھی تک؟“

میں نے دانستہ اس کا سوال گول کر دیا۔ اگر میں اسے اپنی یہاں آمد کی وجہ بتا دیتا تو لازماً وہ میرے
 لیے کھانا گرم کرنے کھڑی ہو جاتیں جبکہ میں اس وقت نہ صرف کسی کو تکلیف دینا چاہتا تھا نہ، اپنی تنہائی میں کسی
 کی مداخلت چاہتا تھا۔

”جی بس وہ کھانا بجھوانا تھا نا ہاسپٹل، تو وہی کام کر رہی تھی۔“

”کیوں؟ عیسیٰ گھر سے کھا کر نہیں گیا جو وہاں منگوایا ہے اس نے۔“

میں نے فریج بند کر دی اور سلیب سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ثانیہ نے جواب میں مجھے گہرا سانس
 بھر کے دیکھا تھا۔ پھر کسی قدر آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

”فیضان صرف عیسیٰ کا ہی نہیں، ممایا اور پیپا کا بھی کھانا وہاں لے کر گئے ہیں۔“

”واٹ؟“

مجھے دھچکا لگا تھا میں نے بھونچکا ہو کر ثانیہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ہی نہیں چہرے پر گہرے
 تاسف و ملال کے رنگ تھے۔

”روٹی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے بھیا! اس کی حالت بہت سیریس ہے۔“

اس کی فراہم کردہ اطلاع نے مجھے چکرا کے رکھ دیا۔ میں نے تحیر و استعجاب میں گھر کر اسے دیکھا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہیں ثانیہ؟ آئی مین کیا ہوا اسے؟“

میں نے خود کو سنبھال کر سرسراتی آواز میں استفسار کیا تھا۔

گیارواں حصہ

میری بات کے جواب میں کچھ پل وہ اسی یاسیت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر گہرا سانس کھینچ کر بولی تھی۔

”آپ نے ڈائورس پیپر جو منگوائے تھے۔ وہ واچ مین نے لا کر روشا نے کو دے دیئے تھے۔ اسے شاید پہلے سے کچھ اندازہ تھا جیسی اس نے لفافہ کھول کر چیک کر لیے۔ اس کے بعد اسے کچھ ہو گیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں بھیا! عیسیٰ نے اسے گھر پر ٹریمنٹ دینے کی کوشش کی مگر حالت نہ سنبھلنے کی وجہ سے ہاسپٹل لے جانا پڑا۔ نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ فیضان بتا رہے تھے ابھی تک ہوش نہیں آئی۔“

مجھے لگا تھا جیسے مجھے کسی نے ایک دم سرد ہواؤں کی زد پر تنہا چھوڑ دیا ہو ہر سمت ہواؤں کی سنساہٹ تھی۔ مجھے عیسیٰ کے الفاظ یاد آئے، اس نے کہا تھا۔

”آپ کچھ نہیں جانتے، کچھ بھی نہیں۔ نہ یہ کہ آپ کے اس انتہائی قدم کی وجہ سے کوئی زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے اور نہ یہ کہ کسی کو غلط سمجھ کر آپ نے اسے عمر بھر کے لیے مصلوب کرنے کا سوچ لیا ہے۔“

بھلا یہ روشا نے اور خود عیسیٰ کے علاوہ کن کی بات ہو سکتی تھی۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ میری وجہ سے اور میں انجان تھا سمجھا ہی نہ تھا۔ میں پتا نہیں ہمیشہ ہر بات کو سمجھنے میں اتنی دیر کیوں لگا دیتا تھا۔ پھر عیسیٰ کتنا دکھ پہنچا ہو گا اسے کہ میں نے اسے غلط سمجھا۔ اس پر شک کیا اُف! میں کیا کروں؟“

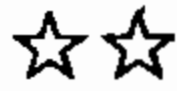
میں ساکن و سامت کھڑا رہا ہونٹ بھیڑنے نظریں زمین پر گاڑھے۔

”آپ کو شدید غلط فہمی لاحق ہوئی ہے بھیا! عیسیٰ تو محض روشی کا دوست ہے بلکہ وہ اس کا بھائی بنا ہوا ہے۔ آپ سے شادی میں اس نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ روشی تب ہی آپ کو پسند کرنے لگی تھی جب اس نے آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ یعنی آپ ماما کے ساتھ پروپوزل کے لیے جب ماما کے ساتھ ان کے گھر گئے تھے اور وہ آپ سے ٹکرا گئی تھی۔ اس نے اپنی ہر بات بہت پہلے سے ہم سب کو بتادی تھی۔ بس گوہ دونوں آپ سے ڈرتے تھے جیسی کسی نے آپ کو بتایا ہی نہیں۔ صرف عیسیٰ نے نہیں بعد میں ہم سب نے حجاب اور ابوداؤد والے معاملے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ سوری بھیا لیکن ہم سمجھتے تھے حجاب کی زندگی برباد نہیں ہونی چاہیے۔ ہم سب کا خیال تھا اس طرح اگر ہم ابوداؤد سے تعاون کریں گے۔ اس کا نقطہ نظر سننے کی کوشش کریں گے تو بہتری کی کوئی راہ نکل سکتی ہے۔“

”روشا نے کس ہاسپٹل میں ہے؟“

میں نے اس کی باقی کی باتیں جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ حجاب اور ابوداؤد والی باتیں تو خاص طور پر۔
 ”عیسیٰ کے ہاسپٹل میں ہی ہے۔“

ثانیہ نے جیسے ہی بتایا میں نے قدم آگے بڑھادیئے تھے میرا رخ ہاسپٹل کی جانب تھا۔



تم ایسا کرنا
 کوئی جگنو، کوئی ستارہ، سنبھال رکھنا
 میرے اندھیروں کی فکر چھوڑو
 بس اپنے گھر کا خیال رکھنا
 ہماری آنکھوں نے جو مل کے دیکھے
 وہ سارے سنے سنبھال رکھنا
 یہ جدائی اپنی تو عارضی ہے
 نہ دل میں اس کا ملال رکھنا
 تمہاری سانسیں، تمہاری دھڑکن
 سنو ہماری امانتیں ہیں
 ہماری خاطر ہی جان جاناں
 ہمیشہ اپنا خیال رکھنا

میں ہاسپٹل پہنچا تو فیضان کو بے حد پریشان پایا تھا۔

”آپ آگئے بھیا! میں نکل ہی رہا تھا آپ کو لینے کے لیے۔“

وہ مجھے دیکھتے ہی بولا تھا۔ میں نے چونک کر بغور اس کے متفکر چہرے کو دیکھا۔

”خیریت؟؟“ میرا دل کسی انجانے پریشان کن خیال کے تحت زور سے دھڑکا۔

وہ اچھوٹا روشانے بھابھی کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے عیسیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ بے ہوشی میں

بھی مسلسل آپ کو پکار رہی ہیں اور..... بھیا پلیز اس وقت ہمیں ہی نہیں روشنی بھابھی کو بھی آپ کی مدد اور تعاون

کی ضرورت ہے۔ نفرت اور غلط فہمی ایک طرف مگر معاملہ انسانی جان کا ہے۔ انسانیت کے ناطے.....“

”کہاں ہے روشنی!؟“

میں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”آئیے میں آپ کو لے کر چلتا ہوں۔“

اس نے قدم آگے بڑھائے تو میں اس کی تقلید میں چل پڑا۔ آئی سی یو کے باہر کارڈور میں می، پپا

اور موسیٰ بھی موجود تھے۔ ممانے مجھے دیکھ کر شدید خفگی سمیت منہ پھیر لیا تو میرے دل پر جیسے کسی نے بے دردی

سے خنجر پھیر دیا تھا۔

”بھیا آگئے ہیں پپا! ابھی انہیں اندر جانے دیں۔“

فیضان کے کہنے پر پپا نے جواب میں کچھ کہے بغیر میرا کندھا تھپک دیا تھا۔ فیضان دروازے کے نزدیک پہنچا اور اندر موجود عیسیٰ کو اشارہ کیا تھا۔ اگلے لمحے عیسیٰ دروازے پر آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بے اختیار اطمینان کا سانس بھرا تھا۔

”آپ اندر آجائیے بھیا! میرا خیال ہے مجھے آپ سے کچھ کہنا نہیں چاہیے۔ اس قسم کی چوہا لیشن میں اگر آپ آگئے ہیں تو آگے کیا کرنا ہے آپ یہ بھی بہتر سمجھتے ہوں گے۔“

اس کا لہجہ کسی حد تک خفگی لیے ہوئے تھا۔ میں نے جواب میں گہرا سانس کھینچا تھا اور نگاہ کا زاویہ بدل کر سامنے دیکھا۔ بیڈ پر سینے تک سفید چادر اوڑھے روشا نے چت لیٹی ہوئی تھی۔ بازو میں ڈرپ جبکہ چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔ اسے سانس بھی جیسے دشواری سے آتی تھی۔ آنکھوں کے حلقے کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ میں آہستگی سے قدم اٹھاتا اس کے نزدیک آگیا۔

”روشانے! آنکھیں کھولو۔“

میں نے اس کے ریشمی بالوں کو آہستگی اور نرمی سے سہلایا اس کے وجود میں کسی قسم کی جنبش نہیں ہوئی تھی۔

”میں آگیا ہوں روشی! اب تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا بیوی! آنکھیں کھولو مجھے دیکھو۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے دبایا۔

”عیسیٰ! عیسیٰ!!!“

اس کے ہونٹوں نے جنبش کی تھی اور جیسے سسکی بھر کے پکارا میں چونک اٹھا۔ اس کے ہاتھ پر میری گرفت بے اختیار ڈھیلی پڑ گئی۔ شک کا ناگ پوری شدت سے کلبلا یا۔ سب لوگ ایک بار پھر مجھے دھوکہ دے رہے تھے۔ بے ہوشی میں وہ میرا نہیں عیسیٰ کا نام پکار رہی تھی۔ میرے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔ میں زہر خند سے مسکرایا تھا۔ سچ اور جھوٹ کا پول کتنے خوبصورت انداز میں کھلاتا تھا۔ میرا جی چاہا میں اپنی حماقت اور بے وقوفی پر اپنا خود مذاق اڑا کر ہنسوں۔ تھا کوئی مجھ سے بڑھ کر پاگل؟

”عیسیٰ! پلیز عیسیٰ عون کو روک لو۔ انہیں کہو مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے صرف ان سے محبت کی ہے۔ صرف انہیں چاہا ہے۔ عیسیٰ عون سے کہو، مجھے بس ایک بار معاف کر دیں۔ میں بدکردار نہیں ہوں نا عیسیٰ! تم انہیں بتاؤ۔“

وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ اسی بے خبری کی کیفیت میں۔ اور میں جو تشنہ اور تلخی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ جیسے پتھر کا ہو گیا۔

”عیسیٰ عون کو بتاؤ۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔“

اس کی آواز بتدریج مدھم ہوتے بالکل ختم ہو گئی۔ مجھے جیسے جھٹکا لگا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا

اس کے جسم کو لگنے والے جھٹکے شدید ہو گئے تھے۔ اس کی رنگت ایک دم نیلی پڑتی جا رہی تھی۔
 ”روشانے.....! روشی.....!“

میں زور سے چیخا تھا۔ اسے جھنجھوڑا مگر وہ جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ میرے اندر وحشت سراسر نے لگی۔
 ”عیسیٰ عیسیٰ!!! اسے دیکھو کیا ہو رہا ہے؟ عیسیٰ اسے دیکھو.....“

میں بے ساختہ چیختا چلا گیا۔ اگلے لمحے آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور عیسیٰ کے ساتھ کچھ اور ڈاکٹر ز بھی خاصی عجلت اور افراتفری کے عالم میں اندر آئے تھے۔ اور روشانے کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اگلے کئی گھنٹے شدید تناؤ کے عالم میں گزرے۔ بے حد اعصاب شکن ثابت ہوئے۔ ماما تو سجدے میں گر گئی تھیں۔ پیا فون پر ملازم کو کسی بھی صورت بکرا لے کر صدقہ کرنے کا کہہ رہے تھے اور میں، مجھے بھی بھیکتی آنکھوں والی اس لڑکی کی شدتوں پر، دیوانگی پر اعتبار آ گیا تھا۔ جی میں اس لمحے شدتوں سے گڑ گڑا کر خدا سے اس کی زندگی کا طلبگار ہو گیا تھا۔ جی تو خدا نے رحم کیا تھا اور اسے زندگی بخش دی تھی۔

☆☆

دھیرے دھیرے وہ رو با صحت ہو رہی تھی۔ ماما اور پاپا نے باقاعدہ خوشی منائی تھی۔ صدقات دیئے گئے، قرآن خوانی کی گئی اور شکرانے کے طور پر غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ اسے جیسے کوئی چپ لگ گئی تھی۔ میرے سامنے تو خاص طور پر خائف ہو جاتی۔ جس روز اسے ہاسپٹل سے گھر لایا گیا۔ ماما بہت خوش تھیں۔
 ”مما پلیز، مجھے چند دن اپنے ساتھ رکھ لیں نا۔“

جس وقت میں کمرے میں آیا وہ ماما کی گود میں منہ چھپائے کہہ رہی تھی۔

”بیٹے یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ آپ یہیں رہو گی۔“

ممانے جوا با اس کے بال سہلائے تھے اور محبت سے ساتھ لگا کر کہا۔ میں چیئر پر بیٹھ کر دونوں کے لاڈ کا مظاہرہ سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ ماما بھی تک مجھ سے خفا تھیں۔

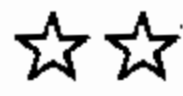
”میرا مطلب ہے ماما! آپ میرے ساتھ میرے کمرے میں سوئیں۔ میں آپ کے نخریلے بیٹے کے کمرے میں اب خود سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔ پتا نہیں کیوں اتنے پراوڈی ہیں۔ شاید سمجھتے ہیں۔ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں انہیں بتانا چاہتی ہوں ماما! میں ان کے بغیر بھی جی سکتی ہوں۔ بہت سارے لوگ محبت کو نہیں پاتے اور مرتے نہیں ہیں۔“ ممانے سٹپا کر پہلے اسے پھر مجھے دیکھا تھا۔ میں مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ہونٹ بھیچے ہوئے تھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ماما کو خاموش رہنے کا متلجی اشارہ کیا۔ وہ کچھ متذبذب اور جزبز ہوئیں۔ شاید لاڈلی دلاری بہو کے راز بیٹے کے آگے کھلنا انہیں پسند نہیں آیا تھا۔

”چند دن آپ کے ساتھ رہ کر میں پھر ماما کی طرف چلی جاؤں گی۔ عون صاحب متیں بھی کریں تو میں اب انہیں مشکل سے ہی لفٹ دوں گی۔ ذرا ناک سے لکیریں نکلو کر مانوں گی۔ ہے نا ماما! تاکہ آئندہ منہ پھلانے سے پہلے ذرا سوچ سمجھ کر.....“

”آہم!“ میں نے کھنکارا کر اپنی موجودگی کا احساس بخشا تو اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ پھر ضبط اور خفت سے اس کا چہرہ بے تحاشا سرخ پڑ گیا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر ماما کو دیکھا اور ایک دم سے رخ پھیر لیا۔ میں اس کی حالت پر حظ لیتا ہوا زور سے ہنس پڑا۔ ماما نے باقاعدہ گھور کر مجھے دیکھا تھا۔

”خبردار! جو میری بیٹی کو تنگ کرنے کی کوشش کی۔ ہم بات نہیں کر رہے ہیں تم سے، چلو بھاگو۔“ میں زور سے کھانسا تھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ماما کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں کو کانوں سے لگایا۔ گویا معافی مانگی اور پلٹ کر باہر آ گیا۔

”ماما! کہیں وہ سچ مچ تو خفا نہیں ہو گئے۔ اُف انہوں نے ساری باتیں بھی سن لیں۔“ کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے اس کی گھبراہٹ زدہ آواز سنی تھی اور کھل کر مسکرا دیا۔ بہت عرصے بعد مجھے لگا تھا میرے دل پر دھرا بوجھ سرک گیا ہو۔ زندگی کی خوبصورتی مجھ پر عیاں ہو رہی تھی۔



ماما کو میں نے کسی نہ کسی طور پر منالیا تھا۔ اور جس روز ماما سے میرے روم میں چھوڑنے آئیں۔ تب تک وہ بالکل تندرست اور پھر سے ویسی ہی خوبصورت ہو گئی تھی۔

”میں اپنی بیٹی کو تمہارے پاس چھوڑ کے تو جا رہی ہوں مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے، اسے کوئی دکھا اگر تم نے دیا تو سمجھ لینا مجھے دکھی کیا ہے۔ بس جو حماقتیں کر چکے کافی ہیں۔ پہلے ہی اتنی عمر ہو گئی ہے تمہاری! کیا بوڑھے ہو کر بچوں کے باپ بنو گے؟“

ان کی بات نے مجھے اچھا خاصا شرمندہ کر دیا تھا۔ میں نے کسی قدر خفگی سے انہیں دیکھا مگر وہ بہو صاحبہ کے لاڈ اٹھانے میں مصروف تھیں۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹے! اگر اس نے تمہیں دھمکانے یا پریشان کرنے کی کوشش کی تو ڈرنے کی ضرورت نہیں، بس مجھے بتانا۔ کان کھینچ کر سیدھا نہ کر دیا تو کہنا۔“

جواباً اس نے بھی شرمندہ سے سر ہلا کر گویا فرمانبرداری کی حد کر دی۔ ماما کے جانے کے بعد بھی اسے کھڑا پا کے میں نے کتاب بند کر دی اور براہ راست اسے دیکھا۔

”تشریف رکھیے محترمہ!“

وہ ناخن کرید رہی تھی چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔ پھر کچھ کہے بغیر جلدی سے بستر پر ٹک گئی۔

”تھینک یو۔ کوئی خدمت ہمارے لائق!؟“

میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا تھا۔ اس نے سٹپا کر مجھے دیکھا۔

”آئی ایم ساری! آپ نے شاید میری اس دن والی باتوں کو بہت مائنڈ کیا تھا۔“

”میری مجال! مجھے گھر سے تھوڑی نکلنا ہے آپ کو کچھ کہہ کے۔“

میں نے پھر اسی لہجے میں کہا تو وہ کسی قدر خشکی سے مجھے تکانے لگی۔

”عون پلیز!!!“

”کیا پلیز؟؟؟“

میں نے زروٹھے پن سے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”اتنے اچھے ہیں نا آپ؟ اگر ایسا ہوتا تو وہ سب کیوں کرتے۔ بس ترس کھایا ہے مجھ پر آپ نے

اور کیا؟ ورنہ محبت تو کوئی نہیں کرتے آپ مجھ سے۔“

”یہ کیا کم ہے کہ میں نے تمہاری محبت کو ایکسپٹ کر لیا ہے؟“

میں اسے جان بوجھ کر چھیڑنے لگا۔ اس نے بوجھل پلکیں اٹھا کر کچھ دیر دیکھا تھا پھر بھرائی ہوئی

آواز میں بولی۔

”جی بہت بڑا احسان ہے آپ کا۔ ورنہ جس غلطی کی مرتکب میں ہوئی تھی آپ نے مجھے معاف کر

دیا وہی بڑی بات ہے۔“

”روشی!“ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں سچ بتاؤں گا تمہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میں تمہیں کتنی محبت کرتا ہوں۔ مگر یہ سچ ہے کہ جب تم

ہاسپٹل تھیں تو میں تمہیں کھونے کے خوف سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو شاید میں کبھی

مسکرا بھی نہ سکوں گا۔ تم نے محبت پر سے میرا اٹھا ہوا ایمان مجھے لوٹایا ہے۔ تم نے مجھے بتایا ہے محبت کتنی انمول اور خاص

ہوتی ہے۔ مجھے تمہارا وہ بولڈ اسٹیپ جس پر تمہیں مجھ سے خوف آتا تھا کہ جانے میں کیا سوچوں تمہارے حوالے سے

اس لیے اچھا لگا ہے روشنی کہ تم اگر ایسا نہ کرتیں، مجھ سے محبت کو دل میں دبا کے رکھ لیتیں تو میری زندگی ہمیشہ ویسی ہی

رہتی۔ بے رنگ، پھکی اور ویران۔ مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ محبت کتنی طاقتور کتنی انمول چیز ہے۔ میں ابھی تم سے بھلے

محبت نہیں کرتا مگر میں تم سے محبت کروں گا ضرور۔ تم میری زندگی کا بلاشبہ انمول سرمایہ ہو۔ تم میرے لیے بہت خاص ہو۔“

میں نے اس کی جانب پیش رفت کی تھی۔ وہ میری بانہوں میں سمٹ کر میرے سینے میں منہ چھپا کر

آنسو بہانے لگی تو میں نے بے اختیار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”نہیں روشنی! آج کے دن یہ آنسو نہیں بہیں گے۔ یہ محبت کی جیت کے لمحات ہیں۔ یہاں ہم

خوشی اور مسکراہٹ کو دیکھیں گے۔ مسکراؤ۔ اس لیے کہ تم مجھے مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔“

میں نے اس کے آنسو پونجھے تھے پھر جھک کر اس کی بھیگی آنکھوں کو چوما تو وہ بے اختیار مسکرا دی

تھی۔ اور میں بے حد آسودگی محسوس کرنے لگا تھا۔



اگلی صبح نماز کے لیے اس نے مجھے جگایا تھا۔ چونکہ ٹائم کم تھا جی میں عجلت میں ہاتھ لے کر مسجد میں

چلا گیا۔ نماز کے بعد میں جاگنگ کے لیے چلا جایا کرتا تھا۔ واپسی اس دن ذرا تاخیر سے ہوئی تھی۔ وہ میرے

انتظار میں لان میں ٹہل رہی تھی مجھے دیکھتے ہی تیزی سے میری جانب آئی۔
 ”کہاں رہ گئے تھے آپ؟ اتنی دیر۔“

سی گرین خوبصورت سے سوٹ میں صبح کی ساری تازگی چہرے پر لیے وہ اتنی فریش اتنی جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی کہ میں بس اسے دیکھتا رہ گیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں جیسے کچھ نیا آگیا ہو میرے چہرے پر؟“

وہ کسی قدر جھینپ کر بولی تو میں کس قدر شرارت سے بولا تھا۔

”نیا تو ہے۔ آپ اتنی حسین پہلے تو کبھی نہیں لگیں جتنی آج لگ رہی ہیں۔“

میرے ذومعنی لہجے میں جو معنی خیزی تھی اس نے روشانے کو کانوں کی لوؤں تک سرخ کر دیا تھا۔
 ”بہت بدتمیز نہیں ہو گئے آپ؟“

مجھے خفیف سا گھور کر وہ خفت زدہ سی بولی۔ تو میں زور سے ہنس دیا تھا۔

”اب ایسے الزام تو ہمیں روز ہی سننے کو ملا کریں گے۔“

میں ہنس دیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر مجھے وہیں چھوڑتی آگے بڑھ گئی۔ میں گنگناتے ہوئے کمرے میں آیا

تھا اور تیار ہونے لگا۔ اسی روز بہت دنوں بعد میں نے وہی وائیٹ پینٹ کوٹ پہنا تھا جس میں روشانے نے پہلی بار مجھے دیکھا تھا۔ بہت سارا پرفیوم اپنے اوپر انڈیل کر جب میں والٹ، سیل فون اور چابیاں اٹھا کر جیب میں ڈال رہا تھا میں نے دروازے پر آہٹ محسوس کی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ روشانے اندر آ رہی تھی۔

”خیریت بیگم صاحبہ! آج آپ کا دل کچن میں کیوں نہیں لگ رہا؟“

میں نے اسے چھیڑا تو وہ مجھے گھور کر مصنوعی غصے سے بولی تھی۔

”آپ سے ناشتے کا پوچھنے آئی تھی۔ ویسے خیریت؟ یہ سوٹ کیوں پہنا۔ ارادے خطرناک لگ

رہے ہیں۔“

اس کا انداز مجھے کھل کر ہنسنے پر مجبور کر گیا تھا۔

”جب ارادے خطرناک نہیں تھے تب بھی صورتحال خطرناک ہو گئی تھی۔ اب تو خیر پھنس گئے۔“

میں نے جیسے بیچارگی کا تاثر دیا تھا وہ مجھے دیکھ کر رہ گئی۔

”یعنی آپ پچھتا رہے ہیں؟“

”نہ جی ہم تو اتنے خوش ہیں کہ دھمال ڈالنے کو جی کرتا ہے ریلی۔ ویسے یہ ٹائی کی ٹاٹ صحیح لگی ہے

دیکھنا؟“ میں نے بات کرتے سنجیدگی سے کہا تو وہ میرے داؤ کو سمجھے بغیر جھانسنے میں آگئی۔ جیسے ہی نزدیک آ کر

جائزہ لینا چاہا میں نے اسے ایک دم بازوؤں کے گھیرے میں مقید کر لیا تھا اور زور سے ہنس دیا۔

”محترمہ ثابت ہوا آپ ہر گز بھی چالاک نہیں ہیں۔ آگئیں نا میرے جھانسنے میں؟“

”یو چیٹر۔“

اس نے جھینپ کر میرے کاندھے پر ہاتھ کا مکہ مارا تھا۔
 ”یار دل کر رہا تھا نا تم سے پیار کرنے کو۔ پھر آفس جانا تھا کہاں ہاتھ آتیں رات سے پہلے۔“
 میں ہنوز ہنس رہا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے مصنوعی غصے سے گھورتی رہی پھر مسکرا کر میرے سینے سے سر ٹیک
 دیا تھا۔ میرے اندر جنموں کا سکون اترتا چلا گیا۔



پھر بہت سارے دن ایسے ہی آسودگی اور سرشاری کی کیفیت میں بیتتے چلے گئے تھے۔ زندگی
 سے مجھے جیسے سارے شکوے ختم ہو گئے۔ سارے دکھ ڈھل گئے تھے۔ میں مطمئن اور مگن ہو گیا تھا۔ کہ ایک
 بار پھر ابوداؤد نے میری زندگی میں ہلچل مچا دی۔ پہلے اس کا فون آیا تھا۔
 ”کیسے ہو عون مرتضیٰ؟“

اس کے دوستانہ لہجے پر میں زہر خند سے مسکرایا تھا۔
 ”تمہیں میری خیریت سے کیا لینا دینا؟“
 ”عون پلیز! چھوڑ دو اب ان باتوں کو!“ وہ تلخی ہوا تھا اور میں حیران۔
 ”کن باتوں کو؟“

”دشمنی کی باتیں عون! میں تھک گیا ہوں۔“ پتا نہیں وہ واقعی مضحک تھا یا مجھے لگا۔ بہر حال اب میں
 اس کے کسی فریب میں نہیں آنا چاہتا تھا۔
 ”میں تم سے کسی بھی موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ بہتر ہوگا آئندہ مجھ سے کسی قسم کا کانٹیکٹ
 نہ کرنا۔“ میں نے رکھائی سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا موڈ آف ہو چکا تھا۔
 ”کون تھا؟“

روشانے کے سوال پر میں نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”ابوداؤد!“

”کیا کہہ رہے تھے؟“ وہ سرک کر میرے قریب آگئی۔ میں ہونٹ بھیچے رہا تو اس نے بے چینی سے
 مجھے مخاطب کیا۔

”عون پلیز مجھے بتائیں نا حجاب کیسی ہے؟“
 ”مجھے نہیں پتا۔ میں نے پوچھا نہیں۔ اس نے بھی بات نہیں کی۔“
 میرا لہجہ ہنوز تھا۔ وہ کچھ دیر کوچپ سی ہو گئی۔
 ”آپ کو پوچھنا چاہیے تھا عون!“

”کیوں پوچھنا چاہیے تھا؟ کیوں پوچھوں میں۔ اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اس کے بعد اس کی
 گنجائش نکلتی ہے؟ ہرگز نہیں۔“

میرا لہجہ تاتا ہوا اور تند تھا۔ وہ کچھ خائف سی ہو گئی۔ مجھے بھی اپنے رویے کا احساس ہو گیا تھا۔
 ”آئی ایم ساری!“

میرے کسی قدر دھیمے لہجے میں کہنے پر اس نے گہرا سانس بھر لیا تھا۔ پھر رسانیٹ بھرے انداز میں
 میرے بازو پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر نرمی و لجاجت سے بولی تھی۔
 ”آپ کو پتہ ہے عون! حجاب وہاں جانا نہیں چاہتی تھی مگر وہ پھر بھی چلی گئی اور وہ بھی اپنی مرضی
 سے کیوں؟ آپ نے سوچا نہیں کیوں کیا اس نے ایسا؟“
 ”نہیں میں نے نہیں سوچا۔ اور مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ روشی پلیز تم مجھ سے اس ٹاپک پر
 بات مت کرو۔“

میں کسی قدر کرب میں مبتلا ہو کر بولا تو روشا نے نے سر کونٹی میں جنبش دی تھی۔
 ”اس طرح مسئلے حل تو نہیں ہوتے ہیں عون!“

”پھر کیا چاہتی ہو تم؟“ میں جیسے بے حد عاجز ہوا تو وہ اسی نرمی سے بولی تھی۔

”میں نے بہت غور کیا ہے اس بات پر عون! کہ جب حجاب وہاں گئی ان دنوں آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا
 تھا نا؟ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے جیسے ابو داؤد نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طریقے
 حجاب کو ٹارچہ کیا ہوگا کہ وہ یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ عون وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ جس روز آپ کا
 ایکسیڈنٹ ہوا اسی روز میری حجاب سے کھل کر اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ اس نے اپنا نظریہ واضح طور پر مجھ پر
 آشکارا کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کے دل میں ابو داؤد کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عون اس روز میں نے اپنی ہر
 کوشش ترک کر دی تھی۔ ایک عورت ہونے کی حیثیت سے میں جانتی ہوں کہ اگر دل میں گنجائش نہ ہو تو پھر کسی
 ناپسندیدہ انسان کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔“

روشانے کی بات نے مجھے گم صم کر کے رکھ دیا۔ حجاب مجھے کتنی عزیز تھی۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی
 نہیں تھی۔ ابو داؤد اس سے قبل مجھے چیلنج بھی کر چکا تھا کہ وہ حجاب کو چھین کر اور میرے خلاف بیان دلو کر دکھائے
 گا۔ یقیناً یہ اسی کی کسی گھٹیا چال کا نتیجہ تھا۔ مجھے لگا میرا دل گھبرانے لگا ہو۔ اگر یہ سچ تھا۔ تو حجاب میری وجہ سے
 اس عقوبت خانے میں اپنے آپ کو مصلوب کرنے چلی گئی تھی۔ اور میں الٹا اس سے بدگمان ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ بس
 یہی تھی میری محبت۔ میری پہچان!؟؟“

مجھے خود اپنے اوپر افسوس ہونے لگا۔ اضطراب اتنا بڑھا تھا کہ میں بے خیالی میں سگریٹ سلگانے لگا
 تھا جب روشا نے نے میرے ہاتھ سے سگریٹ کیس اور لائیٹر لے لیا۔

”نہیں عون پلیز! آپ ایسا نہیں کریں گے۔“

اس کے لہجے میں دھونس تھی نہ زبردستی، بس محبت تھی۔ کیر تھی۔ میں نے کچھ کہے بغیر اپنی جلتی
 آنکھیں کرب آمیز انداز میں بند کر لیں۔

”یہ بھی تو مسئلے کا حل نہیں ہے عون! پلیز مثبت انداز اپنائیے۔“

”کیا کروں میں؟ کیا کر سکتا ہوں۔“

میرے لہجے میں بے چارگی اور لا چاری تھی۔

”ابو داؤد کیا کہہ رہے تھے آپ سے؟“

”معافی کا خواہاں ہے۔ میں جانتا ہوں اسے ڈرامہ کر رہا ہے۔ وہ خبیث ہے پورا۔“ میں مشتعل ہو

کے چیخا۔ پھر احساس ہونے پر ایک دم دھیمابھی پڑ گیا۔

”روٹی! مجھے اس پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ بہت جھوٹا انسان ہے۔ یا تم یہ سمجھ لو کہ میں اس سے دوسری

مرتبہ دھوکہ نہیں کھانا چاہتا۔“

”لیکن عون یہ بھی تو دیکھیں ہماری دکھتی۔ رگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ حجاب ہے اس کے پاس!“

اس کی بات پر میں جیسے پھر مضطرب ہو گیا۔ تو اس نے میرے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے

رسانیت سے کہا تھا۔

”آپ اس کی بات سنیں وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ عون پلیز ٹرائی ٹوائڈ راسٹینڈ کہ اچھائی کی خاطر کوشش

کرنی پڑتی ہے۔ اصلاح کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے۔ پھر کہیں جا کے نتائج برآمد ہوا کرتے ہیں۔“ اس کی بات میں

وزن تھا میں قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

☆☆

اس سے اگلے دن جب میں خود اس سے کانٹیکٹ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ آفس مجھ سے

ملنے چلا آیا اسے رو برو پا کے میرے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں تھیں۔

”السلام علیکم!“

وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر وہ پہلے کی نسبت کچھ کمزور

لگ رہا تھا۔ میں کچھ کہے بغیر اسے گھورتا رہا۔

”سلام کا جواب تو دے دو یار۔“

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا تو میں پھنکارا تھا۔

”جن سے دشمنی اور نفرت کا رشتہ ہو ان پر سلامتی نہیں بھیجی جاتی۔“

اس کا چہرہ کچھ تاریک ہو گیا۔ وہ چند ثانیے کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”عون! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے معاف کر دو۔ پرانی باتوں کو کسی بھیا نک خواب کی طرح سے

بھول جاؤ؟ عون پلیز! پلیز عون مجھے ایک موقع تو دو۔“

”میں تمہیں ایک سے زیادہ مواقع دے چکا مگر تم نے ثابت کیا کہ تم بد فطرت ہو۔ میں کیسے بار بار،

دھوکہ کھاتا رہوں؟“

میرے لہجے میں غراہٹ در آئی تھی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں ہونٹ پکلتا مجھے دیکھتا رہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ غلط کیا۔ مگر عون میں حجاب کو خوش نہیں رکھ پارہا۔ اس دن سے جیسے میں نے اسے مکمل طور پر کھودیا ہے۔ جب میں نے اس سے زبردستی کورٹ میں تمہارے خلاف گواہی دلوائی۔ وہ مجھ سے اتنی خفا ہو گئی ہے کہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ اس کی طرف سے میں جیوں یا مروں مگر.....“

”بالکل ٹھیک کر رہی ہے تمہارے ساتھ۔ تم اسی قابل ہو۔“

میں نے پھر پھنکار کر کہا تو وہ کچھ دیر تک مضطرب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا تھا پھر اس نے سر جھکا لیا۔ ہتا نہیں مجھے کیوں لگا جیسے اس کی آنکھیں جھلملا گئی ہوں۔

”تو تم مجھے معاف نہیں کرو گئے؟“

”اس خوش فہمی کو اپنے دل سے نکال دو۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تمہاری اس ڈرامے بازی کی؟ اب تو میرے پاس ایسا کچھ بھی کھونے کو نہیں رہا جس کی وجہ سے تم ابھی تک میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔“

میں پھٹ پڑا تھا۔ اس نے جیسے ایک سرد آہ بھری تھی۔

”تم صحیح کہتے ہو عون! میں اپنے مطلب کی خاطر ہی تمہاری جانب آیا ہوں۔ اب بھی اسی مقصد کی وجہ سے۔ میں حجاب کو کھونے کے خوف سے ہراساں ہوں۔ وہ ہر گزرتے لمحے مجھ سے ہی نہیں زندگی سے بھی دور ہو رہی ہے۔ عون میں نے جان لیا۔ محبت میں زبردستی نہیں چلتی۔ میں نے زبردستی اسے حاصل کر لیا۔ تم سے چھین لیا۔ مگر میں اس کے دل سے تمہاری محبت نکال کر اپنی محبت ڈالنے میں کس بڑی طرح ناکام ہوا اس کا اندازہ تمہیں میری حالت دیکھ کر ہو گیا ہوگا۔ تم میری آخری امید تھے عون! میری تمہارے پاس آنے کی وجہ میں خود نہیں حجاب کا حوالہ ہی تھا۔ تمہیں اس سے بہت محبت تھی اور میں سمجھتا تھا یہ محبت ہی ہے جو انسان کو ہر مشکل اور کٹھن کام کے لیے بھی آمادہ کر سکتی ہے۔ جیسے مجھ جیسے انسان کا معافی مانگنا، کسی کے آگے گڑ گڑانا۔ تم نے غور کیا؟ میں کیوں بے بس ہوا؟ خیر جانے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے وقت بیت گیا ہے۔ میرے سارے قصور اور گناہ حجاب کے کھاتے میں درج ہو چکے ہیں۔ تمہارا رویہ مجھے بتلا سکتا ہے کہ خدا نے بھی میری توبہ قبول نہیں کی۔ مجھ جیسے انسان کو معافی ملتی بھی نہیں چاہیے۔ وہ اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اتنے دل اجاڑے اور پھر اپنے مقصد کے ٹائم اتنی آسانی سے معاف کر دیا جائے۔

اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ یاسیت آمیز بھرایا ہوا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اور میں اس کے چلے جانے کے بہت دیر تک بھی اس کے رویے و انداز میں سچ اور جھوٹ کی پرکھ کرتا رہا تھا۔

☆☆

میں کس سے جا کے کہوں حال دیدہ غم کا
کہ میرے دکھ سے تو آگاہ میری ماں بھی نہیں
وہ بار بار مجھے آزمائے جاتا ہے
یہ جانتا بھی ہے کوئی اپنے درمیان بھی نہیں

یہ بارشیں بھی تو کچی چھتوں کی دشمن ہیں
مگر یہاں تو میرے سر پر سائباں بھی نہیں

جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ میں نے تو حساب کتاب رکھنا بھی چھوڑ دیا کہ زندگی میں اذیت کرب اور بے بسی کا نام ہو کر رہ گئی تھی۔ جس روز ابو داؤد نے مجھے اس عورت کی وجہ سے اپنے کمرے سے چلے جانے کا کہا تھا۔ اس کے بعد میں دوبارہ اس کے روم میں نہیں گئی تھی۔ اس کے کہنے، بلانے، یہاں تک کہ مجبور کرنے کے باوجود۔ جب اس کا دل چاہتا وہ خود میرے پاس آ جاتا۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ ٹوٹا ٹوٹا سا، بکھرا ہوا۔ مجھے ایسے دیکھتا، جیسے نگاہ کے رستے دل میں محفوظ کر رہا ہو۔ اس کے ہر رویے ہر انداز میں تبدیلی تھی۔ اتنی بے حسی اوڑھ لینے کے باوجود مجھے اس کا کیئرنگ کا انداز، دلجوئی کی مشقتیں محسوس ہونے لگی تھیں۔ بجائے اچھا لگنے کے میرا دل گھبراہٹ کا شکار ہونے لگتا۔ یہ سچ ہے مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کبھی بھی میرا خیر خواہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہمیشہ مجھے توڑا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کیا تھا۔ اس تبدیلی، اس بدلاؤ کے پیچھے اس کا مقصد کیا تھا۔ ابھی آشکار نہیں کیا تھا۔ مگر میں لاشعوری طور پر منتظر تھی کہ وہ اپنی اصلیت سمیت مجھ پر کھل جائے۔ اسامہ کے رونے کی آواز پر میں اپنے خیالات سے چونک اٹھی۔ اسامہ سوتے سے جاگ گیا تھا۔ شاید اسے بھوک لگی تھی۔ میں نے اس کا فیڈر اٹھایا جو خالی تھا۔ میں نے رضیہ کو بلانے کے لیے انٹرکام پر رابطہ کیا مگر وہ شاید کچن میں نہیں تھی جی جھنٹی بجتی رہی تھی اس نے ریسور نہیں اٹھایا۔ گہرا سانس بھرتی میں خود اٹھی تھی۔ اسامہ کو کاندھے سے لگائے فیڈر ہاتھ میں لیے، میں کچن میں پہنچی تو رضیہ وہاں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ مجھے ایک دم اس پر غصہ آ گیا۔

”کہاں پہنچی ہوئی ہو تم؟ میں کب سے انٹرکام پر کال کر رہی تھی۔“

میرے تیور دیکھ کر وہ بے طرح گھبرا گئی۔

”کب بیگم صاحبہ؟ میں تو جی ابھی صاحب کے کمرے سے باہر آئی ہوں۔ چائے منگوائی تھی انہوں

نے، مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ آپ!.....“

”اچھا ٹھیک ہے۔ یہ فیڈر اچھی طرح سے دھو کر دودھ بوائل کر کے ذرا جلدی ڈال کے دے جانا۔“

میں فیڈر اس کی جانب بڑھا کر واپسی کو مڑی تھی کہ اس نے مجھے بے ساختہ پکارا تھا۔

”آپ کے لیے ناشتہ تیار کر دوں؟“

میں نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔ نو بج رہے تھے مگر کچھ کھانے کو ابھی بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اور

یہ داؤد، یہ آفس بھلا کیوں نہیں گئے؟ میرا ذہن الجھا مگر میں نے اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔

”نہیں۔ ابھی بھوک نہیں ہے بس تم فیڈر تیار کر کے دے جانا۔“

”وہ بی بی جی! صاحب نے بھی ناشتہ نہیں کیا۔“

میں نے ابھی ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ اس نے کسی قدر جھجک کر مجھے اطلاع دی۔ شاید وہ اس بات سے

خائف تھی کہ میں اسے ڈانٹ نہ دوں۔ ہمارے بیچ جو فاصلے اور دوریاں وزنجشیں حائل ہوئی تھیں ان سے رضیہ ضرور پوری

طرح آگاہ تھی کہ ہر وقت گھر میں رہتی تھی حالات کو اس سے چھپانا ممکن نہیں تھا۔ پھر ہم دونوں کو پرواہ بھی تو نہیں تھی۔

”تو یہ میرا سر درد تھوڑی ہے۔ جب دل چاہے گا کر لیں گے۔“

میری پیشانی شکن آلود ہوئی تھی۔ میں نے کسی قدر تلخی سے جواب دیا تھا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔
 ”وہ جی بی بی! میرا مطلب ہے کہ ان کی طبیعت کل رات سے ہی بہت زیادہ خراب ہے کل سے ہی انہوں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ اب بھی جب میں چائے لے کر گئی تو خاموش لیٹے رہے۔ میں نے آوازیں بھی دیں مگر بولے نہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے جی! شاید ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔“
 رضیہ کی طویل وضاحت نے میرے چہرے کی ناگواری میں اضافہ کر دیا۔

”زیادہ خراب ہے تو مجھے کیوں بتا رہی ہو؟ میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ اتنی ہمدردی ہے موصوف سے تو ڈاکٹر کوفون کر جا کے۔“

میں نے شدید غصے میں اسے بری طرح جھاڑ کے رکھ دیا۔ اور تلملاتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔
 اسامہ میرے کاندھے سے لگا پھر سو گیا تھا مگر میں بے خیالی میں اسے ساتھ لپٹائے تھکتی اور ٹہلتی رہی۔ پانچ منٹ بعد ہی رضیہ فیڈ رسمیت پہنچ گئی تھی۔

”یہ فیڈ رلے لیں بی بی جی!“

اس کی آواز پر میں چونکی تھی پھر فیڈ راس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”سنو اب کیا حال ہے ان کا؟“

میرے لبوں سے بے اختیار جو جملہ پھیلا تھا اس نے مجھے خود ششدر کر دیا۔ وہ بھی کچھ حیران ہو کے مڑی تھی۔

”کن کا جی؟“

”تمہارے صاحب کا؟ اور کون بیمار ہے یہاں پر؟“

میں بری طرح سے جھلائی تھی۔ وہ اسی قدر خائف ہو گئی۔

”پتا نہیں جی! میں دوبارہ ان کے کمرے میں نہیں گئی۔“

”تو جاؤ۔ اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہے تو ڈاکٹر کوفون کرو۔ نان سنس!“

میں پتا نہیں کیوں اتنا جھلا گئی تھی۔ وہ ڈری سہی سی مجھے دیکھتی رہی پھر تیزی سے پلٹ کر بھاگ گئی۔ میں کتنی دیر یونہی ہونٹ بھینچے کھڑی رہی۔ میرا چہرہ اتنا ہوا تھا اور دل میں جانے کیوں تشویش اٹھ آئی تھی۔ کیا میں ابو داؤد کی وجہ سے پریشان تھی؟

اپنے سوال نے مجھے خود حیران کر دیا۔ میں نے سوئے ہوئے اسامہ کو بیڈ پر لٹایا اور اس کے منہ میں فیڈ ر لگا کر کچھ دیر اسے تھپکا تھا۔ کبل اس پر برابر کیا اور سیدھی کھڑی ہو کر کچھ لمحے جیسے اضطراب کی کیفیت میں رہی۔ پھر پلٹ کر باہر آ گئی تھی۔ رضیہ کچن میں ہی مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر الرٹ نظر آنے لگی۔

”ناشتہ بنا دوں بی بی صاحبہ؟“

”تم گئی تھی داؤد کے کمرے میں؟“

”جی! مگر انہوں نے ڈاکٹر کو بلانے سے منع کر دیا ہے۔“

”کیوں؟ کیا طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے؟“

میرے سوال پر اس نے سرکوفی میں جنبش دی تھی۔

”نہیں جی، طبیعت تو ویسی ہی ہے۔ مگر ڈاکٹر کو بلانے سے منع کر دیا ہے۔“

میں ہونٹ بھیجنے کھڑی رہی۔ پھر کچھ کہے بغیر مڑ کے اپنے کمرے کی جانب جاتے جاتے کیوں میرے قدم ابوداؤد کے روم کی جانب اٹھ گئے تھے۔

”رضیہ! تم دفع ہو جاؤ یہاں سے، ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ کبل سے منہ نکالے بغیر زور سے دھاڑے تھے۔ میں ایک بل کو وہیں تھم گئی۔ جی چاہا یہیں سے پلٹ جاؤں مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں ابوداؤد کی طرح نہ بے حس تھی نہ سفاک! میں اتنی بے اعتنائی چاہتی بھی تو برت نہیں سکتی تھی۔

”ہاؤ ڈیئر یو۔“

”تمہیں سنتا نہیں ہے کہ.....“

میں نے آگے بڑھ کر ان کے چہرے سے کبل ہٹایا تو وہ خطرناک تیوروں کے ساتھ پھنکارتے ہوئے اٹھے تھے۔ مگر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی جیسے ساکن ہو کر رہ گئے۔ کیا تھا ان کی بے تحاشا سرخ آنکھوں میں۔

”غیر یقینی، تحیر، استعجاب!!!“

میں نے گہرا سانس بھرا اور ان کے دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ جیسے مسمرائز ہو گئے تھے۔

یک تک مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ مجھے بے حد الجھن ہوئی۔ تپ چڑھی تھی۔

”ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلانے دے رہے؟“

”مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر مریض کو ڈاکٹر کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔“ میں جھلانے لگی۔

”ہر مریض کو نہیں ہوتی۔“

وہ مجھے اسی طرح دیکھتے ہوئے اپنی بات پر زور دے کر بولے تو مجھے غصہ آنے لگا۔

”بہت خوب! پھر آپ کو اگر ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے تو کس کی ہے؟“

”تمہاری! تمہاری محبت کی۔ تمہاری مسیحائی کی۔“

وہ تو جیسے میرے کسی ایسے ہی سوال کے منتظر تھے۔ اتنی تیزی سے بولے اور لہجہ و انداز میں ایسی

شدت اور لپک تھی جس نے مجھے جکڑ بجالایا مگر مجھے جھنجھلاہٹ نے گھیر لیا تھا۔

”یہ ڈائیلاگز کہیں اور جھاڑیے گا سمجھے آپ! فضول کی باتیں۔“

میری بات کے جواب میں خاموشی رہی۔ وہ بس بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے۔ مجھے دیکھتے رہے۔

پھر انہوں نے سگریٹ سلگایا تھا۔

”میں ڈاکٹر کو کال کر رہی ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ڈرامہ کرنے کی۔ چیک اپ بھی کرایئے اور دوا بھی کھانی ہوگی۔“ میں نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا اور پیٹ کر باہر آ گئی۔ پھر پہلے میں نے ڈاکٹر کو کال کی تھی پھر کچن میں آ کر رضیہ سے ناشتہ تیار کرنے کا کہا تھا۔ دراصل میں خود کو لا پرواہ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ رضیہ نے جتنی دیر ناشتہ تیار کیا اتنی دیر میں دانستہ ہر سوچ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہیں کچن کی کھڑکی سے میں نے ڈاکٹر کو واپس مین کے ہمراہ داؤد کے روم کی سمت جاتے دیکھا تھا۔ رضیہ نے ناشتے کے لوازمات میرے آگے رکھے تو میں بے دلی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئی۔ مگر چند نوالوں سے زیادہ میں حلق سے نہیں اُتار سکی تھی۔ اضطراب کی وجہ واضح تھی مگر میں ماننے سے، اعتراف سے کتر رہی تھی۔ چائے کا گگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے میں نے رضیہ کو برتن اٹھانے کا اشارہ کیا تھا۔ اور خود اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابو داؤد کو اس وقت میری ضرورت ہے میں جانتی تھی مگر میں اس ضرورت کو پورا کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میرے دل میں کچی بات ہے گنجائش ہی باقی نہیں تھی۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ اس کا کیسا عظیم نقصان ہو گیا تھا۔

میرے ہمسفر! تجھے کیا خبر!

یہ جو وقت ہے کسی دھوپ چھاؤں کے کھیل سا

اسے دیکھتے اسے جھیلے

میری آنکھ گرد سے اٹ گئی

میرے خواب ریت میں کھو گئے

میرے ہاتھ برف سے ہو گئے

میرے بے خبر، تیرے نام پر

وہ جو پھول کھلتے تھے، ہونٹ پر

وہ جو دیپ جلتے تھے، بام پر

وہ نہیں رہے

وہ نہیں رہے کہ جو ایک ربط تھا درمیان

وہ بکھر گیا

وہ ہوا چلی

کسی شام ایسی ہوا چلی

کہ جو برگ تھے سر شاخ جاں! وہ گرا دیئے

وہ جو حرف درج تھے ریت پر

وہ اڑا دیئے

وہ جو راستوں کے تعین تھے

وہ جو منزلوں کے امین تھے

وہ نشان پا بھی مٹا دیئے

میں نے خالی مگ نیمل پر رکھا تھا تب ہی دروازہ ناک ہوا۔ میں نے گردن موڑے بغیر رضیہ کو اندر آنے کی اجازت دی۔

”وہ بی بی صاحبہ! ڈاکٹر صاحب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“

رضیہ کی بات نے میری پیشانی شکن آلود کر دی تھی۔

”کیا بات؟“ میں نے نروٹھے پن سے سوال کیا تو وہ کچھ گھبرا کر بولی تھی۔

”پتا نہیں جی! انہوں نے تو بس مجھے آپ کو بلانے کا کہا ہے۔“

میں نے جواب میں ہونٹ بھیج لیے پھر کچھ کہے بغیر اس سے پہلے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

دوپٹہ درست کرتے ہوئے میں داؤد کے کمرے کی جانب آرہی تھی جب دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صاحب باہر نکل آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر کھنکارے۔

”مسز داؤد مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔“

”فرمائیے؟“ میں نے جواباً خشک آواز میں کہا۔

”آپ کا داؤد صاحب سے کوئی جھگڑا چل رہا ہے؟“ ان کا لہجہ گو کہ محتاط تھا اس کے باوجود مجھے

بے حد ناگواری محسوس ہوئی۔ میں نے سر د نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ کچھ گڑبڑا کر بولے تھے۔

”دیکھیے میم پلیر آپ مائنڈ مت کریں۔ میں پرسنل نہیں ہو رہا مگر داؤد صاحب کی جو حالت ہے

اس کے پیش نظر میں نے آپ سے بات کرنا مناسب خیال کیا۔ وہ کسی قسم کے تعاون کو تیار نہیں ہیں۔ چیک آپ

تو کرالیا مگر دوالینے سے صاف انکاری ہیں۔ سگریٹ اور شراب ان کے لیے زہر قاتل کی طرح ہے مگر وہ مسلسل

ان دونوں چیزوں کے استعمال کی وجہ سے اپنے آپ کو تیزی سے تباہ کر رہے ہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے وہ کسی ضد

میں یہ سب دانستہ کر رہے ہیں۔ آپ وائف ہیں ان کی، اتنا تو سمجھتی ہوں گی۔ بہر حال آپ سے یہ سب کہنے کا

مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو پلیر کچھ کرنا چاہیے ان کی بہتری کی خاطر ورنہ خدا نخواستہ.....“

ڈاکٹر نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ پھر اپنا بیگ سنبھالے وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں ساکن

کھڑی رہ گئی تھی یوں جیسے کچھ سمجھ نہ پا رہی ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔ مجھے ان کی بات یاد آئی جو آخری بار مجھے

منانے کو انہوں نے کہی تھی۔

”مجھے چھوڑ کر مت جاؤ ہنی! مجھے معاف کر دو۔ مان جاؤ حجاب! یاد رکھنا اگر تم نہ مانی اور مجھے تنہا چھوڑ

کر چلی گئیں تو میں ساری رات یہاں بیٹھ کر ڈرنک کرتا رہوں گا۔ ان کے لہجے میں بیک وقت لجاحت اور ہٹ

دھرمی تھی۔ مگر میں نے پرواہ نہیں کی تھی۔ اور اپنے کمرے میں آ گئی تھی تو انہوں نے بھی اپنی بات پوری کی تھی۔ اگلی صبح

رضیہ نے ان کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے تین سے چار تازہ خالی ہونے والی بوتلیں نکال کر ڈسٹ بن میں پھینکی

تھیں۔ اور ایش ٹرے میں جو سگریٹ کی راکھ کا ڈھیر تھا وہ الگ تھا۔ وہ بے حد ضدی انسان تھا۔ اس کا منانے اور

معافی مانگنے کا انداز بھی الگ تھا۔ میں کس حد تک اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سامنے ٹھہرتی کہ ادھر تو وہ حال تھا۔

کوئی گمان، کوئی وعدہ تلاش کرتا ہے
وہ واپسی کا ارادہ تلاش کرتا ہے
وہ ریت کر کے میرے خوابوں کی زمینوں کو
میرے وجود میں دریا تلاش کرتا ہے

وہاں سے پلٹنے کے بجائے میں ان کے کمرے میں آگئی تھی مگر بڑی طرح سے جھنجھلائی، تلملائی ہوئی۔ یہ تلملاہٹ انہیں سگریٹ پھونکتے دیکھ کر کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

”کیا تکلیف ہے آپ کو؟ کیوں جان مصیبت میں ڈالی ہوئی ہے۔ آخر آپ سدھر کیوں نہیں جاتے؟“
سگریٹ ان سے جھپٹ کر میں بے دریغ ان پر برس پڑی تھی۔
”حجاب ہنی! ہاتھ جلایا نا اپنا۔ عقل تو بالکل نہیں ہے تمہیں۔“

بے خیالی میں ان سے سگریٹ چھین کر میں نے مٹھی میں دبایا تھا۔ مجھے احساس تک نہ تھا کہ غصہ میرے دماغ کو چڑھا ہوا تھا مگر ان کی توجہ کے شاید بھی ارتکاز میری جانب لگے ہوئے تھے۔ وہ جیسے میری تکلیف کا احساس کر کے تڑپ اُٹھے۔ سب سے پہلے میری بند مٹھی کھول کر سگریٹ اُٹھا کر پھینکا پھر مجلس جانے والی ہتھیلی کی جلد کو پریشان کن نظروں سے دیکھنے کے بعد دراز سے مرہم ڈھونڈ کر لگانے میں مشغول ہو گئے تھے۔ انداز کی اپنائیت، توجہ اور محبت۔ لوٹ لینے والی، جکڑ لینے والی تھی۔ میں جیسے گنگ سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔
”کچھ فرق پڑا تکلیف کو؟“

مرہم لگا کر انہوں نے اچانک سراونچا کر کے مجھے مخاطب کیا تو میں اس کھوئی کھوئی کیفیت سے نکل کر چونک گئی۔

”مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے سمجھے آپ! میں نے کہا بھی تھا کہ اس قسم کے ڈرامے مت کیا کریں میرے ساتھ۔“ میں جیسے بھڑک اُٹھی تھی۔ انہوں نے کچھ دیر مجھے دیکھا پھر گہرا سانس بھر لیا تھا۔
”یہ ڈرامہ نہیں ہے حجاب! محبت ہے۔“

”پلیز انف!“ میں چیخی تو وہ چپ چاپ میرا سرخ چہرہ دیکھتے رہے تو مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔
”ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے؟ آپ میڈیسن نہیں لینا چاہتے۔ یہ ڈرنک اور اسموکنگ چھوڑتے کیوں نہیں ہیں؟“
”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے، بی کا ز تمہیں میری کیا پرواہ؟ مروں یا جیوں۔“

وہ کسی قدر سرد آواز میں بولے تو میں نے جواباً سلگتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔
”مجھے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا مگر کوئی میرے سر چڑھ کے مرے مجھے یہ بھی گوارا نہیں ہے۔“
”ایسی بات نہیں ہے تم ایسا کچھ مت سوچو۔“

انہوں نے جیسے ہارے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ میں کینہ تو ز نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔
”تم مجھے معاف کر دو حجاب! پلیز! میں تمہیں اتنی محبت دوں گا کہ سارے دکھ بھول جاؤ گی۔“
وہ جیسے گڑ گڑانے لگے۔ میرا چہرہ اضطراب کی کوشش میں سرخ پڑ گیا۔

”کروں گی معاف مگر ایک شرط ہے میری۔“

”ک کیا؟“ وہ جیسے ایک دم پر جوش ہوئے۔

”مجھے میرے وہی عون بھیا لوٹا دیں۔ جو آپ کی وجہ سے چھن گئے ہیں۔ مجھے میری ماما کی محبت، پیارا

کی شفقت دے سکتے ہیں؟ نہیں نا؟ میں بھی آپ کو معاف نہیں کر سکتی۔“

میں بے ساختہ چیختی چلی گئی۔ جبکہ وہ ساکن ہو کر مجھے تکتے رہے تھے۔ میں روتے ہوئے وہاں سے

اٹھ کر اپنے کمرے میں بھاگ آئی تھی۔

☆☆

میرے سر میں شدید درد تھا۔ دوائے کر میں سو گئی تھی۔ دوبارہ آنکھ کھلنے پر میں نے رضیہ کو دیکھا۔ وہ

میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ شاید اسی نے مجھے جگایا تھا۔

بی بی صاحبہ! بی بی صاحبہ! صاحب کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ گل خان نے بتایا ہے کہ

وہ اپنے کمرے میں گرے ہوئے تھے۔ اسی نے انہیں اٹھا کر بیڈ پر لٹایا ہے۔ مگر انہیں ہوش نہیں آرہی۔“

رضیہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ میں ایک دم سرد پڑ گئی۔ پھر میں ایک دم اٹھی تھی اور دوپٹے اور چپل کی

پردہ کے بغیر دوڑتی ہوئی ابو داؤد کے روم میں آ گئی۔ گل خان اور مالی کا لڑکا دونوں ہی اندر تھے۔ اور ابو داؤد کو

ہوش میں لانے کی تدابیر کر رہے تھے۔

”یہاں کیا جھک مار رہے ہو؟ جاؤ ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ۔“

میں بے ساختہ چیختی تھی۔ دونوں گھبرا کر باہر چلے گئے۔ میں لپک کر ابو داؤد کے نزدیک آ گئی۔ وہ کچھ

بے ترتیب سے بستر پر دراز تھے۔ ان کی شرٹ بھگی ہوئی تھی اور لانی پلوں والی غلانی آنکھیں سختی سے بند تھیں۔ میں

نے ہاتھ بڑھا کر ان کی پیشانی چھوئی تو جیسے سخت تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ میں بستر پر ان کے سر ہانے آ کر بیٹھی تھی پھر

جیسے تیسے انہیں سیدھا کیا تھا اور اپنے دوپٹے سے ان کا پانی سے تر چہرہ اور جسم خشک کرنے کے بعد کمبل برابر کر دیا۔

”ابو داؤد!“ میں نے انہیں پکارا تھا اور آہستگی سے ان کے رخسار تھپتھپائے مگر ان کے وجود میں کسی

قسم کی کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

”بہت ضدی ہیں نا آپ!“ اپنی بات منوانے کو جب اور کوئی طریقہ نہیں سوچا تو اپنی جان کے دشمن

ہو گئے۔ ”میرا دل اتنا گداز ہو رہا تھا کہ میں بے اختیار پچکیوں سے رو پڑی۔

ہٹ دھری، ضد اور دھونس، زبردستی سے بھی بھلا دل فتح ہوتے ہیں ابو داؤد! مگر آپ نے تو مجھے

ایسے بھی جیت لیا ہے۔ میں ہاری ہوئی تو ہوں۔ کیوں مجھ سے میری انا اور جھوٹا بھرم بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔

اتنے ستم توڑے ہیں۔ میری ذرا سی بے رخی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں۔ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں

کیسے یقین کر لوں؟ جبکہ آج بھی آپ کے ہر انداز میں دہلی ہی جارحیت ہے۔ آج بھی اپنی بات منوانے اور

جیت لینے کا خیال ہی آپ کو کچھ اور سوچنے نہیں دیتا۔“

مجھے پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ میں ان سے لپٹ کر روتے ہوئے سسکیاں بھرتے ہوئے آہستگی سے کہتی

رہی۔ حالانکہ جانتی تھی وہ کچھ نہیں سن رہے۔ کچھ نہیں سمجھ رہے۔ پھر بھی۔ دل پر بوجھ ہی اتنا تھا۔ دکھ ہی اتنا تھا۔ کیا یہ احساس کم تکلیف دہ تھا کہ یہ شخص جس سے میں اپنے تئیں نفرت کرتی رہی تھی اس کی تکلیف پر تڑپ اٹھی تھی۔ وہ درد گر، ستم گر ہو کر بھی مجھے پیارا تھا۔ وجہ تو واضح تھی۔ اپنے آپ سے کترانا اور نظریں چرا نا کیا معنی رکھتا تھا۔ حقیقت بدلنے سے تو رہی تھی۔ جانے کتنی دیر یونہی آنسو بہاتے بیت گئی۔ دروازے پر زور دار دستک ہوئی تو میں چوکی تھی۔ اور جلدی سے ابو داؤد سے الگ ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مالی کالٹر کا اندر چلا آیا تھا۔ ”اب کیا ہوا ہے انہیں؟ بلکہ جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ جبکہ آپ دونوں نے ایک ضد باندھی ہوئی ہے۔“

محترمہ مجھے سمجھ نہیں آتی جب یہ مرنا چاہتے ہیں اور آپ کو پرواہ نہیں تو آپ مجھے بار بار زحمت کیوں دیتے ہیں؟“

ڈاکٹر صاحب آتے ہی مجھ پر برس پڑے تھے۔ وہ ساری نہیں کسی حد تک صورتحال سے آگاہ تو ہو ہی چکے تھے۔ ان کی خفگی کچھ ایسی بے جا بھی نہیں تھی۔ سکی اور خجالت سے میرا سراو پر نہیں اٹھ سکا۔ وہ جھلاتے ہوئے آگے بڑھے اور ابو داؤد کو ٹریٹمنٹ دینے لگے۔ دس پندرہ منٹ اس کام میں مسلسل لگے رہنے کے بعد وہ سیدھے ہوئے تو ان کا موڈ ہنوز آف تھا۔

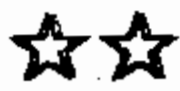
”یہ کچھ میڈیسن ہیں جو لازمی انہیں استعمال کرانی ہیں۔ اگر آپ نے اب بھی پراپر علاج نہ کرایا تو پلیز اسے میری گزارش سمجھ لیں کہ مجھے دوبارہ مت بلائیے گا۔ انسانی ہمدردی میں میں جہاں تک کر چکا ہوں کافی ہے۔ اگر انسان خود اپنے آپ کو بچانا نہ چاہے تو ہر دوا اور علاج بے فائدہ ہوتا ہے۔“

انہوں نے کسی قدر ناراضی سے کہا اور پلٹ کر جانے لگے تھے کہ میں نے بے ساختہ پکار لیا تھا۔

”ون اے منٹ ڈاکٹر صاحب! انہیں ابھی تک ہوش کیوں نہیں آیا؟“

میں ان سے نظریں چرا کر بولی تھی جواباً انہوں نے گہرا متاسفانہ سانس کھینچا اور ٹھہرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئے۔ انہوں نے اپنا کیس خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ساہا سال کی شدت کی شراب نوشی نے ان کے پچھپھروں کو مڈی طرح سے متاثر کیا ہے۔ اب صرف احتیاط اور پریزیسی ان کا علاج ہے۔ ساتھ میں پراپر چیک اپ اور سنجیدگی سے کروایا گیا علاج۔ خیر میں نے انجکشن دیا ہے۔ پانچ سات منٹ میں ہوش آجائے گی۔“

مجھے تسلی دینے اور دوا کا طریقہ استعمال سمجھانے کے بعد وہ کمرے سے چلے گئے تھے۔ میں ساکن بیٹھی ابو داؤد کو دیکھتی رہی۔ اب اس کے سوا کوئی حل نہ تھا کہ میں ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی۔ ایسا میں صرف ان کی ضد کی وجہ سے تو نہ کرتی، ان کی محبت کا بھی یہ تقاضا تھا کہ میں یہ سب کرتی۔ اور میں نے ان کی بات ماننے، انہیں معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بہر حال میں سب کچھ کھو کر اب یہ آخری پوچھی بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں اس نقصان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔



”داؤد اٹھ جائیں اب، میں ناشتہ لے کر آئی ہو آپ کا۔“

میں نے ٹرے ٹیل پر رکھے ہوئے انہیں آواز دی تھی۔ وہ ذرا سا کسمسائے اور کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں۔ اور مجھے یک ٹک دیکھنے لگے۔

”چلیں فریش ہو کے آئیں جلدی سے۔“

میں نے آگے بڑھ کر ان کے جسم سے کبل بٹا دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے مگر بستر نہیں چھوڑا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
”یہ خواب ہے نا، ہنی؟“

”نہیں حقیقت۔“ میں نے جواباً سانسیت سے کہا تو وہ اسی سنجیدگی سے مجھے دیکھتے رہے۔
”تم نے مجھے معاف کر دیا؟“

سوال ہوا تھا اور میں چند ثانیوں کو جواب نہیں دے سکی۔

”ہاں!“ میں نے گہرا سانس بھرا تو وہ مسکرائے تھے۔

”محبت کرتی ہو مجھ سے اس لیے؟“

”ساری باتیں ابھی پوچھ لیں گے۔ ناشتہ کر لیں پہلے۔“

میں نے بات بدل دی مگر ان کا موڈ نہیں بدل سکی۔

”چلو یہ بتاؤ خفا کیوں ہوئی تھیں مجھ سے؟“

میں نے جواب میں شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”آپ کو نہیں پتا؟“ مجھے بے حد دکھ ہوا تھا جواب میں وہ کچھ آہستگی و نرمی سے مسکرائے پھر کسی قدر

شوخی سے بولے تھے۔

”ہاں پتا ہے مجھے کہ۔“

وہ مجھ سے روٹھے ہیں تو صرف اس بات پر

کہ جب ہم پیار کرتے ہیں تو حد تک بھول جاتے ہیں۔

مجھے ان کی اس شرارت نے خفت زدہ کر دیا تھا۔ میں بے ساختہ نظریں چرا گئی۔ وہ میری کیفیت

سے حظ لے کر ہنسنے لگے۔

”آپ ہمیشہ بدتمیز ہی رہیں گے۔ سدھرنے کی امید مجھے چھوڑ دینی چاہیے۔“

میں کسی قدر جھنجھلائی تھی۔ انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔

اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ دیکھو کتنا بدل گیا ہوں میں۔ صرف تمہاری وجہ سے تمہاری محبت میں۔

ورنہ مجھے کسی کی پرواہ کبھی نہیں رہی۔ میں نے کبھی کسی سے معافی نہیں مانگی۔ میں واقعی تم سے محبت کرتا ہوں کیا

خوب ہے یہ شعر کہ۔

کچھ رنگ تیرے روپ میں یوسفؑ کی طرح ہیں

ورنہ میں تیرے ہجر میں یعقوبؑ نہ بننا

”بس ایسی ہی بات ہے جناب!“

ان کی آنکھوں میں شوخی کا رنگ تھا۔ محض میری ایک ذرا سی توجہ، ذرا سے التفات نے انہیں کتنی

جلدی زندگی کی طرف پلٹایا تھا۔ میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”حجاب تمہیں یقین نہیں ہے نا میری بات کا؟“

انہوں نے ایک دم میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے گہرا سانس بھر کے سر جھکا لیا۔ وہ کچھ دیر کو خاموش رہ گئے۔

”حجاب میں تمہاری خوشی کی خاطر عون سے بار بار معافی مانگتا رہا ہوں مگر وہ کسی بھی میری بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں ہے۔ کیا کسی بڑے انسان کا بدل جانا خلاف فطرت ہے حجاب! جو کوئی میری بات ماننے کو تیار نہیں کہ میں بھی بدل سکتا ہوں؟“

وہ جیسے بے بسی کی انتہا پر جا کر مجھ سے سوال کر رہے تھے اور میں نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا میں تو اس جگہ پر اٹک گئی تھی کہ وہ عون بھیا سے معافی مانگنے گئے ہیں۔

میری خاموشی پر انہوں نے گہرا سانس بھرا تھا اور آہستگی وزمی سے گویا ہوئے تھے۔

”لیکن تم فکر نہ کرو حجاب! میں عون کو یقین دلا کر رہوں گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ہنی! کہ تمہارے جو نقصان میری وجہ سے ہوئے ہیں میں انہیں ضرور پورا کروں گا۔“

”آپ ناشتہ کر لیں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

میں نے بات بدل دی تو وہ گہرا سانس بھرتے ہوئے اٹھ کر واش روم میں چلے گئے تھے۔ میں سر جھکائے اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی جب کسی بے حد شناسا پکار پر چونک کر متوجہ ہوئی۔ اگلے لمحے میں حق دق رہ گئی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا وہ اتنا ناقابل یقین تھا کہ میں آنکھیں پھاڑے بس ماما، پاپا، عون بھیا، روشی، فیضی بھائی کے ساتھ اپنے سب پیاروں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ میرا الوژن تھا۔ بھلا وہ سب مجھ سے ملنے کیسے آسکتے تھے۔ میں نے سوچا تھا مگر جب ماما نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا تو میرا یہ گمان یقین میں بدل گیا تھا۔ میں ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روتی چلی گئی تھی۔

☆☆

اے موج ہو تو ہی بتا!!

وہ دوست ہمارا کیسا ہے؟

جو بھول چکا ہمیں کب سے!

وہ جان سے پیارا کیسا ہے

کیا اس کے جیون لمحوں میں

کوئی لمحہ میرا باقی ہے

کیا اس کی جاگتی آنکھوں میں

میری یاد ابھی بھی باقی ہے

اگر ایسا نہیں تو تو ہی بتا

ہم یاد اسے کیوں کرتے ہیں

وہ ہم سے پچھڑ کے خوش ہے اگر
تو پل پل ہم کیوں مرتے ہیں
اے موج ہو تو ہی بتا

میں رات کو سونے کی غرض سے کمرے میں آئی تو ابوداؤد کا شکوہ بھرا میسج موجود تھا۔ جسے پڑھ کر میں بے ساختہ مسکراتی تھی۔ مجھے ماما اور بھیا اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے تو وجہ بہت ساری خوشی کی خبروں کا اکٹھا ہونا تھا۔ فیضان بھائی کا بیٹا ہوا تھا۔ روشا نے پریگنٹ تھی اور عیسیٰ بھائی کے لیے بھی ماما نے لڑکی پسند کر لی تھی۔ سب سے بڑی خوشی تو ہماری صلح تھی۔ ابوداؤد کو بھیا نے معاف کر دیا تھا تو اس کے پیچھے سب سے زیادہ عیسیٰ بھائی اور روشا نے کی کوششوں کا کمال تھا۔ مجھ پر ساری باتیں آشکارا ہوئی تھیں تو میں کبھی جذبات میں آ کر روتی تھی کبھی ہنسنے لگتی۔ خوشی تھی، اطمینان تھا۔ محبتیں اور مان تھے۔ مجھے خدا نے سب کچھ لوٹا دیا تھا۔ ابوداؤد سمیت، میں وہاں آئی تھی تو واپس جانے کو اگر دل چاہتا بھی تو کبھی ماما روک لیتی تھیں۔ کبھی روشی، تو کبھی عیسیٰ بھائی! ابوداؤد ہر روز مجھے لینے آتے اور ہر روز ہی منہ لٹکا کے چلے جاتے۔ اور میں ہنسی چھپاتی رہتی۔ آج ان کا یہ میسج ان کی خفگی کا اظہار تھا۔ میں نے اسی وقت انہیں کال کر لی۔

”آج آپ آئے کیوں نہیں؟“

سلام دعا کے بعد میں نے مقصد کی بات کی تھی۔

”محترمہ وہ میرا سسرال ہے۔ روز روز کا جانا قدر بھی کم کر سکتا ہے جو بڑی مشکلوں سے حاصل ہوئی ہے۔ تم عیش کرو۔ میرا کیا ہے میں راتوں کو سونہ پاؤں تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

وہ مصنوعی ناراضی سے بولے تو میں ہنستی چلی گئی تھی۔

”آپ آجائیں، میں چلوں گی۔“

”پکا وعدہ ہے؟“ وہ ایک دم پر جوش ہوئے۔

”جی جناب! بالکل پکا وعدہ۔ اب اسامہ بھی تو نہیں رہتا نا ہر وقت آپ کا نام الاپتا ہے۔“

”اور تم؟“ ان کے لہجے میں اشتیاق در آیا۔

”میں تو یہاں زیادہ خوش ہوں۔ ظاہر ہے اتنے عرصے بعد پھر گھر والوں سے ملی ہوں۔“

میں نے جان بوجھ کر بے نیازی دکھائی تو جواباً انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔

”ظالم لڑکی! کبھی اظہار محبت کر کے مجھے خوشی مت دینا۔“ ان کے شاکی انداز پر میں پھر ہنس دی۔

اور یونہی ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔ اور اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں بھرنے لگی۔ کہ ان سے ملنے کی

بے چینی تو مجھے بھی تھی۔ وہ جو ساری عمر دردِ گرد رہا تھا اب مہربان ہوا تھا تو میں چاہتوں کے رنگ اپنی ہتھیلیوں پر

بکھرتے دیکھنا چاہتی تھی تو میری یہ خواہش بے جا تو نہیں تھی۔ میں اس رب کی شکر گزار تھی جس نے مجھے میری

سبھی چاہتیں واپس سوپ دی تھیں۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی خوشی ہو سکتی تھی آپ کا کیا خیال ہے؟

